زندگی کی شاہراہ پر

میکسم گورکی

ترجمہ: رضیہ سجاد ظہیر

اچھا تو لیجئے چل پڑا میں زندگی کی شاہراہ پر۔ شہر کی بڑی سڑک پر جوتوں کی دوکان میں ''بوائے'' ہو گیا ہوں۔ اس دوکان کا نام ہے ''فیشن ایبل جوتے''۔

میرا مالک ناٹا سا، موٹا سا آدمی ہے۔ اس کا چہرہ میلا اور بے جان ہے، پھولا ہوا اور خدوخال مٹے مٹے سے۔ اس کے دانتوں پر کائی سی جمی ہوئی ہے۔ مجھے تو وہ اندھا دکھائی دیتا ہے اس لئے آزمانے کو منہ چڑاتا ہوں۔ دیکھوں اندھا ہے یا نہیں؟ وہ مجھ سے بڑی آہستگی لیکن درشتی سے کہتا ہے ''مت بگاڑ و اپنا تھوبڑا''۔

مجھے اس خیال ہی سے کوفت ہوتی ہے کہ ''دھندلی'' آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں، یقین نہیں آتا کہ دیکھ رہی ہیں۔ ہوسکتا ہے مالک نے صرف اندازہ لگالیا ہو کہ میں اس کا منہ چڑارہا ہوں؟

لیکن وہ اپنے موٹے موٹے ہونٹ ہلاتا تک نہیں اور زیادہ دھیرے سے کہتا ہے، پھر دہراتا ہے ''مت بگاڑو اپنا تھوبڑا۔''

پھر اس کی رینگتی ہوئی فوں فوں میرا پیچھا کرتی ہے ''اور ہاتھوں کو مت کھجائے جاؤ۔ یاد رکھو تم شہر کی بڑی سڑک پر ایک فرسٹ کلاس دوکان پر نوکر ہو! بوائے کو دروازے پر تن کر کھڑا ہونا چاہئے، مجسمے کی طرح۔''

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجسمہ ہے کیا۔ بھلا مجھ سے کھجائے بغیر رہا نہیں جاتا کیونکہ ہاتھ سے لے کر کہنی تک تمام سرخ سرخ ددوڑے اور پھنسیاں ہیں اور پسو کھال سے چپک رہے ہیں۔

''گھر پر کیا کرتا تھا؟'' وہ میرے ہاتھوں کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔

جب بتاتا ہوں تو اپنا کدو جیسا سر ہلاتا ہے جس پر بھورے دھبے پڑے ہوئے ہیں، وہ تکلیف دہ انداز میں کہتا ہے ''کوڑا کرکٹ جمع کرنا تو بھیک مانگنے سے بھی بدتر ہے، چوری سے بھی بدتر ہے۔''

''ویسے میں نے چوری بھی کی ہے'' میں ذرا فخر سے جواب دیتا ہوں، تو وہ اپنے پنجوں پر ٹک کر آگے کو جھکتا ہے، بلی کی طرح اور مجھے غور سے حیران نظروں سے تکتے ہوئے کاؤنٹر سے پھنکارتا ہے ''کیا... آ آپ چوری کی؟''

میں سب سمجھاتا ہوں۔ کیسے چوری کی اور کیا چرایا۔

''اچھا خیر، اس کو معاف کیا لیکن اگر تم نے یہاں جوتے یا روپے پیسے چرائے تو جیل خانے بھجوا دوں گا۔ وہاں تجھے عقل آ جائے گی...''

وہ تو بڑے اطمینان سے بات کہتا ہے لیکن میں گھبرا جاتا ہوں اور اس سے اور بھی نفرت کرنے لگتا ہوں۔

مالک کے علاوہ دوکان میں اور دو اسسٹنٹ ہیں۔ ایک تو میرا ماموں زاد بھائی (یاکوف ماموں کا لڑکا) اور ایک بڑا اسسٹنٹ۔ بڑا چست سا بلکہ چکنا چپڑا سا آدمی، لال لال جلد۔ ساشا بھورے رنگ کا کوٹ پہنا ہے، ڈھیلی ڈھالی لمبی پتلون، گلوبند بندھا ہوا اور وہ اس قدر شیخی پر چڑھ گیا ہے کہ مجھے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

جس دن نانا ابا مجھے دوکان کے مالک کے پاس لائے اور ساشا سے التجا کی کہ مجھے بھی کام سکھا دے تو اس نے ناک بھوں چڑھا کر کہا:

''پہلے یہ میرا حکم ماننا تو سیکھے!''

نانا ابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے آگے کو دھکیلا:

''اس کا حکم ماننا، یہ تم سے عمر میں بھی بڑا ہے اور عہدہ میں بھی بڑا ہے...''

ساشا نے بڑی شان سے اپنی آنکھیں گھمائیں

''دیکھ، دادا ابا کی بات یاد رکھنا۔''

پہلے ہی دن سے اس نے اپنے بڑے ہونے کا فائدہ بہت شدت سے اٹھانا شروع کر دیا بلکہ مالک نے اس کو ڈانٹ بھی پلائی ''کاشیرین، آنکھیں پھاڑ کر مت دیکھو۔''

''میں تو کچھ نہیں کر رہا ہوں'' ساشا نے سر جھکا کر جواب دیا۔لیکن مالک نے اس کی جان نہیں چھوڑی ''اور بکرے کی طرح سینگ نہ دکھاؤ۔گاہک سمجھیں گے کوئی بکرا کھڑا ہے...''

بڑا اسٹنٹ بڑے عزت واحترام سے ہنسنے لگا، مالک نے اپنے موٹے بھدے ہونٹ پھیلائے اور ساشا بے حد جھینپا ہوا کاؤنٹر لگے نیچے غوطہ لگا گیا۔

مجھے اس طرح کی گفتگو سے نفرت تھی۔ یہ لوگ بعض وقت ایسے عجیب الفاظ استعمال کرتے تھے جیسے کوئی اجنبی زبان بول رہے ہیں۔

جب کوئی خاتون دوکان میں داخل ہوتین تو مالک فوراً اپنی جیب میں سے ہاتھ نکال کر مونچھوں پر تاؤ دیتا، اس کی چندہی آنکھوں کا انداز تو نہیں بدلتا تھا لیکن جھریاں پڑے ہوئے گالوں پر ایک چپچپی مسکراہٹ پھیل جاتی۔ بڑا اسسٹنٹ جلدی سے تیار ہو جاتا، کہنیاں پہلوؤں میں برابر کر لیتا اور ہاتھ جیسے پیار کرنے کو پھڑ پھڑانے لگتے۔ساشا اپنے باہر نکلے ہوئے دیدوں کو مارے ڈر کے چھپانے کی کوشش میں جلدی جلدی آنکھیں جھپکانے لگتا اور میں دروازے پر کھڑا چپکے چپکے اپنے ہاتھ کھجاتا اور خرید وفروخت کا تماشا دیکھتا۔

جب بڑا اسسٹنٹ دوزانو ہو کر کسی خاتون کو جوتا پہنا کر دیکھتا تو اس کی انگلیاں بڑے عجیب طریقے سے پھیل جاتیں۔ ہاتھ کانپتے اور ایسا لگتا وہ پاؤں کو ہاتھ لگاتے ڈرتا ہے کہ پاؤں کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ حالانکہ عام طور پر وہ پاؤں خوب موٹا تازہ ہوتا جیسے ڈھلوان کندھوں والی کوئی بوتل الٹ کر رکھ دی گئی ہو۔

ایک بار ایک خاتون بدک گئیں اور پیر جھٹکتے ہوئے بولیں: ''افوہ، گدگدی کرتے ہو تم تو...''

اسسٹنٹ نے فوراً جواب دیا ''وہ تو ادب سے، مادام۔''

ایسے عورتوں کے پاس چکر کاٹتے ہوئے وہ بڑا مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ میں تو ہمیشہ ہنسی چھپانے کے لئے دروازے کی طرف منہ کر لیتا تھا۔لیکن پھر بھی اس کی ترکیبیں ایسی مزیدار ہوتی تھیں کہ مڑ کر دیکھے بغیر بھی نہیں رہا جاتا تھا اور ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں تو زندگی بھر کبھی اپنی انگلیاں اس طرح ادب سے نہ پھڑ پھڑا سکوں اور دوسروں کے پیروں میں اس پھرتی اور کاریگری سے جوتے نہ پہنا سکوں۔

اکثر مالک کاؤنٹر کے پیچھے ایک چھوٹی سی کوٹھری میں چلا جاتا اور ساشا کو بھی وہیں بلا لیتا اور بڑا اسسٹنٹ دوکان میں کسی گاہک عورت کے ساتھ اکیلا رہ جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اس نے سرخ

بالوں والی ایک عورت کا تلوا چھوا اور اپنی انگلیاں چوم لیں۔

''توبہ، کیا شریر آدمی ہو بھئی تم'' عورت نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اف! وہ!..'' اسسٹنٹ نے منہ لٹکاتے ہوئے کہا۔

مجھے کو اتنی ہنسی آئی کہ اگر دروازے کا موٹھ نہ پکڑ لیتا تو گر پڑتا لیکن جیسے ہی میں نے موٹھ پکڑا، دروازہ کھل گیا اور میرا سر دروازے سے ٹکرا گیا۔ شیشہ چھنا چھن کرتے ہوتے باہر گر پڑا۔ اسسٹنٹ نے زور زور سے پیر پٹخا، مالک نے میرے سر میں اپنی نگ والی سونے کی بھاری انگوٹھی سے خوب کچو کے دئے، ساشا نے میرے کان کھینچنے کی کوشش کی اور شام کو جب ہم لوگ گھر جانے لگے تو اس نے بڑی سختی سے مجھے خبردار کیا:

''اگر یہی حرکتیں رہیں تو نکال دئے جاؤ گے۔ آخر اس میں اتنے ہنسنے کی کیا بات تھی؟''

پھر اس نے مجھے سمجھایا کہ خواتین جتنا ہی زیادہ دوکان میں کام کرنے والوں کو دلچسپ پاتی ہیں، اتنی ہی زیادہ بکری ہوتی ہے اور کاروبار چلتا ہے۔

''دیکھو نا فرض کرو کہ اگر کسی خاتون کو جوتے کی ضرورت نہیں بھی ہے تب بھی وہ ایک دلچسپ اسسٹنٹ کی خاطر جوتے کا ایک فالتو جوڑا بھی خرید سکتی ہے۔ اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی! تم کو بس کوئی کیا سکھائے...''

مجھے اس کی باتوں سے کوفت ہوئی۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ دوکان میں مجھے کسی نے بھی کچھ سکھایا نہیں اور ساشا نے تو اور بھی کم!

روز صبح کو ہماری باورچن جو بڑی مری گلی اور چڑ چڑی عورت تھی، مجھ کو ساشا سے ایک گھنٹے پہلے اٹھا کے بٹھا دیتی تھی۔ میں سب تندوروں کے لئے لکڑیاں لاتا، سماوار جلاتا، دیگچیاں مانجھتا، مالکوں، بڑے اسسٹنٹ اور ساشا کے کپڑوں پر برش اور جوتوں پر پالش کرتا، کھانے کے برتن مانجھتا۔ دوکان پر بھی میں جھاڑو دیتا، جھاڑ پونچھ کرتا، چائے بناتا، پیکٹ پارسل ادھر ادھر پہونچانے جاتا اور پھر گھر جا کر کھانا لاتا۔ جب میں ان سب کاموں میں رہتا تو ساشا کو دروازے پر کھڑا رہنا پڑتا اور وہ اپنی کسر شان سمجھتا مجھ پر چیختا ''ابے گنوار اجڈ، سارا کام میرے ہی سر ڈال دیتا۔''

مجھے اوکا کے گدلے پانی کے کنارے یا کناوینو کی ریتلی گلیوں کے آس پاس، کھیتوں اور جنگلوں کی

آزاد زندگی کی عادت تھی۔ اس لئے مجھے اپنی یہ زندگی بڑی سپاٹ اور پھیکی لگتی تھی۔ نانی اماں یاد آتی تھیں، اپنے سب ساتھی سنگی یاد آتے تھے، کوئی نہ تھا کہ میں اس سے بات کر لیتا۔ اور اس زندگی کی ظاہر داری اور جھوٹ جو مجھے نظر آتے تھے ان سے مجھے بہت ذہنی اذیت ہوتی تھی۔

اکثر خواتین بغیر کچھ خریدے ہی دوکان سے نکل جایا کرتیں، پھر میرا مالک اور اس کے دونوں اسسٹنٹ خوب غصہ کرتے۔ مالک اپنی چپچپی مسکراہٹ بالائے طاق رکھ دیتا اور حکم دیتا ''کاشیرین، جوتے رکھو، ہٹاؤ! یہیں آ کر اپنی ناک گھسیڑے گی سورنی! گھر میں بیٹھی بیٹھی اوب گئیں تو نکل آئیں دوکانوں کا نظارہ کرنے، کھوسٹ احمق، جو تو ہوتی میری بیوی پھر میں اچھی طرح دکھاتا تجھ کو مال...''

اس کی بیوی دبلی پتلی سی عورت تھی، سیاہ آنکھیں، لمبی ناک اور ان حضرت پر خوب چیختی، خوب پیر پٹختی، جیسے وہ اس کے نوکر ہوں۔

اکثر یہ مالک اور اس کے اسسٹنٹ جاتے وقت تو کسی خاتون کی خوب تعظیم کرتے جھک جھک کر بڑے احترام وادب کے الفاظ کہتے لیکن جب وہ باہر نکل جاتی تو گندی اور ایسی شرمناک باتیں اس کے متعلق کہتے کہ میرا جی چاہتا اس کے پیچھے بھاگوں اور اس کو پکڑ کر سب کچھ بتا دوں۔

ویسے تو ظاہر ہے کہ مجھے یہ معلوم تھا کہ لوگ انسان کے پیٹھ پیچھے بری بات کہتے ہیں لیکن ان تینوں کو اس طرح بات کرتے دیکھ کر تو بس صبر کا دامن ہاتھ سے چھٹ جاتا تھا۔ ایسی بات کرتے تھے جیسے دنیا میں بس یہی لوگ بہترین انسان ہیں اور ان کو اسی منصب پر مقرر کیا گیا ہے کہ دوسروں پر رائے اور فیصلے دیا کریں۔ یہ لوگ سب سے جلتے تھے۔ کیا مجال جو منہ سے کسی کی تعریف کی ایک بات نکل جائے۔ یہ لوگ ہر شخص کے بارے میں کوئی نہ کوئی رسوائی کی بات ضرور جاتے تھے۔

ایک دن دوکان میں ایک نوجوان عورت آئی، خوب گلابی گلابی رخسار، چمکتی آنکھیں، مخمل کا لبادہ پہنے تھی، جس کے کالر سیاہ سمور کے تھے اور اس سمور پر اس کا چہرہ اس طرح رکھا ہوا تھا جیسے کوئی حیرت انگیز پھول۔ جب اس نے اپنا لبادہ اتار کر ساشا کے ہاتھ پر ڈال دیا تو اور بھی حسین لگنے لگی، کانوں میں ہیرے کے آویزے دمک رہے تھے اور چست نیلگوں سرمئی لباس سے سڈول جسم کے خطوط اور بھی نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کو دیکھ کر مجھے حسینہ واسیلیسا کا خیال آیا اور مجھے یقین تھا کہ وہ کم از کم گورنر کی بیوی ضرور ہو گی۔ دوکان میں سب نے ہی اس کا بڑے ادب سے استقبال کیا، آتش پرستوں کی طرح بار بار اس کے

آگے جھکتے تھے اور باتوں میں شہد گھول رہے تھے، دوکان میں چاروں طرف دیوانوں کی طرح بھاگے پھر رہے تھے۔ الماریوں کے شیشوں میں ان کے دوڑتے ہوئے سائے دکھائی دیتے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ دوکان کی ہر چیز جل رہی ہے۔ ہر شے پر شعلے لپک رہے ہیں اور بس ابھی دیکھو کیا سے کیا ہوا جاتا ہے اور کیسے کیسے پھیر، کیسی کیسی شکلیں نمودار ہوتی ہیں۔

اس نے جلدی سے ایک قیمتی جوتے کا جوڑا خریدا اور جب باہر نکل گئی تو دوکان دار نے چٹکارہ بھرا اور پھنکارا:

''توبہ! رنڈی کہیں کی...''

''یوں کہئے۔ ایکٹرس'' بڑے اسسٹنٹ نے حقارت آمیز لہجے میں کہا اور پھر وہ اس خاتون کے عشاق اور اس کی رنگین زندگی کا حال ایک دوسرے کو بتانے لگے۔

کھانے کے بعد مالک پیچھے والی کوٹھری میں سونے کے لئے لیٹا تو میں نے اس کی سونے کی گھڑی کے پچھلے ڈھکنے کو کھول کر اس میں سرکے کے چند قطرے ڈال دئے۔ اور پھر وہ جب سو کر اٹھا تو گھڑی ہاتھ میں لئے بڑبڑاتا ہوا دوکان میں گھسا۔

''بھئی اب اس کو کیا کہتے ہو۔ یکا یک میری گھڑی کو پسینہ آنے لگا ہے! پسینہ! خیال رہے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ تو بہت برا شگون ہے۔ کیوں؟'' مجھے بڑا مزہ آیا۔

دوکان کی چہل پہل اور گھر کے کام کاج سے تھکن کے باوجود مجھ پر بڑی اکتاہٹ طاری رہی تھی۔ اور میں ہر وقت اسی فکر میں لگا رہتا کہ ایسی کیا حرکت کروں کہ یہ لوگ مجھے جواب دے دیں۔

دکان کے دروازے کے سامنے سے برف سے ڈھکے ہوئے لوگ گذرتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی جنازے کے ساتھ جانے میں دیر کر دی ہے اور اب انہیں قبرستان پہنچنے کی پڑی ہوئی ہے۔ گاڑیوں اور ٹھیلوں کو دھڑ دھڑاتے، کھڑبڑاتے کھینچتے رہتے۔ ایسٹر کا زمانہ تھا، اس لئے روز صبح دوکان کے پیچھے والے گرجا گھر کی گھنٹیاں اپنی تھکی ہوئی آوازیں مسلسل بلند کرتی رہتیں۔ یہ مسلسل آوازیں اس طرح سر پر لگتیں جیسے کوئی تکیوں سے مار رہا ہو، جس سے چوٹ تو نہ آئے لیکن سر چکرا جائے۔

ایک دن میں احاطے میں بیٹھا، نئے آئے ہوئے مال کی پیٹی کھول رہا تھا کہ اتنے میں گرجا کا چوکیدار میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک طرف کو ٹیڑھا ہو کر چلتا تھا، کپڑے کی گڑیا کی طرح لجلجا تھا

اوراس قدر اس کے چیتھڑے لگے ہوئے تھے جیسے ابھی ابھی کتوں نے نوچا ہو۔

کہنے لگا ''کیوں بیٹھا، مجھے ایک جوڑا ربر کا غلاف چرا کے دے دو گے؟''

میں چپ رہا۔ وہ ایک خالی پیٹی پر بیٹھ گیا، جمائی لی، اپنے ہونٹوں پر صلیب کا نشان بنایا اور پھر اپنا سوال دھرایا:

''کیوں، اڑا لو گے نا؟''

''چوری کرنا بری بات ہے'' میں نے اس کو اطلاح دی۔

''لیکن سب ہی کرتے ہیں۔ آؤ بھی۔ کچھ میرے بڑھاپے کا ہی خیال کرو۔''

میرے چاروں طرف جس طرح کے لوگ رہتے تھے وہ ان سے بالکل مختلف تھا مجھے وہ اچھا لگا۔ پھر اسے اس قدر بھروسہ تھا کہ میں اس کے لئے یقیناً چوری کرلوں گا۔ میں نے اس سے وعدہ کرلیا کہ چھوٹی کھڑکی سے ایک جوڑا ربر کا غلاف اس کی طرف کھسکا دوں گا۔

''خوب'' اس نے بڑے اطمینان سے کہا لیکن کوئی خاص خوش نہیں نظر آ رہا تھا۔ ''اب تم مجھے دھوکہ نہ دینا، ہیں ٹھیک ہے! ٹھیک ہے تم ایسے آدمی نہیں لگتے جو کسی کو دھوکہ دو۔''

ذرا دیر وہ اسی جگہ بیٹھا اپنے جوتے کی نوک سے میلے، گیلے برف کو کریدتا رہا، پھر چلم جلائی اور ایک دم سے مجھے ڈرا دیا ''اچھا اور اگر فرض کرلو کہ میں تمہیں بیوقوف بنا رہا ہوں تو؟ اگر میں وہی ربر کے غلاف لے کر تمہارے مالک کے پاس چلا جاؤں اور کہوں کہ تم نے مجھے آدھے روبل کو بیچے ہیں، کیوں؟ قیمت تو دو سے بھی اوپر ہے تم نے آدھے کو بیچا! اور پیسے جیب میں رکھ لئے۔''

میں سکتہ میں اس کی طرف دیکھتا رہا جیسے وہ جس بات کی دھمکی دے رہا ہے وہ کر بھی چکا ہو۔ اور وہ اسی طرح باتیں کرتا رہا خنخناتی آواز میں دھیرے دھیرے۔ اس کی نظریں اپنے پر جمی تھیں۔ چلم کا نیلا دھواں بھکا بھک اس کے منہ سے نکل رہا تھا۔

''اور اگر مالک نے ہی مجھے تمہارے پاس ہشکارا ہو کہ ذرا اس لونڈے کو آزما کر تو دیکھو، چور ہے کہ نہیں۔ تو پھر کیا ہو...''

''میں تمہیں ربر کے غلاف نہیں دوں گا'' میں نے غصے میں کہا۔

''اب تم چھوٹ نہیں سکتے۔ اب تم پھنسے! وعدہ کر چکے ہو۔''

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی طرف گھسیٹا اور میرے ماتھے پر اپنی سرد انگلی سے ٹھونکتے ہوئے آہستہ آہستہ بولا ''تم نے کیسے وعدہ کر لیا۔ یوں ہی کہ لو لے جاؤ یہ ربر کے غلاف، کیوں؟''

''مگر تم نے خود ہی مانگے جو تھے۔ مانگے تھے نا؟''

''میں تو بہت سی چیزیں مانگ سکتا ہوں۔ اگر میں تم سے کہوں کہ گرجا گھر میں ڈاکہ ڈالو تو کیا تم ڈالو گے؟ ارے پدے، احمق۔ کیا اس طرح ہر ایک کا بھروسہ کیا کرتے ہیں؟''

اس نے مجھے دھکیلا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''مجھے نہیں چاہئے چوری کے غلاف! ایسا میں جنٹلمین بھی نہیں ہوں کہ جوتوں پر غلاف چڑھائے پھروں۔ میں تو مذاق کر رہا تھا... لیکن تو نے مجھ پر بھروسہ کیا تو تجھے گرجا کے گھنٹہ گھر پر چڑھاؤں گا۔ جب ایسٹر کا زمانہ ہوگا آنا، گھنٹہ بھی بجانا اور شہر کی سیر بھی کرنا۔''

''میں نے شہر دیکھا۔''

''وہاں سے بہت اچھا دکھائی دیتا ہے، گھنٹہ گھر سے...''

پھر وہ برف کو جوتوں سے ٹھکراتا، آہستہ آہستہ چلا گیا اور گرجا کے کونے پر غائب ہو گیا۔ میں اسے جاتے دیکھتا رہا مگر دل میں بڑا دکھ اور پریشانی تھی کہ اس بڈھے نے سچ مچ مجھ سے مذاق کیا تھا یا اسے مالک نے میری آزمائش کے لئے بھیجا تھا۔ اب مجھے دوکان میں جاتے ڈر سا لگا۔

آخر ساشا دوڑتا ہوا احاطے میں نکل آیا اور چیخا:

غصے میں بھر کر میں نے پلاس ہلا کر اسے دھمکایا۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ اور بڑا اسسٹنٹ برابر مالک کی چیزیں چرایا کرتے تھے۔ جوتے یا چپل کا ایک جوڑا تندور کی چمنی میں چھپا دیتے اور جب دوکان بند کرنے کا وقت آتا تو کوٹ کی آستین میں دبا کر چل دیتے۔ اس سے مجھے کوفت ہوتی اور ڈر لگتا کیونکہ مجھے مالک کی دھمکی اب تک یاد تھی۔

''کیا تم چوری کرتے ہو؟'' میں نے ساشا سے پوچھا۔

''میں نہیں، وہ بڑا اسسٹنٹ کرتا ہے'' وہ سختی سے بولا ''میں تو صرف اس کی مدد کر دیتا ہوں۔ وہ مجھ سے کہتا ہے ''جو میں کہوں وہ کرو'' اگر نہ کروں تو مجھ پر کوئی چال چلے وہ۔ رہا مالک کا معاملہ۔ تو وہ سب چالیں جانتا ہے، کیونکہ پہلے وہ بھی ایک دوکان میں اسسٹنٹ تھا، پر تم اپنی زبان بند رکھنا۔''

بات کرتے وقت وہ آئینے میں دیکھ دیکھ کر اپنی ٹائی ٹھیک کرتا جا رہا تھا اور انگلیوں کو اس بناوٹی انداز میں گھما رہا تھا، جیسے بڑا اسسٹنٹ کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ مجھ پر یہ رعب تھا، جیسے بڑا اسسٹنٹ کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ مجھ پر یہ رعب جماتا رہتا تھا کہ وہ مجھ سے بڑا ہے۔ لہٰذا مجھ پر حکم چلا سکتا ہے۔ بھاری آواز میں مجھ پر چلاتا اور مجھے حکم دینے میں شاہانہ انداز دکھاتا۔ ویسے میں اس سے قد میں لمبا تھا، مضبوط بھی زیادہ تھا، لیکن وہ چھوٹا گٹھیلا اور پھرتیلا تھا اور میں ٹیڑھا میڑھا تھا اور ہمیشہ گڑبڑاتا رہتا تھا۔ وہ اپنے کوٹ پتلون میں مجھے بڑا ٹھوس اور لئے دئے نظر آتا۔ مگر اس میں کوئی بات ایسی ضرور تھی جو مجھے بڑی ناخوشگوار معلوم ہوتی۔ اس کو ہماری باورچن سے نفرت تھی۔ دراصل وہ تھی بھی بڑی ہی عجیب عورت۔ یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ نیک ہے یا بد ہے وہ۔ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پھاڑ کر کہتی:

''مجھے تو لڑائی سب سے اچھی لگتی ہے۔ کوئی بھی لڑے اس سے مجھے واسطہ نہیں! چاہے مرغے لڑیں، چاہے کتے اور چاہے گنوار۔''

اگر احاطے میں کہیں مرغوں یا کبوتروں کی لڑائی ہوتی تو وہ بس سب کچھ چھوڑ چھاڑ کھڑکی میں کھڑی ہو جاتی اور جب تک لڑائی ختم نہ ہو جاتی، گونگی بہری بنی تکتی رہتی۔ رات ہوتی تو مجھ سے اور ساشا سے کہتی ''ارے یہاں کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو، بچو۔ باہر جا کے ذرا دکھاؤ دو دو ہاتھ۔''

ساشا چِنچِنانے لگتا ''میں بچہ نہیں ہوں، کھوسٹ بڑھیا، میں جونیر اسسٹنٹ ہوں۔''

''میں یہ نہیں جانتی، جب تک شادی بیاہ نہ ہو جاوے تم میرے لئے بچے ہی رہو گے۔''

''ارے ہاں بھیا شیطان ہوشیاری تو بہت کرتا ہے لیکن پروردگار اس کی باتوں میں نہیں آتا۔''

ساشا کو اس کا بات کرنے کا طریقہ خاص طور پر ناپسند تھا۔ جب وہ اسے چھیڑتا تو وہ بس ایک نظر ساشا کی طرف دیکھتی اور اسے پسپا کر دیتی ''تھو، تیل چٹا کہیں کا۔ خدا کی بھول!''

کئی مرتبہ ساشا نے چاہا کہ مجھے باتوں میں پھانس کر مجھ سے اس کے تکیے میں پنیں لگوا دے یا سوتے میں اس کے چہرے پر موم یا کالک ملوا دے یا کسی اور طریقے سے اس کا مذاق اڑانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نہ مانا۔ مجھے باورچن سے ڈر لگتا تھا کیونکہ وہ بہت ہلکی نیند سوتی تھی، اکثر وہ رات میں اٹھ بیٹھتی، چراغ روشن کرتی اور بیٹھی بیٹھی کسی کونے پر نظریں جمائے خلا میں گھورتی رہتی۔ میرا بستر تندور کے پیچھے ہوتا تھا، کبھی کبھی وہاں پہونچ جاتی اور مجھے جھنجھوڑ کر آہستہ سے بھرائی ہوئی آواز میں کہتی:

''الیوشا بیٹا، مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے، نیند نہیں آتی ہے۔ کچھ بات کرو مجھ سے۔''

کچھ نیم بیداری کے عالم میں میں اسے کوئی قصہ سنانا شروع کرتا، اور وہ چپ چاپ بیٹھی بیٹھی آگے پیچھے ہلتی جاتی۔ ایسا لگتا کہ اس کے تپتے ہوئے جسم سے موم اور لوبان کی خوشبو آ رہی ہے اور اب جلد ہی اس کی موت آنے والی ہے۔ شائد ابھی ختم ہو جائے، اسی لمحے، بس منہ کے بل گرے گی اور ٹھنڈی ہو جائے گی۔ ڈر کے مارے میں آواز ذرا بلند کرتا پر وہ ہمیشہ مجھے روک دیتی ''ش! حرامی بچے اٹھ جائیں گے اور سمجھیں گے کہ تو میرا یار ہے۔''

وہ میرے پاس ہمیشہ ایک ہی طرح بیٹھی رہتی تھی۔ جھکی ہوئی، گھٹنوں میں ہاتھ دئے، پتلی پتلی ٹانگیں بالکل سٹی رہتیں اور موٹے کھردرے کپڑے کے باوجود لبادے میں سے بھی اس کے پچکے ہوئے سینے کی پسلیاں اس طرح نمایاں رہتیں جیسے کسی چرخ ڈھول کی چوڑیاں۔

وہ بری دیر دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہتی، پھر یکایک دھیرے سے کہتی ''کاش مجھے موت آ جائے تو اس مصیبت سے چھٹی پا جاؤں...''

یا کسی کی طرف مڑ کر پوچھتی ''اچھا تو پھر میری زندگی کے دن ختم ہو گئے۔ تو پھر؟''

''سوسو!'' وہ میری بات کاٹ کر کہتی اور اٹھ کر نڈھال نڈھال سی چپ چاپ باورچی خانے کے اندھیرے میں دفن ہو جاتی۔

ساشا اس کے پیٹھ پیچھے چڑیل کہتا تھا۔

ایک دن میں نے اس سے کہا کہ ذرا ''منہ پر بھی کہہ دے۔''

تو الٹ کر جواب دیا ''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں ڈرتا ہوں؟''

پھر فوراً ہی ناک بھوں چڑھا کر بولا ''نہیں۔ اس کے منہ پر نہیں کہوں گا، کیا پتہ سچ مچ ہی چڑیل ہو...''

وہ ہمیشہ چڑچڑی اور جھلائی ہوئی رہتی تھی، اس لئے کسی سے زیادہ مجھ پر کیوں مہربان ہوتی؟ صبح کو چھ ہی بجے وہ میرا پاؤں پکڑ کر جھنجھوڑتی اور چیختی ''بس بہت ہوئے خراٹے! چل لکڑی لا سماوار گرم کر! آلو چھیل!''

اس سب گڑبڑ سے ساشا بھی جاگ پڑتا وہیں سے بھنبھناتا:

''یہ کیا شور مچا رہی ہے۔ مالک سے کہہ دوں گا سونے نہیں دیتی۔''

وہ اپنی بے خوابی سے بوجھل آنکھیں اس کی طرف گھماتی، اپنا ہڈیوں کا ڈھانچہ باورچی خانہ میں ادھر سے ادھر گھسیٹتی ہوئی کہتی جاتی ''تھو۔ خدا کی بھول! اگر تو میرا سوتیلا بیٹا ہوتا تو ٹانکے ادھیڑ دیتی۔''

''مرکمبخت'' ساشا کوستا۔ پھر دوکان کو جاتے ہوئے مجھ سے کہتا ''اس کو نکلوا دوں گا یہاں سے، نظر بچا کر ہنڈیا میں نمک جھونک دیا جائے۔ پھر نمک زہر ہوگا تو آپ ہی نکال دی جائے گی۔ یا مٹی کا تیل ملا دیا جائے۔ تم کر دو گے؟''

''تم خود کیوں نہیں کرتے؟''

''بزدل!'' وہ خرخراتا۔

وہ باورچن ہمارے دیکھتے ختم ہوگئی۔ ایک دن جھک کر سماوار اٹھا رہی تھی کہ یکا یک گر پڑی جیسے کسی نے اس کے سینے پر ایک دھکا دیا ہو، پھر چپ چاپ اس نے کروٹ لی، ہاتھ پھیل گئے، لبوں کے ایک کونے سے خون بہہ رہا تھا۔

ہم دونوں کو فوراً یقین آ گیا کہ بالکل ختم ہوگئی۔ لیکن ڈر کے مارے، ہم لوگ وہیں جمے کے جمے اس کو تکتے رہ گئے۔ مارے ڈر کے گھگھی بندھ گئی۔ آخر کار ساشا باہر دوڑا۔ میری سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ چنانچہ میں وہیں کھڑکی کے شیشے سے لگا کھڑا رہا۔ پھر مالک آیا۔ وہ پریشانی کے عالم میں اس کے پاس اکڑوں بیٹھ گیا، اس کے چہرے کو چھوا اور کہا ''ہاں، بالکل مرگئی ہے... کیوں؟ یہ کیا بات ہوئی؟..''

پھر مقدس شبیہہ والے کونے کی طرف مڑ کر جہاں نکولائی پیر کی شبیہہ لگی تھی، وہ سینے پر صلیب کا نشان بنانے لگا۔ جب دعا ختم ہوگئی تو گلیارے سے پکارا ''کاشیرین دوڑو! پولیس میں اطلاع کرو!''

پولیس کا ایک سپاہی آیا۔ ادھر ادھر ٹہلا، جیب میں ایک سکہ رکھا اور چلا گیا۔ کچھ دیر بعد پھر آیا اور اس کے ساتھ ایک چھکڑے بان۔ پھر انہوں نے باورچن کو سر اور ٹانگیں پکڑ کر اٹھایا اور اسے باہر لے گئے۔ مالک کی بیوی نے دروازے سے جھانک کر دیکھا اور پکار کر مجھ سے کہا ''فرش دھوؤ۔''

مالک بولا ''اچھا ہوا جو شام کو میری...''

میری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ اس میں اچھائی کی بات کیا تھی۔ جب ہم لوگ سونے کو لیٹے تو ساشا نے دبی زبان میں کہا:

''روشنی گل مت کرنا۔''

''ڈر رہے ہو؟''

اس نے کمبل سے منہ ڈھک لیا اور بڑی دیر تک خاموش پڑا رہا۔ رات بھی بالکل خاموش تھی، جیسے کان لگا کر کچھ سن رہی ہو، جیسے کسی چیز کا انتظار کر رہی ہو۔ اور مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ بس اب گھنٹیوں کی جھنجھناہٹ سنائی دے گی اور پھر قصبے بھر کے لوگ ادھر ادھر بھاگتے پھریں گے، چیختے، چلاتے اور خوفزدہ۔

''آؤ دونوں مل کر تندور پر لیٹ رہیں'' ساشا نے کمبل میں سے ناک باہر نکالی اور آہستہ سے تجویز پیش کی۔

''تندور پر بہت گرمی ہے۔''

پھر وہ چپ ہو گیا۔ ''مگر بے چاری کیسی یکا یک چل بسی'' وہ آخر کار کہنے لگا ''اور دیکھو میں سمجھتا تھا کہ وہ چڑیل ہے... اوہ، مجھے نیند نہیں آ رہی ہے...''

''مجھے بھی نہیں آتی۔''

پھر وہ باتیں کرنے لگا کہ کس طرح مردے قبروں سے نکلتے ہیں اور آدھی رات کو شہر میں مارے مارے پھر کر اپنے گھروں اور عزیز رشتہ داروں کو تلاش کرتے پھرتے ہیں۔

''مردوں کو صرف شہر یاد رہتے ہیں، گلیاں اور گھر یاد نہیں رہتے'' اس نے آہستہ سے کہا۔

سناٹا اور بڑھ گیا اور ایسا لگتا اندھیرا ابھی زیادہ ہو گیا ہے! ساشا نے سر اٹھایا ''آؤ، دیکھو، میرے بکس میں کیا کیا ہے۔''

مجھے بہت دنوں سے یہ جاننے کا شوق تھا کہ وہ بکس میں کیا چھپائے رکھتا ہے۔ وہ اپنی صندوق میں بھاری تالا ڈالے رکھتا اور جب کھولتا تو بڑی احتیاط سے کام لیتا۔ اگر کبھی میں اس میں جھانکنے کی کوشش کرتا تو وہ سختی سے کہتا ''ٹھہرو، تم کیا جھانک رہے ہو؟''

اور اس وقت جو میں نے اس سے کہا کہ ہاں ہاں دیکھوں گا تو وہ بستر پر اٹھ بیٹھا اور بڑی قطعیت کے ساتھ مجھے حکم دیا کہ بکس کو اس کے پاؤں کے پاس گھسیٹ لاؤں۔ اس بکس کی کنجی اس کے گلے میں صلیبی زنجیر کے ساتھ بندھی رہتی تھی۔ پہلے تو اس نے باورچی خانے کی تاریکی میں ادھر ادھر دیکھا، پھر بڑی شان سے ناک بھوں چڑھا کر بکس کا تالا کھولا، اس کے ڈھکنے پر پھونکا، جیسے وہ گرم ہو، آخر کار اسے

کھولا اور اس میں سے کچھ اندر پہننے کے کپڑے نکالے۔

تقریباً آدھا بکس دوا دارو کی ڈبیوں، چائے کے خالی پیکٹوں اور جوتے کی پالش اور سارڈین مچھلی کے خالی ٹنوں سے بھرا ہوا تھا۔

''دیکھتے جاؤ...''

بکس کو اپنے گھٹنوں کے بیچ میں دبا کر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا ''اے آسمان کے بادشاہ...''

مجھے کھلونے دیکھنے کی بڑی امید تھی۔ خود میرے پاس تو کھلونے کبھی نہیں رہے، اور اگرچہ میں ظاہراً تو ان کو حقارت سے دیکھتا تھا لیکن جن لوگوں کے پاس کھلونے ہوتے تھے، دراصل میں ان پر رشک کرتا تھا۔ اور مجھے اس خیال سے خوشی ہوئی کہ ساشا گھنا ہی سہی، لیکن اس کے پاس کھلونے تو تھے۔ حالانکہ وہ ان کو دکھاتے ہوئے، جھینپتا تھا اور ان کو چھپا کر رکھتا تھا لیکن میں اس کی جھینپ کو خوب سمجھ سکتا تھا۔

ساشا نے پہلا ڈبہ کھولا، اس میں سے ایک عینک کی فریم نکلی اور اس کو اپنی ناک پر لگا کے ذرا سختی سے میری طرف دیکھا اور بولا ''شیشہ نہیں تو کوئی بات نہیں لیکن یہ اسی طرح لگائی جاتی ہے۔''

''میں تو لگا کے دیکھوں۔''

''یہ تمہاری آنکھوں پر اچھی نہیں لگے گی۔ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جن کی آنکھیں کالی ہوتی ہیں اور تمہاری ہلکے رنگ کی ہیں'' اس نے خرخرا کے بڑے طمطراق سے کہا لیکن اس کی آواز اس قدر غیر متوقع طور پر اونچی ہوگئی تھی کہ وہ خود بھی چونک پڑا اور باورچی خانے میں ادھر ادھر سہمی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

پالش کی ایک ڈبیہ میں کچھ بٹن اکٹھے رکھے تھے۔ فخر سے بولا:

''یہ سب میں نے گلی میں پائے ہیں، میں نے خود سینتیس ہیں...''

تیسرے ڈبے میں پیتل کی کچھ بڑی بڑی پنیں تھیں، وہ بھی اس نے گلی میں پائی تھیں، کچھ موچیوں والی کیلیں اور جوتوں کی نعلیں تھیں، گھسی پٹی ٹوٹی ٹاٹی، کچھ ثابت بھی تھیں۔ ایک پیتل کے دروازے کو موٹھ تھا، ایک عصا کا ہاتھی دانت کا دستہ بھی تھا، ایک زنانی کنگھی تھی، ایک کتاب ''خواب اور پیشین گوئی''۔ اور اسی قسم اور قیمت کی اور کچھ چیزیں۔

میں چیتھڑے اور ہڈیاں جمع کرتا تو ایک مہینے میں اس کا دس گنا سامان اکٹھا کر سکتا تھا۔ ساشا کے خزانے کو دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی، گھبراہٹ ہوئی اور مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ وہ ایک ایک چیز کو غور سے

دیکھتا، محبت سے سہلاتا، فخر سے اس کے موٹے ہونٹ بھنچ جاتے، آنکھیں اشتیاق سے باہر کو ابل پڑتیں لیکن عینک کی وجہ سے اس کی معصوم بھولی بھالی صورت بڑی عجیب لگ رہی تھی۔

''اس سب سامان کا کیا کرو گے؟''

اس نے چشمہ کی فریم میں سے مجھے تیز نظر سے دیکھا اور اپنی عمر کے حساب سے، بہکتی ہوئی آواز میں کہا'' چاہتے ہو کہ تمہیں کچھ دے دوں؟''

''نہیں...شکریہ...''

وہ ایک منٹ چپ رہا، ظاہر ہے کہ اس کو میری یہ بات بری لگی کہ میں نے صاف انکار کر دیا اور اس کی چیزوں سے کوئی دلچسپی بھی نہیں لی۔ پھر اس نے آہستہ سے ایک تجویز پیش کی'' اچھا، ایک تولیہ اٹھا لاؤ، ہم لوگ ان چیزوں کو صاف کریں، سب گرد سے اٹ گئی ہیں...''

جب سارا سامان صاف کر کے واپس رکھا جا چکا تو وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا اور دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ بارش شروع ہو گئی تھی اور بوچھار سے کھڑکی بج رہی تھی۔ ساشا نے ادھر ہی منہ کئے کئے کہا:

''ذرا باغ کی مٹی سوکھ جانے دو پھر میں تمہیں ایک ایسی چیز دکھاؤں گا کہ تمہارے ہوش اڑ جائیں گے!''

میں اس کی بات کا جواب دئے بغیر بستر میں گھس گیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ ایک دم اچھل پڑا اور دیوار میں کھونچے مارتا ہوا ایسی آواز میں بولا جس سے اس کا ڈر بالکل ثابت ہو رہا تھا:

''ارے مجھے ڈر لگ رہا ہے...'' اے پروردگار مجھے کس قدر ڈر لگ رہا ہے! اے معبود رحم کر...''

میں خود ڈر کے مارے ٹھنڈا ہوا جا رہا تھا: ایسا لگتا تھا کہ باورچن میری طرف پیٹھ کئے کھڑکی کے پاس کھڑی ہے، کھڑکی کے شیشے پر ماتھا ٹیکے، جیسے وہ مرغوں کی لڑائی دیکھتے وقت ٹیکتی تھی۔

ساشا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا، دیوار کو نوچے جا رہا تھا اور اس کے پاؤں ایسے کانپ تھے جیسے تشنج ہو رہا ہو۔ میں لپک کر ادھر سے ادھر پہونچا۔ اتنی دور میرے لئے زمین پر قدم رکھنا انگاروں پر لوٹنے کے برابر تھا۔ اور اس کے بستر میں گھس گیا۔ ہم دونوں خوب روتے رہے، یہاں تک کہ روتے روتے تھک کر سو گئے۔

کچھ دنوں بعد کوئی تہوار آیا۔ ہم لوگوں کو چھٹیاں ملیں۔ ہم لوگ صرف صبح سے دوپہر تک کام کرتے تھے اور دن کے کھانے کے وقت گھر آجاتے تھے۔ جب مالک اور اس کی بیوی دوپہر میں آرام کرنے گئے تو ساشا نے مجھ سے بڑے پراسرار انداز میں چپکے سے کہا ''آؤ، چلو!''

میں سمجھ گیا کہ مجھے وہی چیز دکھانے لئے جا رہا ہے جس کو دیکھ کر میرے ہوش اڑ جائیں گے۔

ہم دونوں باغ میں پہونچے۔ دو مکانوں کے بیچ میں ذرا سی زمین چھٹی ہوئی تھی جس پر لیپا کے دس پندرہ درخت تھے جو بہت ہی پرانے تھے، ان کے تناور تنوں پر کائی جمی ہوئی تھی اور ننگی ننگی سیاہ شاخیں بے جان انداز میں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ان شاخوں میں کوے تک کا گھونسلہ نہیں تھا۔ یہ درخت مقبروں کے دیو پیکر ستونوں کی طرح اٹھے ہوئے تھے۔ اور اس جگہ ان کے علاوہ نہ کوئی جھاڑی تھی نہ گھاس کی ایک پتی نظر آتی تھی۔ روشیں تپے ہوئے لوہے کی طرح سخت اور سیاہ تھیں اور پچھلے سال کے گرے ہوئے سڑے ہوئے پتوں کے نیچے سے، جہاں زمین کے ٹکڑے دکھائی بھی دیتے تھے، وہاں رکے ہوئے پانی کی طرح پھپھوندی اور کائی پتی ہوئی تھی۔

ساشا مکان کے آڑ سے نکل کر گلی کی دیوار کی طرف چلا اور لیپا کے ایک درخت کے نیچے جا کر تھم گیا۔ وہاں سے ایک منٹ تک وہ پڑوس کے گھر کی دھندلی کھڑکی کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اکڑوں بیٹھ گیا اور ہاتھوں سے پتیاں کھود کھود کر سرکانے لگا۔ پتیوں کے نیچے سے ایک موٹی جڑ دکھائی دی، جس کے برابر میں دو اینٹیں زمین میں دھنسی تھیں۔ اس نے اینٹیں نکالیں۔ اینٹوں کے نیچے ایک ٹن کا پتر تھا، ٹن کے نیچے ایک چوکھا نٹا لکڑی کا تختہ اور آخر کار ایک بڑا گڈھا نظر آیا جو جڑ میں اندر دور تک چلا گیا تھا۔

ساشا نے ماچس جلائی، موم بتی کا ایک ٹکڑا روشن کر کے گڑھے میں رکھا اور بولا:

''آؤ دیکھو! ڈرو مت...''

حالانکہ خود اس کا ڈرنا صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ ہونٹ بے جان سے ہو کر بڑے بڑے لگ رہے تھے، آنکھیں نم ناک تھیں اور وہ اپنا خالی والا ہاتھ بڑی بے بسی سے کمر کے پیچھے رکھے ہوئے تھا۔ اس کے ڈر کا اثر مجھ پر بھی ہوا، بڑی احتیاط سے میں نے جڑ کے اندر جھانکا جو کھوہ کی محراب سی بن گئی تھی۔ اندر گڈھے میں ساشا نے تین چراغ اور روشن کئے جس سے کھوہ میں نیلی روشنی پھیل گئی۔ کھوہ تقریباً اتنی بڑی تھی جتنی بڑی بالٹی ہوتی ہے لیکن چوڑی زیادہ تھی، دیواروں پر چینی اور شیشے کے رنگ برنگے لیکن چوڑی زیادہ تھی،

دیواروں پر چینی اور شیشے کے رنگ برنگے ٹکڑے چپکے ہوئے تھے۔ بیچوں بیچ سب سے اونچی جگہ پر لال کپڑا بچھا ہوا تھا اور اس پر چھوٹا سا تابوت رکھا ہوا تھا جس پر ٹن کا پتر منڈھا ہوا تھا، اور اس کا آدھا حصہ ایک سنہرے کپڑے کے ٹکڑے سے (جو عبا کی طرح لگتا تھا) ڈھکا ہوا تھا اور اس غلاف کے نیچے سے ایک گوریا کا چونچدار سر اور پنجے نکلے ہوئے تھے۔ اس کے سرہانے ایک منا سا منبر بنا ہوا تھا، جس پر ایک پیتل کی بتیسے والے صلیب رکھی تھی۔ اور تین طرف دیئے جل رہے تھے۔ شمع دانوں کو مٹھائیوں پر لپیٹنے والی سنہری اور روپہلی پتیوں سے سجایا گیا تھا۔

دیئوں کی نوکدار لوئیں کھوہ کے باہر کی طرف مڑتی تھیں جن سے کھوہ کے اندر رنگ برنگی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ اندر طرح طرح کی روشنیوں کے دھبے اور پرچھائیاں پڑ رہی تھیں، دھندلی دھندلی روشنی چھائی ہوئی تھی۔ گیلی مٹی، جلے ہوئے موم اور سڑاند کی لہریں میرے منہ پر تھپیڑے لگا رہی تھیں اور آنکھیں کے سامنے دھنک کے ساتوں رنگ اچھلتے، تھرتھراتے نظر آ رہے تھے۔ اس سے ایک عجیب قسم کی حیرت پیدا ہو رہی تھی جس سے دم گھٹا جا رہا تھا۔ ڈر ختم ہو گیا تھا۔

''ہے نا خوبصورت؟'' ساشا نے پوچھا۔

''پر یہ ہے کس لئے؟''

''گرجا ہے'' اس نے سمجھاتے ہوئے کہا ''لگتا نہیں ہے گرجے کی طرح؟''

''پتہ نہیں۔''

''اور گوریا جو ہے وہ میت ہے، ممکن ہے اس کا جسم تبرک بن جائے۔ جس طرح یہ مری ہے اس وجہ سے۔ بیچاری معصوم شہید...''

''کیا تمہیں مری ہوئی ملی تھی یہ؟''

''نہیں، یہ اڑ کر چھپر میں آ گئی تھی اور میں نے اسے اپنی ٹوپی میں پکڑ کر اس کی گردن مروڑ دی...''

''کیوں؟''

''یوں ہی...'' وہ پھر میری آنکھوں میں جھانکا:

''ہے نا خوبصورت؟''

''نہیں''

وہ کھوہ پر جھکا جلدی سے اس کو پتر ے سے بند کیا، پھر ٹن رکھا، پھر اینٹ رکھی، پھر کھڑا ہو گیا اور گھٹنوں پر سے مٹی جھاڑ کر سختی سے بولا:

''کیوں، تمہیں پسند کیوں نہیں؟''

''کیونکہ مجھے گوریا بیچاری پر ترس آ رہا ہے۔''

وہ کھوکھلی نظروں سے مجھے گھورنے لگا جیسے اسے کچھ نہیں سوجھ رہا ہو، پھر میرے سینے پر ایک مکا دیا اور چیخا:

''بیشک میں نے اچھا بنایا تھا!'' میں ن ے بلا پس وپیش کے جواب دیا۔ اور وہ مجھے کنج یاد آیا جو میں نے اپنے لئے سجایا تھا۔

ساشا نے اپنا فراک کوٹ اتار کر پھینک دیا، آستین چڑھاتے ہوئے ہتھیلوں پر تھوکا:

''اچھا، تو آؤ۔ ہو جائیں دو دو ہاتھ اسی بات پر!''

میرا لڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس سب قصے سے میں بالکل عاجز آ گیا تھا، اور اپنے بھائی کے غصے سے بھرے ہوئے چہرے کو دیکھ کر مجھے کوفت ہو رہی تھی۔

وہ مجھ پر لپکا، سینے پر مار کر مجھے گرا دیا، مجھ پر چڑھ بیٹھا اور چیخا ''موت یا زندگی؟؟''

میں اس سے زیادہ مضبوط تھا اور اب مجھے بھی غصہ آ گیا تھا۔ ایک منٹ بعد وہ ہاتھوں سے سر پکڑے، زمین پر اوندھے منہ پڑا خرخر کر رہا تھا۔ مجھے خوف محسوس ہوا۔ اس کو اٹھانے کی کوشش کی پر اس نے ہاتھ پیر مار کر مجھے دھکیل دیا۔ مجھے اور بھی ڈر لگا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا ''اب میں نے تمہیں پھانسا ہے! اب میں یہاں سے اٹھوں گا ہی نہیں جب تک مالک نہ آ جائے اور پھر میں تمہاری چغلی کھاؤں گا اور تم نکال دئے جاؤ گے!''

وہ گالیاں بکتا جاتا تھا اور اس طرح کی دھمکیاں دیتا جاتا۔ اس بات سے مجھ کو اور بھی جنوں چڑھا۔ کھوہ کی طرف لپکا، اینٹیں اکھاڑیں، گوریا سمیت دیوار پر سے پھینکا اور ہر چیز کو اجاڑ پچھاڑ کے پیروں سے کچل دیا۔

''لو یہ لو۔ دیکھو یہ دیکھو!''

ساشا پر میرے اس غصے کا عجیب اثر ہوا۔ وہ اٹھ بیٹھا، منہ کھولے، بھوئیں سکڑی ہوئی اور ایک لفظ

کہے بغیر مجھ کو دیکھتا رہا۔ جب میں سب کچھ کر چکا تو وہ اطمینان سے اٹھا، گرد جھاڑی، کوٹ کندھے پر ڈالا اور بڑے مزے میں آہستگی اور اطمینان سے بولا:

''اب تم دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ ٹھہر جاؤ۔ میں نے تو یہ خاص تمہارے لئے بنایا ہی تھا۔ یہ جادو تھا، چڑیلوں والا! اب دیکھنا...''

اس کے اطمینان کے لہجے میں انتہائی کینہ اور کمینہ پن تھا۔ میں وہیں ڈھے پڑا، جیسے اس کے لفظ نے مجھے کو مار گرایا ہو اور میرے وجود میں ہر چیز جیسے سرد پڑ گئی۔ وہ چل دیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ اس کے اطمینان نے مجھے بالکل ہی کچل کر رکھ دیا۔

میں نے ارادہ کر لیا کہ اگلے ہی دن اس شہر سے بھاگ جاؤں گا۔ مالک سے، ساشا سے اور اس کی جادوگری سے اور اس بیکار اور بے جان زندگی سے دور۔

دوسرے دن صبح جب نئی باورچن نے مجھے جگایا تو وہ چیخ اٹھی ''معبود یہ تمہاری صورت کو کیا ہوا؟''

مجھے فوراً اس جادو کا خیال آیا کہ لو اب خاتمہ ہو گیا!

لیکن باورچن ایسا قہقہہ مار مار کے ہنسنے لگی کہ میں بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور اس کے آئینے میں جو شکل دیکھی تو میرے چہرے پر کالک کی خوب موٹی تہہ چپڑی ہوئی تھی۔

''کا ی یہ ساشا کی حرکت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شائد میں نے ہی کیا ہو!'' میں نے پوچھا۔

''شائد میں نے ہی کیا ہو!'' وہ ہنستے ہنستے بولہ۔

میں جوتوں پر پالش کرنے بیٹھا ان میں سے ایک میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو پن چبھ گئی۔ فوراً خیال آیا۔ ''اوھو لو بھگتو جادو!''

تقریباً سب ہی جوتوں میں پنیں اور سوئیاں ایسی چالاکی سے چھپائی گئی تھیں کہ ان کا میری ہتھیلی میں چبھ جانا یقینی تھا۔ میں نے ایک جگ ٹھنڈا پانی لیا اور بڑے اطمینان سے جادوگر کے سر پر انڈیل دیا جو ابھی تک سو رہا تھا یا غالباً سونے کا بہانہ بنا رہا تھا۔

لیکن پھر بھی میں بہت غمگین تھا۔ اس تابوت کی تصویر میری نظروں سے اوجھل نہ ہوتی تھی جس میں اس گوریا کی لاش تھی۔ وہ اس کے چمرخ سکڑے ہوئے پنجے اور ننھی سی موم جیسی چونچ اور اس کے

چاروں طرف جھلملاتی ہوئی رنگ برنگی چنگاریاں جیسے قوس قزح میں ڈھل جانا چاہتی ہوں لیکن ناکام۔ میت کا بکس پھیلتا دکھائی دیتا، چڑنے کے پنجے بڑے ہونے لگتے اور اوپر ہی اوپر کو کھنچ جاتے اور ان میں زندگی کی دھڑکن نظر آنے لگتی۔

میں نے اسی شام بھاگ نکلنے کا پلان بنایا تھا۔لیکن جب میں تیل کے اسٹو و پر شوربہ گرم کر رہا تھا تو خیالات میں گم ہو گیا اور شوربہ ابل پڑا، شعلوں کو بجھانے کی جلدی میں دیگچی میرے ہاتھوں میں الٹ گئی اور مجھے ہسپتال بھجوادیا گیا۔

وہ ہسپتال آج بھی مجھے ایک خواب پریشان کی طرح یاد ہے۔ زرد زرد خلاف میں بہت سے خاکے، بھورے اور سفید کفن پہنے ہوئے اکٹھے ہو کر اکراتے اور بدبداتے نظر آتے۔ ایک لمبا سا آدمی بیساکھی لگائے مونچھوں سی بھویں، اپنی لمبی سیاہ داڑھی ہلا ہلا کے چیختا جا رہا تھا:

''میں عزت مآب جناب بشپ صاحب سے تمہاری شکایت کروں گا!''

وارڈوں میں بچھے ہوئے پلنگ تابوتوں کی طرح نظر آتے تھے، ان پر لیٹے ہوئے چھت کی طرف ناک سیدھی اٹھائے ہوئے مریض مردہ گوریوں کی طرح لگتے تھے۔ زرد زرد دیواریں ہلتی دکھائی دیتی تھیں، چھت میں بادبان کی طرح ہوا بھری ہوئی معلوم ہوتی تھی، فرش لہرا رہا تھا جس سے پلنگ آگے پیچھے جھولتے نظر آرہے تھے، ہر چیز پر مایوسی اور وحشت طاری تھی، کھڑکیوں سے باہر درختوں کی ننگی ننگی شاخیں اس طرح اٹھی ہوئی تھیں جیسے کوئی غیر مرئی ہاتھ بیدوں کا سڑکا لگا رہا ہو۔

ایک دبلا پتلا انسان جو دیکھنے میں لاش کی طرح لگتا تھا اور جس کے بال سرخ تھے، دروازے پر کھڑا ناچ رہا تھا۔ بار بار وہ اپنے کفن کو چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اچھی طرح لپیٹتا اور چیں چیں کرتا:

''میں نہیں داخل کروں گا تمہارے ان پاگلوں کو!''

بیساکھی والا آدمی چلاتا:

''عزت مآب جناب ب... بی... بی بشپ صاحب...''

نانا ابا اور نانی اماں اور سب لوگوں نے بھی مجھے بتایا تھا کہ ہسپتالوں میں لوگوں کو بھوکا مار ڈالا جاتا ہے اور میں فوراً اس نتیجے پر پہونچو کہ بس اب زندگی کے دن گنتی کے رہ گئے ہیں۔ ایک عورت آئی عینک لگائے، کفن پہنے اور اس نے میرے سرہانے لٹکی ہوئی سلیٹ پر چاک سے کچھ لکھا، چاک ٹوٹ گئی اور اس

کے ٹکڑے میرے سر پر گرے۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''میرا کوئی نام نہیں۔''

تمہارا نام کوئی نہیں؟''

''نہیں۔''

''حماقت کی باتیں نہ کرو ورنہ کندی کی جائے گی۔''

میں نے اسی لئے جواب سے انکار کیا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ کندی ہوگی! وہ عورت بلی کی طرح پھنکاری تھی اور وہ بلی ہی کی طرح دبے کھسک گئی۔

اتنے میں دو لیمپ جلا دئے گئے اور ان کے پیلے پیلے گولے چھت سے لٹک ہوئے ایسے نظر آنے لگے جیسے دو آنکھیں بھٹک گئی ہیں اور چھت سے لٹکی ہوئی، پلکیں جھپکائی ہوئی ایک دوسرے سے مل جانے کو تڑپ رہی ہیں۔

کسی نے کونے میں سے کہا'' آؤ تاش کھیلیں؟''

''میں ایک بازو سے کیسے کھیلوں؟''

''آہ! تو پھر آخر ان لوگوں نے تمہارا ہاتھ کاٹ ہی ڈالا!''

میں نے فوراً یہ مان لیا کہ لوگوں نے اس کا ہاتھ اس لئے کاٹا ہوگا کہ یہ تاش کھیلتا تھا اور پھر بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ نہ جانے مجھے مار ڈالنے سے پہلے میرا کیا حشر کریں گے۔

میرے ہاتھوں میں اتنی جلن اور درد تھا کہ جیسے کوئی ہڈیاں نوچے ڈالتا ہو۔ ڈر اور تکلیف سے میں چپکے چپکے رو رہا تھا، آنکھیں بند کئے تاکہ میرے آنسو کسی کو نظر نہ آسکیں، لیکن آنسو تھے کہ آنکھوں سے ابل کر میری کنپٹیوں پر بہہ رہے تھے اور وہاں سے کان میں گھسے جا رہے تھے۔

رات ہوگئی۔ سب لوگ بستروں میں گھس گئے اور سرمئی کمبلوں سے اپنے آپ کو ڈھانک لیا۔ ہر لمحہ سناٹا بڑھتا جا رہا تھا، کہ لمحہ سناٹا بڑھتا جا رہا تھا، صرف ایک کونے سے ایک بڑبڑاتی آواز سناٹے کو کبھی کبھی چیر دیتی تھی:

''اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ وہ مرد بھی بالکل جانور ہے اور وہ عورت بھی...''

میرا دل چاہ رہا تھا کہ نانی اماں کو خط لکھوں کہ مجھے اس آفت سے نجات دلائیں، ابھی وقت ہے۔ لیکن نہ تو ہاتھوں کی وجہ سے لکھ سکتا تھا اور نہ ہی میرے پاس کاغذ تھا۔ اس لئے میں نے بھاگ نکلنے کا فیصلہ کیا۔

رات اس طرح چھائی ہوئی تھی موت کی طرح، جیسے اب کبھی جانے کا نام ہی نہ لے گی۔ میں نے آہستہ سے دونوں پاؤں پٹی سے نیچے اتارے اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا اور باہر گلیارے میں ایک بنچ پر مجھے ایک سفید سا ہی جیسا سر نظر آیا، جس کے چاروں طرف دھواں لپٹا ہوا تھا اور اس کی دھنسی ہوئی سیاہ آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ چھپنے کی مہلت نہیں ملی۔

''یہ کون یہاں گھوم رہا ہے؟ یہاں آؤ!''

آواز میں نرمی تھی۔ دھمکی ذرا سی بھی نہیں تھی۔ میں اس کے پاس چلا گیا اور مجھے ایک گول چہرہ دکھائی دیا جس پر خشخشی داڑھی تھی، سر پر سفید بال کے پٹے لمبے تھے جو کندھوں پر ہر طرف لٹکے ہوئے چاندی کے ہالے کی طرح معلوم ہوتے تھے، کمر سے کنجیوں کا ایک گچھا لٹکا ہوا تھا۔ اگر اس کے بال اور داڑھی زیادہ لمبی ہوتی تو وہ سینٹ پیٹر کی طرح نظر آتا۔

''کیا تم وہی مریض ہو جس کے ہاتھ جھلس گئے ہیں؟ رات میں اس طرح گھوم رہے ہو۔ کس قانون میں لکھا ہوا ہے یہ؟''

اس نے دھوئیں کا ایک بادل میں چہرے پر پھونکا اور اپنے نرم گرم بازو میں مجھے لیکر نزدیک کھینچا۔

''ڈر لگ رہا ہے؟''

''ہاں۔''

''یہاں شروع شروع میں سب کو ڈر لگتا ہے مگر ڈرنے کی کوئی بات نہیں اور خاص کر جب کہ میں یہاں موجود ہوں۔ میں کسی کا کچھ نہیں بگڑنے دوں گا۔ تمباکو پیو گے؟ اچھا نہیں تو ٹھیک ہے۔ ابھی کم سن ہو۔ چند سال بعد سہی... تمہارے اماں ابا کہاں ہیں؟ تمہارے ماں باپ نہیں ہیں؟ کوئی بات نہیں! ایسی ضرورت بھی کیا ہے۔ ان کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جی نہ ہارو! سمجھے؟''

مجھے مدت سے کوئی ایسا آدمی نہیں ملا تھا جو اپنی بات اتنے سیدھے سادے انداز میں کہتا ہو، صاف اور دوستانہ! اور اس کی باتیں سن کر وہ خوشی کہ کچھ کہنے کو نہیں۔

وہ مجھے واپس میرے پلنگ پر لے گیا۔

''ذرا دیر میرے پاس بیٹھیے گا'' میں نے التجا کی۔ ''ہاں، وہ تو میں بیٹھوں گا ہی'' اس نے اتفاق کیا۔

''تم کون ہو؟''

''میں سپاہی ہوں۔ سچا سپاہی، قفقاز میں لڑ چکا ہوں۔ سچ مچ کی لڑائیاں۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ آخر سپاہی لڑائیاں ہی لڑنے کو زندہ رہتا ہے۔ میں ہنگری والوں سے، سیر کاشیوں اور پولینڈ والوں، سب سے لڑا ہوں۔ جنگ، میرے بھائی، بہت بڑا فتنہ ہے۔''

میں نے آنکھیں ایک منٹ کو بند کر لیں اور جب کھولیں تو نانی اماں وہاں بیٹھی تھیں، جہاں وہ بیٹھا تھا۔ اور وہ ان کے پاس کھڑا ہوا کہہ رہا تھا:

''ارے، تو وہ سب مر گئے ہیں؟ ایسا تو نہ کہیئے۔''

سورج کی شعاعیں چنچل بچے کی طرح اچھلتی کودتی اندر آئیں اور پھر نکل گئیں۔ وارڈ کی ہر چیز پر سے تیرتی ہوئی اور پھر روشنی کے ساتھ اندر دھنس پڑیں۔

نانی میرے اوپر جھک کر بولیں:

''کیا ہے میرے کبوتر، کیا ان لوگوں نے تمہیں ستایا؟ میں نے اس سرخ بالوں والے بھوت سے کہہ دیا کہ...''

سپاہی جاتے ہوئے بولا ''ذرا سا ٹھہریئے میں ابھی قاعدے قانون کی ساری باتیں ٹھیک کیے دیتا ہوں۔''

''معلوم ہوتا ہے یہ سپاہی بھی بالاخنا کا رہنے والا ہے...'' نانی اماں نے گالوں پر سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

مجھے یہ خیال کہ میں اب تک خواب دیکھ رہا ہوں اور چپ رہا۔ پھر ایک ڈاکٹر آیا اور میرے ہاتھوں کی مرہم پٹی کی۔ اور پھر میں اور نانی اماں ایک گاڑی میں بیٹھ کر شہر سے گذرے۔

''وہ جو تمہارے نانا ابا ہیں نا، ان کا دماغ بالکل قابو سے باہر ہو گیا ہے'' وہ کہنے لگیں ''اتنے کنجوس ہو گئے ہیں کہ دیکھ کر متلی ہونے لگتی ہے! ان کا نیا دوست ہے، سمور کی چیزوں کی مرمت وغیرہ کرتا ہے۔ ابھی کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ اس نے ان کی دعاؤں والی کتاب سے ایک سو روبل کا نوٹ پار کر لیا۔ پھر وہ

جنگ ہوئی ہے کہ توبہ...ہوہو۔ہو۔وو!''

سورج خوب چمک رہا ہے۔ آسمان پر سفید پرندوں کی طرح بادل تیر رہے ہیں۔ ہم والگا کے اوپر شہتیروں کے پل پر چل رہے ہیں۔ برف پھول رہی ہے، پگھل رہی ہے، چرمرا رہی ہے۔ پل کے نیچے پانی تڑپ رہا ہے۔ گوشت کی طرح لال خانقاہ کے اوپر سنہری صلیبیں خوب جگمگا رہی ہیں۔ چوڑے گول منہ والی ایک عورت دکھائی دیتی ہے، جس کے بندے ہوئے بازوؤں میں جڑی بوٹیوں کا گانٹھ ہے۔ لو بہار آرہی ہے، اب ایسٹر قریب ہے!

دل پرندے کی طرح لرز رہا ہے۔

''نانی اماں نے مجھے بہت اچھی لگتی ہو!''

میری بات پر ان کو ذرا حیرانی نہ ہوئی۔ انہوں نے بڑی پرسکون آواز میں کہا:

''اپنا خون جو ٹھہرا۔ میں بڑائی نہیں کرتی۔ پر سچ جان۔ غیر بھی مجھے چاہتے ہیں! پاک مریم تیرا کرم ہے!'' اور مسکراتے ہوئے آگے کہا:

''جلد ہی پاک مریم کے دل کی کلی کھل جائے گی۔ بیٹا آسمان پر پہنچنے والا ہے نا! پر میرے جان واریا...''

اور خاموش ہوگئیں...

نانا ابا سے احاطے میں ملاقات ہوئی۔ وہ گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے کلہاڑی سے ایک بلی کی نوک چھیل کر بنا رہے تھے۔ انہوں نے اس طرح کلہاڑی تانی جیسے میرے پر دے ماریں گے، پھر ٹوپی اتار کر بڑے طنزیہ انداز میں بولے:

''خوش آمدید جناب عالی، ہم سے پھر آملنے پر خوش آمدید! تو نوکری کر چکے جناب؟ تو اب جو دل چاہے وہ کر کے کھائیں گا۔ تھوؤ...''

نانی اماں نے ہاتھ ہلا کر سب معاملہ روک دیا ''یہ سب ہم لوگوں کو معلوم ہے۔'' پھر ہم دونوں کمرے میں داخل ہوئے اور نانی اماں سماوار گرم کرتے ہوئے بولیں:

''اب کے تو تمہارے نانا بالکل ہی صاف منڈ گئے۔ وہ جوان کا دینی بیٹا ہے نا نکولائی، اس کو سود پر سب پیسے دے دئے تھے اور رسیدیں لی نہیں۔ پتہ نہیں یہ سب ہوا کیسے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ صفا

منڈ گئے۔ سب پیسے خاک ہو گئے اور یہ صرف اس لئے کہ ہم لوگوں نے غریبوں کو نہیں دیا، بدبختوں پر ترس نہیں کھایا۔ تو خداوند نے سوچا کہ میں ان کا شیرین خاندان والوں کا آخر کیوں بھلا کروں۔ بس اس نے یہی سوچا اور سب روپیہ لے لیا...''

انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور بولیں ''میں کوشش کرتی رہتی ہوں کہ معبود کا دل ذرا تو پسیجے تا کہ وہ اس غریب بڈھے پر زیادہ سختی نہ کرے۔ میں راتوں کو نکل جاتی ہوں اور اپنی کمائی میں سے کچھ چپکے سے خیرات کر آتی ہوں۔ اگر تمہارا جی چاہے تو تم بھی آج میرے ساتھ چلنا۔ آج میرے پاس کچھ پیسے ہیں...''

نانا ابا منہ بگاڑے اندر آئے۔

''ہاں ہاں۔ کیا نگلنے کے ارادے ہو رہے ہیں؟''

''ہم تمہارا تو کچھ نہیں نگل رہے!'' نانی اماں نے جواب دیا ''اور اگر تمہارا جی چاہے تو ہمارے ساتھ بیٹھ کے کھاؤ، سب کو پورا ہو جائے گا۔''

نانا ابا میز پر بیٹھ گئے اور بڑی مسکین صورت بنا کر بولے ''اچھا، ایک پیالی دے دو...''

گھر میں ہر چیز ویسی کی ویسی ہی تھی۔ سوائے اس کے کہ جس کونے میں امی رہتی تھیں وہ خالی تھا، اور اسے دیکھ کر بے حد صدمہ ہوتا تھا۔ دیوار میں نانا ابا کے پلنگ کے اوپر ایک کاغذ ٹنگا ہوا تھا جس پر بڑے بڑے جلی حروف میں لکھا ہوا تھا:

''یسوع مسیح، میری روح کو اپنی امان میں رکھ اور تیرا رحم و کرم مجھ پر ہمیشہ قائم رہے۔ مرتے دم تک قائم رہے۔''

یہ کس نے لکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

نانا ابا چپ رہے لیکن ذرا دیر بعد نانی اماں مسکرا کر بولیں:

''یہ کاغذ سوروبل کا ہے!''

نانا ابا چیخے ''تم سے کیا مطلب ہے جی! میری چیز ہے، چاہے میں غیروں کو دوں چاہے جس کو میرا جی چاہے!''

نانی اماں بڑے سکون سے بولیں:

''اب دینے کو کیا رہ گیا ہے۔ جب تھا تب تو اس کو دانت سے پکڑتے!''

''چپ رہو!'' نانا ابا چیخے۔

ہر چیز ویسی کی ویسی تھی، اپنے حال پر۔

کولیا جاگ پڑا۔ وہ اس ٹوکری میں لیٹا ہوا تھا جس میں کپڑے رہتے تھے اور ٹوکری ٹرنک پر رکھی ہوئی تھی۔ بھاری پپوٹوں سے اس کی نیلی نیلی آنکھیں تقریباً بالکل چھپ گئی تھیں۔

اس کا رنگ اور بھی زیادہ بجھ گیا تھا، کمزوری بڑھ گئی تھی اور وہ چند دنوں کا مہمان لگتا تھا۔ اس نے مجھے پہچانا بھی نہیں اور دوسری طرف منہ پھیر کر آنکھیں بند کر لیں۔

باہر گلی میں نکلا تو غمناک خبریں سننے میں آئیں: ویاخیر مر چکا تھا، ایسٹر کے ساتویں ہفتے میں چیچک اسے لے گئی تھی، خابی شہر چلا گیا تھا، یاز کے دونوں پاؤں مفلوج ہو گئے تھے، اس لئے وہ گھر سے نکل ہی نہیں سکتے تھا۔ یہ سب باتیں مجھے بتاتے وقت کستروما نے اپنی سیاہ آنکھیں غصے سے گھمائیں:

''لڑکے اتنی تیزی سے مرجاتے ہیں کہ بس ہی بس!''

لیکن صرف ویاخیر ہی تو مرا ہے!''

''وہ ایک ہی بات ہے۔ اگر کوئی گلی سے چلا گیا تو سمجھو مر ہی گیا۔ بس کسی سے دوستی بڑھاؤ کہ وہ یا تو کام کرنے کے لئے بھیج دیا جاتا ہے یا مر جاتا ہے۔ یہاں تمہارے احاطے میں چیسنکوف خاندان کے یہاں کچھ اور لوگ آئے ہیں۔ ایفسے ینکو ہے ان کا نام۔ ان کے یہاں ایک لڑکا ہے نیوشکا۔ اچھا ہے، تیز پھرتیلا سا! دو لڑکیاں ہیں۔ ان میں سے ایک تو بالکل ننھی سی ہے اور دوسری لنگڑی ہے۔ بیساکھی لگا کر چلتی ہے، خوبصورت ہے۔''

پھر کچھ سوچ کر بڑبڑایا:

''میں اور چورکا اس سے عشق لڑاتے ہیں۔ اس لئے ہم دونوں ہمیشہ جھگڑتے رہتے ہیں۔''

''اس لڑکی سے؟''

''ارے نہیں، آپس میں۔ اس سے تو کبھی کبھار!''

مجھے یہ تو معلوم ہی تھا کہ بڑے لڑکے بلکہ بڑی عمر کے مرد بھی عشق کیا کرتے ہیں اور مجھے اس قسم کے عشق کے کھردرے معنی کا بھی احساس تھا لیکن یہ سن کر میں گڑبڑا گیا اور مجھے کستروما پر افسوس ہونے

لگا۔ کیونکہ کسترو ما کے ہڈیالے اور نکیلے جسم اور اس کی سیاہ شعلہ بار آنکھیں مجھے کچھ عجیب سی لگتی تھی۔

اس شام اس لنگڑی سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ سیڑھیوں سے احاطے میں اتر رہی تھی کہ اس کے ہاتھ سے بیساکھی چھوٹ گئی اور وہ بیچاری سوکھی سہمی، کمزور، اپنے مرجھائے ہوئے ہاتھوں سے سیڑھی کا کٹہرا پکڑے اسی طرح بے بس کھڑی رہ گئی۔ میں نے بیساکھی اٹھانے کی کوشش کی لیکن ہاتھوں میں بندھی ہوئی پٹیوں نے بڑی مشکل کردی۔ بہر حال میں گھبرا گھبرا کر کوشش کرتا رہا اور وہ اوپر کھڑی چپکے چپکے ہنستی رہی۔

''یہ تمہارے ہاتھوں کو کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ میری بیوقوفی سے ایسا ہوا کہ جھلس گئے۔''

''اور مجھے دیکھو کہ میں لنگڑی ہوں۔ کیا تم یہیں رہتے ہو، ہمارے احاطے میں؟ بہت دن ہسپتال میں رہنا پڑا ہوگا؟ مجھے تو بہت دن رہنا پڑا تھا۔ افوہ، بہت مدت تک۔''

اس نے ٹھنڈی سانس لی اور پھر کہا:

''بہت دنوں!''

وہ ایک پرانا سا سفید لباس پہنے تھی۔ لیکن اسے اچھی طرح کلف دیا ہوا تھا اور سفید زمین پر گھوڑے کی نیلی نیلی نعلیں چھپی ہوئی تھیں۔ بال میں سیدھی کنگھی کی ہوئی تھی اور چھوٹی موٹی سی چوٹی سینے پر پڑی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور سنجیدہ تھیں۔ اور ان کی گہرائیوں میں نیلے شعلے سے لپکتے ہوئے معلوم ہوتے تھے جن سے اس کے گڈھے پڑے ہوئے، کمزور چہرے پر جلا سی آتی تھی۔ اس کی مسکراہٹ بھی دل کش تھی لیکن مجھے وہ لڑکی اچھی نہیں لگی۔ جیسے اس کا بیمار جسم پکار پکار کر کہتا ہو:

''مہربانی کر کے مجھے چھونا مت!''

پتہ نہیں میرے ساتھیوں کو اس سے کیونکر عشق ہو گیا تھا؟

''میں بہت دنوں بیمار رہی'' اس نے مجھے فوراً اطلاع دی، اس کے لہجے میں فخر کا رنگ جھلکتا تھا۔ ''ہماری پڑوسن نے مجھ پر جادو چلا دیا تھا، ایک بار امی سے اس کی لڑائی ہوئی تھی تو بس اس نے امی سے بدلہ لینے کے لئے مجھ پر جادو چلا دیا... ہسپتال میں تو تمہیں بہت تکلیف ہوئی ہوگی؟''

''ہاں...'' میں نے کہا اور پھر مجھے اس کی موجودگی سے گھبراہٹ ہونے لگی اور میں اپنے گھر میں گھس گیا۔

آدھی رات کے قریب نانی اماں نے مجھے بڑے پیار سے جگایا:

''کیوں چلیں؟ اگر دوسروں کا بھلا کرو گے تو تمہارے ہاتھ بہت جلدی اچھے ہو جائیں گے...''

انہوں نے میرا بازو پکڑا اور اندھیرے میں سیاس طرح مجھ کو لے چلیں جیسے مجھے کچھ سوجھ نہ رہا ہو۔ رات سیاہ اور نمناک تھی، ہوا اس طرح چل رہی تھی جیسے کوئی تیز دریا بہہ رہا ہو، ٹھنڈی ریت سے پاؤں ٹھٹھرے جا رہے تھے۔ نانی اماں بڑی احتیاط سے مزدوروں کے مکانوں کی تاریک کھڑکیوں کے پاس پہنچیں۔ تین بار سینے پر صلیب کا نشان بناتیں، پانچ کوپک اور تین بسکٹ کھڑکی پر رکھ دیتیں، پھر سینے پر صلیب کا نشان بناتیں اور تاریک آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کے کہتیں:

''اے آسمان کی مقدس ملکہ، سب انسانوں کی مدد کرو۔ کیونکہ ہم سب تیرے سامنے گنہگار ہیں، اے مقدس ماں!''

جیسے جیسے ہم اپنے گھر سے دور ہوتے گئے ویسے ویسے تاریکی بڑھتی گئی اور ہر چیز پر سناٹا بڑھتا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رات کے تاریک آسمان نے چاند اور ستاروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی اتھاہ گہرائیوں میں نگل لیا ہے۔ ایک کتا دوڑتا ہوا نکلا اور سامنے کھڑا، ہولوگوں پر غرغر کرنے لگا، اس کی آنکھیں اندھیرے میں دمک رہی تھی۔ میں ڈر کے مارے نانی سے لپٹ گیا۔

''ڈرو مت، کتا ہی تو ہے۔ اب بھوتوں کے نکلنے کے لئے دیر ہو گئی ہے کیونکہ مرغ بانگ دے چکے ہیں۔''

انہوں نے کتے کو پاس بلایا، اس کا سر تھپکا اور بولیں ''کتے میاں، میرے نواسے کو ڈراؤ مت!''

کتا میری ٹانگوں میں منہ ملنے لگا اور ہم تینوں آگے چلنے لگے۔ نانی نے اپنی ''چپکے کی خیرات'' رکھنے کے لئے بارہ جگہ، بارہ کھڑکیوں پر رکھیں۔ اب آسمان پر روشنی پھیل رہی تھی، تاریکی میں مٹیالے مکانات کی پرچھائیں ابھر رہی تھیں۔ نپولنایا کے گرجے کا مینار اشکر کے ڈھیلے کی طرح ابھرا اور قبرستان کی دیوار جعفری کی طرح دکھائی دی۔ روشنی تو اس سے گزرتی ہوئی نظر آتی تھی لیکن آر پار دکھائی نہیں دیتا تھا۔

''اب تمہاری بڑھیا نانی تھک گئی ہے'' نانی اماں بولیں ''اب گھر چلنا چاہئے! جب یہ گھر والیاں اٹھینگی تو دیکھیں گی کہ پاک مریم نے ان کے بچوں کے لئے کچھ ٹکڑے رکھ دئے ہیں۔ اور اگر انسان کے پاس کچھ بھی نہ ہو تو ایک ٹکڑا بھی غنیمت ہوتا ہے۔ آہ، الیوشا، لوگ کیسی غربت سے زندگی بسر کرتی ہیں اور

کوئی ان کی پرواہ نہیں کرتا۔''

امیروں کو آتا نہیں ہے خیال
کہ حکم خدا کیا، قیامت ہے کیا،
انہیں بس سونے چاندی کا رہتا خیال،
غریبوں کے دکھ سے انہیں واسطہ کیا
مگر دیکھ لینا جہنم میں ایک دن انگاروں پر سونے کے جھلسا کریں گے!

''یہی ساری مشکل ہے! خدا تو سب کا ہے مگر انسانوں کو تو ایک دوسرے کا خیال کرنا چاہئے۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ ہم پھر میرے پہلو میں واپس آ گئے بیٹا...''

میں خاموش رہا حالانکہ مجھے بھی اس کی بے حد مسرت تھی اور دل میں ایک مبہم سا خیال تھا کہ اس وقت جو مجھ پر گزر رہی ہے اسے میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ میرے ساتھ ہی وہ کتا بھی برابر پھدکتا چلا آ رہا تھا۔ لومڑی کا سا منہ اور پیار بھری آنکھیں جن سے ندامت ٹپکتی تھی۔

''نانی اماں، یہ کتا اب ہم لوگوں کے ساتھ رہے گا؟''

''کیوں نہیں؟ اس کا جی چاہے تو رہے۔ یہ لو اسے ایک بسکٹ دے دیتی ہوں۔ آؤ اس بنچ پر بیٹھ جائیں، نہ جانے کیوں مجھے بہت تھکن ہو رہی ہے...''

ہم لوگ ایک پھاٹک کے پاس پڑی ہوئی بنچ پر بیٹھ گئے، کتا ہمارے قدموں کے پاس لیٹ گیا اور سوکھے بسکٹ کو کترنے لگا، نانی اماں بولیں:

''یہاں ایک یہودن رہتی ہے، اس کے نو بچے ہیں، نو! میں اس سے پوچھتی ہوں ''موسیو نا تمہاری بسر کیسے ہوتی ہے؟'' تو وہ جواب دیتی ہے ''خدا بسر کرواتا ہے!''

اس کے بعد میں اپنی نانی اماں کے گرم نرم جسم سے لپٹ کر گھس کر سو گیا۔

زندگی اسی طرح تیزی سے بل کھاتی ہوئی بہنے لگی۔ ہر دن ایک چشمے کی مانند تھا جس کا بہاؤ میری روح کے لئے ایسے نقوش مہیا کرتا تھا جو کبھی مسحور کرتے، کبھی خوف دلاتے، کبھی دکھ پہنچاتے اور کبھی میرے ذہن کو سوچنے پر مجبور کر دیتے۔

جلد ہی میرا بھی جی چاہنے لگا وہ لنگڑی لڑکی مجھے زیادہ سے زیادہ نظر آئے، میں اس سے باتیں کر

سکوں یا پھاٹک کے پاس بنچ پر اس کے ساتھ کم از کم خاموش ہی بیٹھ سکوں (اس کے ساتھ تو خاموش بیٹھنا بھی اچھا لگتا تھا)۔ وہ چڑیوں کی طرح صاف ستھری رہتی تھی اور دریائے دان پر رہنے والے کزاکوں کی زندگی کے حالات بڑے خوبصورتی سے بیان کرتی تھی۔ وہاں اس کے ایک چچا مکھن کے کارخانے میں مستری تھے اور وہ بہت دن تک وہاں رہ چکی تھی، پھر اس کے والد، جو فٹر تھے، نیژنی نووگورود چلے آئے تھے۔

''اور میرے ایک چچا اور ہیں جو زار کے یہاں نوکر ہیں۔''

چھٹیوں کے دنوں میں، شام کے وقت سب لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل آتے، مرد شراب خانوں لڑکے لڑکیاں قبرستان کی طرف نکل جاتے، چہلیں کرتے، مرد شراب خانوں میں گھس جاتے۔ گلی میں صرف عورتیں اور بچے رہ جاتے۔ عورتیں بنچوں پر یا پھاٹکوں کے سامنے ریت پر بیٹھی رہتیں اور گپ شپ اور لڑائی جھگڑے کی چیخ دھاڑ مچی رہتی۔

بچے کبڈی، گلی ڈنڈا کھیلتے اور ان کی مائیں یا تو ان کی پھرتی اور کمال کی تعریفیں کیا کرتیں یا ان کے بھدے پن کی مذمت۔ اتنا شور ہوتا کہ کان پڑی اور آواز سنائی نہ دیتی۔ بڑوں کی دلچسپی اور موجودگی سے ہم بچوں کا بھی اشتیاق اور بڑھ جاتا، پھر زوروں میں کھیل بڑے جی جان سے کھیلے جاتے اور مقابلہ خوب ہوتا لیکن میں، چورکا اور کسترو ما کھیل میں کتنا ہی کھو جاتے پھر بھی اتنا وقت ضرور نکال لیتے کہ دوڑے دوڑے اس لنگڑی لڑکی کے پاس پہنچتے اور اپنی اپنی بڑائیاں چھانٹتے۔

''لودمیلا تم نے دیکھا کیسے میں نے ایک ساتھ سب گلی کا صفایا کر دیا۔''

وہ بڑی مٹھاس سے مسکراتی اور سر ہلاتی۔

پہلے تو ہمارا گروہ ہمیشہ ایک طرف ہوتا تھا۔ لیکن پھر مجھے یہ نظر آنے لگا کہ چورکا اور کسترو ما اکثر ایک دوسرے کے خلاف پارٹیوں میں شامل ہو جاتے اور ہر صورت سے ایک دوسرے کی طاقت اور ہوشیاری کا مقابلہ کرتے یہاں تک کہ لڑائیاں بھی ہو پڑتیں، آنسو بھی بہہ نکلتے۔ ایک دن تو دونوں میں ایسی جان توڑ لڑائی ہوئی کہ بڑوں کو بیچ میں پڑ کر چھٹون کرانی پڑی اور وہ ایسے کہ ٹھنڈے پانی کی ایک بالٹی لا کر دونوں پر ڈالی گئی، جس طرح کتوں کو الگ کرتے ہیں۔

لودمیلا بنچ پر بیٹھی اپنے ثابت پاؤں کو پٹک رہی تھی اور جب کبھی یہ جنگجو ایک دوسرے کو لپٹے،

لڑھکتے، اس کی طرف ڈھلکتے تو وہ ڈر کے مارے اپنی بیساکھی سے ان کو کونچتی ''افوہ، بس کرو، رک جاؤ!''

اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا، آنکھیں دھندلا گئی تھیں اور وہ بار بار چونک اٹھتی جیسے کوئی دورہ پڑ رہا ہو۔

پھر ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ چورکا نے کستروما کو گلی ڈنڈا میں بڑے شرمناک طریقے سے ہرایا۔ کسترو ما ایک سبزی والی دوکان کے پاس جا کے صندوق کے پیچھے منہ چھپا کر چپکے چپکے رونے لگا۔ وہ نظارہ بڑا ہی وحشت ناک تھا۔ بار بار وہ اپنے دانت پیتا، اس کے جبڑے پھول جاتے اور دبلا پتلا چہرہ پتھرا جاتا، اور بڑی بڑی سیاہ، غمگین سے موٹے موٹے آنسو ٹپکنے لگتے۔ اور جب میں نے اس کو چپ کرانے کی کوشش کی تو آنسو پی کر اور سانس دبا کر بولا:

''ٹھہر جاؤ... اگر اینٹ سے اس کا سر نہ پھوڑا ہو تو دیکھتے جاؤ!...''

چورکا اتراتا ہوا گھوم رہا تھا۔ سڑک کے بیچوں بیچ سے کنوارے بانکوں کی طرح ترچھی ٹوپی لگائے، جیب میں ہاتھ ڈالے گزرتا اور کہتا:

''اب میں جلدی ہی سگریٹ پینا شروع کرنا والا ہوں۔، پھر وہ دانت بھینچ کر تھوکنے کی ادا دکھاتا۔ یہ کرتب اس نے بالکل نیا نیا سیکھا تھا۔'' ویسے میں دو مرتبہ پی بھی چکا ہوں لیکن ابھی ذرا متلی آنے لگتی ہے۔''

مجھے ان سے باتوں سے کوفت ہوتی تھی۔ ایسا لگتا جیسے دوستوں کی ٹولی ٹوٹ جائے گی اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس سب کی ذمہ دار لودمیلا ہے۔

ایک دن میں احاطے میں بیٹھا اپنے جمع کئے ہوئے چیتھڑوں اور ہڈیوں اور دوسرے کباڑ کو چھانٹ رہا تھا کہ لودمیلا آ کے میرے پاس کھڑی ہوگئی اور بیساکھی پر جھولتی ہوئی اپنا داہنا ہاتھ ہلانے لگی۔ پھر تین مرتبہ سر ہلا کر بولی:

''سلام۔ کیا کسترومتمہارے ساتھ گیا تھا؟''

''ہاں۔''

''اور چورکا؟''

''چورکا اب ہم لوگوں کے ساتھ کھیلتا ہی نہیں، اور یہ سب تمہارا قصور ہے۔ ان لوگوں کو تم سے عشق ہوگیا ہے اور وہ اس لئے کرتے ہیں...''

وہ شرما گئی لیکن بنانے کے انداز میں بولی:

''ایسا تو نہ کہو۔ میرا قصور کیوں ہے؟''

''اس نے غصے میں مچک کر جواب دیا ''میں نے ان سے کب کہا کہ مجھ سے عشق کریں!'' اور پھر چلتے ہوئے بولی ''یہ سب حماقت کی باتیں ہیں! میں ان دونوں سے عمر میں بڑی ہوں۔ میں چودہ سال کی ہوں۔ اپنے سے بڑی عمر کی لڑکی سے کہیں عشق کیا جاتا ہے...''

''تم کچھ نہیں جانتی ہو!'' میں زور سے چیخا، جی چاہتا تھا کہ خوب عاجز کروں ''اس کو دیکھو نا دوکاندارن کو، خلیستوف کی بہن کو۔ بڑھیا ہوگئی ہے پر لونڈے اس کے پیچھے لگے رہتے ہیں!''

وہ میری طرف مڑی اور بولی ''تمہیں خود ہی کچھ پتہ نہیں۔'' اس کی آنکھیں غصے سے جل رہی تھیں، آواز گلے میں پھنس کر بھر گئی تھی۔ ''دوکاندارن تو چھنال ہے۔ پر میں، تم سمجھتے ہو میں بھی ویسی ہوں؟ میں تو ابھی چھوٹی ہوں۔ مجھے بھلا چھونا یا چٹکی کاٹنا نہین چاہئے... اگر تم ناول ''کمچادالکا'' کا آخری آدھا حصہ پڑھتے تو پھر تم ایسی بات ن ہ کہتے!''

وہ تن تن کرتی چلی گئی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا، اس کی باتوں میں کوئی ایسی حقیقت چھپی ہوتی تھی جس کا مجھے اب تک علم نہ تھا۔ یہ میرے ساتھ آخر اس کو چٹکیاں کیوں کاٹتے تھے؟ اور اوپر سے کہتے تھے ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔

دوسرے دن اپنی زیادتی کا ازالہ کرنے کیلئے میں نے سات کوپک کی بال کی مٹھائی خریدی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ لودمیلا کی پسندیدہ مٹھائی ہے۔ ''لوگی؟'' میں نے کہا۔

اس نے بناوٹی غصے سے جواب دیا ''جاؤ۔ میری تم سے نہیں بنیں گی!''

لیکن ساتھ ہی اس نے مٹھائی لی اور بولی:

''ان مٹھائیوں کو کم از کم کاغذ میں تو لپیٹ دیتے۔ دیکھو نا تمہارے ہاتھ کس قدر گندے ہیں۔''

''میں نے تو دھوئے تھے بھئی۔ مگر یہ میل چھٹتی ہی نہیں۔''

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اس کا ہاتھ خشک اور گرم تھا۔ وہ میرے ہاتھ کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی:

''تم نے اپنے ہاتھ برباد کر لئے ہیں...''

''تمہاری بھی تو انگلیاں کھردری ہیں...''

''یہ تو سوئی سے۔ بہت سلائی کرتی ہوں نا...''

پھر چند منٹ بعد اس نے ادھر ادھر دیکھ کر تجویز پیش کی:

''آؤ، کہیں چھپ جائیں اور ''کمچا دالکا'' چاہتے ہو پڑھنا؟''

ہم کو مناسب جگہ ڈھونڈنے میں ذرا دیر لگی، پھر آخر ہم لوگوں نے حمام کی ڈیوڑھی کا فیصلہ کیا۔ وہاں اندھیرا تو بیشک تھا مگر ایک کھڑکی بھی تھی، جس پر بیٹھ سکتے تھے۔ یہ کھڑکی چھپر اور دالان کے بیچ میں زمین کے ایک چھوٹے سے کونے میں کھلتی تھی، جس میں خوب کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا تھا۔ وہاں شاذ ہی کبھی کوئی آتا تھا۔

چنانچہ وہ کھڑکی پر بیٹھی، بیکار والا پاؤں بنچ پر پھیلایا اور اچھا والا زمین پر۔ سامنے ایک پھٹی پرانی کتاب اس کے منہ کے آگے تھی اور پھر اس نے نہایت ہی مشکل اور اکتا دینے والے الفاظ کا دریا بہانا شروع کر دیا۔ میری سمجھ میں تو بہت کم آ رہا تھا لیکن ویسے میں متاثر کافی تھا۔ میں فرش پر بیٹھا تھا اور وہاں سے مجھے اس کی سنجیدہ آنکھوں کے نیلے شعلے، کتاب پر ادھر سے ادھر آتے جاتے لہراتے نظر آتے تھے، کبھی کبھی ان میں آنسوؤں کی دھند چھا جاتی اور کبھی کبھی اس کی آواز کانپنے لگتی جب کہ وہ عجیب وغریب ترکیبیں اور نامانوس الفاظ پڑھتی جاتی۔ میرا ذہن لپک لپک کر ان الفاظ کو اٹھانا اور ان کو مصرعوں میں فٹ بٹھانے کی کوشش کرتا، طرح طرح سے میں ان کو توڑتا مروڑتا۔ چنانچہ اس حرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس کتاب کو خاک نہ سمجھ سکا کہ وہ ہے کس بات کے بارے میں۔

میرا کتا میرے گھٹنوں پر سو رہا تھا، میں نے اس کا نام ''بونڈر'' رکھا تھا۔ کیونکہ اس کے لمبے لمبے پاؤں تھے، جھبرا تھا، تیز تھا اور جس طرح خزاں کی ہوائیں چمنی میں چیختی تھیں اس طرح چیختا تھا۔

''سن رہے ہو؟'' لڑکی نے پوچھا۔

میں نے خاموشی سے سر ہلایا۔ الفاظ کی پیچیدگی سے میرا اشتیاق اور بھی بڑھتا چلا گیا اور شدید تڑپ ہونے لگی کہ ان الفاظ کو پھر سے ترتیب دے کر کوئی گیت بنا دیا جائے، ان میں سے ہر ایک لفظ آسمان پر چمکتا ہوا ستارہ بن جائے۔

جب رات آ گئی تو لودمیلا نے اپنا زرد ہاتھ جو کتاب پکڑے ہوئے تھا، جھکا لیا اور پوچھا ''اچھی ہے

نا؟ میں نے تم سے کہا تھا تمہیں اچھی لگے گی...''

اس شام کے بعد ہم کئی بار حمام کی ڈیوڑھی مین بیٹھے۔اور مجھے بہت اطمینان ہوا جب لودمیلا نے جلدی ''کمچادالکا'' کو چھوڑ دیا۔ورنہ اگر وہ کہیں پوچھ بیٹھتی تو میں اس شیطان کی آنت کتاب کا ایک لفظ بھی اس کو نہ بتا سکتا۔شیطان کی آنت میں اس کو یوں کہتا ہوں کہ ہم لوگوں نے جس جلد سے پڑھنا شروع کیا تھا اس کے بعد ایک تیسری جلد اور تھی اور لودمیلا نے بتایا کہ ایک چوتھا حصہ بھی ہے۔

جب پانی برستا تھا تو ہم لوگوں کو اس ڈیوڑھی میں خاص طور پر بہت لطف آتا تھا۔لیکن بعض اوقات بارش کے دن سنیچر کو پڑ جاتے تھے۔اس دن حمام گرم کیا جاتا تھا۔اس لئے اس دن ہمارا پروگرام نہ بن سکتا تھا۔بارش خوب رم جھم رم جھم برستی تو ہر شخص گھر میں بیٹھا رہتا،اس لئے ہماری اس تاریک کھڑکی کے پاس سے کسی کے گزرنے کا امکان نہ ہوتا۔لودمیلا اس خیال سے بے حد ڈرتی تھی کہ کہیں ہم لوگ پکڑ نہ جائیں۔آہستہ سے کہتی ''جانتے ہو لوگ کیا سمجھیں گے؟''

میں خوف جانتا تھا اور پکڑے جانے سے میں بھی ڈرتا تھا۔ہم لوگ وہاں بیٹھے نہ جانے کیا کیا گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔کبھی کبھی میں اس کو نانی اماں کی کہی ہوئی کہانیاں سناتا،لودمیلا دریائے میدویدیتسا کے آس پاس کے کزاکوں کی زندگی کا حال بیان کرتی۔

''وہاں کتنا اچھا ہے!'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتی ''یہاں کیا رکھا ہے؟ غربت اور بھوک اور کیا...''

میں نے فیصلہ کیا کہ جب بڑا ہو جاؤں گا تو دریائے میدویدیتسا کو ضرور دیکھنے جاؤں گا۔

بہت جلد ایسا ہوا کہ ہم لوگوں کو حمام کی ڈیوڑھی میں بیٹھنے کی ضرورت نہیں رہی۔لودمیلا کی ماں کو ایک سمور فروش کے ہاں نوکری مل گئی۔بہن اسکول جاتی تھی،بھائی ایک ٹائل بنانے والی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔جب موسم خراب ہوتا تو میں جا کر لودمیلا کر کھانے پکانے اور گھر اور باورچی خانہ صاف کرنے میں مدد دیتا۔

''میں اور تم بالکل میاں بیوی کی طرح ہیں'' وہ ہنس کر کہتی ''بس ہم لوگ ساتھ نہیں سوتے۔دراصل ہم لوگ میاں بیوی سے بھی اچھے ہیں۔میاں لوگ تو کبھی اپنی بیویوں کی مدد نہیں کرتے...''

اگر میرے پاس پیسے ہوتے تو میں کوئی مٹھائی خرید لاتا اور پھر ہم لوگ چائے بناتے۔بعد کو ٹھنڈے پانی سے دھو کر سماوار کو ٹھنڈا کر دیتے تا کہ لودمیلا کی ہنگامہ پسند ماں کو پتہ نہ چل سکے کہ چائے بنائی گئی ہے۔

کبھی کبھی نانی اماں آ کر ہم لوگوں کے پاس بیٹھتیں، لیس بنتی جاتیں یا کشیدہ کاڑھتی جاتیں اور بڑی حیرت انگیز کہانیاں اور داستانیں سناتیں۔ جب نانا ابا شہر چلے جاتے تو لودمیلا ہمارے یہاں آتی اور پھر ایسے موقعوں پر ہم بڑی بےفکری کے ساتھ دعوت اڑاتے۔

نانی اماں کہتیں ''ہم لوگوں کی زندگی بھی کتنی شاندار ہے، ہے نا؟ خود کمائیں تو کیوں نہ کھائیں!''

میری اور لودمیلا کی دوستی کو بھی بڑھاوا دیتیں۔

''لڑکیوں اور لڑکیوں کی آپس کی دوستی اچھی چیز ہے۔ بس یہی بات ہے کہ وہ کوئی حماقت نہ کریں...''

اور پھر نہایت سادگی کے ساتھ سمجھا دیا کہ ''حماقت کرنے'' سے کیا مراد ہے۔ ان کے الفاظ میں بڑا حسن تھا، ان سے بہت کچھ، فیض حاصل کیا جا سکتا تھا اور یہ بات فوراً میری سمجھ میں آ گئی کہ پھول جب تک خوب کھل نہ جائیں ان کو ہاتھ نہ لگانا چاہئے ورنہ ان سے نہ تو خوشبو آئے گی نہ پھر ان میں پھل اتریں گے۔

میرا تو جی نہیں چاہتا کہ ''حماقت کی بات'' کروں لیکن پھر بھی میں اور لودمیلا عام طور پر اس موضوع پر گفتگو کئے بغیر نہ رہ سکتے جو اکثر خاموشی میں چھپا رہتا ہے۔ اکثر دونوں جنسوں کے تعلقات بڑے بے ڈھنگے انداز میں ہمارے سامنے آ پڑتے، ہم دونوں کو اس سے کوفت ہوتی اور پھر ایسی باتوں کی ضرورت آ کھڑی ہوتی۔

لودمیلا کے باپ کی عمر تقریباً چالیس سال تھی، خوبصورت آدمی تھے، گھنگھریالے بال، مونچھیں رکھے، بھاری بھاری گھنی بھوئیں جنہیں وہ نہایت فتح مندی کے ساتھ چڑھاتے رہتے تھے۔ وہ بہت ہی عجیب طریقے سے خاموش رہتے تھے۔ مجھے تو یاد نہیں کہ میں نے کبھی ان کو بولتے سنا ہو۔ بچوں کو پیار کرتے تو گونگوں کی سی آوازیں نکالتے یہاں تک کہ اپنی بیوی کو بھی پیٹتے جاتے اور ایک لفظ نہ کہتے۔

چھٹیوں کے دن، شام کو وہ ایک نیلے رنگ کا قمیص چڑھاتے، چوڑی مہری کا مخمل کا پتلون اور چمکدار جوتے۔ کندھے پر ایک بڑے سے فیتے میں ایک اکارڈین لٹکاتے اور پھاٹک کا رخ کرتے اور وہاں اس طرح کھڑے ہو جاتے جیسے کوئی سپاہی سلامی دے رہا ہو! پھر ہمارے گھر کے سامنے سے ایک قطار خراماں خراماں نکلنے لگتی۔ محلے کی لڑکیاں اور عورتیں چنیاں بطخوں کی طرح گزرتیں اور ایفسے ینکو کو یا تو

کنکھیوں سے دیکھتی جاتیں یا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ندیدے پن سے جیسے بھوکی ہوں۔ وہ وہیں کھڑے رہتے، نچلا ہونٹ نکالے اور اپنی سیاہ آنکھوں سے ایک ایک کا جائزہ لیتے۔ جب یہ عورتیں مرد کے سامنے سے آہستہ آہستہ گزرتیں تھیں جیسے جان ہتھیلی پر رکھے ہوں، جب آنکھیں آنکھوں سے مل کر خاموش اشارے کرتی تھیں تو کتوں کی سی شہوانیت کا ایسا اظہار ہوتا تھا کہ متلی آنے لگتی۔ ایسا لگتا تھا کہ مرد کی طرف سے بس اب ایک شاہانہ اشارہ ہوگا اور ان میں کوئی بھی عورت وہیں گلی کی گندی ریت پر چاروں خانے چت لیٹ جائے گی۔

''آنکھیں سینک رہا ہے، بکرا! بے حیا سور!'' لودمیلا کی ماں بڑبڑاتی جاتی۔ وہ گھسی ہوئی جھاڑو کی طرح لگتی تھی۔ لمبی پتلی، چہرہ ستا ہوا، لمبا سا اور اجڑے بال جو میعادی بخار کے بعد کاٹ دئے گئے تھے۔

اس کے پاس لودمیلا بیٹھی ہوتی اور طرح طرح کے سوالات کر کے جان توڑ کوشش کرتی رہتی کہ اس کی ماں کا دھیان کسی اور طرف بٹ جائے۔

''دور ہو لنجی کہیں کی، کمبخت!'' اس کی ماں آنکھیں جھپکاتے ہوئے بگڑ کے کہتی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی منگولی آنکھیں بڑے عجیب زرد رنگ کی تھیں اور طرح جمی رہتی تھیں جیسے کسی چیز میں پھنس گئی ہیں اور وہ چھوڑتی ہی نہیں۔

لودمیلا کہتی ''اماں، خفا نہ ہو۔ خفا ہونے سے کیا بنے گا، دیکھو تو وہ چٹائی والی کی بیوہ کیسی سج کر کھڑی ہے!''

''اگر تم تینوں میرے سر پر سوار نہ ہوتے تو میں اس سے اچھے کپڑے پہن سکتی تھی۔ تم لوگوں نے تو مجھے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ کیا گھر اور کیا باہر۔ کھا گئے مجھے!'' اس کی ماں نے چٹائی والے کی موٹی بیوہ کی طرح دیکھا اور کھسایا کر بے رحمی سے جواب دیا۔

چٹائی والے کی بیوہ کسی چھوٹی عمارت کی طرح لگتی تھی جس میں سے اس کے بھاری بھاری نوکدار سینے برساتی کی طرف نکلے ہوئے لگتے تھے، اس کا سرخ چہرہ جس کے چاروں طرف سبز رنگ کا رومال کس کے بندھا ہوا تھا، مجھے ایسا لگتا جیسے کسی پھسلواں دو چھتی کے روزن سے ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخ روشنی چھن رہی ہو۔

ایفسے ینکو اپنا کارڈین سینے پر کھینچ لیتے، اس کو بجانا شروع کر دیتے۔ ساز سے گہرے اور لطیف سر

نکلنے لگتے، جو نامعلوم منزلوں کی طرف پکارتے ہوئے محسوس ہوتے۔ گلی بھر سے بچے دوڑتے ہوئے آتے اور ساز بجانے والے کے قدموں پر گر گر پڑتے اور ریت پر بےخود ہو کر لوٹنے لگتے۔

ایفسے ینکو کی بیوی کہتی ''ٹھہرو، ٹھہرو، ابھی دیکھو۔ کیسی مار پڑتی ہے۔''

ایفسے ینکو ساز بجانا بند کئے بغیر گھوم کر ایک نگاہ غلط انداز اپنی بیوی پر ڈالتے۔ چٹائی والے کی بیوہ خلیستوف کی دوکان کے آگے والی بنچ پر جم جاتی اور وہاں بیٹھی سنتی رہتی اس کا چہرہ دھک اٹھتا، سر ایک طرف کو ڈھلک جاتا، بھاری سینہ اوپر نیچے ہوتا رہتا۔

قبرستان سے پرے کھیت اور میدان ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخ روشنی میں نہاتے ہوتے۔ بڑے بڑے انسانی ہیولے چمک دار کپڑے پہنے اس طرح گلی سے گزرتے جیسے دریا کے بہاؤ کے ساتھ آ رہے ہوں، ان کے چاروں طرف بچے چھٹکے ہوتے تھے، ہوا میں جنون اور نشے کی سی کیفیت ہوتی۔ مٹی میں سے میٹھی میٹھی خوشبو اڑ رہی تھی جس میں کمیلے کی چربیلی میٹھی بو حاوی تھی۔ خون کی بو اور سمور فروش کے احاطوں کی طرف سے چمڑے کی نمکین اور سڑی ہوئی بو آ رہی تھی۔ عورتوں کی ٹائیں ٹائیں، شراب کے نشے میں دھت مردوں کی غراتی ہوئی آوازیں، بچوں کی تیز چیخ پکار اور اس کے ساتھ اکارڈین کے بھاری سر! یہ سب مل کر ایک جان ہو کر دھڑکتے ہوئے معلوم ہوتے تھے جیسے دھرتی، جاندار دھرتی زور زور سے سانس لے رہی ہو۔ ہر چیز جو ننگی اور کھردری بھی تھی وہ بھی اس زندگی کی حقیقت میں یقین اور ایمان پیدا کرتی تھی۔ یہ زندگی، بالکل درندوں کی زندگی، اپنی نشو ونما کی طاقت کو ظاہر کرنے کے لئے اس قدر بھنائی ہوئی تھی۔

اس تمام شور وشغب میں بعض اوقات کچھ ایسے تلخ الفاظ سنائی دے جاتے کہ دل کو لگ جاتے اور دماغ میں بیٹھ جاتے:

''ارے اب سب کی سب اس پر ایک ساتھ مت گرو۔ باری ہی باری سے تو ہاتھ آئے گا...''

''اگر ہم خود اپنوں پر ترس نہ کھائیں گے تو کون ہم پر ترس کھائے گا؟...''

''ایسا لگتا ہے خدا نے عورت کو بھی بس دل لگی کے لئے پیدا کیا ہے...''

رات قریب آنے لگی۔ ہوا میں تازگی بڑھ گئی، شور کم ہونے لگا، پرچھائیاں لکڑی کے گھروں میں گھسنے لگیں اور ایسا لگا جیسے وہ گھر ان کے بھر جانے سے پھولتے جا رہے ہیں۔ بعض بچے زیادہ قابو میں

آتے جاتے، زیادہ خاموش ہوتے جاتے۔ ایفسے ینکو اس طرح غائب ہوجاتے کہ کسی نے نہ دیکھا جیسے گھل گئے ہوں۔ چٹائی والے کی بیوہ بھی غائب ہوجاتی اور اب اکارڈین کی گہری آواز دور قبرستان کے کہیں آس پاس سے آنے لگتی۔ لودمیلا کی ماں اسی طرح کمر دوہری کئے بنچ پر بیٹھی رہتی۔ نانی اماں پڑوس میں دائی کے یہاں چائے پینے چلی جاتیں۔ دائی لمبی چوڑی عورت تھی، بطخ کی چونچ سی ناک، اس کے چپٹے مردانہ سینے پر ایک سونے کا تمغہ لگا رہتا تھا، جس پر ''ناخدائے قریب المرگاں'' لکھا تھا۔ ہمارے محلے میں سب اس سے خوف کھاتے، اسے ڈائن سمجھتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ایک مرتبہ وہ ایک کرنل کی بیمار بیوی اور تین بچوں کو اکیلی مکان میں سے نکال لائی تھی، جس میں آگ لگی ہوئی تھی۔

نانی اماں کی اس سے بہت پٹتی تھی۔ جہاں گلی میں ایک دوسرے سے سامنا ہوا بس دور ہی سے مسکرانا شروع ہوگیا۔

کستروما اور میں پھاٹک سے لگی ہوئی بنچ میں لودمیلا کے پاس بیٹھ گئے۔ چورکا نے لودمیلا کے بھائی کو کشتی کا چیلنج دیا تھا۔ اب دونوں گتھم گتھا، خوب مٹی اڑا رہے تھے۔

''ارے رک جاؤ، بس کرو!'' لودمیلا نے ڈرتے ہوئے کہا۔

کستروما اپنی سیاہ آنکھوں کی ترچھی نظریں لودمیلا پر جمائے اسے شکاری کالینین کے متعلق بتا رہا تھا کہ وہ ایک گٹھے ہوئے بدن کا بڈھا تھا، خوب تیز آنکھیں اور اس کی بدنامی بستی میں تمام پھیلی ہوئی تھی۔ ابھی حال ہی میں اس کا انتقال ہوا تھا لیکن کستروما کے کہنے کے مطابق قبرستان کی مٹی میں دفنانے کے بجائے اس کے تابوت کو باہر ہی چھوڑ دیا گیا تھا اور قبروں سے ذرا فاصلے پر۔ سیاہ تابوت کے پائے اونچے تھے اور اس کے ڈھکن پر سفید نقوش تھے۔ صلیب، نیزہ، عصا اور دو ہڈیاں!

اور یہ سنا جاتا ہے کہ روز رات کو وہ بڈھا اپنے تابوت میں سے اٹھتا تھا اور صبح جب تک کہ مرغ بانگ نہ دے، وہ سارے قبرستان میں کچھ ڈھونڈتا پھرتا تھا۔

لودمیلا لجاجت سے بولی ''بھئی ایسی ڈراؤنی باتوں کا ذکر نہ کرو!''

''چھوڑو تو مجھے'' چورکا نے لودمیلا کے بھائی سے کہا اور اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کستروما کی طرف مڑ کر مضحکہ خیز انداز میں بولا ''کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔ ہم نے خود ہی دیکھا کہ قبر کھود کر تابوت اس کے اندر رکھا گیا اور اس کے اوپر خالی تابوت یادگار کے طور پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اور یہ جو قصہ ہے کہ اس کا

بھوت قبرستان میں پھرا کرتا ہے یہ سب شرابی لوہاروں کی من گھڑت ہے...''

کستروما نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا ''اچھا۔ اگر ایسا ہی آپ کو یقین ہے تو ایک رات قبرستان جا کر بسر کیجئے گا؟''

پھر دونوں بحث میں الجھ گئے۔ لودمیلا نے مڑ کر اپنی ماں کی طرف دیکھا اور حسرت ناک انداز میں اپنی ماں سے پوچھا:

''اماں، کیا رات کو بھوت نکل کر گھومتے ہیں؟''

اس کی ماں کی آواز جس کی عمر کوئی بیس سال کی رہی ہو گی خوب موٹا، لال لال گال، ٹہلتا ہوا ادھر آ نکلا اور ہم لوگوں کی بحث سنتے ہوئے بولا:

''اگر کوئی جا کر تابوت پر رات بھر لیٹ رہے صبح تک تو بیس کوپک اور دس سگریٹ دیتا ہوں لیکن اگر بیچ میں بھاگ نکلے تو جتنا دل چاہے گا اتنا کان مروڑوں گا۔ کیوں ہوتی ہے؟''

سناٹا اور تناؤ کا عالم چھا گیا جو لودمیلا کی ماں نے توڑا:

''کیا حماقت ہے بچوں سے ایسی بات کرنے کو کہتا ہے کوئی...''

''اچھا اگر ایک روبل دو تو میں کرتا ہوں'' چورکا نے اداسی سے کہا۔

کستروما نے طنزاً پوچھا:

''اور بیس کوپک میں ڈرتے ہو؟'' اور والیوک سیکہا:

''والیوک، چلو۔ ایک روبل لگا دو، یہ جائے گا تو ہے نہیں... خواہ مخواہ ہی شیخی بگھار رہا ہے...''

''اچھا لو روبل!''

چورکا چپ چاپ زمین سے اٹھا اور دیوار کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ کستروما نے انگلیاں منہ میں ڈالیں اور زور سے سیٹی بجائی، لودمیلا ذرا پریشانی سے بولی:

''ارے توبہ، نہ جانے کیوں یہ شیخی بگھارتا ہے!''

''سب کے سب بزدل ہیں!'' والیوک نے کہا ''گلی کے دلیر شیر ہیں نا! اوہنہ! پہلے ہو تم سب پلے۔''

اس کے ہاتھوں یہ توہین بڑی تکلیف دہ تھی۔ ہم لوگوں کو یہ موٹلا بالکل اچھا نہیں لگتا تھا، ہمیشہ بچوں

کو بدمعاشی کیلئے بھڑکایا کرتا، ان کو عورتوں اور لڑکیوں کا مذاق اڑاؤ۔ سنایا اس کے کہنے میں آجاتے اور خوب بھگتتے۔ اس کو میرے بچے اس کے کہنے میں آجاتے اور خوب بھگتے۔ اس کو میرے کتے سے نہ جانے کیوں عداوت تھی، اس کو پتھر مارتا رہتا اور کتے سے نہ جانے کیوں عداوت تھی، اس کو پتھر مارتا رہتا اور ایک دن اور روٹی کا ایک ٹکڑا کھلا دیا جس میں سوئی رکھ دی تھی۔

لیکن اس وقت چورکا کے یوں کھسک جانے سے مجھے سخت تکلیف ہوئی چنانچہ میں نے والیوک سے کہا:

''لاؤ مجھے ایک روبل دو۔ میں جاتا ہوں...''

وہ قہقہہ مار کر ہنسا جیسے مجھے دھمکی دے رہا ہو، اور ایک روبل نکال کر لودمیلا کی ماں کو دینے لگا۔

''میں کیوں لوں! مجھے ضرورت!'' کہہ کر وہ غصے میں پھنپھناتی ہوئی چلی گئیں۔

لودمیلا نے بھی روبل لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر والیوک ہم لوگوں کو اور بھی چھیڑنے لگا۔ میں بغیر مانگے ہی جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ نانی اماں آ گئیں۔ سب ماجرا سن کر روبل لے لیا اور مجھ سے بڑے اطمینان سے بولیں:

''کوٹ پہن لینا اور کمبل بھی لے لینا، اور کمبل بھی لے لینا، صبح ہوتے ہوتے سردی ہونے لگتی ہے...''

ان کے الفاظ نے مجھے امید دلاتی کہ کوئی وحشت ہوتے ہوتے سردی ہونے لگتی ہے...''

ان کے الفاظ نے مجھے امید دلائی کہ کوئی وحشت ناک بات نہ ہو گی۔

والیوک نے یہ سرط لگائی کہ میں رات بھر تابوت پر یا تو بیٹھا رہوں یا لیٹا رہوں، اور جو کچھ بھی ہو اس پر سے سرکوں نہیں، اگر بڈھا کالینین اس میں سے نکلنے لگے اور تابوت جھولنے لگے تب بھی نہیں۔ اگر میں اس پر سے کود جاؤں گا تو گویا شرط ہار جاؤں گا۔

والیوک بولا ''دیکھو، میں رات بھر تم پر نظر رکھوں گا!''

جب میں قبرستان کی طرف روانہ ہونے لگا تو نانی اماں نے مجھے پر صلیب کا نشان بنایا اور مجھے نصیحت کی:

''دیکھ لینا اگر ایسا لگتا کہ کوئی چیز نظر آئے تو ہلنا مت! بس پاک مریم کی خدمت میں دعا پڑھنی

شروع کر دینا...''

میں تیزی سے روانہ ہو گیا کہ جلدی سے اس کام کو ختم کر دوں۔ والیوک، کستروم اور کچھ اور لڑکے میرے ساتھ آئے۔ جب میں دیوار پر چڑھنے لگا تو میرا پاؤں کمبل میں آ گیا اور میں گرا کرا چھلتی ہے۔ معلوم ہوتا تھا زمین نے مجھے اچھال دیا۔

دیوار کے اس طرف سے ہنسی کی آواز آئی۔ میرے سینے میں کھٹ سے جیسے کچھ ہوا اور پیٹھ پر ٹھنڈی جھرجھری رینگنے لگی۔

لڑکھڑاتا ہوا میں اس سیاہ تابوت تک پہونچ گیا۔ اس کے ایک طرف کو مٹی لگی ہوئی تھی اور دوسری طرف اس کے چھوٹے موٹے پائے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر پھر اٹھا نہیں پاتا۔ میں اس کے پائنتی پر بیٹھ گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔

قبروں سے بھرے ہوئے قبرستان میں چاروں طرف مٹیالی صلیبیں خوب گھنی اگی ہوئی تھیں۔ قبروں پر چھدری گھاس نکلی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سائے اپنے سوکھے چمرخ بازوؤں میں ان قبروں کو لئے ہیں۔ صلیبوں کے بیچ بیچ میں کہیں کہیں برچ کے پودے تھے، جن کی شاخیں خود مل کر علیحدہ قبروں کو ایک دوسرے سے ملا رہی تھیں۔ برچ کی شاخوں کی جھالر نما پر چھائیں میں سے جنگلی گھاس اگی ہوئی نظر آ رہی تھی اور سب سے زیادہ وحشت ناک چیز یہی سیاہ جھاڑ جھنکاڑ تھا! ان سب کے بیچ میں گرجا ایک دیو کی طرح سر اٹھائے کھڑا تھا۔ چھوٹا سا مدھم چاند ٹھہرے ہوئے بادلوں کے درمیان چمک رہا تھا۔

یاز کے والد، وہی ''سڑا گنوار'' آہستہ آہستہ چوکیدار والی گھنٹی بجا رہے تھے۔ جب رسی کو کھینچتے تو وہ چھت کے ایک نکلے ہوئے کونے میں پھنس جاتی، ایک مختصر فریادی آواز گونج جاتی اور اس کے فوراً ہی بعد اس چھوٹی سی گھنٹی کی بے جان گھنگھناہٹ۔

مجھے ان کی وہ بات یاد آئی ''پروردگار بے خوابی سے بچائے۔''

اف کس قدر ہولناک تھی وہ رات! نہ جانے کیوں دم گھٹا جاتا تھا۔ ویسے شام سے سردی تھی لیکن مجھے پسینہ آنے لگا۔ اگر وہ بڈھا کالینین اپنے تابوت میں سے نکلنے لگے تو کیا مجھے اتنی مہلت مل سکے گی کہ دوڑ کر چوکیدار جی کے جھونپڑے تک پہونچ سکوں؟ میں قبرستان کے چپہ چپہ سے واقف تھا۔ بیسیوں ہی بار ہم لوگ یاز اور دوسرے دوستوں کے ساتھ یہاں قبروں میں کھیل چکے تھے۔ وہیں گرجا کے پاس میری

امی دفن تھیں۔

ابھی سب لوگ سوئے بھی نہ تھے، بستی سے قہقہوں کے چھپاکے آ رہے تھے، گیتوں کے ٹکڑے سنائی دے رہے تھے۔ اکارڈین کے چیخنے اور آہیں بھرنے کی آواز آ رہی تھی۔ پہاڑوں کی طرف سے، جہاں ریل گاڑی میں ریت بھری جاتی تھی یا پاس والے گاؤں سے جو کتیز وفکا کہلاتا تھا۔ لوہار میا چوف جو ہمیشہ نشے میں دھت رہتا تھا، لڑکھڑاتا ہوا قبرستان کے جنگلے کے باہر باہر چل رہا تھا اور گا رہا تھا۔ میں نے اسے اسی گیت سے پہچانا جو وہ ہمیشہ گایا کرتا تھا:

میری امی کو دیکھو ذرا،
یہ شرارت تو سوچو ذرا،
جانے اپنے کو کیا ہے سمجھتی،
کسی عاشق کو منہ نہ لگاتی،
اپنے ابا کے پکھوے سے لگتی سدا،
میری امی کو دیکھو ذرا آ آ آ...

زندگی کی ان آخری اور ڈوبتی ہوئی سانسوں کو سن کر کیسی ہمت بڑھتی تھی لیکن ہر بار جب گھنٹی بجتی تو سناٹا کچھ اور بڑھ جاتا۔ اور خاموشی اس طرح بڑھتی جا رہی تھی جیسے چڑھتا دریا وادیوں میں موجیں مارتا چلا جائے اور ہر چیز اس میں غرق ہو کر غائب ہوتی چلی جائے۔ میری روح ڈوبتی رہی جیسے کسی نامعلوم اتھاہ، لامتناہی گہرائی میں ڈوب رہی ہو جہاں سے صرف ستارے دکھائی دے رہے ہوں۔ ستارے جن تک کسی کی پہونچ نہ ہو۔ اور باقی تمام چیزیں فنا ہو گئی ہوں۔

میں نے اپنے آپ کو کمبل میں لپیٹ لیا اور پاؤں اٹھا کر تابوت پر بیٹھ گیا، میرا منہ گرجے کی طرف تھا اور جہاں ذرا سا ہلتا تابوت چرچراتا، مٹی جھڑنے لگتی۔

پھر میرے پیچھے مٹی میں کوئی چیز ایک دو بار گری اور اس کے بعد ایک گما تابوت کے پاس آ کے گرا۔ پہلے تو مجھے ڈر لگا۔ پھر میں سمجھ گیا کہ یہ والیوک اور اس کے دوست مجھے ڈرانے کے لئے دیوار پر سے پھینک رہے ہیں۔ اور اس خیال سے کہ آس پاس لوگ موجود ہیں، مجھے تسکین ہوئی۔

مجھے اپنی امی کا خیال آنے لگا۔ ایک مرتبہ جب میں نے سگریٹ پینے کی کوشش کی تھی اور وہ مجھے

مارنے لگی تھیں تو میں نے کہا تھا:

''مجھے ہاتھ نہ لگائیے گا میری ویسے ہی طبیعت خراب ہے۔ متلی ہو رہی ہے...''

پٹائی کے بعد جب میں تندور کے پیچھے چلا گیا تھا تو میں نے سنا کہ وہ نانی اماں سے کہہ رہی تھیں:

''ایسا پتھر دل لڑکا ہے، کسی سے محبت نہیں کرتا...''

مجھے ان کی اس بات سے بہت دکھ ہوا تھا، جب کبھی امی مجھے مارتی تھیں تو مجھے ان پر بہت ترس آتا تھا۔ شرم بھی آتی تھی کیونکہ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کہ میں ان کی دی ہوئی سزا کا سچ مچ مستحق ہوتا تھا۔ اور سچ مچ زندگی میں بہت کچھ دکھ ہی دکھ تھا۔ اب یہی لڑکے تھے جو دیوار کے اس طرف سے پتھر پھینک رہے تھے۔ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ قبرستان میں اس وقت اکیلا بیٹھنا ہی میرے لئے کافی وحشت ناک تھا پھر بھی وہ مجھے اور ڈرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کیوں؟

میرا دل چاہا کہ چیخ کر ان سے کہوں:

''کمبختو، شیطان کے حوالے ہو!''

لیکن یہ بات خطرناک تھی۔ کون جانے شیطان کو یہ بات کیسی لگے؟ یقیناً شیطان یہیں کہیں ٹہل رہا ہوگا۔

ریت کے ذروں میں ابرک ملی ہوئی تھی اور چاندنی میں دھندلی دھندلی چمک رہی تھی۔ ان کو دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ ایک بار میں دریائے اوکا پر ایک بیڑے پر لیٹا ہوا پانی کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ پانی سے ایک مچھلی یکا یک پھدک کر بالکل میری نظروں کے سامنے آ گئی۔ اس نے قلابازی کھائی تو بالکل انسان کے گال کی طرح لگتا تھا، پھر وہ اپنی ننھی ننھی چڑیا کی سی آنکھ سے مجھے تکنے لگی اور پھر دریا کی گہرائی میں اس طرح غوطہ لگا گئی جیسے کوئی ٹوٹا ہوا پتہ پھڑ پھڑا کر غائب ہو جائے۔

میرا حافظ زوروں سے کام کرنے لگا۔ تخیل طرح طرح کی خوفناک تصویریں لا کر سامنے کھڑی کرنے کی کوشش کرتا اور یادداشت زندگی کے بھولے بسرے واقعات کو ایک پر ایک اکٹھا کر کے تخیل کے اس حملے کے آگے فصیل سی کھڑی کرتی جاتی۔

مثلاً مجھے نظر آنے لگتا ہے کہ ایک ساہی، اپنے چاروں مضبوط پنجوں کے بل ریت پر کھٹا کھٹ چلتی، میری طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ تو فوراً مجھے گھریلو جن کا خیال آتا۔ وہ بھی ایسے ہی منے سے اور اجڑے

بچھڑے ہوتے تھے۔

پھر یاد آتا کہ نانی اماں کس طرح تندور کے سامنے اکڑوں بیٹھ کر پڑھتی تھیں ''میرے اچھے ننھے بونے تیل چٹوں کا صفایا کر دے...''

شہر نظر سے اوجھل تھا لیکن اس کے کنارے پر، دور، آسمان پر نور پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ تڑکے کی سرد ہوا میرے گالوں میں چبھ رہی تھی، پپوٹے بھاری ہو رہے تھے۔ میں سکڑ کر ہونا ہے۔

نانی اماں نے مجھے جگایا۔ وہ میرے پاس کھڑی کمبل کھینچتی ہوئی کہہ رہی تھیں:

''اٹھ بیٹا، بہت سردی لگ رہی ہے؟ کیوں؟ بہت ہولناک تھا؟''

''ہاں تھا تو مگر کسی سے کہیئے گا نہیں۔ ان لڑکوں کو پتہ نہ چلنے پائے!''

''مگر کیوں نہیں؟'' نانی اماں نے تعجب سے کہا ''اگر تمہیں ڈر نہیں لگا تو پھر شان ہی کیا...''

ہم دونوں گھر چلے۔ وہ رستے میں پیار سے بولیں:

''زندگی میں ہر بات کی آزمائش خود کرنی چاہیئے، میرے کبوتر و بوتر... ہر بات خود سیکھنی چاہیئے اگر انسان خود سے نہیں کچھ کچھ سیکھتا تو اسے بھلا کون سکھا سکتا ہے...''

شام ہوتے ہوتے میں گلی کا ہیرو بن گیا۔ ہر شخص نے مجھ سے پوچھا:

''بہت خوفناک تجربہ تھا نا؟''

اور جب میں جواب دیتا کہ ''ہاں تھا تو!''۔ تو سب سر ہلا ہلا کر کہتے:

''اچھا، دیکھا...''

دوکان دارن نے بڑے یقین کے ساتھ چیخ کر کہا ''تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کالینین کی قبر سے نکلنے والی بات سب گپ تھی۔ اگر نکلتا تو کیا بھلا اس لڑکے سے ڈر جاتا وہ۔ ایک جھانپڑ مارتا تو یہ قبرستان سے دور جا پڑتا نہ جانے کہاں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔''

لودمیلا محبت اور حیرانی سے مجھے دیکھ رہی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ نانا ابا بھی کافی نہال تھے کیونکہ وہ بار بار مجھے دیکھ دیکھ کر کھیسیں نکال رہے تھے۔ صرف چورکا نے منہ پھلا کے کہا:

''اس کے لئے آسان بات تھی ہی۔ اس کی نانی ڈائن جو ٹھیری!''

میرا بھائی کولیا صبح کے ستارے کی طرح چپکے سے بجھ گیا اور کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ نانی اماں، میں وہ ایک چھوٹے چھپر میں لکڑیوں کے ایک ڈھیر پر سوتے تھے، جس پر چیتھڑے بچھے رہتے تھے۔ دراڑوں سے بھری ہوئی دیوار کے دوسری طرف مکان دار کی مرغیاں رہتی تھیں، روز رات کو ہمیں مرغیوں کی آہٹ سنائی دیتی جو خوب کھا پی کر اپنے پر پھڑ پھڑاتیں اور کک کک کیا کرتیں۔ روز صبح کو ایک سنہری رنگ کا موٹا سا مرغا خوب زور سے گلا پھاڑ کر بانگ دیتا۔

''ارے تیری گردن مڑوڑوں!'' نانی اماں بڑبڑاتی ہوئی اٹھتیں۔

میں اٹھ چکا ہوتا اور لیٹا لیٹا دیوار کی دراڑوں میں سے دھوپ کی ابلتی ہوئی کرنیں دیکھتا رہتا تھا۔ روشنی کی کرنوں میں روپہلی ذرے اس طرح اچھلتے جیسے کسی پریوں کی داستان کے الفاظ۔ لکڑی کے ڈھیر میں چوہے سرسرا دھر دوڑتے پھرتے، ننھے سرخ سرخ کیڑے مکوڑے رینگتے پھرتے جن کے پروں پر سیاہ بندکیاں دکھائی دیتیں۔

بعض اوقات مرغیوں کی بیٹ سے ایسی بو اٹھتی تھی کہ دم گھٹنے لگتا اور اس سے بچنے کے لئے میں چھپر سے رینگ کر چھت پر چلا جاتا تھا۔ وہاں سے میں سب پڑوسیوں کو دیکھتا۔ وہ سو کر اٹھتے، لمبے چوڑے لوگ، آنکھیں پچی ہوئی اور نیند سے بوجھل، سوجھی ہوئی سی۔

ایک کھڑکی میں سے فیرمانوف ملاح کا الجھا الجھا سر جھانکتا۔ وہ بہت شراب پیتا تھا اور ہر وقت منہ بنائے رہتا تھا۔ اپنی سوجی ہوئی آنکھیں کے پپوٹوں وہ سورج کی طرف اٹھاتا اور سور کی طرح زور زور سے خرخر کرتا۔ نانا ابا تیز تیز چلتے ہوئے احاطے میں داخل ہوتے اور اپنے چھدرے سرخ بالوں کو دونوں ہاتھوں سے چپٹا کرتے ہوئے جلدی جلدی حمام میں گھس جاتے جہاں وہ ٹھنڈے پانی سے نہاتے۔ مکان دار کی زبان دراز باورچن اپنی لمبی ناک اور چھائیوں دار چہرے کی وجہ سے کوئل کی طرح لگتی۔ مکان دار موٹے بڈھے کبوتر کی طرح لگتا۔ ہر شخص کو دیکھ کر مجھ کسی پرندے یا کسی جانور کا خیال آتا۔

صبح اتنی صاف ستھری اور پیاری ہوتی تھی لیکن میرے دل پر کچھ بوجھ سا محسوس ہوتا تھا اور جی چاہتا کہ کھیتوں اور میدانوں میں بالکل تنہا نکل جاؤں۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ لوگ ایسی روشن صبح کو داغ دار کر لیتے ہیں۔

اسی طرح ایک دن میں چھت پر لیٹا ہوا تھا کہ نانی اماں نے مجھے آواز دی اور سر ہلا کر اپنے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے بولیں:

''کولیا مر گیا...''

ننھا سرخ چھینٹ کے تکیہ پر سے پھسل کر نمدے پر آ گیا تھا۔ اس کا سارا جسم ننگا اور نیلا تھا، قمیص گلے تک چڑھ گئی تھی، پھولا ہوا پیٹ اور پھنسیوں سے لدی ہوئی ٹانگیں دکھائی دے رہی تھیں، ہاتھ کمر کے پیچھے تھے، جیسے اس نے اٹھنے کی کوشش کی ہو، سر ایک طرف کو ذرا سا ڈھلکا ہوا تھا۔

ننھا سرخ چھینٹ کے تکیہ پر سے پھسل کر نمدے پر آ گیا تھا۔ اس کا سارا جسم ننگا اور نیلا تھا، قمیص گلے تک چڑھ گئی تھی، پھولا ہوا پیٹ اور پھنسیوں سے لدی ہوئی ٹانگیں دکھائی دے رہی تھیں، ہاتھ کمر کے پیچھے تھے، جیسے اس نے اٹھنے کی کوشش کی ہو، سر ایک طرف کو ذرا سا ڈھلکا ہوا تھا۔

''چلو اچھا ہی ہوا کہ ختم ہو گیا'' نانی اماں بالوں میں کنگھی کرتے کرتے کہنے لگیں۔ ''ایسا بیمار، کمزور، مریل بچہ کیسے زندہ رہ سکتا تھا؟''

نانا ابا اندر آئے، ننھے کے جسم کے چاروں طرف ٹہل ٹہل کر اس کی بند آنکھوں کو احتیاط سے چھونے لگے۔

نانی اماں تیز ہو کر بولیں:

''مت اس کو ہاتھ لگاؤ۔ تمہارے ہاتھ دھلے ہوئے نہیں ہیں!''

نانا ابا بڑبڑانے لگے:

''کیا یہ دنیا میں آیا... کیا کھایا... کیا جیا! سب بیکار۔ سب بیکار...''

نانی اماں نے بات کاٹی:

''سوچو تو ذرا کیا کہہ رہے ہو۔''

نانا ابا نے کھوکھلی نظروں سے ان کو دیکھا اور بولتے ہوئے باہر احاطے میں چلے گئے:

''تمہارا جو جی چاہے کرو۔ میرے پاس تو پیسے ہیں نہیں جو اس کا کفن دفن کروں...''

''اونہہ، بدبخت کہیں کا!''

میں باہر نکل گیا اور پھر شام کر واپس آیا۔

دوسرے دن صبح کرلیا کو دفنایا گیا۔ میں گرجے کے اندر نہیں گیا اور جب تک جنازے کی رسم اور دعائیں وغیرہ ہوتی رہیں، اپنی امی کی قبر کے پاس بیٹھا رہا۔ میری ماں کی قبر کو کھودا گیا کہ اسی میں میرے بھائی کو دفن کیا جاسکے۔ میرا کتا اور یاز کے والد میرے پاس بیٹھے رہے۔ انہوں نے قبر کی کھدائی برائے نام کی تھی اور مجھ سے برابر اس کے متعلق شیخی بگھارر ہے تھے:

''وہ صرف اس لئے کہ تم جو میرے دوست ہو ورنہ میں ایک روبل لیتا ہوں...''

جب میں نے اس پیلے گڑھے کے اندر جھانکا جس میں سے ناخوشگوار بو آرہی تھی تو ایک طرف سیاہ لکڑی کے نم تختوں پر نظر پڑی۔ میں ذرا سا بھی کھسکتا تھا تو ریت کی کیچڑ پھسلتی ہوئی اندر گڑھے میں گرتی تھی۔ میں جان بوجھ کر کھسکنے لگا تا کہ ریت سے تختے چھپ جائیں۔

یاز کے والد نے پائپ کے کش اڑاتے ہوئے کہا ''اولونڈے، دیکھ رہا ہوں تیری چال بازی۔ ہٹ ادھر کو۔''

نانی اماں ایک چھوٹا سا سفید تابوت لئے آئیں۔ ''سڑا گنوار'' گڑھے میں اترا، انکے ہاتھ سے تابوت لے لیا، نم تختے کے پہلو میں رکھا، پھر اچک کر باہر آیا اور پھاوڑے اور پاؤں سے مٹی اندر بھرنے لگا۔ اس کی پائپ میں سے عوددان کی دھواں پھوٹ رہا تھا۔ نانی اور نانا خاموشی سے اس کی مدد کرنے لگے۔ نہ کوئی پادری تھا، نہ فقیر تھے۔ بس چاروں طرف لگی ہوئی صلیبوں کے جمگھٹ میں ہم چار انسان تھے۔

نانی اماں نے چوکیدار کو پیسے دیتے ہوئے ذرا رنجیدہ لہجے میں کہا:

''مگر تم نے میری ورواراکی آرام گاہ کو چھیڑ دیا...''

''میں پھر کیا کرتا؟ ویسے پڑوسی کی بھی نہیں۔ اس میں کیا حرج ہے۔''

نانی اماں قبر کیپاس جھکیں، ناک سڑکی اور پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی چل پڑیں، ان کے پیچھے پیچھے نانا ابا اپنے گھسے ہوئے فراک کوٹ کو کھینچتے، ٹوپی سے اپنی آنکھیں چھپائے چل رہے تھے۔

نانی اماں قبر کے پاس جھکیں، ناک سڑکی اور پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی چل پڑیں، ان کے پیچھے پیچھے نانا ابا اپنے گھسے ہوئے فراک کوٹ کو کھینچتے، ٹوپی سے اپنی آنکھیں چھپائے چل رہے تھے۔

''آہ، ہم لوگوں نے بے جتی زمین میں اپنا بیج بویا،، وہ یکا یک بولے اور اس طرح جلدی سے ہم

لوگوں کے آگے چلتے گئے جیسے کوا کیاری سے اڑ جائے۔

''کیا کہا انہوں نے''میں نے نانی اماں سے پوچھا۔

''خدا جانے،ان کا تو سوچنے کا طریقہ ہی نرالا ہے''نانی اماں نے جواب دیا۔

گرمی ہوگئی تھی۔نانی اماں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے جارہی تھیں،ان کے پاؤں برابر گرم ریت میں گھستے جارہے تھے۔بار بار رک کر رومال سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتیں۔

میں نے بڑی ہمت کر کے پوچھا:

''وہ قبر کے اندر جو کالا کالا تھا کیا وہ امی کا تابوت تھا؟''

انہوں نے درشتی سے جواب دیا''ہاں۔وہ کمبخت کھوسٹ بے عقل گورکن...آہ،ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا ہے اور واریا کا جسم گل۔یہ سب ریت کی وجہ سے۔اس میں سے پانی چلا جاتا ہے نا۔چکنی مٹی اچھی رہتی ہے...''

''کیا ہر شخص گل جاتا ہے؟''

''ہر شخص!صرف اولیا ہی محفوظ رہ سکتے ہیں...''

''تو آپ کبھی نہیں گلینگی،نانی اماں!''

وہ رک گئیں اور میرے سر پر ٹوپی ٹھیک کر کے سنجیدہ آواز میں بولیں:

''جانے دو اس ذکر کو۔اس کے بارے میں سوچو ہی مت،سنتے ہو؟''

لیکن میں اپنے دل میں برابر سوچتا رہا کہ موت کتنی بھیانک اور کس قدر نفرت انگیز چیز ہے۔کس قدر نفرت انگیز!اور مجھے بہت ہی کوفت ہو رہی تھی۔

جب ہم لوگ گھر پہونچے تو نانا ابا نے پہلے ہی سے سماوار چڑھا دیا تھا اور میز پر برتن لگا دئے تھے۔

''ہم لوگ چائے پی لیں،ذرا سی،بڑی گرمی ہے...''وہ بولے''میں اپنی چائے بنائے لیتا ہوں۔سب کے لئے۔''

پھر وہ نانی اماں کے پاس پہونچے اور ان کے کندھے تھپتھپا کے بولے:

''کیوں امی،کیا کہتی ہو؟''

نانی اماں نے ہاتھ ہلایا''کیا کہوں۔کہنے کو کیا رہ گیا ہے!''

''ہاں یہی بات ہے، خدا ہم پر اپنا قہر نازل کر رہا ہے۔ ذرا ذرا کر کے وہ ہمارے چیتھڑے بکھیرے دے رہا ہے... کاش کہ خاندان اس طرح اکٹھے مل کر رہ سکتے جیسے ہاتھوں کی انگلیاں...''

بہت دنوں سے میں نے ان کو اتنی نرمی اور سکون سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ میں ان کی بات غور سے سننے لگا کہ شاید اس سے مجھے کچھ تسکین مل، شاید میں اس گڑھے کو اور اس میں سے جھانکتے ہوئے ان سیاہ لکڑی کے ٹکڑوں کو بھول سکوں۔

لیکن نانی اماں نے سختی سے ان کی بات کاٹ دی:

''بس کرو ابا! چپ بھی رہو۔ ساری زندگی تم بات اسی طرح کی کرتے رہے مگر اس سے کس کو کیا فائدہ ہوا؟ عمر بھر لوگوں کو کھاتے رہے جیسے زنگ لوہے کو کھا جاتا ہے...''

نانا ابا نے غرائی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور چپ ہو رہے۔

میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ شام کو پھاٹک پر پہونچ کر لودمیلا سے بیان کیا۔ لیکن ایسا لگا کہ اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔

کہنے لگی ''یتیم ہونا کہیں بہتر ہے۔ اگر میرے ماں باپ مر جائیں تو میں اپنی ننھی بہن کو بھائی کے حوالے کر کے خود زندگی بھر کے لئے خانقاہ چلی جاؤں۔ اور کر ہی کیا سکتی ہوں؟ میں لنگڑی ہوں، کام کاج کر ہی نہیں سکتی، اس لئے شادی تو ہوگی ہی نہیں۔ اگر شادی ہوگی تو کون جانے لنگڑے بچے پیدا ہوں...''

وہ گلی کی بڑی بوڑھیوں کی طرح بات بڑی عقلمندی کی کرتی تھی۔ لیکن اسی شام کو وہ میرے دل سے کچھ اتر سی گئی۔ واقعی اس وقت سے میری زندگی کچھ ایسی ہوگئی کہ اس سے شاذ ہی کبھی ملاقات ہوتی تھی۔

میرے بھائی کے انتقال کے چند دن بعد میرے نانا ابا نے مجھ سے کہا:

''آج ذرا جلدی سو جانا، صبح تڑکے تمہیں اٹھاؤں گا۔ جنگل میں چلیں گے، لکڑیاں لانے...''

''اور میں جڑی بوٹیاں اکٹھی کروں گی'' نانی اماں نے اعلان کیا۔

ہماری بستی سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر فر اور برچ کے جنگل تھے اور وہاں درختوں کی ڈالیاں اور پھوسرے گرے پڑے تھے۔ ایک طرف اس جنگل کے ڈانڈے دریائے اوکا سے ملتے تھے، دوسری طرف اس شاہراہ سے ملتے تھے جو ماسکو جاتی تھی اور شاہراہ سے آگے وہیں پھوسروں کے نرم بچھونے کے

بیچوں بیچ میں دیودار کا ایک جھنڈ تھا، اوپر کو سر اٹھائے جیسے کوئی سیاہ خیمہ نصب کیا گیا ہو۔ اس جھنڈ کا نام ''ساویلوواایال'' تھا۔

یہ ساری جائداد کونٹ شوواالوف کی تھی، اور اس کی دیکھ بھال اچھی طرح نہیں ہوتی تھی۔ کوناوینوبستی کے رہنے والے اس جنگل کو اپنا ہی مال سمجھتے تھے اور وہاں سے جھاڑوئیں، لکڑیاں اٹھا لاتے، سوکھے یا بعض اوقات ہرے بھرے پیڑ بھی کاٹ لایا کرتے تھے۔ خزاں کے موسم میں بیسیوں ہی آدمی ہاتھوں میں کلہاڑیاں لئے کمروں میں رسیاں باندھے، اس جنگل میں جا پہونچتے اور جاڑوں کے لئے ایندھن جمع کر کے لاتے۔

صبح تڑکے کا وقت تھا، ہم تینوں کھیتوں میں سے ہو کر گزرے جہاں سبزی پر شبنم نے چاندی بچھا رکھی تھی۔ دریائے اوکا پر سے، دیاتلوف پہاڑوں کی کھردری قطاروں کے اوپر، نیژنی نووگورود کے سفید مکانوں، سبز باغوں اور سنہرے گنبدوں کے اوپر سست گام روسی سورج آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا۔ دھندلے اور خاموش دریائے اوکا کی طرف سے ہلکی ہلکی خواب آلود ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ سنہرے پھول شبنم سے بھاری ہو کر اپنے سر ہلا رہے تھے۔ سنہرے پھول شبنم سے بھاری ہو کر اپنے سر ہلا رہے تھے۔ اودے اودے گھنگھرو جیسے پھول ساکت وصامت زمین پر سر جھکائے ہوئے تھے۔ رنگ برنگے پھول نما ڈنٹھل سخت اور ناساز گار زمین کو پھوڑ کر اپنا سر اوپر اٹھا رہے تھے۔ ''رات کی رانی'' ستاروں کی طرح جھلملا رہی تھی...

گھنا اور تاریک جنگل ہماری طرف بڑھتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ فر کے درخت بڑے بڑے پرندوں کے سر لگتے تھے۔ برچ کے بلند پیڑ جیسے دوشیزائیں کھڑی ہوں۔ دلدل کی کھٹی بو کھیتوں پر تیرتی ہوئی ہے۔ میرا کتا جو اپنی گلابی سی زبان نکالے ہوئے میرے ساتھ چل رہا تھا، رک گیا۔ ادھر ادھر اس نے کچھ سونگھنے کی کوشش کی اور اپنے لومڑی جیسے سر کو یوں ہلانے لگا جیسے کسی تذبذب میں پڑ گیا ہو۔

نانا ابا نانی اماں کا گرم جیکٹ اور ایک پرانی سی بغیر پھندنے والی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ اپنے پتلے پاؤں کو وہ آہستہ آہستہ چپکے چپکے بڑھا رہے تھے اور خود ہی مسکراتے جا رہے تھے جیسے کسی کو لپک کر دبوچنا چاہتے ہوں۔ نانی اماں نیلا بلاؤز اور سیاہ سایہ پہنے تھیں، سر پر ایک سفید رومال باندھے تھیں اور اتنی پھرتی سے لڑھکتی جا رہی تھیں کہ ان کا ساتھ دینا مشکل تھا۔

ہم لوگ جتنا ہی جنگل کے قریب ہوتے گئے اتنا ہی نانا ابا میں جان آتی چلی گئی۔ خرخر کرتے، سونگھتے، وہ لمبی لمبی سانسیں کھینچتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ پہلے تو کچھ بھٹکتی ہوئی ادھر ادھر کی بات ہوتی رہی جو کچھ سمجھ میں آئی کچھ نہ سلسلہ جاری کر دیا جیسے نشے کے سرور میں ہوں۔

''جنگلات خدا کا باغ ہوتے ہیں۔ کسی نے ان کو لگایا نہیں، ہوا ہی ان کو پیدا کرتی ہے، وہی ان کی باغبان ہے، وہ ہوا جو پروردگار کے لبوں کی پاکیزہ سانس ہوتی ہے، آہ! الیکسئی تم بھلا وہ کیا دیکھو گے جو ہم نے دیکھا! وہ میری جوانی کا زمانہ تھا جب میں دریا کے کنارے کنارے کشتیاں کھینچا کرتا تھا، ژیگولی میں وہاں ہوتا تھا لطف! دریائے اوکا کے کنارے موروم سے لیکر کاسیموف تک جنگل ہی جنگل تھے، یا والگا سے پرے۔ جنگل تھے کہ بس اورال تک چلتے ہی چلے جاتے تھے! ایک لامتناہی معجزہ سا لگتا تھا!..''

نانی اماں نے اپنی بھوؤں کے نیچے سے مجھ پر نظر ڈالی اور آنکھ ماری۔ نانا ابا بات کو ٹھیلتے رہے، گھاس پھوس میں اٹکتے وہ خشک الفاظ کی مٹھّیاں بھر بھر کر بکھرتے جاتے۔ الفاظ جو گر گر کر میرے ذہن میں جڑ پکڑتے جاتے۔

''ہم لوگ ساراتوف سے ایک کشتی کھینچ رہے تھے جس میں سورج مکھی کے بیجوں کا تیل لدا ہوا تھا۔ میلہ لگا تھا نا یوم ماکار کے موقعہ پر، تو وہیں بھیجا جا رہا تھا۔ ہمارے ساتھ ایک تو اسٹنٹ تھا جس کا نام کیریلو تھا۔ وہ پوریخ کا رہنے والا تھا۔ ایک تاتاری بھی تھا جو کشتی میں سے پانی نکالنے کا کام کرتا تھا، وہ کاسیموف کا رہنے والا تھا، اس کا نام آصف تھا... ہاں دیکھو اگر میں بھول نہ گیا ہوں تو ہاں، غالبًا آصف ہی نام تھا۔ بہر حال جب ہم لوگ ژیگولی پہنچے تو ہوا الٹی چلی رہی تھی۔ افوہ، بس سمجھو! ساری طاقت جواب دے گئی، ہم لوگ بس ہانپتے منہ کھولے ٹھپ رہ گئے۔ اس لئے ہم لوگ کو رکنا پڑا۔ پھر کنارے پر دلیہ پکایا گیا۔ مٹی کا مہینہ تھا اور والگا سمندر کی طرح تھا اور ہزاروں جھاگ بھری لہریں اس میں اس طرح سواری کر رہی تھیں جیسے راج ہنسوں کے دل کے دل ہوں اور کاسپین سمندر کی طرح چلی جا رہی تھیں۔ ژیگولی کے پہاڑ بہار سے سرسبز، آسمان سے باتیں کر رہے تھے، اور آسمان کی بلندیوں پر سفید بادل ادھر ادھر تیرتے پھر رہے تھے، اور سورج زمین پر سونا برسا رہا تھا۔ تو ہم لوگوں نے آرام کی، نظاروں کا لطف اٹھایا اور اس نشے سے خوب سیراب ہوئے۔ دل معلوم ہوتا تھا کہ بس پگھل جائیں گے۔ دریا پر سردی تھی، شمالی ہوا چل رہی تھی لیکن کنارے پر خوشگوار گرمی تھی اور خوشبوئیں بکھر ہوئی تھیں! شام کے وقت جو وہ ہمارا کیریلو تھا نا، ویسے تو

وہ بڑا اسنجیدہ سا کسان تھا۔ عمر بھی پکی تھی اس کی۔ پر وہ کیا کرتا ہے کہ بس اٹھ کھڑا ہوتا ہے، ٹوپی اتارتا ہے اور کہتا ہے: ''اچھا، نوجوانو، اب نہ میں تمہارا مالک، نہ میں تمہارا نوکر، یہاں سے اب تم لوگ اکیلے ہی جاؤ۔ میں تو جنگلوں کو چلا۔'' ہم لوگ منہ کھولے بیٹھے رہ گئے، ایسی بات نہ کبھی کسی نے دیکھی نہ سنی! جب تک کوئی سردار نہ ہو کبھی کسی نے دیکھی نہ سنی! جب تک کوئی سردار نہ ہو جو مالک کے سامنے ہماری طرف سے جواب دہ ہو، تب تک ہم لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔ آخر لوگ کسی رہبر کے بغیر تو نہیں بھاگتے پھرتے! وہاں تو والگا بھٹکنے کو تو سیدھے راستوں پر بھی بھٹک جاتے ہیں۔ اور انسان جانوروں میں سب سے وحشی ٹھہرا۔ کہاں جا کر دم لے۔ کیا معلوم! تو ہم لوگ بے حد ڈر گئے لیکن وہ اڑا رہا: ''میں تمہارا چرواہا بننا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ زندگی پسند نہیں میں تو چلا جنگل کو!'' ہم میں سے ایسے بھی تھے جنہوں نے سوچا کہ اس کو پکڑ کر پیٹیں اور باندھ کر لے چلیں مگر اور لوگ اس کا ساتھ دینے والے بھی تھے، وہ چیخنے لگے: ''خبردار، رک جاؤ!'' اور تاتاری ملاح نے تو کہا کہ ''میں بھی اس کے ساتھ جا رہا ہوں!'' یہ تو واقعی بہت برا ہوا۔ اس کے دو پھیروں کے پیسے مالک پر چڑھے ہوئے ہیں، یہ پھیرا ابھی آدھا ہو چکا تھا۔ اور اس زمانے میں اتنے پیسے بھی بہت ہوتے تھے۔ رات ہونے لگی اور ہم لوگ چیخ چیخ کر بگڑتے رہے۔ لیکن جب رات آ گئی تو ہم میں سے سات نکل بھاگے اور ہم پندرہ سولہ آدمی رہ گئے۔ لو یہ رہا تمہارا جنگل!''

''ممکن ہے ڈاکو بنا چاہتے ہوں، ممکن ہے درویش۔ ان دنوں میں لوگ ان دونوں باتوں میں کوئی خاص فرق نہیں کرتے تھے...''

نانی اماں نے یہ سن کر اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا:

''آہ خدا کی ماں! جب لوگوں کا خیال کرو تو دل خون ہونے لگتا ہے۔''

''لیکن انسان کو خدا نے اتنی عقل تو دی ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ شیطان اسے کدھر بہکائے لئے جا رہا ہے...''

ہم لوگ ایک بھیگی ہوئی پگڈنڈی سے جنگل کے اندر داخل ہوئے۔ اس راستے کے ایک طرف دلدل سی تھی جس میں مٹی کے ڈھونکے بن گئے تھے، اور دوسری طرف مرجھائی ہوئی فر کی جھاڑیاں تھیں۔ مجھے خیال آیا کہ اگر پوریخ والے کیریلو کی طرح ہمیشہ کو جنگل میں گھس جایا جائے تو کتنا اچھا ہو۔ نہ وہاں باتونی لوگ تھے، نہ آپس کی لڑائیاں اور جھگڑے تھے، نہ شراب پی پی کر غرانے کی آوازیں تھیں۔ اپنے نانا

کے لالچ کو بھلایا جا سکتا تھا، ماں کی ریتیلی قبر بھی بھلائی جا سکتی تھی۔ ہر اس چیز سے نجات مل سکتی تھی جس سے انسان کو تکلیف پہونچتی ہے اور جو دل پر بوجھ بن کر بیٹھی رہتی ہے۔

جب ہم لوگ ایک خشک حصے پر پہونچے تو نانی اماں نے کہا:

''لو بھئی اب کچھ دونوالے کھانے کا وقت آ گیا ہے۔ آؤ بیٹھ جاؤ!''

انہوں نے اپنی ٹوکری میں سے جئی کی روٹی نکالی، سبز پیاز، کھیرے، نمک اور گھر کی بنی ہوئی پنیر۔ نانا ابا ان سب چیزوں کو گھور کر آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولے:

''اور سوچو تو ذرا۔ میں تو تو کچھ نہیں لایا...''

''یہ ہم سب کے لئے کافی ہے...''

ایک لانبے، سرخی مائل سیاہ دیوار کے تنے سے پیٹھ ٹیک کر ہم سب بیٹھ گئے۔ ہوا میں رال کی خوشبو بسی ہوئی تھی، کھیتوں کی طرف سے نرم نرم ہوا بہتی ہوئی آ رہی تھی جس سے گھاس کی کمر دوہری ہوتی جاتی تھی۔ نانی اماں اپنا سانولا ہاتھ بڑھا کر طرح طرح کی جڑی بوٹیاں توڑنے لگیں اور مجھے بتانے لگیں۔ یہ کیسی ہے اس میں فلاں فلاں مرض کو اچھا کرنے کی خاصیت ہے، یہ سینٹ جانس کی بوٹیاں توڑنے لگیں اور مجھے بتانے لگیں۔ یہ کیسی ہے اس میں فلاں فلاں مرض جادو کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔

نانا ابا جھاڑیوں کو نیچے نیچے سے کاٹتے اور میں ان کو ایک جگہ پر ڈھیر کرتا جاتا لیکن پھر بھی نانی اماں کے پیچھے جھاڑیوں میں چپکے چپکے گھس گیا۔ وہ آگے بڑھ کر بڑے بڑے درختوں کے تناور تنوں کے درمیان اس طرح نرم قدموں سے چل رہی تھیں جیسے تیر رہی ہوں، کانٹوں سے بھری ہوئی زمین پر جھکتیں جیسے پانی میں غوطہ لگا رہی ہوں اور اپنے آپ بدبداتی جاتیں:

''امسال چھتریاں ذرا جلدی ہی نکل آئی ہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ کم ہونگی۔ اے پروردگار، اس طرح تو غریبوں کا کائی بھلا نہیں کر رہا ہے۔ جن کے پاس کچھ کھانے کو نہیں ان کے لئے تو یہ چھتریاں ہی نعمت ہیں!'' میں دبے پاؤں ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس بات کی سخت کوشش کرتا رہا کہ ان کو دکھائی نہ دوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جو باتیں وہ سبزہ سے، مینڈکوں سے اور اپنے پروردگا سے کر رہی تھیں، ان کے آڑے آؤں...

لیکن انہوں نے مجھے دیکھ ہی لیا۔

’’کیوں، نانا ابا کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے ہیں؟‘‘

پھر وہ سیاہ مٹی پر جھک گئیں جو سبز پودوں کے لباس پہنے ہوئے تھی اور مجھے بتاتی جاتی تھیں کہ ایک مرتبہ پرودرگار کو انسانوں پر اتنا غصہ آیا تھا کہ اس نے زمین کو پانی سے بھر دیا اور تمام جانداروں کو اس میں غرق کر دیا۔

’’لیکن پرودرگار کی مقدس ماں کو بس اتنی مہلت مل گئی کہ انہوں نے اپنی ٹوکری میں ہر طرح کے بیج اکٹھے کر لئے اور چھپا دئے۔ پھر جب سیلاب ختم ہو گیا تو وہ سورج کے پاس گئیں اور کہا کہ اتنی بھلائی کی کہ زمین کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک سکھا دے اور نیک بندے ہمیشہ تیرے لئے دعائیں کریں گے اور تیری تعریف کریں گے! چنانچہ سورج نے زمین سکھا دی اور انہوں نے اپنے چھپائے ہوئے بیج بو دئے۔ اب جو خدا دیکھتا ہے تو زمین پر یہاں سے وہاں تک تمام ہریالی ہے اور سبزہ ہے اور مویشی ہیں اور انسان ہیں!... تو اس نے کہا کہ میری مرضی کے خلاف اپنی مرضی چلانے والا ایسا کون ہے؟ تن اس کی مقدس ماں نے اقرار کیا۔ لیکن پرودرگار خود دنیا کو ایسا اجاڑ دیکھ کر بہت غم گین اور پشیمان تھا اور اس نے اپنی ماں سے کہا کہ اے ماں تو نے جو کچھ بھی کیا بہت ٹھیک کیا، بہت ہی اچھا کیا!‘‘

مجھے یہ کہانی تو پسند آئی لیکن اس پر ذرا تعجب ہوا سنجیدگی سے بولا ’’کیا سچ مچ ایسا ہوا تھا؟ کنواری ماں تو سیلاب کے بہت عرصہ بعد پیدا ہوئی تھیں۔‘‘

اب حیران ہونے کی نانی کی باری تھی:

’’تجھ سے کس نے کہی ایسی بات؟‘‘

’’اسکول میں معلوم ہوئی۔ کتاب میں جو لکھی ہے...‘‘

ان کے دل کو تسکین ہوئی۔ انہوں نے مجھے صلاح دی:

’’کتاب کی باتیں چھوڑ دے۔ کتابوں میں تو جانے کیا انا لپ شناپ لکھ دیتے ہیں!‘‘

پھر وہ بڑے مزے میں ہنسیں ’’سوچو تو ذرا ایسی بات بتانا بھلا، بیوقوف کہیں کے! جیسے خدا بغیر ماں کے ہو سکتا تھا۔ پھر آخر خدا کو کس نے جنم دیا؟‘‘

پتہ نہیں۔‘‘

’’یہ بات ہے۔ بس ’’پتہ نہیں‘‘ سیکھا ہے!‘‘

''لیکن پادری صاحب نے تو بیان کیا تھا کہ پاک مریم آننا اور جوشم کی بیٹی تھیں۔''

بس پانی سر سے اونچا ہو گیا! نانی اماں نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور کہا:

''تو گریا یوں کہو کہ وہ ماریا جو جوشمو فنا تھیں! اگر ایسی باتیں سوچے گا تو مار مار کے چمڑا لال کر دوں گی!''

پھر ایک منٹ بعد سمجھانے کے انداز میں بولیں:

''پاک مریم ہمیشہ سے ہیں۔ سب سے پہلے وہی وجود میں آئیں۔ خدا کو انہوں ہی نے جنم دیا اور پھر...''

''اور یسوع مسیح؟''

نانی اماں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

مجھے نظر آ گیا کہ فتح میری ہو گئی تھی۔ میں نے نانی اماں کو خدائی گورکھ دھندے میں چکرا دیا تھا۔ خود مجھے اس سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

سورج کی سنہری کرنیں چاروں طرف چھائی ہوئی نیلی کہر کو چیرتی چلی گئیں تھیں اور ہم لوگ جنگل میں اور آگے بڑھتے گئے۔ نرم گرم جنگل کی اپنی ایک الگ آہٹ سی ہوتی ہے۔ ایک ایسی آہٹ جو خواب کی طرح ہوتی ہے، جو تصور کو پر لگا دیتی ہے۔ دھوبن چڑیوں کا ٹوٹیں ٹوٹیں کرنا، پدیوں کا چہچہانا، کوئلوں کی خندہ زنی، میناؤں کی سیٹیاں، سنہری پری تھی کہ سب کے مقابلے پر اپنا گیت برابر گائے چلی جا رہی تھی، دیوار کی پری آہستہ آہستہ اپنی نغمہ سرائی میں مصروف تھی جیسے کچھ سوچتی جاتی ہو اور گاتی جاتی ہو۔ زمردیں رنگ کے مینڈک ہمارے پیروں کے نیچے پھدکتے پھرتے، ایک گھاس کے سانپ نے جڑوں کے نیچے اپنی پناہ گاہ سے زرد پھن اٹھایا۔ ایک گلہری اپنے ننھے دانت کٹکٹاتی، جھاڑو سی دم کی جھلکی دکھاتی، دیودار کی ٹہنیوں میں غائب ہو گئی۔ دیکھنے میں بے شمار چیزیں آتی جاتی تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اور بہت کچھ دیکھنے کو، اور بہت کچھ پانے کو دل تڑپ رہا ہے۔

دیودار کے تنوں کے درمیان بڑے بڑے لوگوں کے شفاف اور ہوائی ہیولے نظر آتے ہیں اور پھر ہر پتوں میں غائب ہو جاتے ہیں، اور ان کے درمیان سے نیلا اور چاندنی جیسا آسمان دکھائی دیتا ہے۔ پاؤں تلے کائی کا آرام دہ اور سبز قالین بچھا تھا جس پر گوندنیوں کے نقش و نگار کڑے ہوئے تھے اور ہار کشیدہ

کئے ہوئے تھے، سرخ سرخ جھڑ بیری کے دانے خون کے قطروں کی طرح گھاس پر دمک رہے تھے اور سانپ کی چھتریوں کی لطیف خوشبو مشام جاں کر فرحت بخش رہی تھی۔

نانی اماں نے ٹھنڈی سانس بھری ''آہ، پاک مریم اے کائنات کو نور بخشنے والی!''

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نانی اماں اس جنگل کی رانی ہیں اور جنگل کا وجود ان ہی کے لئے ہے۔ وہ ایک سی ریچھنی کے مانند چلی جا رہی تھیں، ہر چیز پر نظر ڈالتی، ہر چیز سے لطف لیتی اور شکرانے کے الفاظ بدبداتی ہوئی۔ جیسے ان کے وجود سے زندگی کی حرارت نکل نکل کر جنگل میں جذب ہوتی جا رہی ہو۔ اور جب کبھی ان قدموں کے نیچے گھاس دبتی اور قدم اٹھانے کے بعد سر اٹھاتی تو میرا دل خوشی سے بھر جاتا۔

چلتے چلتے میں سوچتا جا رہا تھا: کتنا اچھا ہوتا جو میں ڈاکو ہوتا اور کنجوس امیروں سے دولت لوٹ لوٹ کر غریبوں کو دیتا! کاش سب لوگوں کے پاس پیٹ بھر کھانے کو ہوتا، ان کو خوشی نصیب ہوتی تو کوئی کمینے کتوں کی طرح ایک دوسرے پر نہ بھونکتا، ایک دوسرے سے نہ جلتا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں نانی اماں کے خدا اور ان کی پاک مریم سے جا کر سب حال سچ سچ بتا سکتا کہ لوگ کس قدر مصیبت سے زندگی گزارتے ہیں، کس بری طرح وہ ایک دوسرے کو ہولناک ریت میں دفن کرتے اور دنیا میں کتنا غم ہے جو بے ضرورت ہے! اور اگر پاک مریم کو یقین دلا سکوں تو پھر وہ مجھے ایسی قدرت بخش دیں کہ میں سب باتوں کو یک قلم بدل سکوں اور ان کو بہتر بنا دوں۔ لوگ میری باتیں سنیں اور اس کا یقین کریں اور میں بہتر زندگی کا راستہ ڈھونڈ لوں۔ اگر میں بچہ ہوں تو کیا ہوا۔ آخر جب بیت المقدس میں بڑے بڑے عالموں نے یسوع مسیح کی بات سنی اور قبول کی تھی تب وہ مجھ سے ایک سال تو بڑے تھے۔

ایک بار میں ان باتوں کو سوچتے سوچتے اتنا کھو گیا کہ ایک گہرے گڈھے میں جا پڑا۔ ایک سوکھی شاخ سے میرا پہلو چھل گیا، گدی کی کھال بھی چھل گئی۔ گڈھے کی تہہ میں سرد اور چپچپے کیچڑ میں بیٹھے بیٹھے مجھے یہ سوچ کر بڑی شرم آئی کہ میں خود گڈھے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اور یہ بھی جی نہیں چاہتا تھا کہ آواز دے کر نانی اماں کو گھبراؤں لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

نانی اماں نے مجھے جھٹ سے باہر کھینچ لیا، اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور بولیں:

''خدا کا شکر ہے! خیریت گذری کہ گڈھا خالی تھا اگر اس میں کہیں ریچھ ہوتا تو؟..''

اور روتے روتے ہنسنے لگیں۔ پھر وہ مجھے چشمے تک گئیں، پانی سے مجھے دھویا، کٹی ہوئی جگہوں پر درد

کھینچنے کے لئے کچھ خاص پتے چپا دئے، اپنے بلاؤز سے ان کو باندھا اور ایک ریلوے چوکیدار کی کوٹھری میں لے جا کر لٹایا کیونکہ میں اتنی کمزوری محسوس کر رہا تھا کہ چل نہیں پا رہا تھا۔

قریب قریب میں روز ہی نانی اماں سے کہتا:

''آ ئے جنگل چلیں!''

اور وہ بڑی خوشی سے راضی ہو جاتیں۔ گرمیوں بھر، خزاں کے آخر تک ہم دونوں اسی طرح اپنا وقت گذارا کرتے۔ جڑی بوٹیاں، گوندنیاں، چھتریاں اور مونگ پھلیاں جمع کیا کرتے۔ ہم لوگ جو کچھ جمع کرتے وہ نانی اماں بیچ دیا کرتیں اور اسی پیسے میں ہم دونوں بسر کرتے۔

نانا ابا بھنبھنایا کرتے ''مفت خورے!'' حالانکہ ہم لوگ ان کے کھانے کو کبھی بھی ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔

جنگل میں جانے سے مجھے اپنے وجود میں سکون اور صحت کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ اس احساس سے میرے بہت سے دکھوں کو تسکین ملی اور بہت سی تلخیوں کو میں نے بھلایا۔ ساتھ ہی مجھ میں مشاہدے کا خاص شوق پیدا ہو گیا، دیکھنے اور سننے کی اہلیت تیز ہو گئی، حافظ مضبوط ہو گیا اور ان تاثرات کا دائرہ بہت وسیع۔

اپنی نانی اماں کے متعلق میری حیرانی پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ویسے بھی میں ان کو باقی تمام لوگوں سے برتر سمجھتا تھا۔ وہ میرے لئے دنیا میں سب سے زیادہ عقل منداور سب سے زیادہ مہربان ہستی تھیں اور ان کے متعلق میرا یہ یقین اور بھی پختہ ہوتا چلا گیا۔ ایک شام جب ہم لوگ چھتریاں جمع کر کے گھر جا رہے تھے اور جنگل کے بالکل سرے پر پہنچے تو نانی اماں دم لینے کے لئے بیٹھ گئیں اور میں اس امید میں ایک طرف کو کھسک لیا کہ شاید کچھ چھتریاں اور مل جائیں۔

یکا یک میں نے ان کو کسی سے بات کرتے سنا، مڑ کر دیکھا کہ وہ بڑے اطمینان سے پگڈنڈی پر بیٹھی، جمع کئے ہوئے چھتریوں کی جڑیں صاف کر رہی ہیں اور ان کے پاس ایک دبلا پتلا بھورا سا کتا زبان لٹکائے کھڑا ہے۔

''جاؤ بھی، جاؤ بس اب، جاؤ! جا اپنی راہ لے!''

ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ والیوک نے میرے کتے کو زہر دیکر مار ڈالا تھا، میرا جی چاہا کہ اس نئے کتے کو اپنے ساتھ لے چلوں۔ چنانچہ میں واپس بھاگ کر پگڈنڈی پر پہنچ گیا، کتے نے ایک عجیب

طریقے سے کمر ٹیڑھی کی، سر نہیں موڑا، پھر مجھے بڑی ہی بے اعتنائی کے ساتھ اپنی بھوکی سبز آنکھوں سے گھورا اور پچھلی ٹانگوں میں دم دبا کر بھاگا جنگل کی طرف۔ اس کی چال کتوں کی طرح نہیں تھی اور جب میں نے سیٹی بجائی تو اور زور سے بھاگتا ہوا جھاڑیوں میں گھس گیا۔

''کیوں، دیکھا؟'' نانی اماں مسکرا کر بولیں ''پہلے تو میں بھی سمجھی کہ کتا ہے، پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو پھر بھیڑیوں کے سے دانت اور گردن بھی! میں تو بالکل ہی ڈر گئی، تو پھر میں بولی ''اچھا بھئی، تم بھیڑیئے ہی سہی مگر بہتر یہی ہے کہ چلے جاؤ! خوش قسمتی سے گرمی میں بھیڑیئے اتنے بپھرے ہوئے نہیں ہوتے...''

نانی اماں جنگل میں راستہ کبھی نہیں بھولتی تھیں، بھٹکے بغیر ہمیشہ گھر کا راستہ ڈھونڈ نکالتی تھیں۔ جڑی بوٹیوں کو سونگھ کر پتہ چلا لیتی تھیں کہ کس قسم کی چھتریاں کہاں اگتی ہیں اور کس قسم کی کہا۔ اکثر میری معلومات کا امتحان لیتیں:

''لال رنگ کی چھتریاں کون سے درخت کے نیچے اگتی ہیں؟ اچھی، اور زہریلی چھتریوں کی کیا پہچان ہے؟ کون سی چھتریاں جھاڑیوں میں چھپی رہتی ہیں؟''

درخت پر ایک ذرا سا کھرونچا دیکھتیں تو گلہری کے جھونجھ کا پتہ لگا لیتیں، پھر میں درخت پر چڑھتا اور اس میں سے جاڑوں کے لئے جمع کی ہوئی مونگ پھلیاں انڈیل لیتا۔ کبھی کبھی تو پانچ پانچ سیر مونگ پھلیاں اس طرح جمع کی ہوئی ملتیں!

ایک مرتبہ میں ایسے کام میں مصروف تھا کہ ایک شکاری کے ستائیس چھرے میرے دھنے پہلو میں بیٹھ گئے۔ نانی اماں نے ان میں سے گیارہ تو سوئی سے کھود کھود کر نکال دئے اور باقی جو تھے وہ کئی سال تک میری جلد کے نیچے اٹکے رہ گئی اور وقتاً فوقتاً خود ہی نکل آئے۔

جب کبھی میں بہادری سے درد برداشت کرتا تو نانی اماں کو بڑی مسرت ہوتی۔ کہتیں ''شاباش بیٹا، ایک مرتبہ درد برداشت کیا تو سمجھو میدان مار لیا۔''

جب کبھی سانپ کی چھتریوں یا مونگ پھلیوں کے بکنے سے کچھ فاضل پیسے مل جاتے تو نانی اماں گھروں کی کھڑکیوں پر اپنی ''چپکے کی خیرات'' رکھنا شروع کر دیتی۔ حالانکہ خود ان کے چیتھڑے لگے رہتے، تہواروں پر بھی پیوند لگے کپڑے پہنتیں۔

نانا ابا بڑبڑایا کرتے ''بھکارن سے بھی بدتر لپیٹے پھرتی ہے، فقیروں کی طرح! میرا نام ڈبوتی ہے۔''

''کوئی بات نہیں، میں تمہاری بیٹی تو نہیں ہوں، کوئی کنواری تو نہیں ہوں، کوئی مجھے بیاہنے تو نہیں آرہا ہے نا!''

اب نانا ابا اور نانی اماں میں اکثر جھگڑا ہوا کرتا تھا۔

نانا ابا اپنی مصیبتوں کا رونا روتے ہوئے کہتے ''آہ، میں نے آخر اوروں سے زیادہ کیا گناہ کیا ہے مگر مجھ دوسروں سے زیادہ بھگتان بھگتنی پڑتی ہے۔''

پھر نانی اماں ان کو چھیڑتیں:

''شیطان خوب پہچانتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے!''

جب میں اور نانی اماں اکیلے ہوتے تو مجھ سے کہتیں:

''یہ بڑے میاں شیطان سے بے حد ڈرتے ہیں! اسی سے ڈرتے ڈرتے تو دیکھو صورت پر کیسا کھوسٹ پن برسنے لگا ہے، بیچارہ!...''

جنگل میں گرمیاں بسر کرنے سے میرے جسم میں تو کافی طاقت آگئی لیکن میں کم آمیز ہو گیا۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی اور لودمیلا کی سمجھداری سے میں اکتانے لگا...

ایک دن نانا ابا شہر سے واپس آئے تو پانی میں شرابور۔ خزاں کے دن شروع ہو گئے تھے اور بارش ہو رہی تھی۔ دہلیز پر انہوں نے چڑیے کی طرح اپنے جسم کو پھڑ پھڑایا اور نہایت فتح مندی کے انداز میں بولے:

''اچھا، کاہل الوجود، اب کل سے تمہیں کام پر جانا ہوگا!''

''کہاں؟'' نانی اماں نے چڑھ کر پوچھا۔

''تمہاری بہن ماتریونا کے یہاں۔ اس کے بیٹے کے ساتھ کام کرے گا...''

''اوہ، بری جگہ ڈھونڈی تم نے!''

''چپ رہ، کھوسٹ بڑھیا! ممکن ہے کام سکھا کر وہ اس کو نقشہ نویس بنا دیں۔''

تب نانی اماں نے سر جھکا لیا اور ایک لفظ نہیں بولیں۔

شام کو میں نے لودمیلا کو بتایا کہ اب میں شہر جا کر رہوں گا۔

اس نے ذرا سوچ کر جواب دیا ''اب تو مجھے بھی وہاں لے جا کر رہوں گا۔

اس نے ذرا سوچ کر جواب دیا ''اب تو مجھے بھی وہاں لے جایا جائے گا۔ ابا کہتے ہیں کہ ٹانگ کاٹ دی جائے گی، سنتے ہیں کہ کٹ جائے گی تو ٹھیک رہے گا۔''

اس موسم گرم میں وہ کچھ دبلی ہو گئی تھی۔ چہرہ کچھ نیلا ہو گیا تھا اور آنکھیں اور بڑی بڑی لگنے لگی تھیں۔

''تمہیں ڈر لگتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں'' اس نے جواب دیا اور چپکے چپکے رونے لگی۔

میں اس کو بہلانے کے لئے کیا کہتا۔ شہر کی زندگی سے مجھے خود ہی ڈر لگتا ہے۔ بڑی دیر تک ہم دونوں اپنے خاموش غم کو لئے، ایک دوسرے سے سٹے بیٹھے رہے۔

اگر گرمیاں ہوتیں تو میں کہہ سن کر نانی اماں کو گھیر لیتا کہ جیسے وہ لڑکپن میں بھیک مانگا کرتی تھیں اس طرح مانگنا شروع کر دیں۔ ہم لوگ لودمیلا کو بھی ساتھ لے جا سکتے تھے۔

اسے ایک ٹھیلے میں بٹھا لیتے اور میں اس کو گھسیٹتا رہتا۔

لیکن اس وقت خزاں کا موسم تھا، گلیوں میں نمناک ہوائیں چلتی رہتیں، آسمان پر بادل چھائے رہتے جو کبھی ہٹتے ہی نظر نہیں آتے تھے، زمین مرجھائی ہوئی، میلی اور اداس دکھائی دیتی تھی...

4

میں پھر شہر پہنچ گیا، اب کے ایک ایسے مکان میں جو سفید رنگ کا اور دو منزلہ تھا، دیکھنے میں تابوت کی طرح لگتا تھا۔ اس میں بہت سے آدمی رہتے تھے۔ ویسے مکان نیا تھا مگر بیمار لگتا تھا جیسے کسی بھک منگے کو یکا یک دولت وراثت میں مل گئی ہو اور پھر اس نے ندیدوں کی طرح کھا کر اپنا پیٹ ٹھونس لیا ہو۔ اس مکان کا ایک پہلو گلی کی طرف پڑتا تھا، ہر منزل میں آٹھ کھڑکیاں ہیں۔ چار اس طرف کھلتی تھیں جدھر عمارت کا سامنے کا رخ ہونا چاہئے تھا۔ نیچے کی منزل کی کھڑکیاں احاطے کی طرف جانے والے راستے کی طرف کھلتی تھی اور اوپر کی منزل والی کھڑکیوں سے گلی کی دیوار کے پاس ایک گندہ نالہ دکھائی دیتا تھا اور ایک چھوٹا سا مکان جس میں ایک دھوبن رہتی تھی۔

دراصل تو وہ گلی ایسی گلی نہ تھی۔ مکان کے سامنے سے یہ گندہ نالہ گزرتا ہوا جس پر دو جگہ پٹڑے

پڑے ہوئے تھے۔ بائیں طرف نالہ جیل تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں آس پاس کے رہنے والے گھروں کو کوڑا پھینک دیا کرتے تھے جس کی وجہ سے نالے کا پیندا سبز رنگ کی سڑاند سے بھر گیا تھا۔ اور داہنے طرف کو نالہ زویز دین کے تالاب میں جا کر ختم ہو جاتا تھا، اس جگہ تالاب میں بھی کافی سڑانڈ تھی۔ ہمارے مکان کے سامنے نالے کے بیچ والا حصہ پڑتا تھا۔ اس میں سے آدھے حصے میں کوڑا کرکٹ بھرا تھا اور جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ دوسرے آدھے حصے میں پادری دار میدونت پر کروفسکی نے باغ سا بنا رکھا تھا۔ باغ میں سبز پھچیوں سے ایک کنج بنایا گیا تھا۔ اس پر پتھر پھینکو تو پھچیاں چٹاخ سے ٹوٹ جاتیں۔

یہ جگہ نہایت ہی اکتا دینے والی اور بڑی بے ہودہ قسم کی گندی تھی۔ خزاں کے موسم میں تو خس وخاشاک ملی ہوئی چکنی مٹی بالکل سرخ تارکول کی طرح اس زور سے پاؤں سے چمٹتی تھی کہ بس ہی بس! میں نے اس سے پہلے اتنی چھوٹی سی جگہ میں اتنی بہت سی گندگی کبھی نہیں دیکھی تھی اور کھیتوں اور جنگلوں کی پاکیزگی کے بعد، جس کا میں عادی ہو گیا تھا، شہر کے اس ناپاک کونے میں مجھے اتنی کوفت ہوتی اور ایسا دل بیٹھتا کہ کچھ کہنے کو نہیں۔

نالے کے پرے ٹوٹی پھوٹی، بھوری کالی، خستہ حال دیواریں تھیں اور ان ہی میں دور وہ بھورا مکان بھی نظر آتا جس میں میں رہا تھا جس سردیوں میں جوتے کی دوکان میں نوکر تھا۔ اس مکان کی قربت سے مجھے اور بھی کوفت ہوتی تھی۔ آخر مجھے پھر اسی گلی میں کیوں رہنا پڑے؟

میں اپنے نئے مالک سے پہلے سے واقف تھا۔ وہ اور ان کا چھوٹا بھائی میری امی سی ملنے آئے تھے۔ وہ بھائی جو اس قدر مضحکہ خیز طریقے سے چوں چوں کرتا تھا:

''آندرئی پاپا، آندرئی پاپا''

ان دونوں میں سے کوئی ذرہ برابر بھی نہیں بدلا تھا۔ ان میں سے بڑے کی ناک طوطے جیسی تھی اور لمبے لمبے بال۔ وہ خوش اخلاق بھی تھی اور نیک دل بھی نظر آتے تھے۔ چھوٹے وکٹر کا بالکل ویسا ہی گھوڑے کا سا منہ تھا اور اسی طرح چہرے پر چھائیاں تھیں، جیسی اس وقت تھیں۔ ان لوگوں کی ماں تھیں تو نانی اماں کی بہن مگر نہایت ہی چڑچڑی اور چیخنے والی۔ بڑے بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی بیوی کی آنکھیں سیاہ تھیں اور وہ میدے کی ڈبل روٹی کی طرح گول مٹول اور گوری چٹی تھی۔

پہلے چند ہی دنوں میں اس نے مجھ سے دو بار کہا:

''میں نے ایک دفعہ تمہاری ماں کو ایک ریشمی لبادہ دیا تھا، اس میں شیشے ٹکے ہوئے تھے...''

نہ جانے کیوں میں یہ یقین کرنیکے لئے تیار نہیں تھا کہ اس نے امی کو کوئی تحفہ دیا تھا اور امی نے وہ تحفہ قبول کر لیا تھا۔ دوسری مرتبہ جب اس نے لبادے کا ذکر کیا تو میں بولا:

''اگر آپ نے دیا بھی تھا تو اب اس میں اترانے کی کیا بات ہے؟''

وہ حیران ہو کر اچھل پڑی:

''کیا۔ آ۔ آ؟ کیا سمجھتے ہو، کس سے بات کر رہے ہو؟''

اس کے چہرے پر سرخ سرخ دھبے نمودار ہو گئے اور آنکھیں گول گھما کر اپنے میاں کو آواز دی۔

اس کے میاں ہاتھ میں پرکار لئے اور کان میں پنسل رکھے باورچی خانے میں داخل ہوئے۔ جب وہ بیوی کا بیان سن چکے تو مجھ سے مخاطب ہوئے:

''ان سے اور سبھی سے تم کو ادب سے پیش آنا چاہئے!'' پھر بیوی کی طرف مڑ کر جھنجھلائے ''خواہ مخواہ کی بکواس اور بے کار بات کے لئے مت پریشان کیا کرو!...''

''کیا کہتے ہو۔ بیکار کی بات! جب تمہارے اپنے رشتے دار...''

''جہنم میں گئے میرے اپنے رشتے دار!...'' وہ چیخے اور باہر چلے گئے۔

مجھے بھی یہ بات بری لگی تھی کہ یہ لوگ نانی اماں کے عزیز تھے۔ جہاں تک میں نے دنیا دیکھی تھی، رشتہ دار ایک دوسرے کے ساتھ غیروں سے بھی برا برتاؤ کرتے ہیں چونکہ ایک دوسرے کی کمزوریاں اور کردار کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں، اس لئے وہ بدتر افوائیں اڑاتے ہیں اور ایک دوسرے سے زیادہ جھگڑتے اور لڑتے ہیں۔

مجھے صاحب خانہ پسند تھے۔ جس طرح سے وہ اپنے بالوں کو پیچھے جھٹک کر کانوں کے پیچھے کرتے تھے وہ ادا مجھے اچھی لگتی تھی اور نہ جانے کیوں مجھے ان میں ''بہت خوب'' کی جھلک آتی تھی۔ اکثر وہ خوب دل کھول کر ہنستے اور ایسے موقعوں پر ان کی بھوری آنکھیں ملنساری کے نور سے دمکنے لگتیں، عقابی ناک کے دونوں طرف بڑی دلکش جھریاں سی پڑ جاتیں۔

ارے اب بس کرو! بہت سنا تمہارا کٹر کٹرانا، لڑاکو مرغیاں!'' وہ مسکرا کر اپنی ماں اور بیوی سے کہتے اور چھوٹے چھوٹے برابر برابر جمے ہوئے دانت کھل پڑتے۔

ان دونوں عورتوں میں روز لڑائی ہوتی۔ اس قدر جلدی دونوں کو غصہ چڑھتا کہ میں دیکھتا رہ جاتا۔ صبح سے دونوں کی دونوں سر جھاڑ منہ پہاڑ نہ کنگھی نہ چوٹی کمروں میں اس طرح گھبرائی گھبرائی پھرتی رہتیں جیسے گھر میں آگ لگ گئی ہو۔ سارے دن کھڑاگ کیا کرتیں، بس جب دن کے کھانے یا رات کے کھانے یا چائے کے میز پر آ کر بیٹھتیں تو اتنی دیر چین لیتیں۔ کھاتی بھی تھیں خوب ٹھونس کر۔ کھانے کے وقت کھانے پر بحث ہوتی، الفاظ آہستہ آہستہ تیار ہوتے جاتے اور جنگ کی فضا بندھتی جاتی۔ ساس جو کچھ بھی پکاتی، بہو یہی کہتی:

''میری اماں اس کو اس طرح نہیں پکاتی تھیں۔''

''تو پھر کیا خاک پکتا ہوگا!''

''خاک نہیں، اس سے تو کہیں بہتر ہوتا تھا!''

''تو جا کر اپنی اماں کے یہاں کیوں نہیں رہتی ہو؟''

''واہ، میں اس گھر کی مالکن ہوں!''

''اور میں کون ہوں؟''

''افوہ، بس کرو! بہت سنا تمہارا کڑ کڑانا، کڑا کو مرغیاں!''

صاحب خانہ کہتے تھے۔ ''یہ آخر ہو کیا گیا ہے، دماغ چل گئے ہیں ہم لوگوں کے؟''

اس گھر میں ہر بات نا قابل بیان طور پر عجیب اور مضحکہ خیز تھی۔ باورچی خانے سے کھانے کے کمرے میں جانے کے لئے ایک پتلے سے بیت الخلا میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس گھر میں یہی ایک بیت الخلا تھا۔ اسی میں سے ہو کر کھانا اور چائے کا سماوار میز پر لے جایا جاتا تھا۔ اس کا اکثر بڑا مذاق رہتا تھا اور بڑے دلچسپ حادثات ہو جایا تھا۔ اس کا اکثر بڑا مذاق رہتا تھا اور بڑے دلچسپ حادثات ہو جایا کرتے تھے۔ میرے کاموں میں سے ایک کام یہ بھی تھا کہ بیت الخلا میں پانی کا کنڈال ہمیشہ بھرا رہے۔ باورچی خانے میں میں اس جگہ سوتا تھا جہاں سے بیت اخلا کا دروازہ سامنے پڑتا تھا اور برساتی کا دروازہ کھلتا تھا۔ میرے سر پر باورچی خانے کے تندور کی وجہ سے بے حد گرمی رہتی تھی اور برساتی والے دروازے کے نیچے سے آتی ہوئی ٹھنڈی ہوا سے پاؤں یخ ہو جاتے تھے۔ جب سونے لگتا تھا تو فرش پر بچھی ہوئی چٹائیاں اور پائے دان اکٹھے کر کے پاؤں پر ڈھیر کر لیا کرتا تھا۔ بڑے کمرے میں دو دیواری آئینے لگے تھے، دو تاش

کھیلنے کی میزیں تھیں، بارہ کرسیاں تھیں جن کی پیٹھیں بالکل سیدھی تھیں اور کچھ گلٹ کی فریموں والی تصویریں۔ یہ تصویریں رسالہ ''نیوا'' میں مضامین لکھنے کے سلسلے تصویریں۔ یہ تصویریں رسالہ ''نیوا'' میں مضامین لکھنے کے سلسلے میں تحفتاً ملی تھیں۔اس سب سامان کے باوجود بیٹھک بڑی خالی خالی اور اجاڑ سی لگتی تھی۔

دیوان خانے میں بہت سا فرنیچر بھرا ہوا تھا جس پر شوخ رنگ کا کپڑا منڈھا ہوا تھا، الماریوں میں چاندی کے برتن، چائے کے سٹ وغیرہ جو بہو کے جہیز کے تھے، پھر تین لیمپ تھے جو اس کمرے کے طرہ امتیاز تھے، سائز میں ایک دوسرے سے بڑے تھے۔سونے کے کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی، ایک بڑی سی مسہری کے پاس کئی صندوق اور کپڑوں کی الماریاں تھیں جن سے پتی کے تمباکو اور بنفشہ کی بو آیا کرتی تھی۔ یہ تینوں کمرے ہمیشہ خالی پڑے رہا کرتے تھے اور سارا خاندان کھانے کے کمرے میں ٹھسا رہتا تھا جہاں ہمیشہ ایک دوسرے سے ٹکریں ہوتی رہتی تھیں۔ ناشتہ آٹھ بجے ہوتا تھا اور اس کے ختم ہوتے ہی دونوں بھائی میز کو کھینچ کر بڑھا لیتے اور اس پر سفید کاغذ کے تاؤ بچھاتے اور نقشہ بنانے کا سامان لے آتے، طرح طرح کے آلات، پنسلیں، طشتریوں میں روشنائی، اور کام شروع کر دیتے۔ایک میز کے اس سرے پر بیٹھتا، دوسرا دوسرے سرے پر۔ میز ہلتی بھی تھی اور تقریباً پورا کمرہ گھیر لیتی تھی۔ جب کبھی بہو یا بچوں کی کھلائی بچوں کے کمرے سے نکلتیں تو ضرور میز سے ٹکراتیں۔

''الگ ہو کر نہیں چلا جاتا!'' ایسے ہی ایک موقعہ پر وکٹر چلایا۔

بہو نے برا مان کر اپنے میاں کی طرح دیکھا اور بولی:

''واسیا، اس کو سمجھا لو، مجھ پر نہ چیخا کرے!''

شوہر نے سکون سے جواب دیا تو میز مت ہلاؤ نہ۔''

''اچھی بات ہے۔تو ہم لوگ اپنا کام لے کر بیٹھک میں جا رہے ہیں۔''

''ہائے ہائے، اے خدا، بھلا بیٹھک میں بھی کوئی کام کرتا ہے؟'' مالکن غصے میں چیخیں۔

اتنے میں بیت الخلا کا دروازہ کھلا اور بڑی مالکن، ماتریونا ایوانوونا نکل کر آئیں، تندور کے آگے کام کرنے سے ان کا چہرہ لال چقندر ہو رہا تھا۔

اب دیکھ لو واسیا، تم ہو کہ محنت کر کر کے اپنی انگلیاں گھسے ڈال رہے ہو اور یہ ہیں کہ شکایت کر رہی

ہیں کہ چار کمروں کا مکان بھی ان کے لئے پلے جننے کو کافی نہیں ہے۔ ارے یہ تو شہزادی ہے شہزادی، پر عقل نام کو نہیں!...''

وکٹر حقارت سے ہنسنے لگا۔

''بس ہوا!'' صاحب خانہ چلائے۔

لیکن اس کی بیوی نے پہلے تو اپنی ساس پر گالی کوسنوں کی بوچھار کی اور پھر میز پر آڑی گر کے کراہنے اور رونے لگیں:

''میں یہاں نہیں رہوں گی، مر جاؤں گی!''

''ارے تم پر شیطان کی مار کام بھی کرنے دو گی کہ نہیں! یہ تو بالکل پاگل خانہ ہو گیا ہے۔ آخر میں یہاں کھڑا اپنی کمر توڑ رہا ہوں تو تمہارے لئے ہی نا۔ تمہارا دوزخ بھرنے کو، لڑاکو مرغیاں!...''

شروع شروع میں تو مجھے ان لڑائیوں سے ڈر لگتا تھا۔ ایک بار مجھے خاص طور پر ڈر لگا: بہو نے روٹی کاٹنے کی چھری اٹھالی اور اپنے تئیں غسل خانے میں بند کر لیا اور وہاں زور زور سے وحشیانہ چیخیں مارنے لگیں۔ ایک لمحے کو بالکل سناٹا رہا، پھر صاحب خانہ دروازے پر ٹوٹ پڑے اور دوہرے ہو کر زور لگانے لگے، چیخ کر مجھ سے بولے:

''آؤ میرے کندے پر چڑھ جاؤ، کھڑکی کو توڑ کر دروازے کی کنڈی کھول دو!'' چشم زدن میں میں ان کے کندھوں پر چڑھ گیا اور شیشہ توڑ دیا۔ لیکن جب کھڑکی سے جھک کر کنڈی کھولنے لگا تو بہو نے چھری کے دستے سے میرے سر کی خبر لینی شروع کر دی۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح میں نے دروازہ کھول دیا اور پھر میاں بیوی کو کھینچتے ہوئے بیٹھک میں لے گئے اور چھری بھی ہاتھ سے چھین لی۔ جب میں باورچی خانے میں بیٹھا اپنے سر کو سہلا رہا تھا تب مجھے خیال ہوا کہ خواہ مخواہ ہی میں نے اتنی تکلیف بھگتی، چھری تو اس قدر کٹھلی تھی کہ اس سے انسان کا گلا تو خیر کیا، روٹی بھی نہیں کٹ سکتی تھی۔ نہ میرے لئے یہ ضروری تھا کہ مالک کی پیٹھ پر چڑھتا، کرسی پر کھڑے ہو کر بھی کھڑکی توڑی جا سکتی تھی، اور اگر کوئی بڑا آدمی دروازے کی کنڈی کھولتا تو وہ زیادہ آسانی سے کھول لیتا۔ اس کے ہاتھ لمبے ہوتے۔ اس واقعے کے بعد پھر اس گھر کی لڑائیوں سے ڈر لگنا بند ہو گیا۔

یہ دونوں بھائی گرجا کی بھجن منڈلی کے ممبر تھے۔ کبھی کبھی کام کرتے کرتے آہستہ آہستہ گانے لگتے۔

بڑا اوالا بھاری سر میں شروع کرتا:

جھاگوں سے ابلتے پانی میں
میں نے کنواری کا چھلا گرا دیا...

اور پھر چھوٹا بھائی اپنے اونچے سے میں گانے کو آگے بڑھاتا:

پر چھلے کے ساتھ ساتھ چین بھی گیا،
ساری دنیا کا آرام بھی گیا۔

بچوں کے کمرے سے بہو کی دبی ہوئی آواز سنائی دیتی:

. ''ارے کیا پاگل ہو گئے ہو تم لوگ؟ جانتے نہیں بچہ سو رہا ہے...'' یا ''واہ ایسا، تم گھر گرہستی بیوی بچے والے آدمی ہو، تم کو نہیں سجتا کہ کنواریوں کے گیت گاتے پھرو۔ اور پھر اب نماز شب کی گھنٹی بھی ہونے والی ہوگی...''

''اچھا تو پھر آؤ کوئی مذہبی گانا ہی گائیں...''

لیکن بہو اپنی ہی بات کہتی رہتی کہ ''مذہبی گانے ہر کہیں نہیں گائے جاسکتے اور خاص کر (بیت الخلا کی طرف اشارہ کر کے) یہاں۔''

''بھئی حد ہے'' صاحب خانہ غراتے ''اب ہم لوگوں کو دوسرا گھر لینا پڑے گا۔''

وہ اسی طرح یہ بات کہتے جس طرح ہر گھڑی کہتے تھے کہ اب ایک نئی میز لینی پڑے گی حالانکہ تین سال سے مسلسل اسی بات کو دوہرائے جا رہے تھے۔

جب کبھی میں ان لوگوں کو اپنے پڑوسیوں کے متعلق بات کرتے سنتا تو مجھے اس جوتے کی دوکان والی گپ شپ کا خیال آجاتا۔ مجھ پر یہ بالکل واضح ہو گیا تھا کہ یہ لوگ بھی اپنے آپ کو شہر بھی میں سب سے بہتر انسان سمجھتے تھے، اپنے زعم میں گویا وہ اچھے اخلاق کے تمام اصولوں سے واقف تھے اور ان ہی اصولوں کی کسوٹی پر وہ اور لوگوں کو بڑی بیدردی سے پرکھتے تھے۔ یہ اصول میری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ جب وہ دوسروں کو پرکھتے تو مجھ میں ان اصولوں کے خلاف ایک تلخ نفرت سی پیدا ہوتی۔ ان اصولوں کو توڑنے سے مجھے خاص قسم کی تسکین ہوتی۔

مجھے بہت سخت محنت کرنی پڑتی تھی: ماماؤں کے سارے کام میرے حوالے تھے، بدھ کے دن

باورچی خانے کا فرش میلے چیتھڑے سے صاف کرنا، سماوار اور دوسرے پتیل کے برتن مانجھ کر چمکانا، سنیچر کے دن تمام گھر کے فرش اور دونوں زینے اسی طرح صاف کرنے ہوتے تھے۔ پھر میں تندور کے لئے لکڑیاں بھی کاٹتا اور ڈھوتا تھا۔ رکابیاں اور کھانے کے دوسرے برتن صاف کرتا، سبزی بناتا، مالکن کے ساتھ بازار جاتا اور ان کی ٹوکری اٹھائے پھرتا۔ جو کچھ فاضل سودا درکار ہوتا اس کے لئے بنیے کے یہاں یا دوا دارو کی دوکان میں جاتا!

میری بڑی مالکن۔ نانی اماں کی چڑچڑی اور چیخنے چلانے والی بہن۔ روز صبح کو چھ بجے اٹھتی تھیں، جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر صرف کرتے میں مقدس شبیہوں کے سامنے اپنے بیٹوں، بہو اور اپنی پوری زندگی کا شکوہ کرتی تھیں۔ پانچوں انگلیاں اکٹھی کر کے وہ اپنی پیشانی کو چھواتیں اور گلوگیر آواز میں کہتی:

''اے پروردگار، میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتی، میں کچھ تجھ سے نہیں مانگتی۔ بس مجھے تھوڑا سا چین عطا کر، اگر تیری مرضی ہو تو تھوڑا سا سکون مجھ بخش!''

ان کی چیخوں سے میری آنکھیں کھل جاتی اور میں لیٹا لیٹا کمبل کے اندر سے جھانک کر ان کو دیکھتا رہتا۔ ان کی یہ جذباتی دعائیں سن سن کر مجھے خوف سا محسوس ہوتا۔ بارش سے دھلی ہوئی کھڑکی سے خزاں کی صبح ادھ کھلی آنکھوں سے جھانکتی اور سویرے سویرے ان کا بھورا سیاہی مائل ہیولا بار بار سینے پر صلیب کا نشان بناتا ہوا جھلکتا رہتا۔ کبھی کبھی ان کے چھوٹے سے سر سے رومال کھل پڑتا اور ان کے چھدرے، بے رنگ بال کندھوں پر بکھر جاتے، بائیں ہاتھ سے جھٹ سے وہ رومال کو ٹھیک کرتیں اور بڑبڑاتیں:

''انہہ یہ کمبخت چیتھڑا!''

صلیب کا نشان بناتے وقت وہ اپنے کندھوں، ماتھے اور پیٹ پر زور زور سے ہاتھ مارتی جاتیں او غراتی رہتیں:

''اے پروردگار، اگر مجھ سے محبت کرتا ہے تو اس میری بہو کو سزا دے! وہ میری جیسی ذلت کرتی ہے بس تو ہی اس کو سمجھ! اور میرے بیٹے کی آنکھوں کا پردہ اٹھا دے، تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ وہ درحقیقت کس قسم کی عورت ہے! اور اسے وکٹر کا بھی حال معلوم ہو جائے! اور وکٹر کی مدد معبود، اس پر اپنا رحم کر...''

وکٹر بھی وہیں باورچی خانے میں ایک اونچے ٹنڈ پر سوتا تھا۔ اپنی ماں کے اس گلے شکوے سے اس کی بھی آنکھ کھل جاتی اور وہ نیند بھری آواز میں چلاتا:

''افوہ، یہ کونسا وقت ہے بڑبڑ بڑبڑ کرنے کا! اماں بس تم بھی خدا کا عذاب ہو!''

اس کی ماں معافی مانگنے والے انداز میں کہتی ''اچھا، اچھا، سورہ۔'' ایک دو منٹ وہ آگے پیچھے خاموشی سی ہلتی رہتیں اور پھر جلے ہوئے لہجے میں کہتی:

''خدا کرے کہ ان کی ہڈیوں کا گودا جل جائے! خدا کرے خون پانی ہو جائے...''

نانا ابا تک کبھی کبھی اس جلے کٹے طریقے سے دعائیں نہیں مانگتے تھے۔

جب نماز ختم ہو جاتی تو مجھے جگاتیں:

''اٹھ لے! بس ہوا اینڈنا، اس لئے نہیں تجھے تنخواہ دیتے ہیں۔ سماوار چڑھا اور لکڑیاں لا، ہائے پھر تو نے رات سے چھپٹی تیار کر کے نہیں رکھی نا...''

میں جلدی جلدی کام کرنے کی کوشش کرتا تاکہ بڑھیا کی ڈانٹ سے بچوں۔ لیکن ان کو تو خوش کرنا ناممکن تھا۔ وہ طوفان کی طرح باورچی خانے میں دھنس آتی تھیں اور پھنکارتی پھرتیں:

''ش ش، شیطان کہیں کا! وکٹر کا جگا دے گا تو پھر میں بتاؤں گی تجھے! چل دوڑ کر دوکان جا!...'' عام دونوں میں صبح کے نشتے کے لئے سیر بھر کی ڈبل روٹی آتی تھی اور دو کوپک کے بند بہو کے لئے آتے تھے۔ جب میں روٹی لاتا تو یہ عورتیں اس کو گھما پھرا کر مشکوک نگاہوں سے دیکھتیں، ہتھیلیوں پر تول تول کر وزن کا اندازہ کرتیں:

''کیا اور کوئی چھوٹی ٹکڑا نہیں تھا تول برابر کرنے کے لئے نہیں؟ اچھا چل تو اپنا منہ کھول!'' اور پھر فتح مندی سے چیخ پڑتیں ''اس نے کھا لیا ٹکڑا! اس نے کھا لیا! وہ ریزے لگے ہیں دانتوں میں...''

....بہت محنت کرتا ہے۔''

''خوب صفائی کرتا ہے۔''

''لیکن بڑا گستاخ ہے۔''

''یہ بھی تو یاد رکھو کہ آخر اس کی پرورش کس نے کی ہے؟''

دونوں اس بات کی کوشش کرتی تھیں کہ میں ان کا ادب کروں۔ لیکن میں ان دونوں کو جھکی سمجھتا تھا، ان سے کوئی سروکار نہیں رکھتا تھا، ان کے حکم ماننے سے انکار کر دیتا تھا اور ہمیشہ ان کو الٹ کے جواب دے دیا کرتا تھا۔

بہو نے اپنی کچھ باتوں پر میرا جواب سن کر محسوس کیا ہوگا کہ یہ باتیں مجھ پر خاص طور پر برا اثر ڈالتی تھیں اور اسی لئے وہ برابر مجھ سے کہتی رہتی تھی:

''اپنی اوقات مت بھول جایا کرو کہ فقیروں کے یہاں سے اٹھا کر ہم تو کو لائے۔ تمہارے ماں کو میں نے ایک بار ریشمی لبادہ دیا تھا جس میں شیشے ٹکے ہوئے تھے!''

ایک دن میں نے اس سے کہا تھا:

''آپ نے جو ریشمی لبادہ دیا تھا کیا اب اس کے بدلے میں میری کھال کھنچوانا چاہتی ہیں؟''

وہ ڈر کر چیخی ''اے معبود! ارے یہ تو گھر میں آگ لگا بیٹھے تو کیا تعجب!''

میں بوکھلا گیا۔ بھلا، میں گھر میں آگ کیوں لگاتا؟

دونوں مالک سے میری شکایت کرتیں اور وہ سختی سے کہتے:

''یہ کیا رنگ ہیں جوان، ذرا ہوشیار رہو!''

لیکن ایک دن وہ اپنی بیوی اور ماں کی طرف مڑے اور عاجز آ کر کہنے لگے:

''تم لوگ بھی خوب ہو، خوب ہو تم لوگ! سارے وقت اس کی گردن پر سوار رہتی ہو جیسے وہ خچر ہو۔ اور کوئی ہوتا تو کب کا بھاگ نکلا ہوتا یا کام کے مارے مر جاتا...''

اس بات پر ان عورتوں کو اتنا غصہ آیا کہ رونے لگیں۔ بیوی نے غصے میں پیر زمین پر ٹپکا اور چیخی:

''اس کے سامنے یہ بات کہنے کی ہمت کیسے ہوئی تمہاری، پٹے دکھاتے ہوئے گھومتے ہو احمق کی طرح! ایسی باتیں سن سن کر وہ ہمارا حکم کیا مانے گا؟ یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ میرے بچہ ہونے والا ہے۔''

ماں منہ بسور کر روتے ہوئے بولیں:

''واسیلی، خدا تجھے معاف کرے پر میری بات یاد رکھنا کہ تم اس لڑکے کو سر پر چڑھا لو گے اور کیا'' اور پھر دندناتی ہوئی چلی گئیں۔

''دیکھا تمہاری وجہ سے کیا منظر دکھائی دیا۔ شیطان کے بچے، میں ابھی تمہیں تمہارے نانا کے پاس واپس بھجوا دوں گا۔ ہاں یہی کروں گا۔ پھر وہی چیتھڑے بٹورتے پھرنا!''

میں یہ ہتک برداشت نہ کر سکا الٹ کر جواب دیا:

''چیتھڑے بٹورنا آپ کے ساتھ رہنے سے تو اچھا ہی ہے، آپ تو مجھے یہاں کام سکھانے کو لائے

تھے نااور سکھا کیا رہے ہیں۔ کوڑا کرکٹ اٹھا کر پھینکنا اور کیا؟''

میرے مالک نے آہستہ سے میرے بال پکڑے اور میری آنکھوں میں گھور کر دیکھا اور حیرانی سے کہا:

''سچ مچ تو ہے بڑا ہی بدمعاش! نہیں بھیا، یہ نہیں چلے گا! بالکل نہیں چلے گا...''

اب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور مجھ کو چلتا کر دیں گے لیکن دو دن بعد وہ جو باورچی خانے میں داخل ہوئے تو ان کے ہاتھ میں پنسل، رولر اور ٹی اسکوائر اور لپٹا ہوا کاغذ تھا۔ ''جب چھریوں کو چمکا لینا تو اس کی نقل کرنا!'' وہ بولے۔

تصویر میں ایک دو منزلہ مکان کا سامنے والا حصہ بنا ہوا تھا جس میں بے شمار کھڑکیاں تھیں اور پلسٹر کے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔

''دیکھو یہ پرکار ہے۔ سب لکیروں کو ناپنا اور نقطے ڈال کر رولر سے سے لکیریں کھینچتے جانا اور پہلے لمبائی میں کھینچنا۔ ہاں، اس کو افقی لکیریں کہتے ہیں اور پھر اوپر سے نیچے۔ اس کو عمودی لکیریں کہتے ہیں، چلو!''

مجھے اس صاف ستھرے کام کے ملنے کی وجہ سے بے حد خوشی ہوئی اور یہ کہ اب میں بھی تعلیم حاصل کرنا شروع کر رہا ہوں۔ لیکن کاغذ اور آلات کو دیکھ کر مجھ پر رعب سا چھا گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں۔

بہر حال میں نے فوراً ہاتھ دھوئے اور کام شروع کر دیا۔ میں نے تمام افقی لکیروں کے نشان لگائے اور ان کو آپس میں ملا دیا۔ جانچ کر دیکھا۔ سب ٹھیک تھا۔ بس اتنی بات تھی کہ نہ جانے کہاں سے تین فاضل لکیریں پیدا ہو گئیں۔ پھر میں نے عمودی لکیریں بنائیں اور مجھے یہ دیکھ کر بے حد تعجب ہوا کہ مکان نے تو سرے سے اپنی شکل ہی بدل دی: کھڑکیاں اوپر چڑھ گئیں اور ایک کھڑکی تو گھر کے پیچھے ہوا میں لٹک گئی! صدر دروازہ بھی دوسری منزل پر چڑھ گیا، چھت کا چھجہ اوپر چڑھ گیا، دو چھتی کا روزن چمنی پر جم گیا۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بڑی دیر تک کھڑا اس عجیب وغریب تخلیق کو دیکھ رہا اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ یہ ہوا کیسے! آخر کار میں نے اپنے تخیل کے زور سے حالات کی تلافی کرنے کا فیصلہ کیا، چنانچہ تمام کارنس پر اور چھت کی منڈیروں پر میں نے چڑیوں، کوؤں اور کبوتروں کی تصویریں

بٹھانی شروع کیں اور زمین پر کھڑکیوں کے سامنے میں نے ٹیڑھی ٹیڑھی ٹانگوں والے آدمی بنا دئے۔ چھتری لئے جا رہے ہیں، واضح رہے کہ ان چھتریوں سے آدمیوں کا ٹیڑھا پن چھپتا بالکل نہیں تھا، پھر میں نے پوری تصویر پر ترچھی ترچھی اور آڑی لکیریں کھینچیں اور لے کر اپنے مالک کے پاس پہونچا۔

انہوں نے اپنی بھوئیں چڑھا کر غور سے دیکھا، اپنے بالوں کی ایک لٹ کو انگلی پر موڑتے ہوئے منہ سکھا کر بولے:

''اس کو کیا کہتے ہیں بے؟''

میں نے وضاحت کی ''یہ بارش ہو رہی ہے، جب بارش ہوتی ہے تو گھر بھی ٹیڑھے ٹیڑھے لگنے لگتے ہیں کیونکہ بارش بھی تو ترچھی ہوتی ہے نا! اور چڑیاں۔ یہ بس چڑیاں ہیں۔ کارنس میں چھپی ہوئی اور منڈیروں میں۔ بارش میں تو چڑیاں یہی کرتی ہیں۔ اور یہ آدمی لوگ اپنے اپنے گھر بھاگے جا رہے ہیں۔ یہ بڑی بی گر پڑی ہیں، اور یہ نیبو بیچنے والا ہے...''

''واہ بھئی واہ، شکریہ۔'' میرے مالک نے میز پر سر اتنا جھکایا کہ ان کے بال کاغذ کو جھاڑنے لگے، ان کا سارا جسم ہنسی کے مارے جھکورے لے رہا تھا۔ ''بہت بہت شکریہ، ارے تیرا ستیاناس ہو! چڈے کا بچہ!''

بہو اندر آئیں۔ پیٹ مٹکے کی طرح پھولا ہوا، میری بنائی ہوئی تصویر کی طرف دیکھ کر شوہر سے بولیں:

''پیٹو اسے!''

''ارے نہیں، جب میں نے خاکے بنانے شروع کئے تھے تو کیا اس سے اچھے تھوڑا ہی بناتا تھا'' مالک نے نیک دلی کے ساتھ جواب دیا۔ انہوں نے تصویر میں میری غلطیوں پر لال نشان لگائے اور مجھے ایک اور کاغذ دیا۔

''لو پھر کوشش کرو اور ایسے بناتے جانا تاوقتیکہ صحیح نہ بن جائے...''

میری دوسری کوشش بہتر ثابت ہوئی، سوائے اس کے کہ کھڑکیوں میں سے ایک برساتی والے دروازے پر چڑھ بیٹھی۔ لیکن مجھے خالی خالی گھر اچھا نہیں لگا، اس لئے میں نے اس میں ہر قسم کے لوگوں کو آباد کر دیا۔ کھڑکیاں پر نوجوان عورتیں بیٹھی اپنے آپ کو پنکھا جھل رہی تھیں، نوجوان مرد سگریٹ پی رہے

تھے اور ایک جو سگریٹ نہیں پی رہا تھا وہ بس خالی بیٹھا اپنی ناک پر انگلیاں رکھ کر دیکھ رہا تھا۔ برساتی میں ایک کوچوان کھڑا تھا اور اس کے پاؤں کے پاس ایک کتا لیٹا تھا۔

میرے مالک نے غصے سے پوچھا ''کیوں، تم نے پھر یہ گڑبڑ کی؟''

میں نے ان کو سمجھایا کہ لوگوں کے بغیر تصویر نہایت بے جان لگتی ہے مگر وہ ڈانٹنے لگے:

''ارے لعنت بھیج ان سب پر! اگر سیکھنا ہے تو قاعدے سے سیکھ! یہ سب گڑبڑ بات ہے، بیکار بالکل...''

آخرکار جب میں نے اصلی تصویر سے ہو بہو ملتی ہوئی ایک تصویر بنا لی تو وہ بہت خوش ہوئے۔

''دیکھو، دل لگا کے کام کرو تو کتنا اچھا کر سکتے ہو! اگر ایسا ہی کرتے رہو گے تو بہت جلد ترقی کر کے کام سیکھ جاؤ گے۔''

پھر انہوں نے ایک نیا کام میرے سپرد کیا:

''دیکھو یہ ہمارا فلیٹ جو ہے نا اس کا نقشہ بناؤ کہ کہاں کہاں دروازے اور کھڑکیاں ہیں اور کہاں کیا چیز ہے۔ میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا کہ کیسے کیا کرنا ہے۔ سب خود کرو!''

میں باورچی خانے میں چلا گیا اور وہاں سوچ کر پلان بنانے لگا کہ کہاں سے شروع کروں لیکن اس وقت میری نقشہ نویسی کی تعلیم کا خاتمہ ہو گیا کیونکہ بڑی مالکن آئیں اور بڑے کمینے پن سے بولیں:

''اچھا۔ تو اب نقشہ نویس بننے کی سوچ رہا ہے، ایں؟''

پھر انہوں نے میرے بال پکڑے اور اس زور سے میرے سر کو میز سے ٹکرایا کہ میرے ہونٹ کٹ گئے اور ناک بھی۔ پھر وہ غصے کے مارے اچھلنے لگیں، میرا نقشہ پھاڑ کر پھینک دیا، آلات زمین پر پٹخ دئے اور کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئیں اور بڑی فتح مندی سے چیخنے لگیں:

''ذرا بنا کر دیکھ، دیکھ کیا ہوتا ہے! تو اب وہ کسی اور سے، کسی غیر سے کام کروانا چاہتا ہے اور اپنے بھائی کو نکال دینا چاہتا ہے۔ اپنے خون کو، اپنے گوشت کو، اپنے عزیز کو!''

میرے مالک ڈرتے ہوئے آئے، پیچھے پیچھے لگی ان کی بیوی بھی سڑ پڑ کرتی دوڑیں، پھر ایک ہولناک تماشا شروع ہو گیا: تینوں کے تینوں نہ جانے کیا کیا بکتے جھکتے، چیختے، ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ آخر میں خاتمہ اس پر ہوا کہ عورتیں رو رہی تھیں اور میرے مالک مجھ سے کہہ رہے تھے ''بھئی فی الحال

جانے دو، رہنے دو اپنی تعلیم، اب تم خود ہی دیکھو کیا نتیجہ ہوا!''

مجھے اپنے مالک پر ترس آیا۔ بیچارے ان عورتوں کی چیخ پکار سے ہمیشہ ہی مغموم رہتے تھے۔

ویسے یہ تو مجھے پہلے ہی نظر آ رہا تھا کہ اس بڑھیا کو میری تعلیم پسند نہیں تھی اور اپنے مقدور بھر کوشش کرتی تھی کہ اس میں اڑن لگائے۔ جب بھی میں ڈرائنگ کرنے بیٹھتا تھا تو ہمیشہ اس سے پوچھ لیا کرتا تھا:

''کوئی اور کام مجھ سے ہو تو بتا دیجئے۔''

تو جھلا کر جواب دیتیں:

''جب ہوگا تو بتا دوں گی۔ تم میز پر بیٹھ کر یہ بیوقوفی بگھارنے کے سوا اور ہو بھی کس کام کے...''

چند ہی منٹوں بعد وہ ضرور مجھے کسی نہ کسی کام سے اٹھا دیتی:

''یہ ڈیوڑھی کی سیڑھیاں کتنی بری طرح جھاڑی ہیں! تمام کونوں میں کوڑا کرکٹ اٹا پڑا ہے۔ اٹھ پھر سے جھاڑ کے آ...''

میں اٹھ کر جاتا اور دیکھتا تو گرد کا نشان بھی نہ ملتا۔

''ارے مجھ سے زبان لڑاتا ہے، بحث کرتا ہے، ہیں؟'' وہ چیختی۔

ایک دن اس نے میری ڈرائنگ پر تمام کواس☆ الٹ دی۔ ایک مرتبہ صلیبی شبیہوں کے چراغوں میں ڈالنے والے تیل کی بوتل لنڈھا دی، بچوں کی سی شرارت وہ بچوں کی سی ہی چالاکی سے کرتی تھی اور پھر بچوں کی طرح ہی اس کو چھپا بھی نہ سکتی۔

میں نے اتنی جلدی اور ایسی آسانی سے چڑ چڑا جانے والا، ہر چیز اور ہر شخص سے اس طرح بیزار، یوں شکائتیں کرنے والا انسان اب تک نہ دیکھا تھا اور نہ بعد میں دیکھا۔ ویسے لوگ عام طور

☆ کواس ایک قسم کی بہت ہی ہلکی روسی بیئر۔ (مترجم)

پر شکائتیں اور گلے شکوے کرنے میں لطف لیتے ہیں لیکن ان کو اس میں ایسا مزہ آتا تھا جیسے مغنی کو موسیقی میں۔

اپنے چھوٹے بیٹے سے اسے جو محبت تھی وہ ایک قسم کا جنوں تھی۔ مجھے تو وہ صرف ایک زوردار قسم کا دماغی انتشار معلوم ہوتی تھی، جس سے مجھے ڈر بھی لگتا تھا اور جو میرے لئے مضحکہ خیز بھی تھی۔ صبح کی نماز کے بعد وہ کبھی کبھی تندور کے پائدان پر چڑھتی، جس ٹنڈ پر اس کا بیٹا سویا رہتا، اس کے کنارے پر اپنی

دونوں کہنیاں رکھتی اور پھسر پھسر کہتی:

''میرا نیک بخت بچہ! میرے کلیجے کا ٹکڑا! ہیرے کی طرح پاک، فرشتوں کے پر کی طرح سبک! سو رہا ہے! سو میری جان، سو! خدا تجھے میٹھے خواب نصیب کرے! خواب میں بنو دیکھ رہا ہے؟ خدا کرے کہ تو گوری چٹی بنو بیاہ کے لائے، شہزادی بیاہ کے لائے، سوداگر بچی بیاہ کے لائے! تیرے دشمن پیدا بھی نہ ہوں کہ ان کو موت آجائے! تیرے دوست سینکڑوں برس جئیں۔ کنواریاں ڈھیروں تیرے پیچھے چلیں جیسے مور کے پیچھے مورنیاں!''

مجھے ان باتوں پر بڑی زوردار ہنسی آتی تھی: وہ گنوار بھدا، کاہل الوجود وکٹر۔ اگر کبھی بھی لگ سکتا تو تو کھٹک بڑھئی۔ لمبی سی ناک، اول جلول کپڑے، ٹنٹھنا تا ہوا ڈھٹ احمق۔

کبھی کبھی اپنی ماں کی پھسر پھسر سے اس کی آنکھ کھل جاتی، نیند ہی میں بڑبڑاتا:

''اونہہ، جہنم میں جاؤ اماں، میرے منہ پر کھڑی کیوں تھوک چھچ چھچ اڑا رہی ہو!.. تمہارے ساتھ تو زندگی عذاب ہے!''

عام طور پر تو اس بات پر بڑھیا نہایت سعادت مندی سے نیچے اتر آتی اور ہنس کر کہتی:

''اچھا، اچھا، سونا... سو... بددماغ!''

لیکن کبھی کبھی اس کی ٹانگیں لڑکھڑا جاتیں اور منہ کھولے تندور کے ایک کنارے پر بھد سے ڈھے پڑتی، ایسا ہانپتی جیسے زبان جل گئی ہو اور ہانپتے ہانپتے برا بھلا کہتی جاتی:

''کیا۔ آ۔ آ! اپنی ماں کو جہنم میں بھیجتا ہے، حرامی! تھو کلنگ کا ٹیکہ! تو تو پھانس ہے پھانس جو شیطان نے میرے کلیجے میں گڑو رکھی ہے۔ ارے پیدا ہونے سے پہلے ہی سڑ گیا ہوتا، بدبخت!''

وہ اس طرح کے گندے الفاظ استعمال کرتی جیسے گلی میں شرابی لوگ بکتے ہیں۔ ان الفاظ کو سن کر وحشت ہوتی تھی۔

اس کو نیند بہت کم آتی تھی اور جو آتی تھی وہ بھی بے چینی سے۔ رات میں کئی کئی بار تندور پر سے نیچے اترتی اور اس کوچ کو ٹھیلتی جس پر میں سویا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے میں جاگ پڑتا۔ ''کیا بات ہے؟''

''ش ش'' وہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے اندھیرے کونے میں کسی چیز کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہتی ''اے خدا... اے پروردگار، اے وروارا، پاکدامن شہید... ہمیں مرگ مفاجات سے

پناہ میں رکھ۔''

کانپتے ہاتھوں سے شمع جلاتی۔ گول چہرہ اور بڑی سی ناک پریشانی سے تھرتھراتے ہوئے لگتے، بھوری آنکھیں گھبراہٹ میں بار بار جھپکتے ہوئے نیم تاریکی میں ادھر ادھر چیزوں پر نظریں بھٹکاتی نیم تاریکی میں جن کی ہئیت بدل گئی تھی۔ ویسے باورچی خانہ کافی بڑا تھا لیکن اس میں صندوق اور الماریوں کی بھرمار کی وجہ کافی بڑا تھا لیکن اس میں صندوق اور الماریوں کی بھرمار کی وجہ سے کچھ تنگ تھی۔ رات کے وقت یہ باورچی خانہ چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ چاندنی اندر آتی تھی، جس سے ایک مسلسل تابنا کی چھنتی رہتی تھی۔ دیوار پر ٹنگی ہوئی چھریاں برف کے ٹکڑوں کی طرح جھلکتیں اور طاقوں میں ٹنگے ہوئے سیاہ سیاہ فرائی پان اور دیگچیاں اندھے چہروں کی ح نظر آتے۔

بڑھیا ہمیشہ بڑی احتیاط سے تندور پر سے اترتی جیسے وہ گھاٹ سے پانی میں پھسل رہی ہے، پھر ننگے پاؤں پھٹا پھٹ کرتی اس کونے میں جاتی جہاں پانی کا ایک ڈھکن دار ڈول گا لٹکا رہتا تھا، اگالدان کے بالکل اوپر۔ اور وہاں ٹنگا ہوا وہ ڈول گا ایسا لگتا تھا جیسے کسی کا سر کاٹ کر لگا دیا گیا ہو اسی کے پاس صاف پانی کا ایک ٹب رکھا رہتا تھا۔

وہ غٹا غٹ پانی پیتی اور پھر کھڑکی پر جمی ہوئی برف سے باہر جھانکتی۔

''پروردگار، رحم کر۔ میری جان پر رحم کر...'' وہ منہ ہی منہ میں کہتی۔

کبھی کبھی وہ شمع بجھا دیتی اور دوزانو ہو کر بڑی تلخی سے بڑبڑاتی:

''اے معبود، مجھ سے کوئی بھی محبت نہیں کرتا۔ کوئی مجھے اپنا نہیں سمجھتا۔''

پھر تندور پر چڑھ کر وہ چمنی والے دروازے پر صلیب کا نشان بناتی، پر چمنی میں ہاتھ ڈال کر دیکھتی کہ دودکش اپنی جگہ پر ہے کہ نہیں۔ ہاتھ کالکھ سے بھر جاتا، خوب کوستی، بکتی جھکتی اور پھر اس کے بعد اس طرح یکا یک اس کو نیند آ جاتی جیسے کسی نے مسمیریزم کر دیا ہے۔ جب کبھی وہ مجھے تنگ کرتی تو مجھے خیال آتا کہ نانا ابا کی ان سے شادی نہیں ہوئی۔ یہ کتنا برا ہوا! یہ نانا ابا کو خوب ٹھیک کرتی لیکن ہاں اس بھی اپنا جوڑ ملتا۔ مجھ کو اکثر اس کے غصے کی آفت بھگتنا پڑتی، کوفت اٹھانی پڑتی لیکن ایسے دن بھی ہوتے جب اس کے پھولے ہوئے لیکن سپاٹ چہرے پر دکھ کے آثار نمایاں رہتے، آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند چھائی رہتی اور بڑے اعتماد سے کہتی:

''تم سمجھتے ہو میں مزے میں ہوں؟ میں نے بچے پیدا کیے، ان کو پالا پوسا، زندگی میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا اور مجھے کیا ملا؟ ان کے باورچی خانے میں ماما گیری کرتی ہوں، یہ جھیلنا کیا کوئی آسان بات ہے؟ پھر بیٹے کو دیکھو کہ اس غیر عورت کو لا کر میری جگہ بٹھایا ہے۔ اپنے خون اور گوشت کی جگہ پر۔ کیا یہ بھی کوئی اچھی بات ہے؟''

میں نہایت خلوص سے جواب دیتا ''ہاں، اچھی بات تو واقعی نہیں ہے۔''

''ہاں۔ اب دیکھو لو...''

پھر وہ بے حیائی سے اپنی بہو کے خلاف ایک طوفان کی طرح پھٹ پڑتی:

''میں حمام میں اس کے ساتھ گئی ہوں! اور جو کچھ دیکھا وہ خوب دیکھا! آخر اس مردوے کو اس عورت میں کیا دکھائی دیتا ہے؟ اس میں رکھا ہی کیا ہے؟ کیا حور پریاں ایسی ہی ہوتی ہیں؟''

عورت مرد کے تعلقات پر وہ ہمیشہ نہایت گھناؤنے طریقے سے بات کرتی تھی۔ شروع شروع میں تو مجھے اس کی باتوں سے گھن آتی تھی لیکن پھر میں غور سے سننے لگا اور بہت دلچسپی لینے لگا کیونکہ اس کی ان باتوں کی تہہ میں مجھے اکثر کچھ تلخ حقیقت محسوس ہوتی تھی۔

''عورت کا مرد پر بڑا زور چلتا ہے، ارے عورت نے تو خود خدا کو دھوکا دیا!'' وہ زور سے میز پر اپنی ہتھیلی مار کر بڑے اصرار سے اپنی بات آگے بڑھاتی۔ ''حوا ہی کی بدولت سارے انسان جہنم میں جائیں گے۔ یہ بات کبھی بھولنا مت!''

عورت کی طاقت کے متعلق وہ اتنی بات کرتی کہ رکنے کا نام ہی نہ لیتی اور مجھے ہمیشہ ایسا لگتا جیسے وہ یہ ذکر کر کے کسی کو ڈرا رہی ہے۔ خاص طور پر اس کا یہ کہنا کہ ''حوا نے خود خدا کو دھوکا دیا'' میری یادداشت میں چپک کر رہ گیا تھا۔

ہمارے احاطے میں ایک اور گھر تھا جو ہمارے ہی گھر کے برابر ہوگا۔ دونوں مکانوں کے آٹھ فلیٹوں میں سے چار میں فوجی افسران رہتے تھے، پانچویں میں رجمنٹ کا پادری رہتا تھا۔ احاطہ ہر وقت ان افسروں کے ملازموں اور ان کی ملنے جلنے والیوں سے بھرا رہتا تھا۔ تمام باورچی خانوں میں ہر وقت طرح طرح کے ڈرامے ہوتے رہتے اور ان کے مناظر نظر آتے، جھگڑے ہوتے اور پھر آنسو بہتے، رونا پیٹنا ہوتا۔ سپاہی آپس میں لڑتے، احاطے کے باقی لوگوں، مزدوروں یا عورتوں کو ڈانتے ڈپٹتے رہتے۔ احاطے

میں عورتوں مردوں کی ہرجائی زندگی کے تماشے خوب ہوتے رہتے۔ مردوں کی درندوں جیسی بھوک کبھی ختم ہی نہ ہوتی۔ عورتیں ہمیشہ غصہ میں بھری، فوں فوں کرتی، پھنکارتی گھوما کرتیں اور ان مردوں کی گھناؤنی اور بدکار زندگی کے پول کھولا کرتیں۔ کھانے کے وقت میں ہمیشہ اپنے مالک اور بہو کو ان کے متعلق گفتگو کرتے سنتا اور دیکھتا کہ وہ خواہ مخواہ بات کو بڑھا بڑھا کر اس کو اور گھناؤنا بنا رہے ہیں اور بڑی بے حسی سے ان موضوعات پر تبادلہ خیالات کر رہے ہیں۔ جو کچھ احاطے میں گزرتا بڑھیا کو بھی ہمیشہ اس کی خبر رہتی اور وہ اسے مزے لے لے کر دوہراتی رہتی۔

بہو ان داستانوں کی سنتی تو اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر مستقل مسکراہٹ رہتی۔ وکٹر ہنسی سے لوٹ جاتا لیکن مالک سوکھا سا منہ بنا کر کہتے:

''ختم کرو، بس کرو، اماں۔''

داستان گو کو پرا لگ جاتا:

''اے پروردگار، تم تو مجھ کو زبان کھولنے نہیں دیتے!''

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ یہاں آخر تم اپنی زبان کیوں نہ کھولو!... آخر گھر کے ہی تو لوگ ہیں...'' وکٹر ماں کو بڑھاوا دیتا۔

بڑے لڑکے کو اپنی ماں پر ترس آتا لیکن اس ترس میں جھنجھلاہٹ بھی ہوتی، وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ ماں ان کو کہیں اکیلا نہ پائیں، اگر اتفاق سے ایسا کبھی ہو جاتا تو ان کی ماں بہو کی شکایتوں کی بوچھار کر دیتی اور پھر روپیہ بھی مانگنا یقینی تھا۔ وہ جلدی سے دو تین روبل اور کچھ ریزگاری ماں کے ہاتھ پر دھرتے۔

''اماں، تم حماقت کر رہی ہو جو یہ روپیہ لے رہی ہو۔ یہ بات نہیں کہ میں تمہیں روپیہ نہیں دینا چاہتا، پر تمہیں خود ہی نہیں مانگنا چاہئے!''

''ارے فقیروں کو خیرات کروں گی اور اپنے لئے کچھ موم بتیاں لوں گی، گرجا گھر میں جلانے کے لئے...''

''کیسے فقیر! مجھ کو معلوم ہے کہ تم وکٹر کو بگاڑ کے رہو گی۔''

''ہاں ہاں، تجھے بھائی کی کیا محبت ہے! تیرا تو دل پتھر ہو گیا ہے!''

وہ جھنجھلا کر اپنا ہاتھ ہلاتے چل دیتے۔ وکٹر اپنی ماں کے ساتھ نہایت گستاخی اور بے ادبی سے پیش آتا تھا۔ پیٹو اتنا تھا کہ کھانے سے کبھی نیت نہیں بھرتی۔ اتوار کے دن بڑھیا پان کیک بناتی، اس کے لئے ہمیشہ الگ سے اٹھا رکھتی۔ ایک برنی میں ڈال کر اس کوچ کے نیچے چھپا دیتی جس پر سوتا تھا۔ جب وکٹر گرجا سے واپس آتا اس برنی پر ٹوٹ پڑتا اور بڑبڑاتا جاتا:

''اور نہیں رکھے گئے، چمرخ بڑھیا!''

''اچھا اچھا جلدی کر ورنہ کوئی دیکھ لے گا۔ جلدی نگل چکو...''

''اگر مجھے کوئی دیکھ گا تو میں کہہ دوں گا تم نے چرا کر رکھے تھے میرے لئے آستین کا سانپ!''

ایک دن میں نے چند پوریاں نکال کر کھالیں۔ اس پر وکٹر نے مجھے مارا۔ اس کو بھی مجھ سے اتنی ہی نفرت تھی جتنی مجھ کو اس سے۔ وہ مجھے چھیڑتا، دن میں تین بار جوتوں پر پالش کراتا اور اپنے ٹنڈ پر لیٹا لیٹا، تختے کھسکا کر میرے سر پر تھوکتا۔

اس کے بڑے بھائی صاحب اکثر لوگوں کو ''لڑاکو مرغیاں'' کہا کرتے تھے چنانچہ اُسے بھی غالباً ان کی ہی ریس میں کچھ ایسے فقرے کہنے کا شوق تھا جو اس نے خود گڑھے تھے، لیکن وہ نہایت احمقانہ فقرے ہوتے تھے، مثلاً:

''مجھ کو خواہ مخواہ کی باتیں پوچھ پوچھ کو تنگ کیا کرتا:

''الیکسئی، شاید تم بتا سکو کہ 'بالکل' لکھتے ہیں بلکل، کیوں پڑھتے ہیں؟ 'رس اور چاول' کے بجائے 'وساول' کیوں کہتے ہیں؟ 'واپس' کی جگہ 'واپسی' کیوں بولتے ہیں؟''

ان لوگوں کے طریقہ گفتگو سے مجھے نفرت تھی۔ میں نانی اماں اور نانا ابا کے خوبصورت الفاظ کا عادی تھا اس لئے شروع شروع میں تو میری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ یہ لوگ جو الفاظ کی ترکیبیں بناتے تھے ان کے معنی کیا تھے۔ مثلاً ''آفت کا مزے دار'' ''مرجھکا'' ''بری طرح رنگیں''۔ کیونکہ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر کوئی چیز مزیدار ہے تو وہ آفت کیونکر لا سکتی ہے، رنگینی کوئی بری چیز نہیں اور ان لوگوں کی بھوک میں مر جانے کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔

''کیا اس طرح بولنا صحیح ہے؟ یہ ترکیبیں ٹھیک ہیں؟'' میں ان سے پوچھتا۔

''اہاہاہا، دیکھو ذرا کون ہمارا استاد بن کے آیا ہے!'' وہ لوگ غصے سے جواب دیتے۔ ''ارے اسکے

''کان اکھیڑنے'' کی ضرورت ہے!''

مجھے محسوس ہوا کہ ''کان اکھیڑنا'' بھی غلط ترکیب ہے: پودے یا پھول یا پھل تو اکھیڑے جا سکتے تھے لیکن کان نہیں۔ چنانچہ انہوں نے مظاہر کے طور پر میرے کان اکھیڑے تا کہ مجھ پر واضح ہو جائے کہ کان بھی اکھیڑے جا سکتے ہیں لیکن میں قائل نہ ہوا اور فتح مندی کے ساتھ چیخا ''دیکھیے میرے کان تو پھر بھی نہیں اکھڑے!''

یہاں چاروں طرف اتنی زیادہ بے وجہ کی بے دردی اور گندگی تھی۔ یہ بے دردی اور گندگی کناوینو کی ان گلیوں سے بھی زیادہ شدید تھی جہاں رنڈیاں پھرتی تھیں، جہاں قحبہ خانے تھے۔ کناوینو میں گندگی اور برائی تھی تو ضرور، لیکن اس کی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔ اس کی تہہ میں منحوس، نیم جان، مفلسی اور کمر توڑ مشقت کا ہاتھ تھا۔ لیکن یہاں لوگ اچھی خاصی طرح آرام سے رہتے تھے اور محنت کرنے کے بجائے خواہ مخواہ چڑ چڑایا کرتے تھے، تمام ماحول پر ایک جھجھلائی ہوئی بد دماغی اور اکتاہٹ طاری تھی۔

میرا دل اس ماحول میں بے حد کڑھتا تھا اور جب نانی اماں مجھ سے ملنے آ جاتی تھیں تو یہ کڑھن اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ پچھلے دروازے سے باورچی خانے میں داخل ہوتیں، مقدس شبیہوں کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنانے کے بعد اپنی چھوٹی بہن کے سامنے دوہری ہو کر جھکتیں۔ اور مجھے اس وقت یہ محسوس ہوتا کہ اس جھکنے نے منوں وزن کے نیچے کچل دیا ہے۔

میری بڑی مالکن سرد مہری اور بے نیازی سے کہتیں ''اچھا۔ تم آئی ہو اکولینا؟''

میں نانی اماں کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ اس مسکینی سے وہ اپنے ہونٹ دباتیں کہ ان کو پورا انداز ہی بدل جاتا۔ کوڑے کی ٹوکری کے پاس جو دروازہ کھلتا تھا، اس سے لگی ہوئی بنچ پر وہ خاموشی سے بیٹھ جاتیں اور اس طرح چپ چاپ رہتیں جیسے انہوں نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہے، اپنی بہن کی باتوں کا جواب وہ آہستگی اور لجاجت کے ساتھ دیتیں۔

مجھے یہ بات بہت بری لگتی۔ بگڑ کے کہتا:

''وہاں کیوں بیٹھ گئیں آپ؟''

وہ نظر بچا کر میری طرف محبت سے آنکھ مارتیں اور پھر بناوٹی غصے سے کہتیں ''زبان کو لگام دے۔ کیا تو مالک ہے اس گھر کا؟''

میری مالکن شکائتوں کے دفتر کھولتے ہوئے شروع کرتیں ''ارے یہ بات بے بات ہر جگہ اپنی ٹانگ اڑاتا رہتا ہے۔ کتنا ہی کہو، کتنا ہی مارو، سمجھتا ہی نہیں۔''

کبھی کبھی وہ بڑے ہی خباثت سے کہتی:

''اچھا تو اکو لینا، اب تم بھیک مانگنے لگی ہو۔ کیوں؟''

''تو کیا برائی ہے...''

''ہاں، اب بے شرمی پر کمر باندھ لو تو کسی بات میں بھی برائی نہیں۔''

''لیکن کہتے ہیں کہ یسوع مسیح خود بھیک مانگتے تھے...''

''ارے کھوسٹ احمق، ایسی باتیں تو کافر اور بے دین لوگ کہتے ہیں اور تم بے عقل بڑھیاں اس پر کان دھرتی ہو۔ یسوع مسیح ہر گز فقیر نہیں تھے! وہ تو خدا کے بیٹے تھے اور جیسا کہ لکھا ہے جلد ہی آپ کا ظہور ہوگا اور پھر زندوں اور مردوں، سب کا حساب ہوگا۔ خیال رہے! ان سے کوئی چھپ نہیں سکتا اگر اپنے کو جلا کر راکھ کر دو تب بھی بچ نہیں سکتے... اور وہ تمہیں اور واسیلی کو غوور کا بدلہ دیں گے، میرا بدلہ دیں گے۔ وہ جو ایک زمانہ تھا کہ میں نے تم سے مدد مانگی تھی اور تم لوگوں نے انکار کر دیا تھا۔ میرے امیر و کبیر رشتہ دار تھے نہ تم اس وقت...'' نانی اماں پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اطمینان سے جواب دیتیں ''مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا، وہ میں نے تمہارے لئے ہمیشہ کیا، پر اب مالک کی یہی مرضی ہے کہ ہماری آزمائش کرے تو۔ ویسے جزا اور سزا تو سب ہی...''

''ارے ابھی کیا ہے؟ ابھی تم دیکھنا۔ ابھی کیا ہے...''

نانی اماں کی بہن کی زبان کتر کتر چلتی اور نانی اماں کا کلیجہ چھلنی کرتی رہتی۔ میں ان کی ٹیاؤں ٹیاؤں سنتا تو مجھے حیرت ہوتی کہ نانی اماں یہ سب باتیں کس طرح برداشت کر لیتی ہیں؟ ایسے موقعوں پر مجھے نانی اماں بالکل اچھی نہیں لگتی تھیں۔

بہو کمرے سے آتی اور گویا بڑی غریب پروری سے کہتی:

''آؤ آؤ۔ کھانے کے کمرے میں آ جاؤ۔ آ جاؤ آ جاؤ!''

''ارے پاؤں تو پونچھ لے، بھلی آدمی۔ کھوسٹ، گٹھری!'' میری بڑھیا مالکن کہتی۔

میری مالک البتہ نانی اماں کو دیکھ کر خوش ہو جاتے:

''عاقلہ اکولینا کہئے کیسے مزاج ہیں۔ بڑے میاں کا شیرین ابھی بقید حیات ہیں؟''

نانی اماں بھی ان کو اپنی محبت بھری مسکراہٹ بخشتیں ''کیوں، اب تک کام کر رہے ہو؟ بہت مصروف معلوم ہوتے ہو۔''

''جی ہاں مصروفیت کی نہ پوچھیے! بس قیدیوں کی طرح چکی ہوں۔''

نانی اماں ان سے اپنے خاص بزرگانہ انداز میں محبت بھری باتیں کرنے لگتیں۔ بیچ میں کبھی کبھی وہ میری امی کا بھی ذکر کرتے:

''ہوں، وروارا... کیا عورت تھی! کیا مردانہ وار عورت تھی!''

''یاد ہے میں نے اس کو وہ لبادہ دیا تھا۔ وہ ریشمی لبادہ جس پر شیشے ٹکے ہوئے تھے؟'' بہو نے مڑ کر نانی اماں سے کہا۔

''ہاں ہاں...'' انہوں نے جواب دیا۔

''ہوں، بالکل نیا ہی تھا لبادہ...''

''لبادہ وبادہ، زندگی مذاق ہے۔ مذاق...'' میرے مالک بڑبڑائے۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' بہو نے شبہ کے انداز میں پوچھا۔

''میں؟ نہیں نہیں۔ کچھ تو نہیں... اچھے زمانے گزر گئے ہیں، وضع دار اور نیک انسان دنیا سے اٹھتے جا رہے ہیں...''

تم ایسی باتیں آخر کیوں کہتے ہو؟'' بہو نے پریشان ہو کر کہا۔

پھر میں چائے کے جھوٹے برتن اٹھانے لگا اور نانی اماں کو نوزائیدہ بچے کو دیکھنے کے لئے لے جایا گیا، میرے مالک کی اتنی مدہم آواز سنائی دی جیسے وہ خواب میں بول رہے ہوں...

''تمہاری نانی بھی بہت ہی خوب عورت ہیں...''

میں اس بات کے لئے دل ہی دل میں ان کا مشکور رہا۔ جب نانی اماں کے ساتھ اکیلے میں ملنے کا موقع ہوا تو میں نے درد بھرے دل سے کہا:

''نانی اماں، آپ یہاں آتی ہیں؟ آپ کو نظر نہیں آتا کہ یہ لوگ کس طرح کے لوگ ہیں...''

''آہ الیوشا، مجھے سب نظر آتا ہے'' انہوں نے جواب دیا، ان کے شاندار چہرے پر شفقت کی ایسی

مسکراہٹ تھی کہ میں نادم ہو گیا۔ بے شک ان کو سب کچھ نظر آتا تھا، وہ سب کچھ جانتی تھیں۔ اس جذبہ کا بھی ان کو علم تھا جو اس وقت میرے دل میں کروٹیں لے رہا تھا۔

پھر انہوں نے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی آس پاس تو نہیں ہے، مجھ کو سینے سے لگایا اور بڑے جذباتی لہجے میں بولیں:

''میں یہاں کبھی نہ آتی۔ مگر تیری محبت مجھے کھینچ لاتی ہے ورنہ ان لوگوں سے مجھے کیا لینا؟ پھر یہ بات بھی ہے کہ نانا ابا بیمار تھے اور ان کی دیکھ بھال کرنے کی وجہ سے میں کام نہیں کر سکی تو پیسے بالکل نہیں ہیں۔ میخائل ماموں نے اپنے ساشا کو نکال دیا ہے، اس لئے اس کو بھی کھلانا پلانا پڑتا ہے۔ ان لوگوں نے وعدہ کیا تھا کہ سال پیچھے چھ روبل تیری تنخواہ کے دیں گے۔ میرا بھی یہی خیال تھا شاید اس وقت کم از کم ایک روبل ہی دے دیں، چھ مہینے تو ہو گئے ہوں گے تجھے کام کرتے ہوئے نا...'' وہ مجھ پر جھک کر آہستہ سے بولیں ''یہ لوگ مجھ سے کہتے تھے کہ تجھ کو ڈانٹوں کہ تو کہنا نہیں سنتا، اگر کچھ دن اور کس طرح یہاں گزار دے میرے کبوتر وبوتر۔ سال دو سال اور بھگت لے۔ پھر تو تیرے پاؤں میں کس بل آ ہی جائے گا۔ کیوں کوشش کرے گا نا؟''

میں نے وعدہ کیا کہ کروں گا، کتنی مشکل تھی! کس قدر مشکل! اس منحوس بے رنگ زندگی سے میں کس قدر بیزار تھا، صبح سے شام تک پیٹ کی خاطر ادھر سے ادھر ناچتے پھرو۔ میری زندگی خواب پریشاں کے مانند تھی۔

کبھی کبھی بہت ہوک اٹھتی کہ بھاگ نکلوں، لیکن سردیاں کمبخت اپنے پورے عروج پر تھیں، رات کو برفانی طوفان اٹھتے، دو چھتی میں ہوائیں چیختیں، شہتیریں سرد ہوا کے پنجے میں پھنس کر چرچراتیں۔ بھاگتا بھی تو کیسے؟

مجھے باہر جا کر کھیلنے کی اجازت نہ تھی، دراصل فرصت بھی کہاں ملتی تھی: جاڑوں کے دن یوں ہی چھوٹے ہوتے ہیں، جھٹ پٹ کاموں ہی میں بیت جاتے۔

لیکن مجھے گرجے جانا ہوتا تھا، سنیچر کے دن رات کی عبادت میں اور اتوار کو دوپہر کی عبادت میں۔

گرجے جانا مجھ کو اچھا لگتا تھا، گرجے میں میں کوئی اندھیرا، الگ تھلگ کونا ڈھونڈ نکالتا اور وہاں کھڑا ہو کر اس شبیہوں والی محراب کو دیکھا کرتا۔ دور سے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ شمع کی روشنی میں پگھلتی جا رہی ہیں،

شبیہیں آہستہ آہستہ تھرتھراتیں اور شبیہوں کے دھندلے ہیولوں سے چنگاریاں پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ نیلی فضا میں لٹکتی موم بتیاں تتلیوں کی طرح لگتیں اور ان کے نیچے بیٹھی ہوئی عورتوں اور لڑکیوں کے سر پھولوں کی طرح معلوم ہوتے۔

مناجاتی موسیقی کے ساتھ یہ تمام فضا بڑی خوبی سے کھپتی اور میل کھاتی۔ چاروں طرف ہر چیز پر پرستان کی سی کیفیت دکھائی دیتی۔ یوں محسوس ہوتا کہ سموچا گرجا اس گھپ اندھیرے میں پالنے کی طرح جھکورے لے رہا ہے۔

کبھی کبھی مجھے یوں لگتا کہ گرجا کسی جھیل کی تہہ میں اتر گیا ہے۔ دنیا کی نظروں سے پوشیدہ ہو گیا تاکہ اپنی ایک الگ زندگی بسر کر سکے، جو دنیا کی باقی تمام زندگی کی گھما گھمی سے الگ ہو۔ غالباً یہ خیال مجھ کو اس کہانی سے پیدا ہوا ہوگا جو نانی اماں نے مجھے شہر کیتیژ کے بارے میں سنائی تھی۔ اکثر گرجے میں جب میں اپنی جگہ پر کھڑا بے خودی کے عالم میں جھولتا رہتا، بجھن منڈلی کی دبی دبی آواز اور عبادت کرنے والوں کی دبی دبی آہیں، مجھے لوریاں دیتی رہتیں، تو میں دل ہی دل میں اس یاس انگیز اور مترنم داستان کو دوہراتا رہتا:

''پھر جو تاتاریوں نے وہ حملہ کیا
اپنے گھوڑوں پر تھے سب وہ کافر سوار
سر سے پاؤں تک زرہ بکتر سجے
شہر کیتیژ کو گھیر آخر لیا
اس حسین شہر میں تھا صبح کی عبادت کا وقت...
خالق کائنات میرے پروردگار
پاک میریم کی درگاہ یہ فریاد ہو!
دستگیری یہ بندوں کی ہو جائے اب
اتنی امداد ایماں کو مل جائے اب
کہ عبادت تو پوری کسی طرح ہو
نام تیرا تو لینے کی مہلت ملے،

اپنے مسکن کو بربادیوں سے بچا
کنواریوں کی سلامت رہے آبرو،
قتل سے ننھے بچوں کی گردن چھڑا
ہاتھ پاؤں ضعیفوں کے ان سے بچا
تب خداوند تعالے غفور الرحیم،
اور مریم کنواری کا دل ہل گیا
آہ وفریادوزاری غضب کی ہوئی
خالق دوجہاں طیش میں آ گیا۔
تب میخائل کو حکم خدا یہ ہوا
اب مبارک فرشتے، زمین پر تو جا
نیچے انساں کی بستی کو جا کر ذرا
شہر کیتیژ کے نیچے زمیں کو ملا
تا کہ پانی ہی پانی ہو بس برملا
شہر کیتیژ پانی کے نیچے سمائے
بندگان خدا کی مرادیں برائیں،
تہہ میں پانی کی پائیں سکون وقرار
بھر کے جی کرلیں تب حمد پروردگار
ہمیشہ عبادت وہ کرتے رہیں،
بے تھکے اپنے خالق کے آگے جھکیں
صبح سے شام تک ہو عبادت رواں
تا نمازیں ہو ان سب کی قائم سدا
سالہا سال تک وہ عبادت کریں،
تا قیامت وہ بس نام مول جپیں!

اس زمانے میں میرا دل نانی اماں کے سنائے ہوئے اشعار سے لبریز ہو جاتا تھا جیسے شہد سے چھتہ۔ ایسا لگتا تھا کہ ہر خیال ان کے اشعار کے قالب میں ڈھل رہے ہوں۔

میں گرجے میں کبھی دعا نہیں مانگتا تھا۔ میرے نزدیک نانی اماں کے خدا کو نانا ابا کی بیکار اور روہانسی دعاؤں کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے ان سے جتنی نفرت تھی اتنی ہی نانی اماں کے پروردگار کو بھی ہوگی۔ بس یہ سب دعائیں کتاب میں لکھی ہوئی تھیں جس کے معنی یہ تھے کہ یہ دعائیں تو خدا کو ازبر ہوں گی جیسے کس بھی پڑھے لکھے انسان کو ہو سکتی تھیں۔

اس لئے جب بھی میرے دل میں کوئی میٹھا میٹھا درد چٹکیاں لیتا یا دن بھر کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کا احساس بڑھتا تو میں خود اپنی دعائیں موزوں کرنے کی کوشش کرتا اور میرا نا قابل رشک مقسوم تھا کہ بغیر کوئی خاص کوشش کئے نیت باندھتے ہی الفاظ خود بخود موزوں ہونے لگتے:

''آہ اے خالق دو جہاں، اے خدا
کس قدر میرے حصے میں غم ہے ملا
جلدی سے مجھ کو بڑا کیجیئو
جتنا انسان سے ممکن تھا، بھگتا ہے خوب
پڑھتا ہوں لیکن کچھ کام بنتا نہیں!
وہ تو ہے سڑیل چڑیل
کان بس کھینچنا، ڈانٹنا جانتی
زندگی ایک اجڑی سی کتیا بنی!''

آج بھی مجھے اپنی کچھ ''دعائیں'' یاد ہیں، اصل میں بچپن کے نقوش ذہن پر کچھ ایسے گہرے ہوتے ہیں کہ مرتے دم تک مٹائے نہیں مٹتے۔

گرجے بہت لطف رہتا تھا اور مجھے جو سکون پہلے کھیتوں اور جنگلوں میں نصیب ہوتا تھا، وہی اب یہاں ملنے لگا۔ میرے ننھے سے دل نے اتنی ہی سی عمر میں بہت سے زخم کھائے تھے، زندگی کی سختیوں سے چھل گیا تھا۔ یہاں اسے مبہم اور جوشیلے خواب دکھائی دیا کرتے تھے۔

لیکن میں گرجے صرف اس وقت جاتا تھا جب بڑی سخت سردی ہوتی تھی یا شہر پر برفانی طوفان کا

حملہ ہوتا تھا۔ جب معلوم ہوتا تھا کہ ہوائیں یخ بستہ آسمان پر پڑے ہوئے بادلوں کی نقاب کوتتر بتر کر رہی ہیں۔ زمین بھی برف کے بوجھ تلے یوں جم جاتی تھی جیسے نہ اب جی سکتی ہے نہ جئے گی، نہ زندگی کے کوئی آثار اس میں کبھی پیدا ہوں گے۔

جب شامیں پرسکون ہوتی تھیں تو میں شہر میں گھومنے کو ترجیع دیتا تھا، ایک سڑک سے دوسری سڑک پر کسی الگ تھلگ دور دراز کونے کی تلاش میں مارا پھرتا۔ تیزی سے چلتا جیسے ٹانگوں میں پہیے لگے ہوں، تنہا جیسے آسمان پر چاند سفر کر رہا ہو، آگے آگے میرا سایہ ہوتا تھا، جس سے برف پر چمکتی ہوئی روشنیاں بجھتی جاتیں۔ جب کھمبوں اور احاطوں کی دیواریں آتیں تو سایہ ان پر سے بڑے مزے میں پھسل جاتا۔ سڑک کے بیچوں بیچ میں رات کا چوکیدار چلتا نظر آتا۔ لمبا سا بھیڑ کی کھال کا کوٹ پہنے، ہاتھ میں گھنٹی لئے پاؤں سے لگا ہو، ساتھ میں کتا۔ اس کے بھاری جسم کو دیکھ کر مجھے یوں لگتا کہ یہ دراصل کتا گھر تھا جو چپکے سے کسی احاطے میں سے رینگ کر نکل بھاگا اور اب سڑک پر چلتا ہوا کسی نامعلوم منزل کی طرف بڑھا جا رہا ہے اور کتا بے چارہ اپنے گھر کے پیچھے پیچھے بوکھلایا، حیران چلا جا رہا ہے۔

کبھی کبھی مجھے ہنستی کھلکھلاتی ہوئی جوان جوان لڑکیاں اور ان کے عشاق نظر آتے اور میں اس نتیجے پر پہنچتا کہ یہ لوگ بھی رات کی عبادت سے نکل بھاگے۔

بعض بعض جگہ کھلی ہوئی کھڑکیوں میں سے عجیب عجیب طرح کی خوشبوئیں آتیں۔ سوندھی خوشبوئیں، غیر مانوس خوشبوئیں جن کے پس منظر میں ایک اور ہی طرح کی زندگی محسوس ہوتی تھی۔ میں کھڑکیوں کے نیچے کھڑا ہو جاتا، سونگھتا اور کان لگا کر سنتا اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا کہ یہاں کس قسم کے لوگ رہتے ہیں اور کس قسم کی زندگی گزارتے ہیں؟ اس وقت جب کہ سب شریف لوگ رات کی عبادت کو گئے ہوئے ہیں، یہ لوگ بیٹھے ہنس بول رہے ہیں اور ایک عجیب قسم کا چھتارا بجا رہے ہیں، جس کے میٹھے سر تیرتے ہوئے کھڑکی سے باہر نکل رہے ہیں۔

مجھے خاص طور پر یک منزلہ گھر کے متعلق بڑی کرید رہتی تھی۔ یہ گھر دو سڑکوں، تخونوفسکایا اور مرتینوفسکایا کے نکڑ پر تھا، دونوں سڑکیں سنسان سی رہتی تھیں۔ روزوں سے پہلے جب برف پگھلنی شروع ہوتی تھی میں ایک بار چاندنی رات میں اس گھر کے پاس سے گزرا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے گرم بھاپ آ رہی تھی اور ان کے ساتھ ساتھ ایک عجیب وغریب آواز جیسے کوئی مضبوط اور نہایت پرخلوص آدمی لبوں کو بھینچے

کچھ گنگنا رہا ہے۔ الفاظ تو سمجھ میں نہیں آتے تھے لیکن گانا مانوس اور جانا پہچانا ہوا تھا، ویسے میں اچھی طرح نہیں سن پا رہا تھا۔ کیونکہ ساتھ میں کوئی تاروں والا ساز تھا جو بار بار گانے کے بہاؤ میں رکاوٹ ڈالتا تھا۔ اور مجھ کو اس سے سخت کوفت ہوتی تھی۔ میں ایک ٹھنٹھ پر بیٹھ گیا اور اس سے سخت کوفت ہوتی تھی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ موسیقی وائلن سے پیدا ہو رہی ہے۔ اس میں بڑے غضب کی طاقت تھی، ناقابلِ برداشت حد تک شدت۔ سننے سے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی تھی۔ کبھی سُر اس تیزی سے نکلتے کہ پورا مکان تھرتھراتا ہو محسوس ہوتا، کھڑکیوں کے شیشے جھنجھنانے لگتے۔ چھت پر سے پگھلتی ہوئی برف بوند بوند کر کے ٹپکتی جاتی اور آنسو میرے گالوں پر بہتے جاتے۔

مجھے احساس بھی نہ ہوا کہ چوکیدار آ پہونچا ہے۔ اس نے مجھے ٹھنٹھ پر سے دھکیلا۔

''یہاں کیا سونگھتا پھرتا ہے، آوارہ گرد؟'' آوارہ گرد؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ موسیقی...'' میں نے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''ہاں تو، تو پھر کیا؟ نکل یہاں سے...''

میں تیزی سے دوڑا اور مکان کا چکر کاٹ کر پھر وہیں آ بیٹھا لیکن اب کوئی ساز نہیں بجا رہا تھا اور کھڑکی سے کچھ رنگین اور طربناک شور سنائی دے رہا تھا۔ ان آوازوں اور اس غم ناک موسیقی میں اس قدر تضاد تھا کہ ایسا لگتا تھا میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔

تقریباً ہر سنیچر کو بھی اس مکان کے آس پاس منڈلایا کرتا تھا لیکن وہ موسیقی میں نے صرف ایک بار اور سنی۔ اس وقت بہار کا موسم تھا اور موسیقی آدھی رات گئے تک سنائی دیتی رہی۔ جب میں لوٹ کر گھر آیا تو میری مرمت ہوئی۔

راتوں کو اس آوارہ گردی سے جب کہ جاڑوں کے ستارے جھلملاتے اور شہر کی گلیاں اور سڑکیں ویران رہتیں، میری زندگی کو بڑا رس ملا۔ میں جان بوجھ کر شہر کی باہر والی سڑکیں انتخاب کرتا تھا کیونکہ شہر کی مرکزی سڑکوں پر روشنیوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اور اگر میرے مالکوں کے کوئی جان پہچان والے دیکھ لیتے تو انہیں مالکوں کو پتہ چل جاتا کہ میں رات کی عبادت میں شریک ہونے کے بجائے آوارہ گردی کر رہا ہوں۔ پھر بڑی سڑکوں پر شرابی اور پولیس والے اور رنڈیاں بھی میرے لئے ایک مصیبت بن جاتیں اور میرا لطف غارت ہو جاتا۔ شہر کی باہر والی سڑکوں پر یہ بھی فائدہ تھا کہ اگر مکانوں کی کھڑکیوں کے پردے نہ

کھنچے ہوتے یا کھڑکیوں پر برف نہ جمی ہوتی تو ان سے اندر تک بھی نظر آ تا تھا۔

میں نے ان کھڑکیوں سے خوب خوب مناظر کی جھلکیاں دیکھی تھیں: لوگوں کو عبادت کرتے، ایک دوسرے کو پیار کرتے، لڑتے، تاش کھیلتے اور دبی زبان، سنجیدہ بحث مباحثہ کرتے۔ میری نظروں کے سامنے جیسے ایک سینما کی خاموش سی ریل چلتی۔

ایک بار میں نے تہہ خانے کی کھڑکی سے دو عورتوں کو دیکھا۔ ایک خوب جوانی پر آئی ہوئی اور دوسری اس سے ذرا مسّن۔ دونوں میز کے کنارے بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے ایک طالب علم بیٹھا تھا، لمبے لمبے بال، ان کو ایک کتاب پڑھ کر سنا رہا تھا اور زور زور سے اشارے کر کر کے سمجھا تا جا رہا تھا۔ نوجوان لڑکی کرسی پر پیچھے کو ٹکی ہوئی بڑے غور سے سن رہی تھی۔ اس کی ابروئیں سکڑ گئی تھیں اور ایک گہری لکیر ماتھے پر پڑ گئی تھی۔ بڑی والی بہت دبلی پتلی تھی اور اس کے بال پھولے پھولے۔ یکا یک اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ طالب علم لڑکے نے فوراً کتاب پٹک دی اور جب نوجوان لڑکی جلدی سے اٹھی اور جھٹ پٹ کمرے سے باہر نکل گئی تو وہ پھولے بالوں والی کے سامنے دوزانو ہو گیا اور اس کے ہاتھوں کو چومنے لگا۔

ایک اور کھڑکی سے دیکھا کہ ایک بڑا سا ڈھیل آدمی ایک عورت کو اپنی آغوش میں لئے ہے۔ وہ عورت سرخ بلاؤز پہنے تھی۔ مرد عورت کو اپنے گھٹنے پر بٹھا کر بچوں کی طرح جھلا رہا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گا رہا ہے کیونکہ وہ بار بار منہ پھیلاتا اور آنکھیں گول گول گھماتا۔ وہ ہنسی کے مارے لوٹی جا رہی تھی اور اس کی آغوش میں گھستی ہوئی پاؤں کو ہوا میں اچھار رہی تھی۔ وہ ہنستے ہنستے پیچھے کی طرف جھک جاتی۔

وہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے بٹھاتا اور گانے لگتا۔ اور وہ پھر ہنسنے لگتی۔ میں بڑی دیر تک ان کو دیکھتا رہا اور یہ سوچتا ہوا گھر گیا کہ یہ رات بھر اسی طرح چہلیں کرتے رہیں گے۔

اس طرح کے بہت سے مناظر نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے۔ اکثر ان نقوش کی دلکشی مجھے روکے رکھتی، دیر سے گھر پہونچتا، جس سے میرے مالکوں کو شک ہوتا اور سوال کرنا شروع کرتے:

''کون سے گرجے گئے تھے؟ کس پادری نے دعا پڑھائی تھی؟''

ان کو سب معلوم رہتا تھا کہ شہر میں کس گرجے میں کون پادری ہے اور وہ انجیل کا کون سا باب پڑھا

رہا ہے، تو ظاہر ہے میرا جھوٹ پکڑنا ان کے لئے آسان تھا۔

یہ دونوں عورتیں، بڑی مالکن اور بہو، نانا ابا والے قہار خدا کی عبادت کیا کرتی تھیں۔ ایک ایسا خدا جو ہمیشہ خوف اور رعب کا طلب گار تھا۔ لڑنے جھگڑنے میں بھی اس کا نام ان کے لبوں پر رہتا تھا:

''اچھا ٹھیر! خدا تجھ سے سمجھے! جہنم کا کندہ بنیگی، ٹھہر چمڑا جھلس کر رہ جائے گا حرافہ...''

روزوں کے پہلے اتوار کو بڑھیا نے کچھ پان کیک بنائے لیکن وہ برابر فرائی پان میں چپکتے رہے، اترتے ہی نہ تھے۔ بڑھیا کا منہ آگ کی تپش سے سرخ ہو رہا تھا، غصے میں آگ بگولا ہو کر بولی:

''ارے تمہیں شیطان لے جائے...''

یکا یک اس نے فرائی پان کو جو سونگھا تو چہرہ سنولا گیا، فرائی پان کو زمین پر پٹخ کر چلائی:

''ہائے خدا! فرائی پان تو چکنا ہو رہا ہے، پیر شریف کو اسے جلانا تو مجھ کمبخت کو یاد نہیں رہا۔ اے خدا!'' پھر وہ گھٹنوں کے بل گر پڑی اور رو رو کر گڑگڑانے لگی:

''اے رحیم و کریم خدا، مجھے معاف کر! میں گنہگار ہوں، تجھے اپنی رحمت کا واسطہ مجھ بڑھا بیوقوف کو معاف کر!...''

بگڑے ہوئے پان کیک کتے کو کھلا دئے گئے برتن جل گیا لیکن اس واقعے کے بعد سے بہو اکثر بڑھیا کو اس بات کا طعنہ دیا کرتی تھی:

''ارے تمہارا کیا ہے، تم روزوں کے دنوں میں بھی پاک کئے بغیر فرائی پان میں پان کیک تلنے بیٹھ گئیں...''

وہ معبود کو ہر قسم کے گھریلو جھگڑوں میں، اپنی حقیر زندگی کے ہر تاریک کونے میں گھسیٹ لیتی تھیں۔ ان کو ایسا لگتا تھا کہ اس بات سے ان کی بے ہودہ زندگی میں کوئی خصوصیت اور اہمیت آجاتی ہے۔ گویا ہر لحظہ اعلیٰ ہستی کی خدمت میں گزر رہا ہے۔ ان کی اس حرکت سے کہ ہر معمولی بات کا رشتہ خدا سے جوڑ دیں، مجھے بڑی گھٹن ہوتی تھی۔ غیر ارادی طور پر میں کونوں میں نظریں دوڑاتا، ایسا محسوس کرتا کہ جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا ہیا ور میں اسے نہیں دیکھ سکتا۔ راتوں کو مجھے ڈر کا ٹھنڈا پسینہ چھوٹتا۔ اس خوف کی شروعات باورچی خانے کے کونے سے ہوئی تھی، جہاں مقدس شبیہوں کے آگے چراغ رات دن مسلسل جلتا رہتا تھا۔

طاق کے پاس ایک بڑی سی کھڑکی تھی جس میں دو کواڑ تھے اور بیچ میں ایک ٹیک لگا ہوا تھا۔ اس

کھڑکی سے سیاہ خلا جھانک رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا کہ یہ مکان، یہ باورچی خانہ اور ہر چیز میرے سمیت اس خلا کے کنارے لٹکی ہوئی ہے اور ذرا سی جنبش سے بھی ہم اس تاریک، سرد گہرائی میں جا پڑیں گے، ستاروں سے بھی آگے جہاں موت کی سی خاموشی ہوگی جیسے کوئی پتھر پانی میں پھینک دیا جائے۔ بڑی دیر دیر تک میں بے حس و حرکت بستر پر لیٹا رہتا اور ایسا خوف چھایا رہتا کہ بس اب دنیا کا خاتمہ نزدیک ہی ہے۔

مجھے یہ یاد نہیں کہ میں نے اپنے دل سے یہ خوف کیسے دور کیا۔ لیکن کر لیا اور بہت ہی جلد۔ ظاہر ہے کہ نانی اماں کے رحیم و کریم خدا نے اس میں میری بڑی دستگیری کی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی مجھے ایک سیدھی سادی حقیقت اور سچائی کا احساس ہوا تھا۔ کہ ابھی میں نے کوئی برائی نہیں کی ہے، اور اگر میں بے گناہ ہوں تو کسی بھی قانون کی رو سے مجھے سزا نہیں دی جاسکتی اور دوسروں کے گناہ کا ذمہ دار نہیں۔ صبح کی عبادت سے بھی میں کبھی کبھی آوارہ کی طرح نکل کھڑا ہوتا، خاص کر موسم بہار میں فطرت میں تبدیلیوں کی شان ایسی تھی کہ رہا نہ جاتا اور وہ مجھے گرجے سے کھینچ نکالتی۔ اوپر سے اگر دو چار کوپک بھی ہاتھ میں ہوتے جو گرجے میں شمع روشن کرنے کے لئے دئے جائے، تو پھر کیا ہی بات تھی۔ بالکل ہی قابو سے باہر ہو جاتا معاملہ۔ میں کھیلنے والی ہڈیاں خرید لیتا، عبادت کے پورے وقت بھر کھیلتا رہتا اور پھر گھر دیر میں لوٹتا۔ ایک دن اسی طرح میں نے دس کوپک اڑا دئے۔ یہ دس کوپک مجھے اس لئے دئے گئے تھے کہ فاتحہ کے لئے ڈبل روٹی خریدوں اور مردوں کی فاتحہ دلواؤں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب کسی اور کی فاتحہ ہو رہی تھی تو پادری صاحب جو روٹیاں لائے، ان میں سے ایک روٹی پار کر دینے کے سوا میرے سامنے اور کوئی چارہ نہ تھا۔

مجھے کھیل کود سے بے حساب دلچسپی تھی، بڑے جوش سے کھیلتا تھا اور تھکتا نہیں تھا۔ خوب مضبوط اور پھرتیلا تھا اور جلدی ہی ہڈیوں والے کھیل، گیند اور گلی ڈنڈا کھیلنے میں مشہور ہو گیا۔

روزوں کے زمانے ہی میں مجھے نیم روزے پر مجبور کیا گیا اور مجھے پادری پوکروفسکی کے پاس بھیجا گیا تا کہ اپنے سب گناہ ان کے سامنے قبول کروں۔ میں ان کو سخت انسان سمجھتا تھا اور میں نے اس کے سلسلے میں جو گناہ کئے تھے وہ بھی سب مجھے تسلیم ہی تھے: پتھر پھینک پھینک کر اکثر میں نے ان کے کنج کا ستیاناس مارا تھا، ان کے بچوں سے لڑائی جھگڑا کیا تھا اور بہت سے ایسی الٹی سیدھی باتیں کی تھیں

جنہوں نے ضرور مجھ کو ان کی نظروں سے گرایا ہوگا اور جب میں اپنے گناہ قبول کرنے کے لئے اندھیرے گرجا میں ایک کونے میں کھڑا ہوا تو ان تمام گناہوں کا بوجھ میرے دل پر محسوس ہونے لگا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

لیکن فادر پوکروفسکی مجھے سے بڑے اخلاق سے ملے۔ ایسے اخلاق سے جس سے شکوہ ٹپکتا تھا۔

''اچھا، ہمارے ہمسائے صاحب!...اچھی بات ہے، دوزانو ہو جایئے اور مجھے سے اپنے گناہوں کا اقبال کیجئے!...''

انہوں نے میرے سر پر وزنی مخمل کا ایک ٹکڑا ڈال دیا، موم اور لوبان کی مہک سے میرا دم گھٹنے لگا۔ بات کرنا مشکل تھا اور بات کرنے کو دل تیار بھی نہ تھا۔

''کیا آپ اپنے بزرگوں کے فرمانبردار ہیں؟''

''جی نہیں۔''

''اچھا تو کہئے۔ میری روح گناہ گار ہے!''

نہ جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا ''فاتحہ کے وقت میں نے نذر کی روٹی چرائی تھی۔'' اپنی اس بات پر میں خود حیران رہ گیا۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کہاں؟'' پادری صاحب نے ذرا سوچ کر آہستہ سے کہا۔

''وہ تین ولیوں کو جو گرجا ہے، نکولائی پر، پاکروف خانقاہ میں...''

''چلئے چلئے۔ کیا آپ کا مطلب ہے ان سب گرجاؤں میں! یہ تو بری بات ہے بیٹا۔ گناہ ہے نا! سمجھ رہے ہیں آپ؟''

''جی ہاں۔''

''تو کہئے میری روح گناہ گار ہے! بیوقوف لڑکا۔ کیا کھانے کیل ئے چرائی تھی نذر کی روٹی؟''

''بعض وقت کھاتا بھی تھا لیکن کبھی کبھی ہڈیوں کے کھیل میں پیسے ہار جاتا تھا اور نذر کی روٹی کا تبرک گھر لانا ہوتا تھا اس لئے چرا تا تھا...''

فادر پوکروفسکی منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائے، پھر انہوں نے مجھ سے چند سوال اور کئے، پھر ایک دم سے درشت آواز میں جواب طلب کیا:

''کیا آپ نے کبھی وہ کتابیں پڑھی ہیں جو روپوش پریس سے چھپتی ہیں؟''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا پوچھ رہے ہیں۔

''جی؟'' میں نے پوچھا۔

''ممنوع کتابیں۔ کیا آپ نے پڑھی ہیں کوئی؟''

''جی نہیں، نہیں تو...''

''تو ٹھیک ہے۔ آپ کے گناہ بخش دئے گئے... اٹھئے!''

میں نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا، ان کے چہرے پر شفقت اور فکر کے آثار تھے۔ مجھے ندامت ہوئی۔ بڑھیا مالکن اور بہو نے مجھے اقبال گناہ کے لئے بھیجا تھا تو خوب مرعوب کر کے اور ڈرا بھیجا کہ سب باتوں کا اقبال کرلوں۔

''میں نے آپ کے کنج پر پتھر پھینکے تھے'' میں نے کہا۔

پادری صاحب نے سر اٹھایا ''یہ بھی بری بات ہے! اچھا اب چلئے...''

''اور آپ کے کتے پر بھی...''

''دوسرے شخص کو لایا جائے!'' پادری پوکروفسکی نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

مجھے سخت کوفت ہوئی جیسے یکا یک مجھے دھوکہ دے دیا گیا ہو: اس اقبال گناہ کے قصے سے میرے سارے اعصاب تشنج کے عالم میں تھے اور یہ تو کچھ نہ نکلا۔ کچھ لطف بھی تو نہ آیا۔ البتہ ان کتابوں کے بارے میں سوال ضرور دلچسپ تھا جن سے میں آشنا نہ تھا۔ مجھے وہ طالب علم یاد آیا جو تہہ خانے میں کتاب پڑھ کر عورتوں کو سنا رہا تھا۔ اور مجھے ''بہت خوب'' کی بھی یاد آئی، اس کے پاس بھی کالے رنگ کی موٹی موٹی بہت کتابیں تھیں جن میں کچھ ایسی تصویریں تھیں، جن کا سر پیر کچھ پلے نہیں پڑتا تھا۔

دوسرے دن مجھے پندرہ کوپک دے کر تبرک کے لئے بھیجا گیا۔ اس سال ایسٹر ذرا دیر میں ہوا تھا، برف پگھل چکی تھی اور گلیوں میں کیچڑ سوکھ چکی تھی، فضا میں دھوپ سے چمک اور رنگینی تھی۔

گرجا کی دیوار تلے کچھ مزدور ہڈیوں والا کھیل بڑے جوش سے کھیل رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ تبرک لینے میں تو ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ ان لوگوں سے پوچھا:

''بازی شروع کرنے کا ایک کوپک ہوگا، سرخ بالوں والا شخص بڑی اکڑ سے بولا جس کے چہرے پر

ماتا کے داغ تھے۔

اچھا بائیں ہاتھ سے تیسری ہڈی جو ہے اس پر میں تین کوپک بدتا ہوں!''

''پہلے پیسے دکھاؤ!''

کھیل شروع ہو گیا!

میں نے اپنا پندرہ کوپک والا سکہ تڑوایا اور تین کوپک دو ہڈیوں پر لگائے۔ جو بھی انہیں گرا دے اس کو پیسے مل جائیں اور اگر نہ گرا سکے تو مجھے تین کوپک دے۔ میری تقدیر نے ساتھ دیا: دو کھلاڑیوں نے میری ہڈی پر نشانہ لگایا اور دونوں کا نشانہ خالی گیا، جسکے معنی یہ تھے کہ میں نے چھ کوپک جیت لئے تھے۔ اور وہ بھی بڑے بڑے لوگوں سے! بس میں پھولا نہ سمایا...

''دیکھو لوگو، اس پر نگاہ رکھنا، ورنہ یہ اپنے جیت کے پیسے لے کر نو دو گیارہ ہو جائے گا...'' ایک کھلاڑی نے کہا۔

''اچھا بائیں ہاتھ سے آخری ہڈی پر نو کوپک!'' میں نے ڈپٹ کر کہا۔ میرے جوش کا ان کھلاڑیوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ لیکن میری ہی عمر کا ایک لڑکا چلا کر بولا:

''ارے، اس پر نگاہ رکھنا۔ یہ بڑا تقدیر والا ہے، شیطان! میں اس کو جانتا ہوں۔''

''کیا کہا؟ شیطان؟ ہوں۔ اچھا دیکھتے ہیں...'' ایک دبلا سا مزدور بولا جو سموور ساز تھا۔

اس نے تاک کر نشانہ لگایا، میری ہڈی گرا دی اور پھر مجھ پر جھک کر بولا:

''کیوں، آیا مزہ؟''

میں نے تنک کر جواب دیا:

''دھنے ہاتھ کی آخری ہڈی پر تین کوپک!''

''ابھی گراتا ہوں...'' سموور ساز نے شیخی بگھاری لیکن اس کا نشانہ چوک گیا۔

قاعدے کے مطابق کوئی ایک کھلاڑی مسلسل تین بار سے زیادہ پیسہ نہیں لگا سکتا تھا اب میں نے دوسروں کی بازی کھیلنا شروع کی۔ چار کوپک جیتے بھی۔ لیکن جب میرے پیسے لگانے کی باری آئی تو میں نے تین بار پیسے لگائے اور سب ہار گیا۔ اور جیسے ہی کھیل ختم ہوا عبادت بھی ختم ہو گئی، گھنٹیاں بجنے لگیں، لوگ گرجے سے باہر نکلنے لگے۔

سمور فروش مجھے پر لپکا اور میرے بال پکڑنے چاہا ''کیوں نکل گیا کچومر!'' لیکن میں اس کو جھکائی دے گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک نوجوان کو جالیا جو اتوار کے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور اس سے لجاجت سے پوچھا:

''کیا آپ بھی نذر سے آ رہے ہیں''

اس نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھا ''اچھا اگر آ رہا ہوں تو پھر کیا؟''

میں نے اس سے پوچھا کہ مجھے بتا دے کہ نذر کیسے ہوئے، پادری نے کہا اور جن لوگوں نے نذر لی انہوں نے کیا کیا۔

نوجوان سر جھکائے بیل کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑا:

''اچھا تو آپ نذر سے بھاگ نکلے! ہیں؟ کافر! میں آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا جناب۔ جائیے آپ کے والد صاحب آپ کی مرمت فرمائیں گے!''

میں گھر بھاگا۔ یقین تھا کہ گھر پر مجھ سے سوالات کئے جائیں گے کہ نذر میں گیا تھا کہ نہیں لیکن بڑھیا نے دعا دی اور صرف ایک سوال کیا:

''پادری کو کتنے پیسے دئے؟''

''پانچ کوپک'' میں نے الل ٹپ جواب دیا۔

''تین بہت کافی ہوتے اور دو کوپک اپنے لئے بچا رکھتا خر دماغ!''

...موسم بہار آ گیا تھا۔ ہر دن ایک نئے نویلے لباس میں ظاہر ہوتا اور گذشتہ دن سے بھی زیادہ حسین اور روشن لگتا۔ تازہ تازہ گھاس اور برچ کی سبزی میں سے سرور انگیز خوشبو پھوٹتی اور میرے دل میں ناقابل برداشت تمنائیں کروٹیں لینے لگتیں کہ کھیتوں میں نکل جاؤں اور وہاں نرم گرم زمین پر چت لیٹ کر چکاوک کی آواز سنوں۔ لیکن اس کے بجائے یہاں مجھے جاڑوں کے کپڑوں کو برش کر کے صندوقوں میں بند کرنا پڑتا تھا، پتی کے تمباکو کو کترنا پڑتا تھی۔ ایسے فرائض مجھے صبح سے شام تک انجام دینے پڑتے تھے، جن سے میں نفرت بھی کرتا تھا اور جن کو بیکار بھی سمجھتا تھا۔

فرصت کے وقت مجھے بھی کچھ کرنے کو نہیں تھا۔ ہماری گلی بالکل ہی بے جان تھی، کہیں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ اور اس سے آگے جانے کی مجھے اجازت نہ تھی۔ احاطے میں کچھ بیلدار رہتے تھے،

چڑ چڑے، تھکے ماندے۔ باورچن اور دھوبنیں وغیرہ جو ہمیشہ میلی کچیلی رہتی تھیں۔ روز شام کو بڑے زوروں کے معاشقے چلتے تھے اور مجھے یہ سب باتیں بری اور نفرت انگیز لگتی تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ اندھا ہو جاتا تو اچھا تھا۔ نہ یہ سب دیکھتا نہ اتنی کوفت ہوتی۔

کبھی کبھی میں رنگین کاغذ اور قینچی لے کر دوچھتی میں جا بیٹھتا اور وہاں بیٹھا بیٹھا پھول دار بیلیں اور جالیاں کاٹتا جن سے شہتیروں کو سجاتا۔ وقت کاٹنے کو کچھ تو ہونا چاہئے۔ دل چاہتا تھا کہ کسی ایسی جگہ نکل جاؤں جہاں لوگ کم سوئیں، کم لڑیں، خدا پر اس طرح ہر گھڑی شکوہ کی بوچھار نہ کرتے ہوں اور اپنی سخت رائے سے دوسروں کی اس طرح دل آزادی نہ کرتے ہوں۔

...ایسٹر سے پہلے والے سنیچر کو ولادیمیر کی کنواری کی شبیہہ اور انسکی خانقاہ سے ہمارے شہر لائی گئی۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ یہ معجزے دکھاتی ہے۔ کنواری وسط جون تک ہمارے شہر میں مہمان رہنے والی تھیں اور اس عرصہ میں ہر ایک صاحب ایمان کے گھر وہ تشریف لے جانے والی تھیں۔

چنانچہ میرے مالکوں کے مکان پر بھی وہ عام دنوں میں صبح کے وقت آئیں۔ میں باورچی خانے میں بیٹھا پیتل کے برتن چمکا رہا تھا کہ دوسرے کمرے سے بہو کی خوفزدہ چیخ سنائی دی:

''ارے دوڑو، صدر دروازہ کھول! وہ اور انسکا یا کنواری لائی جا رہی ہیں!''

میرے ہاتھ تمام گندے تھے، چکنائی اور پوتنے کی مٹی اور راکھ سے بھرے ہوئے، پھر بھی میں اسی طرح دوڑا اور دروازہ کھولا۔ دہلیز پر ایک نوجوان پادری کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں لوبان دان لئے۔ مجھے کو دیکھ کر بڑبڑایا:

''ارے تم لوگوں کو کتنی دیر لگتی ہے۔ آؤ سہارا دو...''

اس کے پیچھے دو آدمی ایک بھاری شبیہہ کو تنگ زینے سے چڑھا رہے تھے۔ میں نے شبیہہ کے نیچے اپنا کندھا لگا کر اور اس کو اپنے دونوں میلے ہاتھوں سے پکڑ کر سہارا دیا۔ ہم لوگوں کے پیچھے پیچھے چند موٹے پادری سٹر پٹر کرتے اور رک رک کر گاتے ہوئے آ رہے تھے ''پاک مریم تیری درگاہ میں تیرے رحم و کرم کے امیدوار ہیں...''

میں دل میں سوچ رہا تھا جو انہیں اپنے گندے ہاتھوں سے چھولیا ہے تو اب شاید باز و سوکھ کر جھڑ جائیں یا گل جائیں۔

دو کرسیوں پر ایک سفید صاف پاک چادر ڈال دی گئی تھی۔ کنواری کی شبیہہ کو اس پر رکھ دیا گیا۔ دونوں طرف سے دو نوجوان اور خوبصورت وجیہ پادری اس کو پکڑے تھے، ان کی آنکھیں چمکیلی تھیں، گال پھولے پھولے تھے اور چہروں پر ایسی مسرت تھی کہ فرشتے لگتے تھے۔

اب دعا شروع ہوئی۔

ایک بڑے سے بھاری بھرکم پادری صاحب نے دعا شروع کی ''خداوند خدا کی ماں...'' زور زور سے دعا پڑھتے پڑھتے وہ اپنے بالوں کے ڈھیر کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر اپنے ایک کان کی پھولی ہوئی سرخ لو کو سہلانے جا رہے تھے۔

''پاک مریم رحیم و کریم! اپنی رحمت ہمارے اوپر نازل کر...'' دوسرے پادری لوگ تھکی ہوئی آواز میں گاتے جا رہے تھے۔

میں پاک مریم پر فدا ہو گیا۔ نانی اماں کے کہنے کے مطابق اسی نے تو غریبوں کی تسکین اور آسودگی کے لئے دنیا میں پھول بکھیرے تھے، خوشیاں پھیلاتی تھیں، نیکی اور حسن کی تخلیق کی تھی۔ اور جب پاک مریم کے ہاتھ کا بوسہ لینے کا وقت آیا تو میں کانپتا ہوا آگے بڑھا اور اس کے لبوں پر اپنے لب رکھ دئے۔ یہ میں نے دیکھا ہی نہیں کہ بڑوں نے کیسے بوسہ لیا تھا۔

پھر کسی کے مضبوط ہاتھ نے مجھے دروازے کے پاس والے کونے میں زور سے دھکیل دیا۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ پادری لوگ کس وقت اس شبیہہ کو باہر لے گئے لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ میرے مالک اور میری مالکن میرے پاس کھڑے تھے۔ میں زمین پر بیٹھا تھا اور وہ لوگ پورے جوش اور ڈر کے ساتھ بحث کر رہے تھے کہ اب میرا کیا انجام ہوگا؟

میرے مالک نے مجھے ایک ہلکی سی ڈانٹ دی:

''احمق کہیں کا، اب پادری صاحب سے پوچھا جائے گا کہ کیا کیا جائے۔ ایسی باتوں کو وہ ہم سے بہتر سمجھتے ہیں۔ ارے بیوقوف، تجھے پتہ نہیں تھا کہ پاک مریم کے لبوں کا بھی کہیں بوسہ لیا جاتا ہے؟ اسکول میں کیا جھک مارتا رہا تھا...''

کئی دن تک میں سزا کا انتظار کرتا رہا۔ پہلے تو میں نے کنواری کی شبیہہ کو گندے ہاتھوں سے پکڑا اور پھر غلط طریقے سے اس کا بوسہ لیا۔ ہائے مجھے ضرور اس کی سزا ملے گی، ضرور ملے گی سزا!

لیکن ظاہر یہی ہوا کہ کنواری نے میرے ان انجام گناہ کو معاف کر دیا کیونکہ وہ آخر عقیدت ہی میں تو سرزد ہوئے تھا۔ یا ہوسکتا ہے کہ اس نے کوئی ایسی ہلکی سی سزا دے دی ہو جوان نیک انسانوں یعنی میرے مالکوں کی دی ہوئی سخت سزاؤں کی بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھوگئی ہو۔

کبھی کبھی بڑھیا کو ستانے کے لئے میں کہتا:

''لگتا ہے پاک مریم مجھے سزا دینا بھول گئیں...''

وہ جواب دیتی:

''ٹھہر جا! ابھی ایسا کیا گیا ہے...''

...دوچھتی کی شہتیروں کو چائے کے پیکٹوں کی سرخ پتی، ٹین کے پتروں، درختوں کے پتوں اور چھوٹی موٹی چیزوں سے سجاتے وقت میں اکثر گرجا گھر کی مناجاتی دھن پر شعر کہتا جاتا، جو کچھ بھی جی میں آتا بکتا جاتا، جس طرح کارواں والے کرتے ہیں:

بیٹھتا ہوں دوچھتی میں\
لئے ہاتھ میں قینچی،\
کاٹتا ہوں کاغذ، ہاں کاٹتا ہوں\
میں اداس ہوں، پریشاں ہوں\
اگر میں ہوتا کتا\
بھاگتا پھرتا جہاں چاہتا\
سبھی مجھے ڈانٹتے ہیں،\
دھمکاتے ہیں:\
بیٹھ جا چپ چاپ!

بڑھیا میرے کام کا جائزہ لیتی، ہاتھ ہلاتی اور سر دھنتی:

''ارے تو جو اس طرح باورچی خانے کی سجاوٹ کرتا...''

ایک بار دوچھتی میں مالک آئے۔ انہوں نے میرا کارنامہ دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

''خوب آدمی ہو پیشکوف، خدا سمجھے! تو مداری بنے گا جادوگر۔ ایں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا...''

انھوں نے مجھے پانچ کوپک والا سکہ دیا۔

میں نے سکے میں تار پرویا اور اسے اپنے رنگارنگ کارناموں کے درمیان سب سے نمایاں جگہ پر لٹکا دیا، جیسے یہ کوئی تمغہ ہو۔

لیکن ایک دن بعد سکہ تار سمیت غائب ہو گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ کارستانی بڑھیا کی ہے۔

5

میں موسم بہار میں آخر بھاگ ہی نکلا۔ ایک دن صبح کو میں ڈبل روٹی خریدنے دوکان گیا۔ نانبائی میں اور اس کی بیوی میں لڑائی چل گئی۔ نان بائی نے ایک بھاری سا باٹ اٹھا کر بیوی کے سر پر دے مارا۔ وہ دوڑتی ہوئی باہر گلی میں بھاگی اور وہاں پہنچ کر گر پڑی۔ ایک دم بھیڑ اکٹھی ہو گئی۔ عورت کو ایک ٹھیلے میں لٹا کر ہسپتال لے جایا گیا۔ میں ٹھیلے کے ساتھ ساتھ دوڑتا چلا گیا اور نہ جانے کیسے میں نے یکا یک دیکھا کہ میں والگا کے کنارے پر کھڑا ہوں اور بیس کوپک میری مٹھی میں دبے ہیں۔

بہار کا وہ دن نرمی سے مسکرا رہا تھا، والگا کا پاٹ بڑھ گیا تھا، وسیع زمین کا دل دھڑکتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اب تک میں چوہے کی طرح بل میں بند رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب لوٹ کر اپنے مالک کے یہاں نہ جاؤں گا اور نہ ہی نانی اماں کے پاس واپس جاؤں گا کیونکہ میں نے وہ وعدہ توڑ دیا تھا جو میں نے ان سے کیا تھا اور ان کو منہ دکھانے لائق نہ تھا۔ پھر نانا ابا بھی تو اس بات کا طعنہ دیتے۔

دو تین دن تک میں دریا کے کنارے مارا مارا پھرا۔ ملاح بے چارے کھانا کھلا دیتے، رات کو اپنے پاس گھاٹ پر سونے کی جگہ دے دیتے۔ آخر کار ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا:

''میاں لڑکے، یہاں اس طرح مارے مارے پھرنے سے کیا ملے گا؟ ''دوبری'' (اسٹیمر) پر نوکری کیوں نہیں کر لیتے؟ وہاں ایک برتن دھونے والے کی ضرورت بھی ہے...''

میں وہاں پہونچا۔ ایک لمبا سا ڈھیل ڈھول بڑا خانساماں، سیاہ ٹوپی پہنے، عینک لگائے، دھندلی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے آہستگی سے بولا:

''دو روبل ماہوار۔ پاسپورٹ ہے؟''

میرے پاس پاسپورٹ کہاں تھا۔ بڑے خانساماں نے ایک پل سوچا، پھر بولا:

''اپنی ماں کو بلا لا۔''

میں دوڑ کر نانی اماں کو بلا لایا۔ انہوں نے اس خیال کو پسند کیا اور نانا ابا سے کہہ کر ان کو راضی کر لیا کہ پولیس سے مجھے پاسپورٹ دلوا دیں۔ وہ خود اسٹیمر پر میرے ساتھ آئیں۔

بڑا خانساماں ہم دونوں کو دیکھ کر بولا ''بس ٹھیک ہے۔ آ جاؤ۔''

وہ مجھے جہاز کے دنبالے میں لے گیا، وہاں ایک لمبا چوڑا بھاری بھرکم باورچی بیٹھا تھا، سفید کوٹ، سفید ٹوپی، میز کے کنارے بیٹھا چائے پی رہا تھا اور ہاتھ میں دبے ہوئے ایک موٹے سے سگریٹ کے کش کھینچ رہا تھا۔ بڑا خانساماں مجھے آگے کو دھکیلتے ہوئے بولا:

''برتن والا۔''

اور پھر فوراً ہی وہاں سے کھسک لیا۔ باورچی غرایا اور بڑے خانساماں کو سناتا ہوا بولا:

''ہاں ہاں، تم کو بس سستا مال چاہئے، جہاں کہیں بھی مل جائے۔ چاہئے وہ شیطان ہی کیوں نہ ہو...'' غراتے میں اس کی سیاہ مونچھیں کھڑی ہو گئی تھیں۔ غصے میں اس نے سر کو پیچھے جھٹکا دیا۔ اس کے سر پر بال چھوٹے ترشے ہوئے تھے، منہ پھلا کر مجھ پر گرجا:

''کون ہے بے تو؟''

مجھے یہ شخص بالکل اچھا نہیں لگا۔ کپڑے ت وہ بے شک سفید پہنے ہوئے تھا مگر نہ جانے کیوں گندہ لگتا تھا۔ انگلیوں پر موٹے موٹے روئیں تھے اور بڑے بڑے کانوں سے بھی بال جھانک رہے تھے۔

''مجھے بھوک لگی ہے''، میں نے کہا۔

اس نے آنکھ ماری اور پھر ایک دم سے اس کا غصیل چہرہ بدل گیا۔ ایک چوڑی سی مسکراہٹ سے اس کے گالوں پر لہریں پیدا ہوئیں اور کانوں سے جا کر ٹکرا گئیں۔ گھوڑے کے سے بڑے بڑے دانت باہر نکل آئے، مونچھیں نیچے کو جھک گئیں۔ وہ ایسا لگنے لگا جیسے کوئی شفیق اور نیک گرہستن ہو۔

بچی کھچی چائے اس نے جہاز کی منڈیر پر سے باہر اچھال کر پھینک دی، پھر گلاس بھرا اور پوری روٹی کباب کے ایک بڑے سے ٹکڑے کے ساتھ میری طرف سرکایا۔

''لے۔ بھئی، ماں باپ ہیں؟ چوری کرنی آتی ہے؟ کوئی فکر کی بات نہیں۔ یہاں سب چور بستے

ہیں۔ بہت جلدی تجھے سکھا دیں گے!''

وہ بھونک بھونک کر بولتا تھا۔ بھاری بھاری گال شیو کرنے کی وجہ سے نیلے لگتے تھے، ناک کے پاس گوشت میں لال لال رگوں کا ایک جال سا بچھا تھا۔ بڑی سی سرخ، پھولی ہوئی ناک مونچھ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نیچے کا موٹا سا ہونٹ کچھ اس طرح لٹکا تھا جیسے سب کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہو۔ منہ کے ایک کونے میں ایک سگریٹ چپکی ہوئی تھی جس سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس وقت بالکل یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ابھی ابھی حمام سے نکل کر آیا ہے، کیونکہ اس میں سے بید کی ڈالیوں کے جلنے اور کالی مرچوں کی شراب کی خوش بو آ رہی تھی اور کنپٹیوں اور گردن پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

جب میں کھانا کھا چکا تو اس نے میرے ہاتھ پر ایک روبل رکھا:

''جا، اپنے لئے دوا پرن خرید لا۔ ٹھہر، اچھا میں خود ہی خرید لاتا ہوں!''

اس نے اپنی ٹوپی ٹھیک کی اور عرشے پر چل دیا۔ وہ جھولتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کے قدم بھاری اٹھ رہے تھے جیسے ریچھ چل رہا ہو۔

اس نے اپنی ٹوپی ٹھیک کی اور عرشے پر چل دیا۔ وہ جھولتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کے قدم بھاری بھاری اٹھ رہے تھے جیسے ریچھ چل رہا ہو۔

''رات، چمک دار چاند جیسے اسٹیمر پر سے گذرتا ہوا وادیوں کی طرف دوڑا چلا جا رہا ہے۔ چاندنی سے بھرے ہوئے پانی میں ہمارا دقیانوسی قسم کا سرخ اسٹیمر، جس کی چمنی پر بڑا سا سفید چھلا لگا ہوا تھا، آہستہ آہستہ ہلتا چلا جا رہا ہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے تاریک ساحل اسٹیمر سے ملنے کے لئے اٹھ رہا ہے۔ ساحل کی تاریک پرچھائیاں بڑھ رہی ہیں اور ان کے اوپر کھڑکیوں کی روشنیاں تڑپ رہی ہیں۔ دیہات سے گانے کی آواز آ رہی ہے۔ لڑکیاں گا بجا رہی ہیں۔

ہمارے اسٹیمر کے ساتھ ساتھ مضبوط رسیوں سے بندھا ہوا کتھئی رنگ کا بجرا بھی گھسٹ رہا ہے۔ اس کے عرشے پر ایک بڑا سا لوہے کا پنجرہ رکھا ہے اور اس پنجرے میں وہ قیدی ہیں جنہیں جلاوطنی کی بامشقت سزا ملی ہے۔ اس کی نوک پر سنتری کھڑا ہے اور اس کی سنگین شمع کی طرح روشن معلوم ہو رہی ہے۔ نیلے آسمان میں چھوٹے چھوٹے ستارے بھی ننھی ننھی موم بتیوں کی طرح روشن ہیں۔ بجرے کے عرشے پر مکمل خاموشی طاری ہے اور پورا بجرا چاندنی میں لپٹا ہوا ہے۔ پنجرے کی سلاخوں کے پیچھے گول گول سرمئی

پر چھائیاں پڑ رہی ہیں۔ یہ قیدی والگا کو تک رہے ہیں اور والگا کا پانی قل قل کرتا ہوا گزرتا جارہا ہے۔ شاید رو رہا ہے یا شاید چپکے چپکے ہنس رہا ہو۔ چاروں طرف گرجا گھر والی فضا ہے اور روغن میں بسی ہوئی بو پھیلی ہوئی ہے۔

میں بجرے کو تکتا رہتا ہوں تو مجھے اپنے بچپن کا ابتدائی زمانہ یاد آتا ہے۔ استراخان سے نیژنی کا سفر۔ اپنی امی کا بے جان چہرہ اور نانی اماں، جنہوں نے مجھے اس جفاکشی کی مگر دلچسپ زندگی سے روشناس کروایا۔ جب بھی مجھے نانی اماں یاد آتی ہیں تو زندگی کے قابل نفرت اور کوفت دہ عناصر بھول جاتے ہیں۔ ہر چیز بدل جاتی ہے، زیادہ دلچسپ اور زیادہ مسرت بخش ہو جاتی ہے۔ انسان زیادہ اچھے نظر آتے ہیں، ان میں محبت زیادہ محسوس ہونے لگتی ہے۔

رات کے حسن کے جادو سے میں اتنا متاثر ہوتا ہوں کہ میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ بجرا بھی میرے دل میں ایک عجیب ہیجان پیدا کرتا ہے۔ وہ بالکل تابوت کی طرح لگتا ہے، اور بہتے دریا اور گرم رات کے اور خموش فکرمند سناٹے میں وہ بالکل ایسا نظر آتا ہے جیسے کوئی غیر ضروری اجنبی سی چیز ہو۔ ساحل کے کھردرے پیچ و خم جو کہیں دبتے ہیں اور کہیں ابھرتے ہیں، میرے دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دیتے ہیں۔ مجھ میں خیر کی قوتوں کو بیدار کرتے ہیں، انسانیت کی خدمت کرنے کا حوصلہ ابھارتے ہیں۔

ہمارے مسافروں میں ایک خاص بات ہے۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے یہ سب۔ بوڑھے، بچے، مرد اور عورتیں۔ ایک سے ہی ہیں۔ ہمارے اسٹیمر کی رفتار بہت مدھم ہے۔ جن لوگوں کو کسی کام کی جلدی ہوتی ہے، وہ تو ڈاک کے اسٹیمر سے چلے جاتے ہیں اور ہمارے حصے میں وہ مسافر آتے ہیں جو چپ چاپ چل رہے ہیں، جنہیں کوئی خاص جلدی نہیں۔ صبح سے شام تک کھاتے رہتے ہیں اور بہت سی رکابیاں، چھریاں، کانٹے اور چمچے جھوٹے کرتے ہیں۔ ان برتنوں کو دھونا اور چھریوں کانٹوں کو چمکانا میرا کام ہے او ر میں اس کام میں صبح چھ بجے سے لے کر آدھی رات تک لگا رہتا ہوں۔ دن میں دو بجے سے چھ بجے تک اور رات میں دس بجے سے بارہ بجے تک مجھے کام ذرا کم رہتا ہے کیونکہ کھانے کے بعد مسافر صرف چائے اور بیئر اور واد کا پیتے ہیں۔ ان اوقات میں سب ہی ویٹر خالی رہتے ہیں۔ ہمارا پورا عملہ عام طور پر بھونپو کے پاس ایک میز پر اکٹھا ہو جاتا ہے اور سب مل کر چائے پیتے ہیں۔ ان میں سموری باورچی ہے، یا کوف ایوانووچ جو اس کا مددگار ہے، میکم ہے جو باورچی خانے کے برتن صاف کرتا ہے اور سرگئی ہے جو عرشے

کے مسافروں کو کھانا کھلاتا ہے، اس کی پیٹھ میں کوب ہے، چوڑے چکلے چہرے پر ماتا کے داغ، چکنی چکنی آنکھیں۔ یاکوف ایوانووچ ان لوگوں کو گندی گندی کہانیاں سناتا ہے، قہقہہ مار کر اس طرح ہنستا ہے کہ لگتا ہے رو رہا ہے۔ اس کے سبز رنگ کے میلے دانت باہر نکل آتے ہیں۔ سرگئی کا مینڈک جیسا منہ ہنسی سے کھل جاتا ہے، ہنسی جو اس کان سے ان کان تک چری رہتی ہے، اور میکسم خاموش سنتا رہتا ہے۔ اس کی سخت اور مبہم سے رنگ کی آنکھیں دوسروں پر جمی رہتی ہیں۔

بڑا باورچی اپنی گونجتی ہوئی آواز میں بیچ بیچ میں بولتا جاتا ہے:

''حبشی وحشی!''

میں ان سب لوگوں سے نفرت کرتا ہوں۔ موٹا، گنجا یاکوف ایوانووچ صرف عورتوں کے متعلق بات کرتا ہے اور وہ بھی نہایت فحش طریقے سے۔ اس کی شکل پر جذبات کی ذرا سی جھلک دکھائی نہیں دیتی اور تمام چہرے پر نیلی نیلی چھائیاں ہیں۔ ایک گال پر ایک بڑا سا مسہ ہے اور مسہ میں سرخ سرخ بال اگے ہوئے ہیں جن کو وہ چٹکیا کر نوکدار کرتا رہتا ہے۔ جب بھی عرشے پر کوئی ایسی عورت آجاتی ہے جس کے منہ لگا جا سکے تو وہ بھک منگوں کی سی لجاجت کے ساتھ اس کے پیچھے لگ لیتا ہے اور نہایت مسکینی کے ساتھ چکنی چپڑی باتیں کرتا ہے، ہونٹوں پر جھاگ ابھرتے جاتے ہیں، جنہیں وہ اپنی بے حیا زبان کو جلدی جلدی حرکت دے کر چاٹتا جاتا ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال آتا ہے کہ جلاد بھی ایسے ہی موٹے اور چکنے مکنے ہوتے ہوں گے۔

سرگئی اور میکسم کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہتا ''ارے پہلے تو یہ سیکھنا چاہئے کہ عورت کو گرمایا کیسے جاتا ہے۔'' ان دونوں کا رنگ گلابی پڑ گیا، پھول سے گئے اور غور سے اس کی بات سنتے رہے۔

باورچی سمورئی نفرت سے گرجا ''وحشی!'' پھر آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا اور مجھے حکم دیا ''پیشکوف، آؤ چلو یہاں سے!''

جب ہم لوگ اس کے کیبن میں پہنچے تو اس نے مجھے چمڑے کی جلد بندھی ہوئی ایک چھوٹی سی کتاب دی اور خود اپنے ٹنڈ پر لیٹ گیا جو ٹھنڈے خانے کی دیوار سے لگا ہوا تھا۔

''چلو، پڑھ کے سناؤ مجھے!''

میں سیویوں کی ایک پیٹی پر بیٹھ گیا اور فرمانبرداری سے پڑھنا شروع کر دیا:

''اومبرا کول یہ چھتری جس میں ستارے چھٹکے ہوئے ہیں دراصل آسمان بادشاہت سے انسان کے تعارف کا ایک ذریعہ ہے جو اسے جہالت کی قید سے نکالتا اور نبیوں اور پیروں سے بے نیاز کراتا ہے...''

سمورئی نے سگریٹ جلا کر دھوئیں کا ایک بادل چھوڑا اور بولا:

''اونٹ کہیں کے! یہ کیا لکھنے کی بات ہوئی بھلا...''

''ننگے بائیں سینے سے مطلب ہے پاک دل...''

''مگر کس کا بایاں سینہ؟''

''یہ تو اس میں نہیں لکھا۔''

''تو پھر عورت کا سینہ مراد ہوگا۔ فحاش کہیں کے...''

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور بازو سر کے نیچے رکھ لیا، منہ کے کونے میں چپکی ہوئی سگریٹ کو زبان سے قابو میں کیا اور پھر اتنے زور سے کش کھینچا کہ سینے میں ایک زور کی سیٹی بجتی سنائی دی اور اس کا بڑا اس اچہرہ دھوئیں کی دھند سے اٹ گیا۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ سو گیا ہے اور پھر میں پڑھنا روک کر اس کمبخت کتاب کو دیکھنے لگتا۔ اس کتاب سے مجھے متلی ہونے لگتی۔ لیکن وہ بھونکتا:

''پڑھو!''

''پھر عزت مآب نے جواب دیا: دیکھو، میرے بھائی سوویریان....''

''سیویریان...''

''لیکن لکھا تو سوویریان ہے...''

''جہنم میں جائے! ڈبہ گول کر و اس کا یہاں سے... نیچے دیکھو کچھ شعر لکھے ہیں...''

میں فوراً وہاں سے ڈبہ گول کر دیتا۔ نیچے شعر ہوتے:

آہ اے نادان انسان

تو ہماری مصلحتوں میں کیوں دخل انداز ہے

آس پاس ان کے پہنچ سکتا نہیں تیرا دماغ

تو ندائے پیر و مرشد تو سمجھتا ہی نہیں

آہ اے نادان انسان!

''رک جاؤ۔ اس کو بھلا شعر کہتے ہیں! لاؤ مجھے دو کتاب...''

غصے میں بھرا ہوا وہ کتاب کے نیلے موٹے ورق الٹتا اور پھر اسے ٹنڈ سے نیچے پھینکتا۔

''دوسری پڑھ کے دیکھو...''

میری کمبختی سے اس کے صندوق میں، جس پر فولاد کی چاپنیں چڑھی ہوئی تھیں، اور بھی بہت سی کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ مثلاً: ''اومیر کے ہدایات'' ''فوجی یادداشت'' ''لارڈ سیڈنگلی کے خطوط'' ''کھٹمل کی بابت جو ایک نفرت انگیز کیڑا ہے، اس کا خاتمہ اور اس کے کاٹے کا ازالہ'' وغیرہ۔ ایسی بھی کتابیں تھیں جن کا شروع اور آخر غائب تھا۔ بعض اوقات باورچی سموری مجھ سے کہتا کہ ان کو ایک ایک کرکے نکالوں اور نام سمجھاتا جاؤں۔ جب میں ایسا کرتا تو غصے میں بڑبڑاتا:

''کیا لکھتے ہیں، بدذات! جیسے بلاوجہ اٹھا کر ایک چانٹا دھر دیا منہ پر۔ گیرواسی! اب پوچھئے بھلا مجھ کو کمبخت گیرواسی سے کیا لینا ہے۔ اومبراکول! انہہ!...''

یہ عجیب وغریب اور اجنبی الفاظ اور نام میرے دماغ میں بری طرح چپک کر رہ جاتے تھے، ان کو دوہرانے کے لئے زبان کھجلاتی گویا ان کو بار بار دوہرانے سے معنی صاف ہی تو ہو جائیں گے۔ کھڑکی سے پرے دریا اپنا مسلسل گیت اور چھپا چھپ جاری رکھتا۔ میرا دل تڑپتا کہ اوپر دنبالہ میں جاؤں جہاں ملاح اور خلاصی پیٹیوں پر بیٹھے گایا کرتے، سوت کاتا کرتے یا تاش کھیل کھیل کر مسافروں سے پیسے جیتا کرتے۔ اگر وہاں بیٹھ کر ان کی سیدھی سادی گفتگو سننے کو ملے، وہ الفاظ جو سمجھ میں آجائیں، تو کتنا لطف آئے، ساتھ ساتھ دریائے کاما کے ساحل کو بھی دیکھتے جائیں۔ دیودار کی شاخیں سر اٹھائے ہوئے اوپر کی طرف پھیلتی ہوئی، تانبے کے تاروں کی طرح تنی ہوئی، اور چراگاہیں جن میں پیچھے ہٹتے پانی نے گذرتے گذرتے ننھی ننھی جھیلیں چھوڑ دی ہیں۔ جھیلیں ٹوٹے ہوئے آئینے کی طرح بکھری ہوئی ہیں اور ان میں آسمان کا عکس جھلک رہا ہے۔ ہمارا اسٹیمر زمین سے الگ تھا اور اس سے دور ہٹ رہا تھا لیکن ساحل سے تھکے ہمارے دن کے سناٹے میں کسی گرجے کی گھنٹیوں کی آواز آیا کرتی جو دکھائی تک نہ دیتا تھا اور اس آواز کے ساتھ انسانوں اور انکی بستیوں کا تصور بھی ابھر آتا تھا۔ کہیں ماہی گیروں کی کوئی کشتی، روٹی کے ٹکڑے کی طرح، پانی پر اچھلتی کودتی گذرتی۔ رفتہ رفتہ پھر ایک گاؤں دکھائی دینے لگتا۔ کنارے پر پانی

میں ننھے ننھے لڑکے کھیلتے کودتے پانی اچھالتے ہوتے۔ ریت کے ایک پیلے فیتے پر ایک کسان، سرخ قمیص پہنے چلتا ہوا نظر آتا۔ دور سے ہر ایک چیز نہایت دل کش معلوم ہوتی، ایک ایک شئے سکڑ کر کھلونوں کے سائز کی ہو جاتی اور بہت ہی رنگا رنگ۔ بے اختیار میرا دل چاہتا کہ ساحل سے کوئی پیار کی بات کہوں۔ ساحل سے بھی اور بجرے سے بھی۔

اس کھٹی بجرے نے تو جیسے میرا دل موہ لیا تھا۔ میں گھنٹوں مہر بہ لب بیٹھا رہتا اور دیکھتا رہتا کہ کس طرح بجرا گدلے پانی کو اپنی ناک سے تراشتا چلا جا رہا ہے۔ اسٹیمر اس کو یوں کھینچے لے جاتا تھا جیسے گلے میں رسی بندھی ہوئی بکری۔ جب اسٹیمر کی رفتار مدہم ہوتی تو رسیاں ڈھیلی ہو کر پانی پر چھپا چھپ کرنے لگتیں اور پھر تن جاتیں، پانی ان میں سے ٹپکتا جاتا اور وہ بجرے کو ناک سے پکڑے گھسیٹے لئے جاتیں۔ میرا دل تڑپتا کہ ان انسانوں کو ایک نظر ہی دیکھ لوں جو جانوروں کی طرح پنجرے میں بند تھے۔ جب ہم پیرم پہنچے اور وہ لوگ ساحل پر لے جائے جانے لگے تو میں اوپر والی سیڑھی پر چڑھ گیا، درجنوں تاریک، سرمئی ہستیاں میرے پاس سے گذریں، زنجیریں بجتی ہوئی اور اپنے تھیلوں کے بوجھ سے کمریں دوھری۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی، جوان بھی اور بوڑھے بھی، خوبصورت بھی اور بدصورت بھی۔ بالکل جیسے معمولی انسان ہوتے ہیں۔ بس فرق یہ تھا کہ ان کا لباس مختلف تھا اور سر مونڈ کر ان کی صورتوں کو بھیانک بنا دیا گیا تھا۔ یقیناً یہ لوگ ڈاکو تھے۔ لیکن نانی اماں نے مجھے ڈاکوؤں کے متعلق بہت سی اچھی اچھی باتیں بھی بتائی تھیں۔

سموری تو ان میں سے کسی سے بھی زیادہ ڈاکو لگتا تھا۔ وہ بجرے پر نگاہ ڈالتا اور کہتا:

''خدا کی پناہ! پروردگار مجھے ہمیشہ اس طرح کی آفت سے محفوظ رکھے!''

ایک دن میں نے اس سے کہہ دیا:

''یہ کیا بات ہے کہ آپ باورچی ہو گئے اور کوئی چور ہو گیا تو کوئی ڈاکو اور کوئی قاتل؟''

میں باورچی نہیں ہوں میں صرف کھانا پکاتا ہوں، باورچی کا کام عورتیں کرتی ہیں'' اس نے غرا کے جواب دیا۔ پھر ایک منٹ سوچ کر بولا ''اصل بات یہ ہے لوگ ہوشیار ہوتے ہیں، کچھ بے وقوف ہوتے ہیں اور کچھ بس گدھے ہوتے ہیں اگر صحیح کتابیں انسان پڑھے تو ہوشیار ہو سکتا ہے، مثلاً کالا جادو اور اسی طرح کی اور کتابیں۔ لیکن اب یہ ہے کہ سب کتابیں پڑھو تب کہیں پتہ چل سکتا ہے کہ صحیح کتابیں کونسی

ہیں...‘‘

وہ ہمیشہ مجھ سے کہتا رہتا تھا:

’’پڑھو! اگر کوئی کتاب سمجھ میں نہ آئے تو سات بار پڑھو۔ سات بار پڑھنے سے کام نہیں بنتا تو بارہ بار پڑھو۔ مگر پڑھو...‘‘

سموری سب لوگوں سے نہایت حاکمانہ شان سے بات کرتا تھا یہاں تک کہ بڑے خانساماں سے بھی، جو یوں ہی ہر وقت خاموش رہتا تھا۔ اور جب کسی سے بات کرتا تو اپنا نیچے کا ہونٹ حقارت سے لٹکا لیتا۔ اس کی مونچھیں تن جاتیں اور الفاظ اس کے منہ سے یوں نکلتے جیسے روڑے لڑھک رہے ہوں۔ لیکن مجھ پر وہ خاص طور پر سے مہربان تھا، میرا خیال کرتا تھا، حالانکہ اس کی مہربانی میں بھی کچھ ایسی بات تھی جس سے مجھے کچھ گھبراہٹ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا کہ نانی اماں کی بہن کی طرح اس باورچی کا بھی دماغ صحیح حالت میں نہیں تھا۔

کتاب پڑھوا کر سنتے سنتے کبھی ایک دم کہتا:

’’رک جاؤ۔ مت پڑھو...‘‘

پھر بڑی دیر تک لیٹا لیٹا، آنکھیں بند کئے، گہری سانسیں لیتا رہتا، بڑا سا پیٹ اوپر نیچے ہوتا ہاتھ میت کی طرح سینے پر بندھے ہوئے، بالوں سے بھری، جھلسی ہوئی انگلیاں اس طرح کانپتیں جیسے وہ غیر مرئی سلائیاں پکڑے غیر مرئی موزے بن رہا ہو۔

پھر ایک دم سے بڑبڑانے لگتا:

’’اب مثال کے طور پر پر دماغ ہی کر لو۔ بس لے کے دیکھو کہ آخر بن کیا سکتا ہے اس کا! دماغ بہت کم کو نصیب ہوتا ہے اور پھر بھی برابر کا نہیں۔ کاش سب کے پاس برابر دماغ ہوتا مگر نہیں ہے... کوئی سمجھتا ہے تو کوئی نہیں سمجھتا۔ کوئی سمجھنا چاہتا ہی نہیں!‘‘

الفاظ کو لڑکھڑا لڑکھڑا کر ادا کرتے ہوئے وہ مجھے اپنی زندگی کی کہانیاں سناتا۔ اس وقت کی کہانیاں جب وہ سپاہی تھا۔ مجھے اس کی سب کہانیاں بے تکی معلوم ہوتی تھیں اور کبھی ان میں کوئی دلچسپی پیدا ہی نہیں ہوتی تھی، خاص طور پر اس لئے کہ وہ شروع سے تو کہتا ہی نہ تھا، بیچ میں سے جہاں سے طبیعت چاہتی کہنے لگتا۔

''...تو رجمنٹ کا افسر اس سپاہی کو بلاتا ہے اور کہتا ہے: ''کیوں، لفٹنٹ نے تم سے کیا کہا تھا؟'' اور وہ سب کچھ کہہ دیتا ہے جیسے کا تیسا سنا دیتا ہے، کیونکہ سپاہی کو سچ بولنا ہوتا ہے۔ اور لفٹنٹ بت بنا، اس کے سامنے کھڑا دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہے، پھر منہ پھیر کر آنکھیں جھکا لیتا ہے۔ ہوں...''

پھر باورچی ایک گہری سانس اندر کو کھینچتا اور بڑبڑاتا:

''اب یہ نہیں کہہ سکتا ہوں کہ مجھ کو یہ بھی سلیقہ تھا کہ بھئی انسان کو کیا کہنا چاہئے، کیا نہ کہنا چاہئے۔ تو وہ لوگ اٹھا کر اس لفٹنٹ کو جیل میں ڈال دیتے ہیں اور اس کی ماں بولی... اف اے پروردگار! کسی نے مجھے کچھ نہیں پڑھایا سکھایا کبھی...''

موسم گرم تھا۔ ہر چیز آہستہ آہستہ ہلتے ہلتے گنگناتی جاتی تھی۔ کیبن کی فولادی دیواروں کے پرے اسٹیمر کے پہیے تھپ تھپ کرتے جاتے تھے اور پانی چھپا چھپ کرتا جاتا تھا۔ جہاز کی کھڑکی میں دریا کا پانی ایک چوڑے چکلے چشمے کی طرح ابلتا جاتا تھا، وادیوں کی زمین کا ایک حصہ دور سے دکھائی دے رہا تھا، درختوں کی قطاریں دھندلی دھندلی نظر آتی تھیں۔ میرے کان ان تمام آوازوں کی اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ مجھے اب صرف سناٹے کا احساس تھا حالانکہ اسٹیمر کی ناک والے حصے سے ایک ملاح برابر کہے جارہا تھا:

''سات۔ سات۔ سا۔ آ۔ آت... سا۔ آ۔ آت...''

میں چاہتا تھا کہ ہر چیز سے بالکل الگ تھلگ رہوں، نہ کچھ کروں، نہ کچھ سنوں، بس چھاؤں میں کسی جگہ بیٹھا رہوں، باورچی خانے کی چکٹی بو اور گرمی کی حد سے دور، اور وہاں بیٹھا بیٹھا اس خاموش تھکی ہوئی زندگی کو پانی کی سطح پر بہتے ہوئے نیم خواب آنکھوں سے دیکھتا رہوں۔

اور یکایک باورچی جھنجھلا کر بول پڑتا ''پڑھو!''

فرسٹ کلاس تک کے ویٹر اس سے ڈرتے تھے۔ بیچارا خانساماں بھی اس کے سامنے مسکین بھیگی بلی بنا رہتا تھا اور اس پر خوف چھایا رہتا تھا۔ جہاز کے باورچی خانے میں کام کرنے والوں میں سے کسی کو آواز دیتا:

''ابے او سور، ادھر آ! چوٹٹا کہیں کا، ادھر آ! وحشی... او مبرا کول!''

اسٹیمر میں سبھی کام کرنے والے اور خلاصی اس کی عزت کرتے تھے، اور اس کی نظروں میں عزیز

ہونے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ وہ انہیں سالن میں سے بوٹیاں نکال نکال کر دے دیا کرتا اور ان سے ان کے گھر والوں اور گاؤں کے حال چال پوچھتا۔ بیلوروسی خلاصی بیچارے سب سے زیادہ میلے کچیلے اور چکٹے ہوتے تھے اور سب سے زیادہ ذلیل بھی خیال کئے جاتے تھے۔ روسی لوگ انکو ''بھینسا'' کہتے تھے اور چڑایا کرتے تھے:

''بھینس کے آگے بین بجائے، بھینس کھڑی پگڑائے...''

سموری کو ان باتوں پر غصہ آتا تھا، مونچھیں تن جاتیں، چہرہ لال ہو جاتا اور خلاصیوں پر چیختا:

''ارے کیوں ان لوگوں کا جوتا چاٹتے ہو، سر پر چڑھائے لیتے ہو! ان روسی بچوں کا سر کیوں نہیں توڑ دیتے!''

ایک بار جہاز ہی کے صدر ملاح نے جو خوبصورت مگر بگڑے دل آدمی تھا، سموری سے کہا:

''بھینسا ہو یا یوکرینی، ایک ہی بات ہے۔ فرق ہی کیا ہے دونوں میں!''

سموری نے اس کی پیٹی پکڑی، گردن ناپی اور اس کو ہوا میں اٹھا کر چیخا:

''بول، کر دوں قیمہ!''

اکثر ایسے جھگڑے ہوتے جن کے آخر میں مار پیٹ کی نوبت آجاتی لیکن سموری پر کوئی ہاتھ نہیں اٹھاتا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ غیر انسانی طور پر مضبوط تھا، دوسرے یہ کہ اس سے کپتان کی بیوی سے بہت پٹتی تھی۔ وہ لمبے قد کی قبول صورت عورت تھی، مردانہ چہرہ اور لڑکوں کی طرح کٹے ہوئے بال۔

سموری بہت بہت سی وادکا پیا کرتا تھا لیکن کبھی اس کو نشہ نہ چڑھتا۔ صبح سے جو پینا شروع کرتا تو چار مرتبہ میں ایک بوتل صاف اور بیئر تو دن بھر سڑپا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے چہرے کا رنگ لال لال ہو جاتا، بھوری پتلیاں اور آنکھیں یوں پھیل جاتیں جیسے حیراں ہوں۔

بعض دفعہ وہ شام کو عرشے پر جا بیٹھتا تو گھنٹوں بیٹھتا رہتا۔ اس کا بڑا سا بھاری سا وجود، سفید کپڑوں میں ملبوس دور گہرائیوں کو خاموش اور اداس تکتا رہتا۔ ایسے موقعوں پر زیادہ تر لوگ تو اس سے خوف کھاتے مگر ترس آتا۔

یاکوف ایوانووچ باورچی خانے سے نمودار ہوتا، لال چہرہ، پسینے میں تر، اپنی گنجی کھوپڑی کھجاتا ہوا، سموری کی طرف دیکھ کر مایوسی سے ہاتھ نچاتا، اور پھر غڑاپ سے باورچی خانے میں غوطہ لگا جاتا یا پھر دور

سے آواز دیتا:

''تو کباب بنالے اس کے...''

''اور اگر کسی نے ابلی مچھلی مانگ لی، یا سوپ مانگ لیا؟''

''کباب بنالے۔ سب تھوڑ لینگے جو کچھ ملے گا۔ فرنہ کر۔''

کبھی کبھار میں ہمت کر کے اس کے پاس پہنچ جاتا۔

''کیا بات ہے، کیا چاہئے؟'' وہ بڑی مشکل سے میری طرف مڑ کر کہتا۔

''کچھ نہیں۔''

''تو ٹھیک ہے...''

ایک بار میں نے اس سے کہا:

''آپ سے ہر ایک شخص اتنا ڈرتا کیوں ہے، آپ تو بہت بھلے آدمی ہیں؟''

جب اس سوال پر اسے غصہ نہیں آیا تو مجھے تعجب ہوا۔

''وہ تو میں بس تیرے ساتھ بھلا آدمی ہوں'' ذرا سوچ کر بڑے اخلاق سے بولا ''یا ہو سکتا ہے سب ہی کے ساتھ ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں دکھاوا نہیں کرتا، لوگوں پر یہ ظاہر کبھی نہیں کرنا چاہئے کہ ہم نیک ہیں، ورنہ لوگ چیتھڑے اڑا دیتے ہیں۔ اچھے آدمی لوگ اس طرح چڑھ بیٹھتے ہیں جیسے دلدل میں سوکھی ریت کے کسی ڈھونکا پر... تب پھر وہ کمبخت ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ چل میرے لئے بیئر نکال لا تھوڑی سی...''

جب وہ دو چار گلاس بیئر چڑھا چکا تو مونچھوں کو چاٹتے ہوئے بولا:

''اگر تو اتنا پدی نہ ہوتا تو میں تجھ کو بہت کچھ عقل سکھاتا۔ دو چار باتیں کام کی جانتا ہوں۔ بیوقوف نہیں ہوں... تجھے کتابیں پڑھنی چاہئے، جو کچھ تجھے جاننا چاہئے وہ سب تجھے کتابوں سے مل جائے گا۔ کتاب بڑی زوردار چیز ہوتی ہے۔ بیئر لے گا؟''

''مجھے اچھی نہیں لگتی۔''

''ٹھیک ہے، پینا مت شروع کر دینا۔ پینا بڑی بری بلا ہے! وادکا تو سمجھ بس شیطان کی تخلیق ہے! اگر میرے پاس پیسے ہوتے تو تجھے اسکول بھیجتا۔ جاہل بھی کیا انسان ہوتا ہے۔ وہ تو بیل ہوتا ہے بیل! یا

کندھوں پر جوا رکھ کے چلوا لو یا کاٹ کر کباب بنالو اس کے۔ دم پھڑ پھڑ ہلانے کے سوا جانتا بھی کیا ہے وہ...''

کپتان کی بیوی نے اس کو گوگول کی کتاب کی ایک جلد دی تھی اور میں نے ''انتقام خوفناک'' اس کو پڑھ کر سنائی۔ مجھ کو تو فوراً پسند آ گئی لیکن سمورئی غصے میں چیخا:

''کیا بیکار کی بکواس بھری ہے اس میں، پریوں کی کہانی لگتی ہے! مجھے یقین ہے دنیا میں اور بھی بہت سی اچھی اچھی کتابیں ضرور ہوں گی...''

اس نے مجھ سے کتاب لے لی اور ایک اور کتاب کپتان کی بیوی سے مانگ لایا۔

''اے لے یہ پڑھ۔ تاراس... اس کا دوسرا نام کیا ہے؟''

اس نے کھوئے ہوئے انداز میں حکم دیا۔ ''ذرا پتہ لگا تو کہانی کیسی ہے، وہ کہتی ہے اچھی ہے۔ اب کس کے لئے اچھی ہے؟ کون جانے ممکن ہے اس کے لئے اچھی ہو، میرے لئے بری ہو۔ دیکھتا ہے اس نے اپنے بال کیسے کاٹ رکھے ہیں! تعجب ہے اپنے کان بھی کیوں نہیں کاٹ ڈالتی!''

جب ہم اس جگہ پہونچے جہاں تاراس نے استاپ کو لڑائی کا چیلنج دیا تو باورچی غرغرا کے ہنس پڑا:

''کیوں، کیسی جچی یہ بات؟ ایک کے پاس دماغ ہے، دوسرے کے پاس کس بل ہے۔ کیا باتیں لکھتے ہیں یہ لوگ! اونٹ کہیں کے، بے ہنگم...''

وہ غور سے سنتا تھا لیکن اکثر بڑبڑایا کرتا تھا:

''اونہہ، بے وقوف کی بات! بھلا ایک وار میں انسان کو کندھے سے کمر تک کیونکر کاٹا جا سکتا ہے، ہو ہی نہیں سکتا ایسا! اور انسان کو نیزے پر اٹھا ہی نہیں سکتے۔ نیزہ ٹوٹ کر دو ہو جائے گا! کیا سپاہی نہیں ہوں، اتنا نہیں جانتا؟...''

جب اندرئی کی غداری کا حال پڑھا گیا تو اس کو سخت صدمہ ہوا:

''غلیظ کہیں کا! اور وہ بھی ایک عورت کی خاطر! اونہہ...''

لیکن جب تاراس نے اپنے بیٹے کو گولی ماری تو باورچی نے اپنے دونوں پیر ٹنڈ سے نیچے لٹکا لئے، پٹی کو ہاتھوں میں مضبوط پکڑ لیا اور رونا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ اس کے آنسو فرش رپ گر رہے تھے۔ سوں سوں کرتا جاتا اور بڑبڑاتا جاتا:

''اے خدا... اے پروردگار...''

پھر ایک دم مجھ پر چیخا:

''پڑھتے جاؤ، شیطان کی اولاد!''

لیکن جب سزا یافتہ استاپ نے چلا کر اپنے باپ سے کہا ''ابا! سنتے ہیں آپ میری آواز!'' تو وہ اور بھی زور زور سے اور تلخی سے رونے لگا، اور روتے روتے مدہم آواز میں منمنا کے بولا:

''سب ختم ہو گیا۔ سب کچھ تو یہ ہے انجام! ہائے کیا کمبختی کا معاملہ تھا۔ ہاں یہ لوگ بے شک انسان تھے، اس زمانے میں بے شک انسان پیدا ہوتے تھے۔ وہ تاراس... کیوں؟ واقعی مرد تھا، اور پروردگار...''

اس نے میرے ہاتھ سے کتاب لے لی اور اس کو غور سے دیکھتے ہوئے اسے اپنے آنسوؤں سے بھگو دیا۔

''اچھی کتاب بھی بڑی ہی تفریح ہے!''

اس کے بعد ہم دونوں نے ''آئی وان ہو'' پڑھی۔ سموری کو رچرڈ پلانجنٹ پسند آیا۔ متاثر ہو کر بولا ''ہاں اسے کہتے ہیں بادشاہ!'' لیکن مجھے اس کتاب نے بور کر دیا۔

ہم دونوں کا ذوق بالکل مختلف تھا۔ مجھے ''ٹامس جونس کی کہانی'' اچھی لگتی تھی، جو ''تاریخ ٹامس جونس لاوارث'' کا پرانا ترجمہ تھا، لیکن سموری بڑبڑاتا:

''اونہہ، واہ ٹامس ہمارا کیا لگتا ہے؟ مجھے اس سے کیا لینا؟ ضرور اور بھی کتابیں ہوں گی...''

ایک دن میں نے اسے بتایا مہ میں ایک خاص قسم کی کتابوں کے متعلق جانتا ہوں۔ ممنوع کتابیں، جو صرف رات کے وقت اور وہ بھی تہہ خانوں کے اندر پڑھی جا سکتی تھیں۔

اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، مونچھوں کے بال تن گئے۔

''وہ کیا ہوتی ہیں؟ یہ کیا جھوٹ بکواس کرتے ہو؟''

''نہیں، میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ ایک مرتبہ اقبال گناہ کے وقت پادری صاحب نے مجھ سے ان کے بارے میں پوچھا تھا۔ اور اس سے پہلے میں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ لوگ ان کو پڑھتے اور روتے ہیں۔''

سموری نے میری طرف بیزاری سے دیکھا اور پوچھا:

''کون رویا تھا؟''

''ایک خاتون جو سن رہی تھیں، دوسری تو مارے خوف کے اٹھ کر بھاگ گئیں...''

''اے کیا خواب دیکھ رہا ہے۔ اٹھ بیٹھ'' سموری نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر کہا۔ ایک پل ٹھیر کر پھر بولا:

''یقیناً کہیں نہ کہیں کچھ باتیں چھپی ہوئی ضرور ہیں... ہو ہی نہیں سکتا کہ نہ ہوں... لیکن میں تو اب بہت بڈھا ہو گیا ہوں... اور اس قسم کا ہوں بھی نہیں۔ پھر بھی اگر سوچا جائے تو...''

وہ اس شان سے گھنٹوں بولتا رہ سکتا تھا۔

لاشعوری طور پر میں نے پڑھنے کی عادت ڈال لی اور پڑھنے میں مجھے لطف آنے لگا۔ کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہ زندگی سے بالکل مختلف ہوتا تھا اور بڑا پرلطف ہوتا تھا۔ زندگی کا بوجھ اور بڑھ جاتا تھا۔

سموری بھی کتابوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ اکثر وہ مجھے کام کرنے سے آواز دے کر بلا لیتا:

''پیشکوف، آؤ، پڑھو۔''

''اور یہ ڈھیروں برتن جو دھونے کو پڑے ہیں؟''

''میکسم دھولے گا۔ تم آؤ۔''

بڑے برتن دھونے والے کو ڈپٹ کر وہ میرے کام پر جوت دیتا اور وہ بدلا لینے کے لئے برتن توڑتا۔ بڑے خانساماں نے بھی آہستگی مجھے اشارہ کیا:

''اسٹیمر سے نکال دوں گا اگر یہی وطیرہ رہا تو۔''

ایک دن میکسم نے جان بوجھ کر میلے پانی کے ایک طشلے میں کچھ گلاس چھوڑ دئے۔ جب میں نے جہاز کی منڈیر پر سے طشلہ الٹایا تو گلاس بھی ساتھ ہی رخصت ہو گئے۔

''میری غلطی ہے یہ!'' سموری نے بڑے خانساماں سے کہا ''میں ڈنڈ بھر دوں گا۔''

اور جو ویٹر تھے وہ بھی مجھ پر آنکھیں نکالتے تھے۔ ''ہوں، کتاب کا کیڑا، تنخواہ کس بات کی ملتی ہے'' وہ کہتے۔

جان بوجھ کر وہ ڈھیروں برتن جھوٹے کر کے میرا کام بڑھاتے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اس کا انجام برا ہوتا ہے اور میرا یہ خیال غلط بھی نہ تھا۔

ایک روز شام کو کسی گھاٹ پر لال لال چہرے والی ایک بڑھیا ہمارے اسٹیمر پر سوار ہوئی، اس کے

ساتھ ایک لڑکی بھی، جس کے سر پر ایک زرد رنگ کا رومال بندھا ہوا تھا اور گلابی رنگ کی قمیص پہنے ہوئے تھی۔ دونوں تھوڑا تھوڑا اپئے ہوئے تھیں۔ جو کوئی بھی سامنے سے گزرتا، عورت مسکراتی اور اس کے آگے جھکتی اور پادری کی طرح گا گا کر فقرے ادا کر رہی تھی:

''معاف کرنا میرے پیارو! میں نے تھوڑی سی پی ہے۔ لوگ مجھے عدالت میں لے گئے تھے نا، اور پھر میں رہا کر دی گئی۔ اور اس خوشی میں میں نے تھوڑی سی پی لی ہے، تھوڑی سی...''

لڑکی بھی ہنس رہی تھی اور ہر ایک کی طرف دھندلی نظروں سے دیکھ دیکھ کر عورت کے پہلو میں ٹہوکے مارتی جاتی تھی ''چل بھی حرافہ، چل چل...''

وہ دونوں سکنڈ کلاس کے قریب اس کیبن کے آگے بیٹھ گئیں جس میں یاکوف ایوانووچ اور سرگئی سوتے تھے۔ عورت تو فوراً ہی نہ جانے کہاں غائب ہوگئی اور سرگئی لڑکی کے پہلو میں براجمان ہو گیا۔ مینڈک جیسا منہ کھیسیں نکالنے سے، یہاں سے وہاں تک چر گیا تھا۔

اس رات کام ختم کرنے کے بعد میں اس میز پر چڑھ بھی چکا تھا جہاں میں سوتا تھا، جب سرگئی میرے پاس پہونچا اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولا:

''آؤ بھی۔ چلو تمہارا جوڑا ملا دیں...''

وہ نشے میں دھت تھا۔ میں نے ہاتھ چھڑانا چاہا تو مجھے ایک تھپڑ مارا:

''چل۔ آ رے آنا۔ چل!''

پھر میکسم بھی دوڑتا ہوا پہونچا۔ وہ خوب پئے ہوئے تھا۔ دونوں مل کر مجھے عرشے پر کھینچے ہوئے، سوتے ہوئے مسافروں کے پاس سے گھسیٹتے ہوئے، اپنے کیبن کی طرف لے گئے۔ لیکن سمورئی دروازے کے پاس کھڑا تھا اور دہلیز پر یاکوف ایوانووچ لڑکی کا راستہ روکے اس کے سامنے ہی کھڑا تھا۔ لڑکی اس کی پیٹھ پر گھونسہ مار رہی تھی اور نشہ بھری آواز میں روتی جا رہی تھی:

''مجھے جانے دو...''

سمورئی نے مجھے سرگئی اور میکسم کے ہاتھوں سے گھسیٹا، ان دونوں کے بال پکڑے اور زور سے دونوں کا سر آپس میں ٹکرا دیا، پھر دونوں کو گھما کر پھرکی کی طرح نچاتے ہوئے عرشے پر دھکیل دیا۔

''وحشی! آدم خور!'' اس نے یاکوف سے کہا اور اس کے منہ پر دروازہ بند کر دیا، پھر اس نے مجھے

دھکیلا اور بھونکا:

''نکل یہاں سے!''

میں دنبالے میں بھاگا۔ رات ابرآلود تھی، دریا تاریک تھا۔ جہاز اسے چیرتا ہوا چلتا تو اس کے پیچھے دومٹیالے راستے نامعلوم ساحلوں کی طرف مختلف اطراف میں دور تک جاتے نظر آتے، انہیں کے بیچ میں بجرا اچل رہا تھا۔ سرخ روشنیاں کبھی بائیں طرف نظر آتیں کبھی دہنی طرف۔ ان سے کسی چیز پر اجالا نہ پڑتا۔ وہ تیزی سے دریا کے پیچ وخم میں گم ہو جاتیں۔ جب روشنیاں مٹ جاتی تھیں تو رات اور بھی زیادہ تاریک، پہلے سے بھی زیادہ ہولناک لگنے لگتی تھی۔

سموری آ کر میرے پاس بیٹھ گیا، گہری آہ بھری اور ایک سگریٹ جلایا۔

''کیا وہ لوگ گھسیٹ کر لے گئے تھے تمہیں اس آوارہ لڑکی کے پاس؟ سور کہیں کے! میں نے اسی وقت سن لیا تھا جب وہ لپکے...''

''کیا آپ نے اس لڑکی کو ان لوگوں سے بچایا؟''

''لڑکی کو؟'' اسنے لڑکی کو ایک گالی دی اور بڑی دردناک آواز میں اپنی بات جاری رکھی ''یہاں سب کتے ہیں، سور! اسٹیمر تو گاؤں سے بھی زیادہ بری جگہ ہے۔ تم کبھی گاؤں میں رہے ہو؟''

''نہیں۔''

''گاؤں تو جڑ تک گندگی ہے بس! خاص کر جاڑوں میں...''

اس نے سگریٹ کا ٹوٹا پانی میں پھینکا اور مختصر خاموشی کے بعد اپنی بات جاری رکھی:

تم ان سوروں کی بھیڑ میں مل جاؤ گے۔ مجھے تمہارے اوپر ترس آتا ہے، کبھی کبھی تو یہ جی چاہتا ہے کہ بس کیا اٹھا رکھوں.... ہاتھ تک جوڑوں، پیر تک پڑوں، ان سے کہوں ''حرامیو، یہ کیا حرکت ہے تمہاری؟ اندھے ہو گئے ہو کیا؟ اونٹ کہیں کے، بے ہنگم!..''

اسٹیمر نے ایک طویل سیٹی دی، رسیاں پانی میں چھپا چھپ کرنے لگیں، رات کے اندھیرے میں ایک لالٹین کی روشنی ادھر سے ادھر ڈولنے لگی، جس سے پتہ چلتا تھا کہ گودی کہاں پر ہے۔ کنارے پر اور بھی روشنیاں جھانکتی نظر آتی تھیں۔

سموری بڑبڑایا:

نشیل جنگل! اور ایک دریا بھی نشیلا دریا۔ ایک زمانے میں ایک افسر تھا جس کا نام تھا نشیلے خان۔ اور کلرک تھا مست شاہ...لو بھی ہم تو چلے کنارے پر.....''

دریائے کام کے اطراف کی رہنے والی مضبوط کنارے پر...'' لمبے لمبے ٹھیلوں پر لکڑیاں لا رہی تھیں۔ لچکتے ہوئے پاؤں سے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتیں، اپنے بوجھ تلے جھک جھک جاتیں۔ دو دو آتیں اور خلاصیوں کے گودام کے سیاہ منہ میں چار چار فٹ لمبی لکڑیاں ''ہیا ہو، ھیا ہو!'' کر کر کے جھونکتی جاتیں۔

جب وہ لکڑیاں جھونکتیں تو جہاز کے عملے کے لوگ ان کی ٹانگیں اور چھاتیاں پکڑنے کی کوشش کرتے اور وہ چیخ مار مار کر ان پر تھوکتیں۔ واپسی پر یہ عورتیں اپنے آپ کو چٹکیوں اور تھپڑوں سے بچانے کے لئے ٹھیلے سے مقابلہ کرتیں۔ میں نے سینکڑوں ہی بار، ہر سفر میں، یہ منظر دیکھا تھا۔ جہاں بھی ہم رکتے اور لکڑیاں بھرتے وہاں یہ سماں نظر آتا۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے میں بہت بوڑھا ہوں اور اس اسٹیمر پر ایک مدت سے رہتا ہوں اور مجھے سب معلوم ہے کہ اب کل کیا ہوگا، اگلے ہفتہ کیا ہوگا اور موسم خزاں میں کیا ہوگا اور اگلے سال بھی۔

اب ہلکی ہلکی روشنی ہونے لگی ساحل کے ڈھلان پر گودی سے بھی اونچا دیودار کا جنگل نظر آ رہا تھا۔ کنارے پر عورتیں پہاڑ کی بلندیوں پر چڑھ رہی تھیں۔ ہنستی، کھلکھلاتی، گاتی، چیختی۔ لمبے لمبے ٹھیلے پکڑے وہ سپاہیوں کی طرح لگتی تھیں۔

مجھے رونا آ رہا تھا، آنسو سینے میں مچل رہے تھے اور دل پر ایسا بوجھ محسوس ہوتا تھا جس سے سخت کوفت ہو رہی تھی۔

لیکن مجھے آنسو بہاتے بھی شرم آتی تھی، لہذا میں جا کر جہازی رنڈین کی مدد کرنے لگا جو عرشے کو گیلے کپڑے سے پونچھ رہا تھا۔

رنڈین بیچارہ بڑا ہی معمولی سا آدمی تھا۔ زرد بے رنگ چہرہ ادھر ادھر کونے کھدرے میں بیٹھا اور بس وہاں سے چھوٹی چھوٹی آنکھیں جھپکایا کرتا۔ ایک بار مجھ سے بولا:

''میرا اصلی نام تو رنڈین نہیں ہے، بلکہ...میری ماں پیشہ کرتی تھی...اسی لئے رنڈین...میری بہن بھی ہے۔ وہ بھی پیشہ کرتی ہے۔ ایسا لگتا ہے ان دونوں کا مقدر یہی ہے۔ میرے بھائی قسمت تو گلے کا

ڈھول ہے، بھاری پتھر ہے۔ انسان کتنا بھی اٹھنا چاہے وہ اسے نیچے ہی کو گھسیٹتی ہے، کہتی ہے۔ لو اٹھو اور اٹھو...''

اس وقت فرش کو پونچھتے پونچھتے وہ آہستگی سے بولا:

''دیکھو کیسا لڑکیوں کو نوچتے ہیں یہ لوگ؟ ذرا ان کو دیکھے کوئی۔ اگر انسان جی لگا کے خوب کوشش کرے تب تو ظاہر ہے گیلا کندہ ہی بھڑک اٹھیگا! یہ بات مجھے پسند نہین ہے، بھائی۔ میرے گلے نہیں اترتی۔ اگر میں لڑکی ہوتا تو کسی اندھے کنویں میں ڈوب مرتا۔ خدا کی قسم!... اپنا جو فرض ہے وہی انجام دینا مشکل ہے اوپر سے اپنے جذبات کو اور بھڑکا دے انسان! میں تم سے کہتا ہوں یہ آختے جو ہو جاتے ہیں، یہ کوئی احمق نہیں ہیں۔ آختہ کبھی سنا ہے کس کو کہتے ہیں؟ ہجڑے کو۔ بڑے تیز لوگ ہوتے ہیں یہ۔ انہوں نے زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ سیکھ لیا ہے: زندگی کی سب چھوٹی موٹی گندی باتوں پر لعنت بھیجی اور بس خدا خدا کرتے ہیں۔ پاکیزہ زندگی مزے کی...''

کپتان کی بیوی سایہ اونچا کئے پاس سے گذری کہ پانی سے نہ بھیگے۔ گیلے گیلے دھبوں کے بیچ بیچ میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ بہت سویرے اٹھتی تھی۔ اس کا قد لمبا اور جسم پر شکوہ تھا، شکل سے ایسی سیدھی سادی اور صاف گو لگتی تھی کہ میرا جی چاہتا کہ اس کے پیچھے دوڑوں اور دل و جان سے کہوں:

''مجھے بتا دو۔ مجھے بتا دو نا!...''

آہستہ آہستہ اسٹیمر گودی سے روانہ ہونے لگا۔

''لیجئے، چل پڑے ہم لوگ...'' رنڈین نے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا۔

6

سارا پول پر میکسم اسٹیمر سے اتر گیا۔ وہ بالکل خاموشی سے گیا۔ نہ کسی سے رخصت ہوا، نہ کسی سے خدا حافظ کہا، بس سکون و سنجیدگی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اس کے پیچھے وہ رنگین مزاج عورت بھی اتری، ابھی تک وہ ہنس رہی تھی۔ لڑکی بھی ساتھ ملی دلی آنکھیں سوجی ہوئی۔ سرگئی بڑی دیر تک کپتان کے کمرے کے آگے دوزانو جھکا رہا اور دروازے کی چوکھٹ کو چوم چوم کر اس پر اپنا ماتھا ٹیکتا رہا:

''معاف کر دیجئے۔ بخش دیجئے مجھے!'' وہ زار زار رو کے کہہ رہا تھا۔ ''میرا کوئی قصور نہیں۔ یہ سب میکسم کا کیا دھرا ہے...''

اسٹیمر کے سارے عملے، باورچی خانے کے سارے نوکروں اور بہت سے مسافروں کو بھی معلوم تھا کہ وہ بالکل جھوٹ بول رہا ہے، لیکن وہ اسے بڑھاوا دیتے رہے:

''مانگو معافی، ہاں مانگو معافی۔ وہ معاف کر دیں گے!''

کپتان نے اس کو لات مار کر دھکیل دیا لیکن پھر معاف کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے سرگئی عرشے پر ادھر ادھر ناشتے کی کشتیاں لئے دوڑتا پھر رہا تھا اور لوگوں کی طرف پیار کی نظروں سے دیکھتا جاتا تھا جیسے کوئی پٹا ہوا کتے کا پلا۔

میکسم کی جگہ ایک آدمی رکھا گیا جو ویاتکا کا رہنے والا تھا اور پہلے سپاہی رہ چکا تھا۔ سوکھا سہا، چھوٹا سا سر، آنکھوں میں بادامی اور سرخ رنگ ملا جلا۔ باورچی کے میٹ نے فوراً اس کو بھیجا کہ مرغیاں ذبح کر لاؤ۔ سپاہی نے دو تو ماریں اور باقی سب چھوٹ کر عرشے پر ادھر ادھر دوڑنے لگیں۔ مسافروں نے بھی انہیں پکڑنے کی کوشش کی تو تین مرغیاں جہاز پر سے اڑ کر پانی میں کود گئیں۔ مایوس ہر کر وہ سپاہی باورچی خانے کے پاس رکھے ہوئے لکڑیوں کے ڈھیر پر بیٹھ گیا اور زار وقطار رونے لگا۔

سموری نے حیران ہو کر پوچھا:

''ابے کیا ہوا بے گدھے! کہیں سپاہی بھی روتے ہیں؟''

سپاہی نے آہستہ سے جواب دیا:

''میں لڑتا نہیں تھا۔''

بس اس جواب نے اس کی کمبختی بلا دی۔ آدھے گھنٹے کے بعد لوگ ایک ایک کر کے آتے، اس کو گھورتے اور پوچھتے ''یہی سپاہی؟'' اور پھر قہقہے مار کر ہنستے، ایسی ہنسی جس سے سخت کوفت ہوتی۔

پہلے پہل تو سپاہی نے نہ ان لوگوں کا خیال کیا نہ ان کی ہنسی کا۔ وہ اپنی پرانی سوتی قمیص کی آستین سے آنسو پونچھتا رہا گویا آنسوؤں کو آستین میں چھپاتا۔ لیکن پھر جلد ہی اس کی سرخ مٹیالی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں اور ویاتکا کے خاص انداز میں چوں چوں کر کے گنگنانے لگا ''ارے مجھے پر کیوں دیدے نکالتے ہو؟ جہنم میں جاؤ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، سدا کے لئے...''

اس بات نے لوگوں کو اور گدگدایا۔ اس کی پسلیوں میں انگلیاں چبھونے لگے اور اس کی قمیص اور اپرن کھینچ کھینچ بھاگنے لگے اور بڑی بیدردی سے بکرے کی طرح اسے چھیڑتے رہے، یہاں تک کہ کھانے کا وقت ہو گیا۔ کھانے کے بعد کسی نے نیبو کا ایک چھلکا ایک لکڑی کے چمچے سے باندھ کر اس کے اپرن کے پیچھے لٹکا دیا۔ جب وہ چلا تو چمچہ ادھر ادھر ڈولنے لگا۔ ہر شخص کو ہنسی آ رہی تھی اور وہ پریشان تھا کہ آخر لوگ کیوں مذاق کر رہے ہیں۔ اس وقت وہ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بے بس چوہا جال میں پھنس جائے۔

سموری اسے برابر دیکھتا جا رہا تھا مگر بولا ایک لفظ نہیں۔ بہت سنجیدہ رہا، چہرے پر ایسی نرمی اور شفقت تھی جیسے کسی عورت کا چہرہ ہو۔ مجھے سپاہی پر ترس آ رہا تھا، سموری سے پوچھا:

''اس کو چمچے کی بات بتا دوں؟''

اس نے خاموشی سے سر ہلایا۔

جب میں نے سپاہی کو بتایا کہ سب لوگ کس بات پر ہنس رہے ہیں تو اس نے جھٹ چمچے کو ٹٹولا، اسے کھینچا اور فرش پر پٹک کر پاؤں سے کچلا اور دونوں ہاتھوں سے میرے بال پکڑ لئے۔ ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ باقی سب لوگوں کو بڑا مزہ آیا اور ایک دم ہمارے چاروں طرف تماشائی اکٹھے ہو گئے۔

سموری نے سب کو منتشر کیا اور ہم دونوں کو کھینچ کر الگ کیا، پہلے میرا کان اینٹھا، پھر سپاہی کا کان کھینچا۔ جب وہ دبلا پتلا منحنی آدمی اپنے کو چھڑانے کی کوشش میں بل کھانے اور اینٹھنے لگا تو لوگ چیخنے اور سیٹی بجانے لگے، زمین پر زور زور سے پیر پٹکنے لگے اور ہنسی کے مارے دوہرے ہو ہو گئے۔

واہ، واہ، فوج کی جئے ہو! ارے باورچی کے پیٹ میں لات رسید کرنا!..''

انسانوں کے اس گلے کی مجنونانہ سرخوشی دیکھ کر میرا جی ایسا چاہا کہ ایک بڑا لکڑا اٹھاؤں اور ان سب کے گندے سر پر دے ماروں کہ بھیجا نکل جائے۔

سموری نے سپاہی کو چھوڑ دیا اور جنگلی سور کی طرح تماشائیوں پر ٹوٹا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف تھے، دانت باہر کو نکلے ہوئے مونچھیں کھڑی ہو گئی تھیں۔

''چلو اپنے اپنے ٹھکانے چلو! ایک دو تین! چلو وحشی...''

سپاہی مجھے پر پھر لپکا لیکن سموری نے اسے ایک ہاتھ سے اٹھا لیا اور دنبالے میں گیا۔ وہاں اس نے اس کے سر کو نل میں گھسیٹ کر خوب تریڑے دئے اور سپاہی کے منحنی جسم کو یوں گھمایا جیسے وہ چیتھڑے کی گڑیا

ہو۔ جہاں کے کچھ ملاح، صدر ملاح اور میٹ دوڑتے ہوئے آپہونچے۔ پھر بھیڑ جمع ہو گئی۔ ہر شخص سے اونچا بڑا خانساماں لگ رہا تھا، اسی طرح خاموش اور لجایا ہوا جیسے ہمیشہ دکھتا تھا۔

سپاہی لکڑیوں کے ڈھیر پر بیٹھ گیا اور کانپتے ہاتھوں سے اپنے جوتے کھولنے لگا، پھر اس نے جوتوں کے اندر رکھا ہوا گودڑ نکالا اور اس کو نچوڑنے لگا لیکن وہ بالکل سوکھا تھا، اس کے چھدرے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا اور تماشائیوں کو اس منظر پر پھر ہنسی آرہی تھی۔

سپاہی باریک اونچی آواز میں بولا ''دیکھتے جاؤ، اس لڑکے کو مار کر رہی رہوں گا۔ مار ہی ڈالوں گا جان سے!''

سموری نے میرے کندے پر ہاتھ رکھا اور بڑے میٹ کے کان میں کچھ کہا۔ ملاحوں نے بھیڑ کو منتشر کر دیا۔ جب سب لوگ ہٹ گئے تو سموری نے سپاہی سے کہا:

''بھئی، اب ہم تمہارا کیا کریں؟''

سپاہی چپ رہا۔ وہ میری طرف خونی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور سارے جسم پر ایک عجیب سی تھر تھراہٹ طاری تھی۔

''اٹنشن! بیہودہ کہیں کا، بڑبڑ بڑبڑ کئے جا رہا ہے!'' سموری نے کہا۔

''اونہہ، خواہ مخواہ۔ یہ کوئی فوج تھوڑا ہی ہے!'' سپاہی نے جواب دیا۔

میں نے دیکھا کہ باورچی اس جواب کے لئے تیار نہ تھا، اس لئے کچھ بوکھلا گیا، پھولے ہوئے گال پچک گئے، زور سے زمین پر تھوکا اور مجھے ساتھ لئے چل پڑا۔ میں بہت پریشان اور گھبرایا ہوا تھا۔ بار بار مڑ کر سپاہی کو دیکھتا لیکن سموری بے تکے پن سے بڑبڑایا ''کیا اینٹھے خان ہے! کیوں؟ اونہہ، آؤ چلو بھی...''

سرگئی دوڑتا ہوا آپہنچا اور نہ جانے کیوں سرگوشی میں بولا ''ارے، وہ اپنا گلا کاٹنا چاہتا ہے!''

''کیا۔آ۔آ؟'' سموری چیخا اور واپس بھاگا۔

سپاہی باورچی خانے کے نوکروں کے کیبن کے دروازے میں کھڑا تھا، ہاتھ میں وہ بڑی سی چھری تھی جس سے مرغیوں کے سر اڑائے جاتے تھے اور لکڑی کی چھپٹیاں کاٹی جاتی تھیں۔ چھری کند تھی اور آری کی طرح چلتی تھی۔ کیبن کے سامنے ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا اور اس مخنی انسان کو گھور گھور کر تکے جا رہا تھا

جس کے بالوں سے ابھی تک پانی ٹپک رہا تھا۔ اس کا چہرہ جیلی کی طرح تھل تھل کر رہا تھا، پکوڑا سی ناک کانپ رہی تھی، کھل گیا تھا، ہونٹ کپکپا رہے تھے اور وہ بدبداتا جا رہا تھا:

''ظالم... ظالم.... بیدرد...''

میں لپک کر کسی چیز پر چڑھ گیا اور لوگوں کے سروں پر سے ان کے چہروں کو دیکھتا رہا۔ وہ مسکرا رہے تھے اور کھلکھلا رہے تھے اور ایک دوسرے کو ٹہوکے دے رہے تھے:

''دیکھو، دیکھو...''

جب وہ اپنے بچوں کے سے چھوٹے چھوٹے چمرخ ہاتھوں سے قمیص کو پتلون کے اندر ٹھونسنے لگا تو میرے قریب کھڑے ہوئے ایک وجیہ آدمی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا:

''مرنا ہے تو قمیص کیوں اندر ٹھونس رہا ہے...''

پبلک اور بھی زور سے ہنسی۔ بالکل ظاہر ہو رہا تھا کہ ہر شخص کو یقین ہے کہ وہ اپنے جان نہیں لے سکتا، مجھے بھی یقین نہیں تھا۔ لیکن سموری نے اس کو اچٹتی نظروں سے دیکھا اور پھر اپنی توند سے لوگوں کو ٹھیلنے لگا اور کہتا جاتا تھا:

''دور ہو، احمق کہیں!''

وہ اس لفظ کو واحد نہیں بلکہ جمع کے لئے استعمال کیا کرتا تھا۔ بھیڑ میں جاتا تو اکٹھے سب کے لئے یہ لفظ استعمال کرتا:

دو ہو، احمق کہیں کا!''

یہ بات تو بڑی مضحکہ خیز تھی لیکن صحیح بھی تھی اس لئے کہ آج صبح سے تو جتنے بھی لوگ تھے، وہ بس اکٹھے ''احمق کہیں کا'' بنے ہوئے تھے اور وہ بھی نہایت بھاری قسم کا۔

جب بھیڑ کا چھانٹ چکا تو سپاہی کے پاس پہونچا اور اپنا ہاتھ بڑھایا۔

''چھری مجھے دو...''

''ایک ہی بات ہے'' سپاہی نے چھری دیتے ہوئے کہا۔

باورچی نے وہ چھری مجھے بڑھادی اور سپاہی کو کیبن میں دھکیلا ''لیٹ جاؤ اور سو رہو ذرا سا، یہ آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟''

سپاہی ایک لفظ کہے بغیر ٹنڈ پر بیٹھ گیا۔

''یہ لڑکا تمہارے لئے کچھ کھانے کو لائے گا اور پینے کو تھوڑی سی وادکا۔ وادکا پیتے ہو؟''

ذرا سی پی لیتا ہوں...''

''اور دیکھو خبردار جو تم نے اس کو ہاتھ لگایا۔ وہ نہیں اڑا رہا تھا تمہارا مذاق، سنتے ہو۔ میں جو تم سے کہتا ہوں وہ نہیں ہنس رہا تھا تم پر...''

سپاہی نے آہستہ سے کہا ''مگر ان لوگوں نے آخر کیوں اس طرح میرا مذاق اڑایا، مجھے ستایا؟''

سموری نے ایک منٹ تک کچھ نہیں کہا پھر آخر کار بولا ''بھلا میں کیا جانوں؟ مجھے کیا معلوم؟''

میں اور سموری باورچی خانے میں چلے گئے، وہ جاتے جاتے بڑبڑا رہا تھا:

ہنہہ... کیا اول جلول نمونہ پکڑا ہے ان لوگوں نے بھی۔ دیکھا تم نے؟ لوگوں کو مجمع ہو جائے تو پھر انسان کو پاگل بنا سکتے... ہاں پاگل بنا دیتے ہیں...اور ایسے چپک جاتے ہیں آدمی کو جیسے کھٹمل، اور بس! پھر اللہ دے اور بندہ لے! کیا کہہ رہا ہوں کھٹمل، اور بس! پھر اللہ دے اور بندہ لے! کیا کہہ رہا ہوں۔ کھٹمل؟ ارے نہیں، کھٹمل سے ہزار درجہ بدتر، ہزار درجے!...''

میں کچھ روٹی، گوشت اور وادکا لے کر سپاہی کے پاس گیا۔ وہ ٹنڈ پر بیٹھا، آگے پیچھے ہل رہا تھا اور عورتوں کی طرح چپکے چپکے رو رہا تھا۔ میں نے پلیٹ میز پر رکھ دی اور کہا:

کھاؤ...''

''دروازہ بند کر دو۔''

''اندھیرا ہو جائے گا۔''

''نہیں، بند کر دو، ورنہ وہ لوگ پھر آ جائیں گے...''

میں باہر نکل گیا۔ مجھے اس سپاہی سے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی، اس پر نہ تو رحم آ رہا تھا نہ اس سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے بڑا عجیب لگ رہا تھا، نانی اماں نے تو ہمیشہ مجھ سے کہا تھا کہ ''لوگوں پر ترس کھانا چاہئے، بیچارے بدنصیب، جفاکش، لشٹم پشٹم زندگی گذارتے چلے جاتے ہیں...''

لوٹ کر پہونچا تو سموری نے مجھ سے پوچھا ''کیوں دے آئے اسے؟ کیا حال ہے اس کا؟''

''رو رہا ہے۔''

''انہہ... پھٹیچر کہیں کا! ایسے کو کیا سپاہی کہتے ہیں؟''

''مجھے اس پر ترس نہیں آتا۔''

''یعنی اس کا کیا مطلب؟''

''اورانسان کو لوگوں پر ترس کھانا چاہئے...''

سمورئی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور تنبیہ کے لہجے میں کہا:

''تم کو ترس تو نہیں آرہا ہے پھر جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ؟ اب بیکار کو مت پسیجو، پتہ ہے کہ تمہارے دماغ میں کیا ہے۔''

پھر مجھے دھکیلتے ہوئے ذرا افسوس ناک لہجے میں بولا:

''یہ جگہ تمہارے لائق نہیں! لو سگریٹ پیو...''

جہاز کے مسافروں کے رویہ سے میرے جذبات میں ہل چل مچ گئی تھی۔ جس طرح ان لوگوں نے اس سپاہی کو چھیڑا تھا اور جب سمورئی نے اس کا کان کھینچا تھا تو خوشی کے مارے ہنسے تھے، اس سے مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں اپنی نظروں میں خود ذلیل ہو گیا ہوں۔ آخر ان کو اس طرح سے کسی کی ذلت پر ہنسی کیوں آئی، یہ تو ترس آنے کی بات تھی۔ اس میں اس طرح خوش ہونے کی کیا بات تھی، مزے کی کیا بات تھی؟

اور اب سب کے سب عرشے پر بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھے، شراب پی رہے تھے، جگالی کر رہے تھے، تاش کھیل رہے تھے، نہایت شریفانہ اور پرسکون طریقے سے گپ شپ کر رہے تھے، دریا کے مناظر دیکھ رہے تھے گویا وہ تو وہ تھے ہی نہیں جو ابھی ایک گھنٹہ پہلے ہی اس شور وغل کے ساتھ سیٹیاں بجا رہے تھے اور منہ چڑھا رہا تھے اور مذاق اڑا رہے تھے۔ پھر سے ان پر خاموشی اور سستی طاری ہو گئی تھی۔ صبح سے شام تک وہ اسٹیمر پر اکٹھے یوں رینگتے پھرتے تھے جیسے مچھریا جیسے دھوپ کی کرنوں میں جھلستی ہوئی گرد۔ اور اب ان میں سے درجنوں لکڑی کے زینے پر اکٹھے ہو گئے تھے کیونکہ ان کو گودی پر اترنا تھا اور ان جیسے درجنوں اور لوگ ویسے ہی کپڑے پہنے ہوئے، اسی طرح جھک ہوئے تھے، کندھوں پر بوریاں اور گٹھر رکھے، اسٹیمر پر چڑھ رہے تھے۔

انسان کی اس مستقل آوا جاہی سے اسٹیمر کی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ نئے آنے والے

مسافر بھی وہی بات کرتے تھے، وہی بحث ومباحثہ جوان سے پہلے مسافر کرتے تھے۔ زمین کی بات، محنت مزدوری کی بات، پروردگار کا ذکر، عورتوں کا ذکر، یہاں تک کہ الفاظ بھی ایک ہی سے استعمال ہوتے تھے۔

ہاں یہ تو خدا کی مرضی ہے جو بھگتان ہے وہ تو بھگتیں گے ہی۔ کیا کیا جائے، انسان کی قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے...''

یہ باتیں سن کر اکتاہٹ اور جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ مجھ سے کوڑا کرکٹ برداشت نہیں ہوتا تھا اور نہ یہ بات برداشت ہوتی تھی کہ کوئی میرے ساتھ زیادتی یا بے انصافی کرے۔ مجھے پکا یقین تھا کہ میں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی ہے جو میرے ساتھ ایسا برتاؤ ہو۔ نہ اس بیچارے سپاہی نے کوئی ایسی بات کی تھی۔ وہ کب چاہتا تھا کہ اپنا مذاق اڑائے...

ان ہی لوگوں بیچارے میکسم کو جو کہ رحم دل اور سنجیدہ تھا، اسٹیمر سے اتار دیا تھا اور سرگئی کو جو قابل نفرت تھا، رکھ لیا تھا۔ یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ اور کیوں یہ لوگ، جو کسی انسان کو پریشان کر کر کے پاگل بنا سکتے تھے، وہ جہاز کے ملاحوں کے سخت احکام دم دبا کر سن لیتے تھے اور ذرا بھی برا مانے بغیر گالیاں برداشت کر لیتے تھے؟

جہاز کے صدر ملاح نے اپنی خوبصورت چالاک آنکھیں سکیڑیں اور زور سے چلایا:

''ارے، اسٹیمر کے عرشے پر کیوں جم گئے؟ ہٹو وہاں سیڑھی پر بھیڑ نہ لگاؤ! کھسکو، شیطان کہیں کے...''

شیطان سب کے سب فرمانبرداری کے ساتھ عرشے کے دوسرے کنارے پر چلے گئے، اور وہاں سے بھی بھیڑوں کے گلے کی طرح ہنکا دئے گئے ''چلو ادھر سے چوھے سب کے سب!''

رات کو جب کبھی گرمی ہوتی تو لوہے کی چھت کے نیچے سونا دشوار ہو جاتا کیونکہ وہ دن بھر دھوپ میں تپتی رہتی تھی۔ مسافر عرشے پر تیل چٹوں کی طرح رینگتے پھرتے اور جہاں جی چاہتا پڑ کر سو رہتے۔ جہاں اسٹیمر رکتا جہاز کے ملاح ان کو ٹھوکریں اور گھونسے مار مار کر جگاتے:

''اے ہٹو رستے سے! جاؤ اپنے اپنے ٹھکانے...''

وہ اٹھتے اور نیند میں لڑھکتے پڑھکتے کسی اور طرف کو چل پڑتے۔

جہاز کے ملاحوں میں اور ان عوام میں کوئی فرق نہ تھا۔ البتہ وہ لوگ لباس دوسری طرح کا پہنے تھے،

پھر بھی وہ عوام کو پولیس کے سپاہیوں کی طرح ہنکاتے رہتے تھے۔

عام طور پر لوگ خاکسار، نادم نادم سے اور قسمت پر صابر وشاکر دکھائی دیتے ہیں۔لیکن کبھی کبھی ان میں اچانک نہایت بیدردانہ قسم کی تفریح کا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔ایسے لمحوں میں اس قناعت اور صبر وشکر کے بند ٹوٹ جاتے ہیں اور یہ لمحات عجیب وغریب اور نہایت اندوہ ناک ہوتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ زیادہ تر لوگوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ جا کہاں رہے ہیں اور اسٹیمر ان کو کہاں اتار دیتا ہے۔اس بات سے ان کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ جہاں کہیں وہ اترتے تھے، وہاں ان کا قیام تھوڑی دیر رہتا تھا اور پھر اسی یا کسی اور اسٹیمر میں بیٹھ لیتے تھے اور پھر کسی انجانی منزل کی طرف چل دیتے۔ یہ سب کے سب بے گھر اور بے در آوارہ گرد لوگ تھے جن کے لئے ہر زمین اجنبی تھی اور یہ سب کے سب بزدل تھے۔

ایک مرتبہ آدمی رات گذری ہوگی کہ اسٹیمر کی مشین میں کچھ ٹوٹ گیا، بڑے زور کی آواز آئی جیسے توپ چھٹی۔فوراً عرشے پر سفید بھاپ کے ایسے بادل نظر آئے کہ عرشے اس میں کھو گیا۔ یہ بھاپ انجن والے کمرے سے نکلی تھی اور تمام دراڑوں سے بل کھاتی ہوئی باہر نکل آئی۔کسی نے ایسے زور سے آواز دی کہ کان کے پردے پھٹ گئے:

''گاوریلو، ایک چمڑے کا ٹکڑا اور لال سیسہ لاؤ، جلدی...''

میں انجن والے کمرے کے بغل ہی میں ایک میز پر سویا کرتا تھا، وہیں برتن بھی دھوتا تھا۔ جب میں دھماکے کے دھکے سے جاگا تو عرشے پر بالکل سناٹا تھا، مشین کی بھاپ سوں سوں کر رہی تھی اور ہتھوڑے سے چل رہے تھے۔لیکن ایک ہی منٹ بعد تمام عرشے والے مسافروں نے بھانت بھانت کی آواز میں چیخنا چلانا شروع کر دیا اور یکا یک فضا بھیانک ہوگئی۔

سفید گہری کہر تیزی سے پگھل رہی تھی، عورتیں سر جھاڑ منہ پہاڑ اور مرد آنکھیں مچکاتے ادھر سے ادھر بھاگتے اور ایک دوسرے کو دھکیلتے پھر رہے تھے۔سب ہی لوگ گٹھریوں، سوٹ کیسوں، بوروں اور بکسوں کو گھسیٹ رہے تھے اور گرتے پڑتے، ایک دوسرے کو کچلتے دھکیلتے، خدا کی اور نکولائی پیر کی دھائی دے رہے تھے۔ یہ منظر خوفناک مگر دلچسپ تھا۔ میں لوگوں کے پیچھے پیچھے بھاگتا رہا کہ دیکھوں یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔

لیکن لوگ کچھ نہیں کر رہے تھے سوائے اس کے کہ بوکھلائے ہوئے ادھر سے ادھر بھاگتے پھر رہے

تھے...

رات کے وقت اس ہنگامے کا تجربہ میرے لیئے پہلا تھا اور نہ جانے کیوں میں نے ایک دم محسوس کیا کہ یہ سب غلط تھا: اسٹیمر اپنی معمولی رفتار سے چل رہا تھا۔ دھنی طرف کے ساحل پر گھاس کاٹنے والوں کے الاؤ بالکل نزدیک سے دکھائی دیتے تھے۔ بلندی پر پورا چاند اپنی روشنی پھیلا رہا تھا اور اس کی وجہ سے رات خوب تاب ناک تھی۔ لیکن لوگ اور زیادہ بوکھلائے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ پھر کیبن کے مسافر نمودار ہوئے۔ کوئی شخص جہاز کی منڈیر سے کود گیا۔ اور لوگ بھی اس کے پیچھے پیچھے کودنے لگے۔ دو کسانوں اور ایک پادری نے مل کر کچھ ڈنڈے اٹھائے اور ان کے ذریعہ ایک بنچ اکھاڑنے کی کوشش کی جو عرشے پر پیچوں سے کسی ہوئی تھی۔ مرغیوں کا ایک بڑا سا جھابہ سیڑھیوں سے لڑھکا۔ عرشے کی بیچوں بیچ کپتان کے کیبن پر چڑھنے والے زینے کے پاس، ایک کسان دوزانو جھکا ہوا ہر گذرنے والے کو سلام کرتا جاتا تھا اور بھیڑیئے کی طرح دھاڑ رہا تھا:

''ایماندارو! میں گنہگار ہوں! آہ میں گنہگار ہو!...''

ایک موٹے سے صاحب بہادر خاکی پتلون پہنے اپنے سینے پر مکوں سے ماتم کر رہے تھے ''کشتی لاؤ، ارے کوئی ایک کشتی لاؤ، کمبخت!''

جہاز کے ملاح ادھر ادھر دوڑتے لوگوں کی گردن ناپتے پھرتے تھے اور سروں میں ٹھوکے دے دے کر ان کو دھکیل رہے تھے۔ سمورئی اپنے رات کے کپڑوں پر ایک بڑا سا کوٹ ڈالے، ادھر ادھر گھوم رہا تھا اور ہر شخص سے گرجتی ہوئی آواز میں کہتا:

''ارے کچھ تو شرم کرو! کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے؟ اسٹیمر اچھا بھلا چل رہا ہے، کوئی ڈوب نہیں رہا۔ دو قدم پر کنارا ہے! دیکھو جتنے گدھے پانی میں کودے تھے، وہ رہے دو کشتیوں میں بھرے ہوئے۔'' وہ زور زور سے تیسرے درجے کے مسافروں کے سروں پر دھولیں جماتا جو جگہ جگہ ڈھیر ہوئے پڑے تھے۔

ابھی یہ دہشت ختم بھی ہ ہوئی تھی کہ ایک بڑی مقطع سی خاتوں فرغل پہنے، ہاتھ میں ایک بڑا سا کھانے کا چمچہ تانے چیختی ہوئی سمورئی پر لپکی:

''ارے، تیری یہ ہمت؟!''

ایک تربتر صاحب بہادر ان کو پیچھے سے کھینچ رہے تھے ''جانے بھی دو کمبخت کو۔ خردماغ ہے...''

سموری نے کندھے اچکائے کھسیا کے آنکھیں جھپکائیں اور مجھ سے مخاطب ہوا:

''لو اور دیکھو۔ کہو اب کیا کہتے ہو۔ بھلا ان کو مجھ سے کیا واسطہ؟ میں نے تو ان کو زندگی میں کبھی نہیں دیکھا...''

ایک کسان ناک میں سے خون چھنکتے ہوئے بولا:

''کیا لوگ ہیں! کیا اٹھائی گیرے ہیں!..''اس موسم گرم میں میں نے دو مرتبہ اسٹیمر پر یہ ہنگامہ دیکھا اور دونوں مرتبہ یہ ہنگامہ اصلی خطرے کا نہیں تھا بلکہ صرف ڈر کا تھا۔ تیسری مرتبہ مسافروں نے دو چور پکڑے۔ ان میں سے ایک یاتری کا بھیس بدلے ہوئے تھا۔ مسافر ان دونوں کو جہاز کے ملاحوں کی نظروں سے دور ایک طرف کو لے گئے اور تقریباً ایک گھنٹے تک ان کی کندی کرتے رہے اور جہاز کے عملے نے جو آخر ان لوگوں کو چھڑایا تو بھیڑ جہاز رانوں پر ٹوٹ پڑی:

''ہاں ہاں، تم سب ہو چور کے بھائی گرہ کٹ۔ چوروں کو چھپاتے ہو!''

چوروں کی اتنی پٹائی ہوئی تھی کہ وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ اگلی جگہ جب اسٹیمر نے پڑاؤ کیا تو ان کی یہ حالت تھی کہ کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے...

ایسے کئی واقعات گذرے اور ان سے ایسی خلش پیدا ہوئی جو ناقابل بیان ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ عوام بنیادی طور پر نیک ہیں یا بد؟ صلح پسند ہیں یا شر پسند؟ کیوں یہ لوگ اتنے بے درد۔ کیوں اتنی ذلیل حد تک کمینے ہیں اور کیوں اس قدر شرمناک طریقے پر دبو بھی؟

اگر میں سموری سے کبھی اس مسئلے پر سوال کرتا تو وہ بس سگریٹ کے دھوئیں کی نقاب میں اپنا چہرہ چھپا لیتا اور جھنجلا کر کہتا:

''پھر تمہیں کیا! عوام تو عوام ٹھہرے...کوئی احمق ہے تو کوئی سمجھدار۔ تم کتابیں پڑھو اور اپنا سر مارنا بند کرو۔ کتابوں میں تمہیں سب باتوں کا جواب ملے گا۔ بشرطیکہ وہ صحیح قسم کی کتابیں ہوں...''

واضح رہے کہ سموری کے نزدیک مذہبی یا ولیوں کی زندگی پر کتابیں بالکل بے کار تھیں۔

''یہ کتابیں؟ یہ تو پادریوں کے لئے ٹھیک ہیں۔ یا پھر پادریوں کے بیٹوں کے لئے۔''

ایک بار میرا دل چاہا کہ سموری کی کچھ خاطر کی جائے۔ چنانچہ میں نے ایک کتاب تحفہ دینے کا فیصلہ کیا۔ قازان کی بندرگاہ پر جب اسٹیمر رکا میں نے پانچ کوپک میں ایک کتاب خریدی ''پیٹر اعظم کو ایک

سپاہی نے کیونکہ بچایا''۔لیکن سموری صاحب اس وقت خوب شراب چڑھائے ہوئے نشے میں تھے۔ان سے اس وقت کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔لہذا میں نے سوچا کہ لاؤ پہلے میں ہی اس داستان کو پڑھوں۔ مجھے وہ بے حد اچھی لگی۔ ہر بات اس میں نہایت صاف اور سادے طریقے سے کی گئی تھی، اختصار کے ساتھ اور دلچسپ پیرائے میں۔ مجھے یقین تھا کہ سموری کو وہ بے حد پسند آئے گی۔

لیکن میں نے جب وہ اس کی خدمت میں پیش کی تو اس نے اس کو موڑ توڑ کر گولا سا بنا کے جہاز کی منڈیر پر سے دریا میں پھینک دیا اور منہ بنا کر بولا:

''لو یہ ہے تمہاری کتاب کا حشر! یہاں میں ہوں کہ تم کو شکاری کتا بننے کی ٹریننگ دے رہا ہوں اور تم ہو کہ خود ہی پدیوں کو چیرتے پھاڑتے پھرتے ہو۔''

پھر پیر پٹک کر چیخا:

''آخر تمہارا کیا خیال ہے یہ کون سی کتاب ہے، اچھی؟ اس میں کیا رکھا ہے؟ بتاؤ۔ چلو بتاؤ!''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''لیکن مجھے معلوم ہے۔ اگر ان لوگوں نے واقعی پہلے والے سپاہی کا سر اڑا دیا ہوتا تو وہ سیڑھی پر سے نیچے آ گرتا اور پھر کوئی دوسرا گھاس کے ڈھیر پر نہ چڑھتا! سپاہی بے وقوف نہیں ہوتے ہیں۔ وہ یہ کرتے کہ گھاس کے اس مینار میں آگ لگا کر اس کا ڈبہ گول کر دیتے! سنتے ہو؟''

''سمجھا۔''

''تو پھر۔ اب تم خود ہی دیکھ لو۔ میں اس زار پیٹر کو خوب جانتا ہوں۔ اس پر ایسی کوئی واردات کبھی نہیں گذری! کھسکو یہاں سے...''

مجھ پر تو بالکل واضح ہو گیا کہ سموری کی بات بالکل صحیح تھی لیکن پھر بھی وہ کتاب مجھے پسند تھی۔ میں نے اگلی بار پھر وہ داستان خریدی اور اس کو دوسری مرتبہ پڑھا اور یہ محسوس کر کے خود ہی حیران رہ گیا کہ کتاب واقعی ردی تھی۔ بڑی شرم آئی اور دل میں سموری کا احترام اور اعتبار اور بھی بڑھ گیا۔ اور وہ زیادہ تر یہی کہتا رہتا تھا:

''تم کو تعلیم حاصل کرنا چاہئے۔ یہ جگہ تمہارے لائق نہیں...''

مجھے خود بھی یہ احساس تھا کہ یہ جگہ میرے لائق نہیں ہے۔ سرگئی میرے ساتھ نہایت کمینا برتاؤ کرتا

تھا۔کئی بار میں نے دیکھا کہ اس نے میرے والے ٹیبل پر سے چھریاں کانٹے وغیرہ اٹھائے اور خانساماں کی آنکھ بچا کر مسافروں کے ہاتھ بیچ دئے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ چوری ہے۔سمورئی مجھ کو کئی بار خبردار کر چکا تھا:

''دیکھو، ذرا ہشیار رہنا اپنے ٹیبل پر سے کسی ویٹر کو چھری یا کانٹے مت اٹھانے دینا!''

اور بھی کئی باتیں تھیں جو میرے حق میں اچھی نہ تھیں اور اکثر میرا دل بے اختیار چاہتا کہ یہ جگہ چھوڑ دوں اور جنگلوں کی طرف بھاگ نکلوں۔لیکن ایک تو سمورئی مجھے ایسا کرنے سے روکتا رہتا تھا کیونکہ اس کی محبت مجھ سے دن بدن زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ دوسرے، مجھے اسٹیمر بھی پسند تھا اور اس کی ہلکی ہلکی مسلسل رفتار اچھی لگتی تھی۔گھاٹوں پر پڑاؤ مجھے پسند نہ تھا۔اور یہ انتظار رہتا تھا کہ کوئی ایسی بات ہو جائے کہ ہم دریائے کاما سے دریائے بیلایا میں پہنچ جائیں، پھر ویاتکا میں یا والگا میں تاکہ مجھے نئے نئے ساحل نظر آئیں، نئے شہر اور نئے انسان۔

لیکن یہ سب کچھ نہ ہوا۔اسٹیمر پر میری زندگی یکا یک ایک جگہ آ کر رک گئی۔اور خاتمہ بھی ایسا ہوا جو بالکل اچانک اور ساتھ ہی شرمناک بھی تھا۔ایک شام جب ہم قازان سے نیژنی جا رہے تھے، خانساماں نے مجھے طلب کیا۔ جب میں حاظر ہوا تو اس نے دروازہ بند کیا۔سمورئی بھی وہیں ایک مخمل پوش اسٹول پر بیٹھا تھا۔ پھر خانساماں سمورئی سے مخاطب ہوا:

''لو۔آ گیا یہ۔''

''کیا تم سرگئی کو چمچے اور دوسری چیزیں دیتے ہو؟''

سمورئی نے مجھے سختی سے پوچھا۔

''دیتا تو نہیں ہوں لیکن وہ میری آنکھ بچا کر خود لے لیتا ہے۔''

''ہوں۔تم نے دیکھا تو نہیں مگر تم جانتے تو تھے'' خانساماں نے سنجیدگی سے کہا۔

سمورئی نے زانو پر ہاتھ مارا اور پھر اس جگہ کو سہلاتا ہوا بولا:

''ٹھہرو۔کوئی جلدی نہیں ہے...''

اور پھر سوچنے لگا۔میں نے خانساماں کو دیکھا اور اس نے مجھے۔لیکن مجھے ایسا لگا کہ عینک کے پیچھے آنکھیں نہیں ہیں۔

وہ نہایت خاموشی سے زندگی بسر کرتا تھا، دبے پاؤں چلتا، مدہم لہجے میں بولتا۔ کبھی کسی کونے میں اس کی بے رنگ، مرجھائی ہوئی داڑھی نظر آتی اور خالی خالی آنکھیں، اور پھر یکا یک غائب ہو جاتیں۔ سونے سے پہلے وہ مقدس شبیہہ کے آگے بڑی دیر تک دوزانو جھکا رہتا، اس شبیہہ چراغ جلتا رہتا تھا۔ دروازے میں ایک دل نما چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ میں نے کھڑکی سے کئی بار اسے دیکھا لیکن مجھے یہ دکھائی نہ دیا کہ وہ کسی طرح دعائیں مانگتا ہے۔ بس صرف دوزانو رہتا اور مقدس شبیہہ اور اس کے چراغ پر آنکھیں گڑوئے، اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر پھیر کر ٹھنڈی سانسیں بھرتا رہتا۔

سموری نے ذرا رک کر پوچھا:

''سرگئی نے تمہیں کبھی پیسے دئے؟''

''نہیں۔''

''کبھی نہیں؟''

''کبھی نہیں۔''

سموری نے خانساماں سے آہستہ سے کہا ''جھوٹ نہیں بولے گا۔'' لیکن اس نے آہستہ سے کہا ''اس سے کیا ہوتا ہے؟''

چلے آؤ!'' سموری نے میری میز کے نزدیک آ کر کہا اور میرے سر پر ایک دھول جمائی: ''احمق! اور میں بھی احمق ہوں! مجھے تمہاری دیکھ بھال کرنی چاہئے تھی...''

نیژنی پر خانساماں نے میرا حساب کر دیا۔ مجھے کوئی آٹھ روبل ملے، یعنی اب تک میں نے جب کبھی بھی کمائی کی تھی تو یہ کمائی ان سب سے زیادہ تھی۔

سموری مجھے رخصت کرنے لگا تو غمگین لہجے میں بولا:

''ہنہ... اب آئندہ اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔ سنتے ہو؟ مکھیاں مت مارتے رہنا...''

پھر اس نے ایک چمکدار تمباکو کی تھیلی میرے ہاتھ میں رکھ دی۔ اس پر موتیوں کا کام بنا ہوا تھا۔

''لو، لو۔ بہت اچھی دستکاری ہے! میری دینی بیٹی نے میرے لئے بنائی تھی... اچھا، الوداع! کتابیں پڑھتے رہنا۔ یہی تمہارے لئے سب سے اچھا ہوگا!''

اس نے مجھے بغلوں میں ہاتھ دے کر ہوا میں اچھالا اور پیار کیا، پھر مجھے نیچے گھاٹ پر اتار دیا۔ مجھے

اس پر اور اپنے اوپر افسوس ہو رہا تھا۔اور جب میں نے دیکھا کہ وہ بھاری بھرکم شہتیر سا انسان، جو بالکل اکیلا اور تنہا تھا، زینے پر پاؤں رکھتا ہوا، بھیڑ میں ادھر ادھر کہنیاں مارتا جہاز پر واپس جا رہا ہے تو میرا دل بھر آیا...

آنے والے زمانے میں میری ملاقات ایسے کتنے انسانوں سے ہوئی۔ ایسے ہی نیک، ایسے ہی اکیلے اور اسی طرح زندگی سے بچھڑے ہوئے...

7

نانا ابا اور نانی اماں پھر شہر آ گئے تھے۔ میں واپس ہوا تو میرا دل بھاری تھا، مزاج چڑچڑایا ہوا اور غصے میں کاٹ کھانے کو جی چاہتا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے چور کیوں بنایا؟

نانی اماں حسب دستور طنزیہ انداز میں مخاطب ہوئے:

''کیوں؟ بٹور لائے خزانہ؟''

''جو خزانہ ہے وہ میرا خزانہ ہے''میں نے جواب دیا، کھڑکی پر بیٹھ گیا، بڑے فخریہ انداز سے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک جلایا۔

''اوھو'' نانا ابا میری حرکتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بولے ''تو یوں کیوں نہ کہو! تو تم نے بھی شیطان کی پتیاں شروع کر دیں۔ ہیں؟ مگر ابھی تو ذرا سویرا ہے نا؟''

''میرے پاس تمباکو کی تھیلی بھی ہے'' میں اترایا۔ ''تحفہ ہے۔''

''تھیلی! کیا مطلب؟ یہ کر کیا رہا ہے تو۔ مجھ کو الو بناتا ہے؟''

وہ مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ سوکھے سوکھے مضبوط ہاتھ آگے کو پھیلائے ہریالی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ میں اچھا اور ان کے پیٹ میں سر مارا۔ بڑے میاں زمین پر اوندھے گر پڑے اور چند منٹ تک وہیں حیران بیٹھے آنکھیں مچکا کے مجھے گھورتے رہے۔ ان کے سیاہ لب کھل گئے تھے۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے پوچھا:

''اچھا تو اب تو اپنے نانا کا پیٹیگا۔ ہیں؟ نانا کو؟ اپنی ماں کے باپ کو؟''

''میں آپ کی بہت پٹائی کھا چکا ہوں'' میں بدبدایا حالانکہ مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی کہ میں نے برا

کیا۔

نانا ابا پھرتی سے اٹھے اور لپک کر میرے پاس آ بیٹھے۔ انہوں نے سگریٹ میرے ہاتھ سے چھین کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا ''ارے او کاٹھ کو الو، جانتا ہے تو نے وہ حرکت کی ہے کہ خدا تجھے کبھی معاف نہیں کریگا۔ زندگی بھر نہیں۔'' ان کی آواز سے خوف نمایاں تھا۔ پھر نانی سے مخاطب ہوئے ''ذرا سوچو تو اس نے مجھ کو مارا! مجھ کو، یہ! اور مجھ کو مارا۔ ذرا پوچھ تو اس نے مارا ہے کہ نہیں!''

نانی اماں نے مجھ سے پوچھنے کی تکلیف نہیں گوارا کی۔ بس میرے پاس آئیں اور میرے بال پکڑ کر جھٹکے دینے لگیں:

''لو یہ ہے اس کی سزا۔ یہ لو۔ اور لو...''

ان کی اس حرکت سے مجھے جسمانی تکلیف تو بالکل نہیں ہوئی مگر میرے احساسات کو سخت ٹھیس لگی۔ خاص کر نانا ابا جو حقارت سے ہنس رہے تھے تو وہ بہت کھلا۔ وہ کرسی پر اوپر نیچے اچھل رہے تھے اور زانو پر ہاتھ مار مار کر ٹرا رہے تھے:

''ہاں ہاں یہ ہے۔ یہ، یہ بات ہے...''

میں نے اپنے آپ کو چھڑایا اور گلیارے میں جا پڑا۔ وہاں لیٹے ہوئے میں اپنے اوپر کوفت اور مایوسی کا عالم طاری کئے سماوار کی سنسناہٹ سنتا رہا۔

نانی اماں باہر آئیں اور مجھ پر جھک کر اتنی آہستہ سے بولیں کہ مشکل سے ان کی باتیں سنائی بھی دیتی تھیں:

''معاف کر بیٹا۔ میں نے کوئی سچ مچ تھوڑا ہی مارا تھا۔ کیوں؟ مارا تھا؟ وہ تو بس دکھانے کے لئے۔ اور آخر کیا بھی کیا جاتا۔ آخر نانا ابا بوڑھے آدمی ہیں۔ تمہیں ان کا ادب کرنا چاہئے۔ ان کی خود ہی تمام ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں اور دل غم سے بھرا ہے۔ ان کو اور دکھ پہنچانا ٹھیک نہیں۔ اب تم بچہ نہیں ہو۔ سمجھدار ہو... تمہیں سمجھنا چاہئے نا الیوشا! وہ بوڑھے ہیں تو کیا ہوا، وہ تو خود ہی ایک بچے کی طرح ہیں۔ بس۔ نہ کم نہ زیادہ...''

ان کے الفاظ کی لہریں میرے جسم کو دھو رہی تھیں جیسے جسم پر کوئی گرم پانی بہا رہا ہو۔ ان الفاظ کی دوستانہ سرسراہٹ سے میرے دل کا دکھ دب گیا اور شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ میں ان سے کس کے

لپٹ گیا اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پیار کیا۔

''لو، آؤ اندر چلو! آؤ چلو! سب ٹھیک ہے۔ بس ان کے سامنے یوں ایک دم سے سگریٹ نہ پینے لگنا، ذرا مہلت دو تو خود ہی عادی ہو جائیں گے...''

جب میں کمرے میں داخل ہوا اور نانا ابا کو دیکھا تو مجھ سے ہنسے بغیر نہیں رہ گیا۔ وہ سچ مچ بچوں کی طرح خوش ہو رہے تھے۔ چہرہ چمک رہا تھا، بار بار زمین پر پاؤں پٹختے اور سرخ روئیں بھرے ہاتھ میز پر مارتے۔

''کیوں بے بکری کے بچے، پھر سینگ مارنے آ گیا کیا؟ اٹھائی گیرا، بالکل اپنے باپ کی طرح۔ یوں ہی گھر میں گھس آئے۔ نہ سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور تمبا کو پینے کو ہاتھ بڑھا دیا۔ تھو۔ دو کوڑی کا نپولین کہیں کا!''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ بکتے بکتے ان کے پاس الفاظ بھی ختم ہو گئے، منہ بھی دکھ گیا اور تھک کر بیٹھ رہے۔

لیکن چائے پیتے وقت انہوں نے مجھے پھر لیکچر دینا شروع کیا:

''سب سے بڑی چیز خدا کا خوف ہے۔ انسان کے لئے خدا کا خوف ایسا ہی لازمی ہے جیسے گھوڑے کے لئے لگام۔ دنیا میں انسان کا کوئی دوست نہیں سوائے خدا کے! یہاں آدمی کا دشمن آدمی ہے!''

اور باقی دشمن ہونے والی بات تو میں نے بھی محسوس کی لیکن باتوں کا اثر دل پر نہ ہوا۔

''اب اس وقت تو تم اپنی خالہ ماتریونا کے یہاں پھر کام پر چلے جاؤ۔ موسم بہار میں چاہئے پھر اسٹیمر پر چلے جانا۔ لیکن جاڑے تو ان لوگوں کے یہاں گذارو اور ان سے کہنا بھی مت کہ میں بہار میں چلا جاؤں گا...''

خواہ مخواہ لوگوں کو کیوں بے وقوف بنایا جائے!'' نانی اماں نے لقمہ دیا۔ حالانکہ ابھی ابھی وہ مجھے جھوٹ موٹ سزا دے کر نانا ابا کو بیوقوف بنا چکی تھیں۔

''لوگوں کو بیوقوف بنائے بغیر دنیا میں گذارہ نہیں' نانا ابا اپنی بات پر مصر رہے۔ ''کوئی بھی گذارہ نہیں کر سکتا۔''

شام کو نانا ابا مناجات پڑھنے بیٹھے تو میں اور نانی اماں پھاٹک سے نکل کر کھیت کو روانہ ہو گئے۔ نانا ابا جس جھونپڑے میں رہتے تھے وہ منا سا تھا۔ اس میں دو کھڑکیاں تھیں اور وہ شہر کے بالکل کنارے، گلی کنا تنایا کے پیچھے کھڑا تھا۔ جہاں ایک عرصہ پہلے ان کا اپنا مکان تھا۔

نانی اماں ہنس کر بولیں:

''دیکھو ذرا، کہاں ہیں رہنا نصیب ہوا ہے! بات یہ ہے کہ نانا ابا کو کہیں چین نہیں آتا تو مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور یہاں بھی ان کو چین نہیں ملتا۔ لیکن میرے مزے رہتے ہیں۔''

ہمارے مکان کے سامنے کوئی ڈھائی میل لمبا چوڑا ایک کھیت تھا جس میں جگہ جگہ نالے تھے۔ کھیت کے کنارے پر جنگل تھے اور دوسری طرف قازان کی سڑک کے ساتھ ساتھ برچ کی قطاریں دوڑتی چلی گئی تھیں۔ نالوں کے اوپر بید کی جھاڑیوں اور ان کی شاخیں سورج کی روشنی میں یوں چمک رہی تھیں جیسے خون میں بھیگی ہوئی چھریاں ہوں۔ شام کی ہوا سرمئی گھاس کو لہلہا رہی تھی۔ قریب کے نالے کے اس پار لڑکیوں کے سیاہ ہیولے تنکوں کی طرح ہل رہے تھے۔ دور دھنی طرف کو قبرستان کی سرخ دیوار تھی۔ یہ قبرستان ''بوگروفسکی خانقاہ'' کہلاتا تھا اور یہاں ان لوگوں کے مردے دفن ہوتے تھے جو پرانے مذہب کے پیرو تھے۔ بائیں طرف کی پیڑوں کا ایک جھنڈ یہودیوں کے قبرستان کا پتہ دیتا تھا۔ ہر چیز سے افلاس ٹپکتا تھا۔ ہر چیز بڑی خاموشی کے ساتھ خستہ حال زمین سے ہم آغوش معلوم ہوتی تھی۔ شہر کے اس سرے پر بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکان بڑی شرمندگی کے ساتھ ٹمٹماتے ہوئے لگتے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ خاک آلود سڑک کو دیکھ کر آنکھیں جھپکا رہے ہیں۔ سڑک کے آس پاس دبلی سوکھی سہمی مرغیاں دانے چگتی پھرتی تھیں۔ ''دیوپچی خانقاہ'' کے پاس سے گایوں کا ایک گلہ ڈکارتا نکلا۔ پاس کسی کیمپ سے فوجی موسیقی سنائی دے رہی تھی۔ باجے بج رہے تھے۔

ایک شرابی لڑکھڑاتا ہوا گزرا، اس کے ہاتھ میں ایک اکارڈین تھا جسے وہ نہایت بے دردی سے کھینچ رہا تھا اور بدبداتا جا رہا تھا:

''میں اب بھی تجھ تک پہنچ جاؤں گا... ضرور پہنچ جاؤں گا..''

نانی اماں نے سورج کی سرخ روشنی کی زد پر آنکھ دبا کر کہا:

''کہاں جائے گا؟ بھولے! تو تو بس ابھی اوندھا ہو کر گرے گا اور سو جائے گا۔ اور لوگ تیرے

کپڑے تو اتار لے جائیں گے اور تجھے ننگا کر دیں گے بلکہ تیرا اکارڈین بھی اٹھا لے جائیں گے جس سے تیرے دل کو سکھ ملتا ہے...''

میں چاروں طرف دیکھتا جاتا تھا اور نانی اماں کو اسٹیمر پر کی زندگی کے متعلق بتاتا جاتا تھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کے بعد اب مجھے اپنا ماحول بڑا ہی دل بجھانے والا لگتا تھا اور مجھے کوفت ہو رہی تھی۔ نانی اماں بڑے اشتیاق سے اور بہت غور سے سن رہی تھیں جیسے میں ہمیشہ ان کی باتیں سنا کرتا تھا۔ جب میں نے ان سے سموری کا ذکر کیا تو انہوں نے زوروں میں اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور بولیں:

''آہ بیچارہ غریب، نیک انسان تھا! پاک مریم اس کی مددگار ہوں! دیکھو بیٹا، اس کو بھی بھولنا مت! اچھی باتوں کو کس کر اپنی گرہ سے باندھ رکھنا چاہئے! اور جو بری یادیں ہوں ان کو اچھال پھینکنا چاہئے...''

میرے لئے ان کو یہ بتانا سب سے زیادہ مشکل تھا کہ میں اسٹیمر پر سے کیوں برخاست کیا گیا لیکن پھر بھی میں نے ہمت کی، دانت بھینچے ان کو سب کچھ بتا ہی ڈالا۔ لیکن اس قصے کا نانی اماں پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوا۔ بے نیازی سے بولیں:

''تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ ابھی تم نہیں جانتے کہ دنیا میں زندگی کس طرح بسر کی جاتی ہے...''

''لیکن لوگ تو ایک دوسرے سے مسلسل یہی کہتے رہتے ہیں کہ تم کو زندگی بسر کرنا نہیں آتا۔ کسان بھی، جہاز ران بھی، خالہ ماتریونا اپنے بیٹے سے یہی کہتی رہتی تھیں۔ آخر آدمی کیا سیکھے؟''

نانی اماں نے ہونٹ بھینچ لئے اور سر ہلایا ''یہ تو مجھے نہیں معلوم!''

''لیکن کہتی تو آپ بھی رہتی ہیں!''

''کیوں نہ کہوں؟'' نانی اماں نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ''لیکن تم اس بات کا برا نہ مانا کرو۔ ابھی تم بچے ہو۔ تم سے یہ امید بھی کیسے کی جا سکتی ہے کہ تم دنیاداری کے حالات کو سمجھو گے اور ویسے سمجھتا بھی کون ہے؟ صرف چور اور بے ایمان ہی سمجھتے ہیں۔ اپنے نانا کو دیکھو، پڑھے لکھے ہیں، تیز طرار ہیں لیکن آخر اس سے ان کو فائدہ کیا ہوا۔ ذرا سا بھی نہیں...''

''کیا آپ کی زندگی اچھی طرح بسر ہوئی؟''

''میری؟ آہ، ہاں۔ اچھی خاصی بھی اور بری بھی۔''

لوگ ٹہلتے ہوئے ہمارے پاس سے گزرے۔ لمبی لمبی پرچھائیاں ان کے پیچھے کھینچتی جاتی تھیں اور

قدموں تلے سے غبار دھوئیں کی طرح اٹھ اٹھ کر ان پر چھائیوں کو دبا دبا کر دفنا تا جاتا تھا۔ دونوں وقت ملنے کا سناٹا اور غمگینی بڑھتی جاتی تھی۔ کھڑکی سے نانا ابا کی بڑبڑاتی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی:

''اے میرے معبود، مجھے اپنے عتاب کی شدت سے پناہ دے۔ اے پروردگار، مجھ پر اتنا ہی ڈالنا جتنا میں برداشت کرسکوں...''

نانی اماں مسکرائیں:

''خدا بھی ان سے عاجز آ گیا ہوگا، جان ضیق میں ہوگئی اس کی اور کیوں بھلا! کوئی پوچھے اب ان کا بڑھاپا ٹھہرا۔ آخر ان کو کیا چاہئے جو اس طرح سے خرخرخر کرتے رہتے ہیں، گلوں شکوؤں کا دفتر کھولے رہتے ہیں، روز شام کو جب خدا ان کی آواز سنتا ہوگا تو اس کو ہنسی آجاتی ہوگی کہ لو بھئی، وہ واسیلی کاشیرین صاحب پھر پہنچے اپنا دکھڑا لے کر! انہ، خیر چلو آؤ۔ سونے چلیں...''

اب میں نے یہ فیصلہ کیا کہ گانے والے چڑیاں پکڑا کروں گا۔ کیونکہ مجھے ایسا نظر آتا تھا کہ یہ روزی کمانے کا اچھا خاصہ ذریعہ ہے۔ میں چڑیاں پکڑا کروں گا۔ نانی اماں بیچ دیا کریں گی۔ اس لئے میں نے ایک جال، ایک گھیرا اور کچھ پھندے خریدے اور کچھ پنجرے خود ہی بنا لئے۔ اب میں روز صبح تڑکے نالے کے پاس جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ نانی اماں ایک تھیلی اور ٹوکری لئے پاس ہی جنگلوں میں گشت لگاتی ہیں اور موسم کی آخری چھتریاں، گوندنیاں، مونگ پھلیاں تلاش کرتی ہیں۔

ستمبر کے تھکے ہمارے سورج نے ابھی سر اٹھایا ہے۔ اس کی ہلکی زرد شعاعیں کبھی بادلوں میں فنا ہوتی جاتی ہیں اور کبھی اس کی روپہلی چمک اڑتی ہوئی وہاں پہنچ جاتی ہے جہاں میں دبکا بیٹھا ہوں۔ نالے کے پیندے میں پرچھائیاں ابھی تک منڈلا رہی ہیں اور سفید کہر بلند ہو رہا ہے۔ نالے کا کھڑا کنارا تاریک اور سنسان لگتا ہے۔ دوسرا کنارا آہستہ آہستہ نیچے کو اترتا چلا گیا ہے اور اس پر جھاڑیاں اور گھاس خوب گھنی اگی ہوئی ہیں۔ ان کی پتیاں سرخ، سبز اور کتھئی ہیں۔ اور جب ہوا چلتی ہے تو ان پتیوں کو نوچ نوچ کر نالے میں پھیلاتی جاتی ہے۔

نالے کے پیندے میں اگی ہوئی گوکھرو کی جھاڑیوں میں سبز چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ میری نظر ان کے نوکیلے سروں پر سجے ہوئے قرمزی تاجوں پر پڑتی ہے۔ چڑیاں میرے چاروں طرف اکٹھے ہو کر سوالیہ انداز میں چوں چوں کر رہی ہیں، اپنے سفید سفید پوٹے پھیلائے وہ اس طرح چائیں چائیں کر رہی ہیں

جیسے کونا وینو کی دوشیزاؤں کا میلا لگا ہو۔ یہ بے حد تیز ہیں، بے حد پھرتیلی اور چلبلی، ہر چیز کو دیکھیں گی، ہر چیز کو چھوئیں گی۔ چنانچہ ایک ایک کر کے جال میں پھنستی جاتی ہیں۔ ان کو پھڑ پھڑاتے دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ لیکن مجھے اپنے دل پر پتھر رکھنا پڑتا ہے۔ یہ میرا روز گار ٹھیرا۔ میں چڑیوں کو جال سے نکال کر ایک علیحدہ پنجرے میں بند کرتا ہوں اور اس پر ایک بورا اڑھا دیتا ہوں تا کہ وہ شور نہ مچائیں۔

بلبلوں کا ایک جھنڈ کانٹے دار جھاڑی پر اترتا ہے، جو دھوپ سے چمک رہی ہے، دھوپ سے چڑیوں میں اور بھی چونچالی آ گئی ہے اور وہ بڑی مسرت سے چہک رہی ہیں جیسے اسکولی لڑکوں کا جھنڈ ہو۔ ایک مٹکتی ہوئی چالاک بلبل دکھائی دیتی ہے۔ اس کے اور ساتھ غالباً جنوب کو جا چکے ہیں اور اس کو دیر ہو گئی ہے۔ وہ جنگلی گلاب کی ایک چمکتی، جھولتی شاخ پر بیٹھی ہے چونچ سے اپنے پروں میں کنگھی کر رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ادھر ادھر شکار کی تلاش میں اپنی کالی آنکھیں بھی گھماتی جاتی ہے۔ یکا یک وہ چکاوک کی طرح زن سے اوپر کی طرف اڑتی ہے اور ایک کیڑے کو گرفتار کر لیتی ہے۔ اسے ایک کانٹے کی نوک میں پرو دیتی ہے اور پھر اپنا بھورا، چالاک سر گھما گھما کر اس کی نگرانی کرتی رہتی ہے۔ 'شور' چڑیا اڑتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ یہ میرے دل کو سب سے زیادہ پیاری ہے، کاش میں ایک بھی پکڑ لوں۔ ایک نر بلبل سرخ رنگ، جنرل کی طرح سر اٹھائے اینڈتا، اپنا جھنڈ چھوڑ کر ایک جھاڑی پر آ کر بیٹھتا ہے۔ اور وہاں بیٹھا بیٹھا جیسے جھنجھلا جھنجھلا کر گاتا جاتا ہے۔ اس کی کالی چونچ اوپر نیچے ہوتی رہتی ہے۔ سورج جتنا اوپر اٹھتا جاتا ہے چڑیوں کی تعداد اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ سارے کا سارا نالہ ان کے گانوں سے اور بھی زیادہ سرخوشی سے لبریز ہو جاتا ہے۔ ہوا میں جھاڑیوں کی مسلسل سرسراہٹ اس گانے کے ساتھ ساتھ ساز کا کام دیتی جاتی ہے۔ چڑیوں کی آواز اس سرسراتے ہوئے ساز کی غنائیت پر حاوی نہیں ہو سکتی جس میں بڑی نرمی اور ایک عجیب لطیف غم آمیزی ہے۔ موسم گرم کے جاتے جاتے یہ الوداعی گیت سنائی دیتے ہیں۔ اس موسیقی سے الفاظ ابھرتے ہوتے ہیں جو گویا برابر جمتے جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ مصرعے بنتے جاتے ہیں۔ بے ساختہ میری یاد کے پردے پر گزرے ہوئے مناظر ابھر آتے ہیں۔

اوپر کہیں سے نانی اماں کی آواز آتی ہے:

''کہاں ہے بیٹا؟''

وہ نالے کے کنارے پر بیٹھی ہیں سامنے رومال بچھا ہوا ہے۔ رومال پر روٹی، کھیرے، شلجم اور کچھ

سیب رکھے ہیں۔ان تمام نعمتوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا ک ٹ گلاس کا دستہ دار جگ چمک رہا ہے جس کا بلوریں ڈاٹ نپولین کے سر کا مجسمہ ہے۔اس جگ میں تھوڑی سی واد کا ہے جس کو سینٹ جان کے بنفشہ سے باسا گیا ہے۔

نانی اماں شکر کا سانس بھرتے ہوئے کہتی ہیں ''اے پروردگار، کتنا اچھا ہے یہ سب کچھ! تو نے کیا کچھ نہیں دیا!''

''میں نے ایک گیت بنایا ہے۔''

میں ان کو کچھ مصرعے سناتا ہوں:

سردیاں آگئیں، پھول مرجھا چلے

گرم موسم چلا، دھوپ گئی،

الوداع دھوپ کا موسم الوداع

وہ میرے سب مصرعے سنے بنا ہی بول پڑتی ہیں ''ایسا ایک گیت تو ہے مگر اس سے اچھا ہے!''

اور وہ سریلی آواز میں گاتی ہیں:

گرمیوں کا سورج رخصت ہوا،

کھو گیا اندھیری راتوں میں، دور جنگلوں کے پیچھے! میں رہ گئی اکیلی، لڑکی، تنہا،

اور میری مسرتوں کی بہار چھن گئی۔

میں رہ گئی، اکیلی، تنہا!...

صبح سویرے میں نکلتی ہوں باہر مئی کا جشن یاد آتا ہے

میدان اور کھیت اداس نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

ان ہی کی آغوش میں تو میں نے جوانی کے موتی لٹادئے۔

اے میری سہیلیو، سکھیو،

دیکھ لو ابھی سے ہلکے ہلکے سفید گالے برف کے گر رہے ہیں، میرے سفید سینے میں دھڑکتے دل کو سنبھال کے رکھ لو...

میری شاعرانہ تعلّی کو اس سے ذرا سی بھی ٹھیس نہیں لگتی۔ کیوں مجھے ان کا گانا بے حد پسند آتا ہے اور

اس دوشیزہ سے ہمدردی ہو جاتی ہے اور اس پر ترس آنے لگتا ہے۔

نانی اماں بولیں:

''دیکھو، غم دراصل شعر پیدا کرتا ہے! یہ نظم اس دوشیزہ نے لہک کر گائی ہوگی: گرمیوں میں وہ اپنے چھیلے کے ساتھ خراماں خراماں خوش خوش ٹہلتی پھرتی تھی لیکن جاڑوں کا موسم آیا تو اس کا محبوب اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ شاید کسی اور سے عشق کا کھیل کھیلنے... اور وہ غم کی ماری آنسو بہاتی رہ گئی... اصل بات یہ ہے کہ جس بات کو آدمی شدت سے محسوس نہ کرے اس کے متعلق وہ شعر کبھی نہیں کہہ سکتا۔ اس کو کبھی گا نہیں سکتا۔ اور دیکھو اس دوشیزہ نے کتنا اچھا گیت کہا، ہے نا؟''

جب نانی اماں نے پہلی بار کچھ چڑیاں چالیس کوپک میں بیچ لیں تو وہ حیران رہ گئیں۔

''بھئی کمال ہو گیا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ اس سے بھلا کیا ملے گا۔ ایک ننھے سے بچے کا کھیل ہے تو یوں ہی سہی! لیکن ذرا سوچو تو کس قدر منافع ہوا۔ حد ہے!''

''اور پھر بھی آپ نے ذرا سستے داموں ہی بیچیں...''

''اچھا؟ سستے داموں بیچیں میں نے؟''

جس دن بازار لگتا اس دن تو وہ ایک روبل یا اور زیادہ بھی پیدا کر لیتیں، اور مارے خوشی کے پھولی نہ سماتیں: ذرا سی بات میں کتنا پیسہ مل جاتا!

''دیکھو، اب کوئی عورت بیچاری دن بھی کپڑے دھوئے یا فرش پونچھے رگڑے، تب کہیں جا کر پچیس کوپک پائے! یہ بھلا کیا بات ہوئی، بہت ہی غلط بات ہوئی نا! اور چڑیوں کو پنجرے میں بند کرنا بڑی زیادتی ہے۔ اس دھندے کو چھوڑ دے الیوشا بیٹا!''

لیکن مجھ پر تو چڑیاں پکڑنے کا شوق سوار ہو گیا تھا۔ مجھے اس میں بہت لطف آتا تھا۔ میری آزادی بھی برقرار رہتی تھی اور سوائے اس کے کہ چڑیوں کو تھوڑی سی پریشانی ہوئی تھی، اور کسی کو کوئی مشکل نہ تھی۔ میں نے اچھا ساز و سامان حاصل کیا۔ تجربہ کار چڑی ماروں سے بات کر کے میں نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ میں تقریباً بیس میل پیدل نکل جاتا تھا۔ کستوفسکی کے جنگل میں، والگا کے ساحل پر، جہاں میں دیودار کی پریاں پکڑ سکتا تھا یا پدیوں کی ایک خاص قسم بھی وہاں مل جاتی تھی۔ چڑیاں پالنے کے شوقین لوگ پدی کے بہت اچھے دام دیتے تھے۔ یہ ایک چھوٹی سی سفید رنگ کی پدی ہوتی ہے، لمبی دم اور فی الجملہ نہایت حسین۔

کبھی کبھی میں شام کو گھر سے نکلتا اور ساری رات شاہراہ قازان پر چلتا رہتا۔ کبھی کبھی خزاں کی بارشوں سے سابقہ پڑتا، گہری کیچڑ میں چلنا ہوتا۔ میرے کندھے پر موم جامے کا ایک تھیلا ہوتا جس میں جال پھندے، پنجرے اور چڑیوں کو للچانے والی چڑیا ہوتی۔ ہاتھ میں شاہ بلوط کی لکڑی کا مضبوط عصا ہوتا۔ خزاں کی یہ راتیں بڑی سرد اور ڈراؤنی ہوتی تھیں، سخت ڈراؤنی!.. سڑک کے دونوں طرف پرانے، فرسودہ، بجلی کے مارے برچ کے درخت کھڑے ہوتے۔ ان کی بھیگی ہوئی شاخیں اوپر جا کر ملی ہوئی ہوتیں اور میں ان کے نیچے سے گزرتا۔ میرے بائیں ہاتھ کو سیاہ والگا پر، پہاڑ کے دامن میں، آخری اسٹیمروں اور بجروں کی اکی دکی روشنیاں دکھائی دیتیں اور پھر تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتیں۔ مجھے ان کے بھونپو کی چیخیں سنائی دیتیں، پانی سیان کے پہیوں کی چھپا چھپ کی آہٹ آتی۔

جن دیہات سے ہو کر گزرتا وہاں ایسا لگتا کہ فولاد کی طرح ڈھلی ہوئی زمین سے ننھے ننھے جھونپڑے اگ آئے ہیں، بھوکے کتے میں ٹانگ لیتے، چوکیدار اپنی پھنگیاں گھما گھما کر ڈراونی آوازوں میں چیختے:

''کون جاتا ہے؟ یہ کس کو شیطان گھسیٹ کر لایا ہے۔ شیطان کا نام رات کو منہ پر آتا ہے۔ تھو!''

مجھے ڈر رہتا تھا کہ کہیں میرے پھندے وغیرہ نہ چھین لیں۔ اس لئے ہمیشہ اپنے پاس پانچ کوپک والے سکے رکھتا تھا تاکہ چوکیدار کی مٹھی گرم کرسکوں۔

فوکینو نامی جو گاؤں تھا اس کے چوکیدار سے تو میری دوستی ہوگئی تھی۔ وہ میری اس بادہ پیمائی پر حیران رہ جاتا تھا:

''ارے تم! پھر آ پہنچے؟ بھئی کیا نڈر بچہ ہے، چمگاڈر ہے! کیوں؟''

اس کا نام نیفونت تھا، چھوٹا سا قد، سر کے بال پکنے لگے تھے، صورت ولی اللہ کی سی۔ اکثر وہ ایک شلجم یا ایک سیب یا تھوڑے سے مٹر کے دانے اپنی جیب سے نکالتا اور میرے ہاتھ پر رکھ کر دباتے ہوئے کہتا:

''لے دوست، یہ ذرا سی چیز میں نے تیرے لئے اٹھا رکھی تھی۔ امید ہے کہ تجھے اچھی لگے گی۔''

پھر وہ میرے ساتھ ساتھ چلتا ہوا گاؤں کے سرے تک پہنچانے آتا۔

''خدا حافظ۔ خدا تیرا نگہبان ہو!''

میں صبح کاذب تک جنگلوں میں پہنچ جاتا۔ اپنا جال وغیرہ لگاتا۔ پھندے پھیلا کے جماتا، اور پھر جنگل کے سرے پر جا کر لیٹ جاتا اور صبح صادق کا انتظار کرتا۔ خاموشی۔ مکمل خاموشی۔ میرے چاروں طرف ہر چیز پر خزاں کی گہری نیند کی حکومت ہوتی۔ تاریک پہاڑوں کے دامن کے آس پاس پھیلی ہوئی ان وادیوں کی ہلکی سی جھلکی دکھائی دیتی جنہیں والگا نے کاٹا تھا۔ ان کے آخر سرے افق پر چھائی کہر میں گھلتے ہوئے معلوم ہوتے۔ جنگلوں سے پرے وادی کی سرحدوں سے سورج آہستہ آہستہ اٹھتا جاتا اور دھیرے دھیرے جنگل کی سیاہ ایالوں میں شعلے بھڑکاتا جاتا۔ تمام فضا کچھ اس طرح متحرک ہوتی کہ روح کے تار جھنجھنا اٹھتے: کہر اوپر کو اٹھنے لگتی، اس کی پرواز کی رفتار تیز تر ہوتی جاتی، سورج کی روشنی اس میں چاندی کے بہتے ہوئے دریا کی طرح سرائت کرتی جاتی اور کہر کی اس چادر کے نیچے، درخت اور سبزہ آہستہ آہستہ روشنی کی طرف اشتیاق سے بڑھتے ہوئے محسوس ہوتے۔ ایسا لگتا کہ وادیاں سورج کی گرمی سے پگھل رہی ہیں اور ایک سنہری آبشار ہر طرف گر رہا ہے۔ اب سورج نے دریا کے ساحل پر ٹھہرے ہوئے پانی کو چھوا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ دریا اس طرف دوڑ پڑا جہاں سورج نے اپنی سنہری انگلیاں ڈبوئیں۔ سورج کی زرتاب ٹکیہ جیسے جیسے اوپر اٹھتی جاتی، چاروں طرف مسرت کی نعمتیں لٹاتی جاتی، سردتھر تھراتی زمین میں زندگی کی گرمی دوڑ جاتی اور زمین شکرانے کے طور پر خزاں کی سوندھی خوشبو بخشتی جاتی! شفاف ہوا کے آئینے میں زمین بڑی وسیع لگتی۔ لامتناہی طور پر وسیع۔ ہر چیز کسی دور کی منزل تک بڑھتی محسوس ہوتی جیسے انسان کو زمین کے آخری نیلے نیلے سروں تک کھینچ لے جانا چاہتی ہے۔ بیسیوں بار میں نے اس جگہ سے طلوع آفتاب کا منظر دیکھا اور ہر بار جیسے میں نے ایک نئی کائنات کی پیدائش دیکھی۔ ایک ایسی کائنات جو لاثانی طور پر حسین اور دلفریب تھی!

نہ جانے کیوں مجھے آفتاب سے ہمیشہ سے ایک خاص قسم کا عشق ہے۔ میں نے اس کے نام پر مرتا ہوں، اس کی خاموش موسیقی اور اس موسیقی کی پھیلتی ہوئی گونج مجھے محبوب ہے۔ اس میں مجھے بڑا لطف آتا ہے۔ کہ میری آنکھیں بند ہوں اور اس کی نرم گرم کرن میرے چہرے پر کھیلتی ہو، یا جب کوئی کرن تلوار کی طرح کسی روزن، دراز یا درخت کی ٹہنیوں سے ہوتی ہوئی گھس پڑے تو میں اسے مٹھی میں دبا لوں۔ نانا ابا کے دل میں ''شہزادے میخائل چیز نیگوفسکی سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا''۔ لیکن مجھے وہ لوگ کمینے محسوس ہوتے، جو خانہ بدوشوں کی طرح تاریک اور غمگین زندگی بسر کرتی تھے اور جن کی آنکھیں مردوین کسانوں

کی طرح ہر وقت دکھتی رہتی تھیں۔ جب وادیوں سے پرے آفتاب جھانکتا تو میرے لبوں پر بھی مسکراہٹ خود بہ خود کھیلنے لگتیں۔

جہاں میں لیٹتا وہاں میرے بالکل سر پر سدا بہار کی شاخیں سرسرا کے اپنے اوپر سے شبنم جھٹکتیں، درختوں کے نیچے پھیلی ہوئی پرچھائیوں میں مجھے جھاڑیوں کی بیلدار اور پھولدار جالیوں کے کنارے پر پالے کی جھالر ٹکی ہوئی نظر آنے لگتی۔ بارش سے دبی ہوئی، گرائی ہوئی، بھوری بھوری گھاس بے حس وحرکت، زمین سے ہم آغوش ہوتی۔ لیکن جیسے ہی سورج کی روپہلی کرن اس کو چھوتی ایسا دکھائی دیتا جیسے اس میں ہلکی سی حرکت پیدا ہو رہی ہے۔ جیسے وہ پھر سے زندہ ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔

چڑیاں جاگ اٹھیں۔ ایک ڈال سے دوسری ڈال پر پروں کی ننھی گیندیں پھدکتی پھرتیں۔ یہ پدیاں ہیں۔ دیوار کی اونچی شاخوں کے میناروں پر دیودار کی چڑیاں بیٹھی اس کے سخت پھلوں میں اپنی ٹیڑھی چونچ کھٹ کھٹ مارتی رہتیں۔ ایک ڈال کے بالکل سرے پر ایک ننھی سی چڑیا لٹکتی رہتی اور لٹکے ہی لٹکے وہ اپنے پروں کو کھجا کھجا کر میرے پھیلائے ہوئے جال کو مشکوک نظروں سے تکتی جاتی۔ ایک دم سے مجھے یہ دکھائی دینے لگتا کہ سارا جنگل جو ابھی ایک منٹ پہلے جیسے کسی گہری سوچ میں غرق تھا، پرندوں کی ان کی ان سیکڑوں قسم کی آوازوں سے بھر گیا ہے۔ متحرک ہو گیا ہے۔ ان جانداروں نے اسے زندگی کی حرکت بخش دی ہے۔ انسان نے، اشرف المخلوقات نے اس دنیا کے حسن کے خالق نے، ان ہی جانداروں سے تشبیہ لے کر اپنے لئے طرح طرح کے تخیلاتی وجود تخلیق کئے ہیں۔ پریاں، پری زاد غلمان اور فرشتوں کی ایک پوری برادری کی برادری۔

ان چڑیوں کو گرفتار کرنا بڑا دردناک تھا اور ان کو پنجرے میں قید کرنا شرمناک۔ مجھے ان کے نظارے سے اتنی مسرت ملتی تھی جس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ لیکن میرے رحم کے جذبے کے مقابلے پر شکاری کا خاص جذبہ اور روپیہ کمانے کی خواہش کا پلہ ہمیشہ بھاری رہتا تھا۔

چڑیوں کی ہوشیاری دیکھ کر مجھے بڑا مزا آتا تھا۔ ایک نیلی سی پدی بڑی غور سے جال کو دیکھتی اور جب پھندے کا خطرہ اس کی سمجھ میں آجاتا تو ایک طرف سے بڑھتی، بڑی احتیاط سے، دبے پاؤں اور بڑی چالاکی سے بانس کی جال کے سوراخوں کے درمیان صرف اپنی چونچ داخل کر کے اندر سے بیج نکالنے لگی۔ پدیاں بہت ہی چالاک ہوتی ہیں لیکن ان کو ٹوہ لینے کا بڑا چاؤ ہوتا ہے۔ اور یہی چاؤ ان کی جان کا گاہک

ہوتا ہے۔ مغرور مینائیں ذرا احمق ہوتی ہیں۔ جھنڈ کی جھنڈ جال میں گھس پڑتی ہیں، جیسے پیٹ بھرے عبادت گزار گرجا گھر میں جاتے ہیں۔ جب جال ان پر گرتا ہے تو وہ بہت حیران ہوتی ہیں۔ آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی ہیں اور شکاری کی آنگلیوں پر چونچ مارتی ہیں۔ دیودار کی پریاں جال میں بڑے اطمینان اور سکون سے جاتی ہیں۔ پوپلرین چڑیا بالکل نرالی ہوتی ہے۔ یہ چڑیا جال کے سامنے دیر تک بیٹھتی رہتی ہے، لمبی چونچ گھماتی ہے، گھنی دم کے سہارے ٹکی رہتی ہے۔ یہ کھٹ بڑھئی کی طرح درختوں کے تنوں پر پھدکتی ہے اور ہمیشہ پدیوں کے راہبر کا کام کرتی ہے۔ سرمئی رنگ کی چڑیا میں کچھ عجیب بات ہے، بالکل اکیلی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی اسے نہیں چاہتا اور نہ وہ کسی کو۔ یہ کوے کی طرح چور کرتی ہے اور ہر چمک دار چیز کو چھپا کر رکھتی ہے۔

دوپہر تک میں شکار کی مہم ختم کرتا ہوں۔ جنگلوں اور کھیتوں سے ہوتے ہوئے گھر جاتا ہوں۔ کیونکہ اگر بڑے راستے سے گاؤں ہو کر جاؤں تو لڑکے جال اور پنجرے چھین لیں گے اور توڑ دیں گے۔ میں اس کا مزہ چکھ چکا ہوں۔

شام تک میں تھکا ماندہ بھوکا گھر آتا ہوں۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں زیادہ بڑا ہو گیا ہوں، میں نے کچھ سیکھا ہے، مجھے میں زیادہ تاب و تواں پیدا ہو گئی ہے۔ اس طاقت سے میں اس قابل ہو جاتا ہوں کہ نانا ابا کی ڈانٹ پھٹکار بغیر غم و غصے کے اطمینان سے سن سکوں۔ یہ دیکھ کر نانا ابا نے سنجیدگی سے بات کرنا شروع کر دیا ہے۔

''چھوڑ یہ بیکار کا کام، چھوڑ یہ سب! چڑیوں کے پھیر میں پڑ کر کبھی کوئی انسان نہیں بنا۔ میں نے ایسا ہوتے نہیں دیکھا۔ اپنے لایق کوئی کام ڈھونڈ اور اس میں اپنی عقل کے جوہر دکھا۔ انسان بیکار دھندوں کی خاطر نہیں جیتا۔ انسان خدا کا بیج ہے، اس سے اچھی اور مبارک فصل آنی چاہئے۔ انسان کیا ہے؟ روبل۔ اچھے کاروبار میں لگاؤ اور ایک روبل کے تین بنا لو۔ کیا سمجھتے ہو زندگی کا کھیل اتنا آسان ہے؟ نہیں، بالکل نہیں۔ دنیا ہر انسان کے لئے اندھیری رات ہے۔ ہر انسان کو اپنی روشنی سے اجالا کرنا پڑتا ہے۔ ہر انسان کے دس انگلیاں ہیں اور ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر ہاتھ مارنا چاہتا ہے۔ ضرورت ہے طاقت کی۔ اگر طاقت نہیں تو پھر چالاکی چاہئے۔ جو چھوٹا ہے سو کھوٹا ہے! لگتا تو یہی ہے کہ آدمی سب سے مل کر جیتا ہے۔ لیکن جیتا ہے اصل میں اکیلا۔ سن میری بات گرہ سے باندھ لے، کسی کی بات پر کان نہ دھر۔ آنکھوں پر

بھروسہ اور مکان زبان سے نہیں بنتے۔ ان کے لئے روبل اور کلہاڑی چاہئے۔ تو بشکیری نہیں، کالمک نہیں، جن کی دولت اور جوؤں کے سوا کچھ نہیں...''

وہ پوری پوری شام اسی طرح باتیں کر سکتے تھیاوران کی باتیں میرے حافظے میں جم گئی تھیں۔ ان کی باتیں میرے دل میں گھر کر جاتی تھیں۔لیکن ان باتوں میں جو معنی چھپے ہوئے تھے ان پر مجھے اعتماد نہ تھا۔ ان کی باتوں سے یہ بات صاف تھی کہ انسان کو صرف دو طاقتیں چین سے جینے نہیں دیتیں۔ خدا اور لوگ۔

نانی اماں کھڑکی کے پاس بیٹھی جھالر کے لئے تاگا بناتی رہتیں۔ ان کے چست اور پھرتیلے ہاتھوں میں گھرنی گھومتی رہتی۔ وہ دیر تک خاموشی سے نانا ابا کی لن ترانیاں سنتی رہتیں اور پھر اچانک بول اٹھتیں:

''وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' نانا چیختے۔''خدا! میں نے خدا کو بھلایا نہیں۔ میں خدا کو چاہتا ہوں! بیوقوف بڑھیا، کیا خدا نے ہی زمین پر احمقوں کے بیج بوئے ہیں؟''

...مجھے ایسا لگتا تھا کہ سپاہیوں اور کزاکوں سے بہتر زندگی کوئی نہیں بسر کرتا تھا۔ ان کی زندگی سیدھی سادی اور پرمسرت تھی۔ اچھے موسم میں صبح سویرے دیکھوتو ہمرے گھر کے سامنے جو نالہ تھا، اس کے پرے وہ لوگ نظر آنے لگتے۔ ویران کھیت میں سانپ کی چھتریوں کی طرح پھیل جاتے اور اپنا الجھا سلجھا اور دلچسپ کھیل شروع کر دیتے۔ ہاتھوں میں بندوقیں لئے، سفید قمیص پہنے، یہ مضبوط اور پھرتیلے لوگ ہنستے کھیلتے کھیت میں دوڑتے اور نالے میں کھو جاتے اور بگل کی آواز سن کر ''ہرا'' کا نعرہ لگاتے کھیت میں نکل آتے۔ ساتھ ساتھ نقارے بجتے جاتے اور یہ لوگ سیدھے ہمارے گھر کی طرف بھاگتے، سنگینیں اور طرح چمکتیں جیسے ان کی نوکیں ہمارے گھر کو گھاس کے گٹھے کی طرح بکھیر کر رکھ دیں گی۔

میں بھی ''ہرا'' کا نعرہ لگاتا اور ان کے پیچھے بھاگتا۔ نقاروں کی دہشت خیز آواز سن کر مجھے ایک عجیب نا قابل برداشت خواہش ہوتی کہ احاطے کا جنگلہ نوچ کر پھینک جدوں، کچھ نہ کچھ توڑ پھوڑ دوں اور لڑکوں کو پیٹوں۔

جب سپاہیوں کو فرصت رہتی تو وہ مجھے تمبا کو پلاتے اور اپنی بھاری بھاری بندوقیں دیکھنے کو دے دیتے۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی اپنی سنگین سے میرے پیٹ پر نشانہ باندھتا اور بڑے بناوٹی جوش کے

ساتھ چیختا:

''ٹانگ دو تیل چٹے کو!''

سنگین دھوپ میں چمکتی جیسے کوئی بل کھاتا ہوا سانپ، بس اب پھن مارنے ہی والا ہے۔ اس سے کچھ ڈر بھی لگتا مگر مزہ بھی آتا۔

ان میں سے ایک مردوین لڑکا تھا جو نقارہ بجایا کرتا تھا۔ اس نے مجھے نقارے پر چوبیں لگانا سکھایا۔ پہلے اس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے اور ان کو اتنا ہلایا کہ دکھنے لگے۔ پھر اس نے وہ چوبیں میری انگلیوں میں رکھ دیں حالانکہ اس کے دبانے سے میری انگلیاں سن سی ہوگئی تھیں۔

''تو لگاؤ۔ ایک بار لگاؤ۔ پھر لگاؤ۔ پھر لگاؤ! ترام۔ تا۔ تا تام، ترام۔ تا۔ تا۔ تام۔ بائیں سے آہستہ اور دہنے سے زور سے!'' وہ چیختا تو اس کی آواز دھمکی دیتی ہوئی معلوم ہوتی۔ میری طرف اپنی چڑیا کی سی آنکھوں سے گھورے چلا جا رہا تھا۔

میں سپاہیوں کے ساتھ کھیت میں بھاگتا پھرتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کی ڈرل ختم ہو جاتی۔ پھر میں سارے شہر بھر میں ان کے ساتھ گھوم کر پھر ان کی بارک چلا جاتا۔ اس وقت وہ لوگ زور سے گاتے تھے اور میں ان کا شفیق اور نیک چہروں کو جھانک جھانک کر دیکھتا جاتا اور ان کا گانا سنتا جاتا۔ ان کی صورتیں ایسی نئی نئی اور تابناک لگتیں جیسے پانچ کوپک والے سکے ابھی ابھی ٹکسال سے نکلے چلے آ رہے ہیں۔

آدمیوں کا یہ جتھا جس میں سب ایک سے لگتے تھے، بڑے مزے میں گلیوں سے ہوتا چلتا تھا، ان کو دیکھ کر دل خوشی سے بھر جاتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ غڑاپ سے ان کے جمگھٹ میں کود پڑوں جیسے دریا میں غوطہ لگایا جاتا ہے۔ اس طرح ان کے درمیان گھس جایا جائے جیسے جنگل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ کسی چیز سے ڈرتے نہیں تھے، ہر چیز پر بہادری سے نظر ڈالتے تھے، کسی چیز کو بھی فتح کر سکتے تھے، جو چاہتے تھے حاصل کر لیتے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بہت سادہ طبیعت اور نیک تھے۔

لیکن ایک دن جب ہم لوگ رستے میں ستا رہے تھے، ایک جوان افسر نے جسے ابھی تک کمیشن نہیں ملا تھا، مجھے ایک موٹا سا سگریٹ دیا۔

میں نے سگریٹ کا کش لگایا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن ایک دم سے ایک سرخ شعلہ بھڑکا، میری آنکھیں چندھیا گئیں اور انگلیاں، ناک اور بھوئیں جھلس گئیں۔ سرمئی اور کڑوے دھوئیں سے مجھے

چھینکیں اور کھانسی آنے لگی۔ میری آنکھیں مند گئیں۔ میں خوفزدہ ہو کر بھٹکنے لگا اور سپاہی سب میرے چاروں طرف ایک گھنا دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے اور بڑے مزے میں زور زور سے ہنسنے لگے۔

پھر میں گھر چلا آیا۔ لیکن میرے پیچھے بھی مجھے ان کی ہنسی اور سیٹیوں کی اور ایک خاص طرح کی شائیں کی آواز آرہی تھی جو غالباً کوئی چابک گھمانے سے پیدا ہوئی ہوگی۔ میری انگلیوں میں تکلیف تھی، چہرہ چرچرا رہا تھا، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن اس تکلیف سے بھی زیادہ مجھے ایک دردناک حیرانی کی تکلیف تھی: ان بھلے لوگوں نے آخر میرے ساتھ یہ کیا کیا اور کیوں کیا؟

گھر پہونچ کر میں بڑی دیر تک دوچھتی میں بیٹھا، ان تمام ظلم وستم کے بارے میں سوچتا رہا جن سے سابقہ پڑا تھا۔ اپنی چھوٹی سی زندگی میں میں نے اکثر ایسی باتیں دیکھی تھیں اور ان کا جواز سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اسی وقت مجھے اس بیچارے مخنی سپاہی کا خیال آیا جو اسٹیمر پر آیا تھا۔ وہ جیسے جیتا جاگتا میرے سامنے کھڑا مجھ سے پوچھ رہا تھا:

''کیوں؟ اب تمہاری سمجھ میں آیا کچھ؟''

لیکن اس واقعے کے فوراً ہی بعد مجھ کو ایک ایسا واقعہ دیکھنا پڑا تھا جو اس سے کہیں زیادہ ظالمانہ اور وحشت ناک تھا۔

میں اکثر ان بارکوں میں جاتا رہتا تھا جہاں کزاک لوگ رہتے تھے۔ یہ بارکیں پیچورسکایا بستی کے پاس تھیں۔ یہ کزاک لوگ فوجیوں سے مختلف لگتے تھے، اس لئے نہیں کہ وہ زیادہ اچھے کپڑے پہنتے تھے اور زیادہ اچھے گھوڑسوار تھے بلکہ اس لئے کہ وہ دوسری زبان بولتے تھے، دوسرے گانے گاتے تھے اور خوب ناچتے تھے۔ شام کو کبھی کبھی اپنے گھوڑوں کو مالش وغیرہ کر کے وہ اصطبلوں کے پاس ہی گھیرا بنا کر بیٹھ جاتے۔ سرخ بالوں والا کزاک اپنی گھنگریالی زلفوں کو پیچھے کی طرف پھینکتا ہوا پیتل کے بگل جیسی اونچی سریلی آواز میں گانا شروع کر دیتا۔ وہ تن کر سیدھا کھڑا ہوتا اور اس کا گیت پرسکون دریائے دون یا نیلے ڈینیوب کے متعلق ہوتا۔ وہ اس طرح آنکھیں بند کر لیتا جیسے چکور جو اکثر گاتے گاتے گر پڑتا ہے اور اپنی جان دے دیتا ہے۔ قمیص کے گریبان کھلے ہوئے اور اس میں سے ہنسلی کی ہڈی تانبے کے ساز وسامان کی طرح ڈھلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ دراصل اس کا پورا وجود ہی تانبے کا ڈھلا ہوا معلوم ہوتا۔ اپنی پتلی پتلی ٹانگوں پر ہلتا جیسے اس کے پیروں تلے زمین لرز رہی ہو۔ آنکھیں بند کئے رہتا، وہ اپنے بازوؤں کو ہلاتا رہتا۔

ایسا لگتا ہے کہ وہ انسان نہیں بلکہ بگل ہے یا گڈرئے کی بانسری جس میں جان پڑ گئی ہے۔ بعض وقت تو مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ اب وہ پیچھے کی طرف دھڑام سے دھرتی پر گر پڑے گا اور چکور کی طرف تڑپ تڑپ کر جان دے دے گا۔ کیونکہ اس کی ساری قوت، اس کی روح کی ساری توانائی گیت میں کھپ چکی ہے۔

اس کے ساتھی اس کے چاروں طرف کھڑے رہتے جیبوں میں ہاتھ ڈالے یا ہاتھوں اور تانبے سے چہرے پر نگاہیں جمائے رہتے اور اس طرح آہستہ آہستہ اس کے ساتھ گاتے جاتے جیسے گرجے میں مناجات پڑھی جا رہی ہو۔ اس وقت وہ سب کے سب چاہے داڑھی والی ہوں یا بغیر والے اس وقت مقدس شبیہوں کی طرح لگتے۔ ویسے ہی بے جان اور ویسے ہی بے نیاز۔ اور گیت لمبا ہوتا جیسے کوئی شاہراہ ہو، اسی طرح آگے ہی آگے دوڑتا ہوا، چوڑا اور ہموار۔ میں سنتے وقت بھول جاتا تھا کہ رات ہے یا دن، میں بوڑھا ہوں یا بچہ، ہر بات بھول جاتی۔ گانے والوں کی آوازیں رکتے رکتے مدہم ہو جاتیں تو ہم لوگوں کو کھیتوں پر بڑھتی ہوئی خزاں کی رات کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگتی، گھوڑے شاید صحراؤں کی آزادی کو یاد کر کے آہیں بھرتے اور ان ٹھنڈی سانسوں کی سرسراہٹ ہم تک بھی پہونچتی۔ میرا دل غیر معمولی احساس کے وفور سے پھٹنے لگتا لوگوں سے، زمین ایک خاموش اور وسیع عشق سا دل میں ابلنے لگتا۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ چھوٹا سا تانبے کے رنگ کا کزاک معمولی انسان سے بلند کوئی چیز ہے۔ کوئی بہت ہی اہم چیز۔ کوئی اساطیری ہستی، فانی انسان سے برتر۔ مجھ میں اس سے بات چیت کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اگر وہ مجھ سے کوئی بات پوچھتا تو میں بڑی خوشی سے مسکراتا لیکن گھبراہٹ کے مارے چپ رہتا۔ میں کتے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلنے کو تیار تھا تا کہ اسے زیادہ سے زیادہ دیکھنے کا، سننے کا موقع ملے۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ وہ اصطبل کے ایک کونے میں کھڑا ہے اور اپنے انگلی میں چاندی کی ایک سادی انگوٹھی کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ اس کے خوبصورت ہونٹ ہل رہے تھے، چھوٹی سی سرخ مونچھ لرز رہی تھی اور چہرے پر اداسی اور رنج کے آثار نمایاں تھے۔

ایک بار اندھیری شام کو میں چوک استاروسینایا کے شراب خانے میں اپنے چڑیوں کے پنجرے لئے ہوئے پہونچا۔ اس شراب خانے کے مالک کو گانے والی چڑیوں کا بے حد شوق تھا اور اکثر مجھ سے خریدا کرتا تھا۔

وہیں بار کے نزدیک، تندور اور دیوار کے بیچ میں وہی کزاک بھی بیٹھا تھا۔ اسکے پاس ایک موٹی سی عورت بیٹھی تھی جو جسامت میں اس کی دونی ہوگی۔ اس کا گول چہرہ موم جامے کی طرح چمک رہا تھا، اور اس کو کچھ ایسے پیا اور کچھ فکرمندی کی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسی ماں کی نظروں میں ہوتی ہے۔ وہ نشے میں دہت تھا اور فرش پر اپنے پیر کبھی اٹھاتا کبھی دھرتا۔ یقیناً اس کی ٹھوکر اس عورت کو بھی لگی ہوگی کیونکہ وہ ایک دم چونک پڑی اور تیوری چڑھا کر آہستہ سے اس سے بولی:

''انہہ۔ کیا حماقت ہے...''

بڑی مشکلوں سے کزاک نے اپنی بھوئیں اوپر کو اٹھائیں مگر پھر ایک دم جھکالیں۔ اسے گرمی لگ رہی تھی۔ اس نے وردی کے بٹن کھولے اور قمیص کا گریبان بھی۔ عورت نے سر پر بندھا ہوا رومال سر سے کندھوں پر گرالیا۔ اپنے مضبوط اور سفید بازو میز پر ٹیک دئے اور دونوں ہاتھ اس زور سے کس کر ملائے کہ انگلیاں سرخ نظر آنے لگیں۔ جتنا ہی میں ان دونوں پر غور کرتا تھا اتنا ہی مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ کزاک غالباً اپنی لاڈ پیار کرنے والی ماں کا بگڑا ہوا بیٹا ہے۔ وہ اسے بڑی محبت سے کچھ سمجھا رہی تھی اور وہ بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اس سے کچھ کہہ نہیں رہا تھا بس اس کی صحیح ڈانٹ سنے جا رہا تھا۔

یکایک وہ اس طرح اٹھ کھڑا ہوا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مارا، ٹوپی کو سر پر جھکایا، زور سے ٹوپی پر ایک ہاتھ مارا اور کوٹ کے بٹن لگائے بغیر باہر کو چلا۔ عورت بھی اٹھی، شراب خانے کے مالک سے بولی:

''کوزمیچ، ہم ابھی ایک منٹ میں آتے ہیں...''

جب وہ دونوں جانے لگے تو باقی لوگ ہنسنے اور مذاق کر کر کے قہقہے لگانے لگے۔ ایک شخص سنجیدگی سے بولا:

''جب پائلٹ واپس آجائے گا تو اس عورت کو ایسا دے گا کہ یاد رکھے گی!''

میں ان لوگوں کے پیچھے پیچھے باہر نکلا۔ تاریک رات میں وہ مجھ سے تقریباً دس قدم کے فاصلے پر آگے آگے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے چوک کو پار کر لیا جس پر کیچڑ تھی۔ وہ سیدھے والگا کے اونچے ساحل کی طرف چلے جا رہے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ عورت اس کو سنبھالنے کی کوشش میں دوھری ہو ہو جاتی تھی اور کیچڑ کی پچ پچ ان کے قدموں تلے سنائی دیتی تھی۔ عورت بار بار آہستہ آہستہ اس سے التجا کرتی تھی:

''کہاں جا رہے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟''

میں ان کے پیچھے پیچھے کیچڑ میں چلتا رہا اگر چہ میرا راستہ دوسری طرف تھا۔ جب وہ لوگ پشتے پر پہونچے تو کزاک رک گیا، ایک قدم پیچھے کو ہٹا اور اس عورت کے منہ پر ایک زور کا طمانچہ مارا۔ وہ خوف اور تعجب سے چیخ پڑی:

''ہائے، کیوں! تم نے یہ کیوں کیا؟''

میں بھی ڈر گیا اور دوڑ کر ان کے نزدیک پہونچ گیا لیکن کزاک نے اس عورت کو کمر سے پکڑا اور پشتے پر سے پھینک دیا، پھر خود اس کے پیچھے کودا اور دونوں لڑھکتے ہوئے نیچے، ڈھلان پر اگے ہوئے سبزے کی تاریک گہرائیوں میں کھو گئے۔ میں حیران کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ نیچے سے دھینگا مشتی اور کپڑوں کے پھٹنے چرنے کی آواز آرہی تھی اور ساتھ ہی کزاک کے زور زور سے غرانے کی آواز۔ عورت ہانپتے ہوئے آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی:

''میں چیخ پڑونگی... میں چیخ پڑوں گی...''

پھر وہ ایک بار زور سے دردناک آواز میں کراہی اور پھر سناٹا چھا گیا۔ میں نے ٹٹول کر ایک پتھر اٹھایا اور پشتے سے نیچے پھینکا۔ لیکن گھاس کی سرسراہٹ کے سوا کوئی جواب نہ ملا۔ شراب خانے کے دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آتی۔ کسی نے زور سے اس طرح ''اونہہ'' کی جیسے وہ گر پڑا ہو اور پھر خاموشی چھا گئی۔ خاموشی جو خوف میں لپٹی ہوئی تھی۔

پھر پشتے سے ادھر کوئی بھاری سی سفید چیز رینگتی نظر آنے لگی۔ آہستہ آہستہ وہ برابر اوپر کی طرف چڑھتی چلی آرہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ روتے روتے سسکیاں بھرتی جارہی تھی۔ میں نے پہچان لیا کہ وہی عورت ہے۔ وہ چاروں ہاتھ پاؤں پر بھیڑ کی طرح چل رہی تھی اور مجھے نظر آرہا تھا کہ وہ کمر تک بالکل ننگی ہے، اس کی بڑی بڑی سفید چھاتیاں لٹک رہی تھیں جس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے تین چہرے ہیں۔ آخر وہ پشتے کی دیوار کے پاس آ کر بالکل میرے نزدیک بیٹھ گئی اور ہانپتے ہوئے گھوڑے کی طرح سانس لیتے ہوئے اپنے بکھرے بال درست کرنے لگی۔ اس کے سفید جسم پر مٹی کے سیاہ سیاہ دھبے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ روتے روتے وہ اس طرح اپنے چہرے سے آنسو پونچھتی جارہی تھی جیسے کوئی بلی پنجے سے منہ دھو رہی ہو۔ یکایک اس کی نظر مجھ پر پڑی، وہ آہستہ سے چیخی:

''اے پروردگار! ارے تو، کون ہے؟ اے، دور ہو یہاں سے، بے شرم لڑکا!''

لیکن مجھ سے ہٹانہ گیا، حیرانی اور تلخ احساس رنج نے مجھے جیسے مفلوج سا کر دیا تھا۔ مجھے نانی اماں کی بہن کی بات یاد آ رہی تھی:

''عورت ایک طاقت ہے جس کی قوت کا مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ آخر حوا نے تو خدا تک کو چکمہ دے دیا تھا...''

عورت اٹھی، جتنا کچھ لباس ثابت بچا تھا، اس سے اپنی چھاتیاں ڈھکیں، اس طرح اس کے پاؤں کھل گئے اور پھر تیزی سے چل پڑی۔ کزاک پشتے پر چڑھا اور سفید کپڑے ہوا میں ہلانے لگا، ہلکی سی سیٹی بجائی، کچھ غور کیا جیسے کچھ سن رہا ہو اور پھر بڑے رنگیلے لہجے میں بولا:

''داریا! میں تم سے کہتا تھا کزاک لوگ جو لینا چاہتے ہیں وہ لے کر ہی رہتے ہیں...تو تمہارا خیال تھا میں نشے میں دھت ہوں؟ ارے نہیں! وہ تو صرف تمہیں الو بنانے کے لئے ایک بہانہ تھا...داریا!''

اس کے قدم باقاعدگی سے زمین پر ٹکے ہوئے تھے، آواز پرسکون اور طنز آمیز تھی لیکن اس عورت کا مذاق اڑاتی ہوئی لگتی تھی۔ جھک کر اس نے داریا کے لباس سے اپنے جوتے پر لگی ہوئی کیچڑ پونچھی اور کہتا گیا:

''لو۔ یہ رہا...تمہارا بلاؤز...آؤ بھی داریا...اب خفا نہ ہو...''

اور پھر اس نے آواز اونچی کر کے داریا کو ایک گندی گالی دی۔

میں وہیں پتھروں کے ڈھیر پر بیٹھا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ وہ آواز جو رات کے سناٹے میں اکیلی معلوم ہوتی تھی اور جس کا لہجہ بڑا شاہانہ اور تحکمانہ تھا۔

چوک میں لگی ہوئی روشنیاں میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھیں۔ دھنی طرف جو درختوں کا جھنڈ تھا، اس کے بیچ سے ''مدرسہ برائے بنات اشرفا'' کی سفید عمارت سر اٹھائے کھڑی تھی۔ کزاک بڑی بے دلی سے گالیاں بکتے ہوئے اور آہستہ آہستہ سفید کپڑوں کو ہلاتا ہوا چوک کی طرف روانہ ہو گیا اور اس طرح نظروں سے اوجھل ہو گیا جیسے کوئی بھیانک خواب یکا یک ٹوٹ جائے۔

ساحل کے نچلے حصے سے پانی کے پمپ سے نکلتی ہوئی بھاپ کی سائیں سائیں سنائی دے رہی تھی۔ دریا کی طرف اترنے والے رستے پر ایک گھوڑا گاڑی ٹپ ٹپ اترتی چلی جا رہی تھی۔ آس پاس کسی متنفس کا نام و نشان نہ تھا۔ میں زہر میں بجھا ہوا پشتے کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا، ہاتھ میں ایک ٹھنڈا

پتھر دبائے جو میں نے کزاک کو مارنے کے لئے اٹھایا تھا۔ فاتح سینٹ جارج کے گرجے کے قریب چوکیدار نے مجھے ٹوکا، بگڑ کر پوچھا کہ میں کون ہوں اور میرے کندھے پر جو جھول ہے اس میں کیا ہے۔

جب میں نے اس کزاک کے متعلق تفصیل سے بتایا تو وہ زور سے ہنسنے لگا:

''ہاں، بہت خوب! کزاک لوگ تکلف نہیں کرتے بھائی! ہمارا ان کا کیا مقابلہ! اور وہ عورت کتیا ہے ہی!...''

اور پھر ہنسنے لگا۔ میں اپنے رستہ پر چل پڑا اور سوچتا جاتا تھا کہ اس شخص کو اس دردناک اور فحش قصے میں آخر ہنسنے کی کیا بات نظر آئی؟

مجھ پر سوچ سوچ کر وحشت طاری ہوتی تھی کہ اگر اس عورت کی جگہ میری ماں ہوتی یا نانی اماں ہوتیں تو...

جب پہلی برفباری ہوئی تو نانا ابا پھر مجھے نانی اماں کی بہن کے یہاں لے گئے۔

''چل تو آخر اس میں تیرا نقصان بھی کیا ہے۔ کچھ نقصان نہیں۔ چل آ'' وہ کہنے لگے۔

مجھے یہ محسوس ہوا کہ گرمی بھر میں نے جو زندگی بسر کی تھی، اس سے مجھے زبردست تجربات حاصل ہوئے تھے، اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میری عمر اور عقل پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے لیکن میرے مالکوں کے یہاں زندگی کی اکتاہٹ اور یکسانیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اسی پرانے طریقے سے یہ لوگ کھانے کی زیادتی سے اپنے جسم میں زہر بھرتے رہتے تھے، اسی ایک ڈھرے سے اپنی بیماریوں کا طولانی ذکر کرتے رہتے تھے۔ وہ بڑھیا مالکن اسی وحشت ناک انتقامانہ جذبے کے ساتھ اپنے پروردگار سے دعائیں مانگتی رہتی تھی۔ بہو بچہ ہونے کے بعد دبلی تو ضرور ہو گئی تھی اور جگہ کم گھیرتی تھی لیکن اس کی چال میں وہی مغرور انداز باقی تھا۔ وہ بچوں کے لئے کپڑے سیتی رہتی اور آہستہ آہستہ ایک ہی گیت ہمیشہ گنگنایا کرتی:

وانیا، وانیا، وانچکا،
میرا پیارا وانیا بھیارے،
میں تو گاڑی میں بیٹھوں گی آگے رہے،
تو جھک کر دھکیلنا پیچھے سے رہے،

وانیا، وانیا، وانچکا!

اگر کوئی کمرے میں جاتا تو وہ فوراً گانا بند کر کے بگڑ کر پوچھتی:

''کیا چاہئے؟''

یقیناً اس کو بس یہی ایک گانا آتا تھا۔

شام کے وقت میری مالکنیں مجھے کھانے کے کمرے میں بلالیتیں اور کہتیں:

''ہمیں اپنی اسٹیمر کی زندگی کے متعلق کچھ بتانا!''

میں بیت الخلا کے دروازے کے پاس ایک کرسی پر بیٹھتا اور انہیں سب کچھ بتاتا۔ اس موجودہ زندگی میں مجھے زبردستی دھکیلا گیا تھا اس لئے اس ماحول میں بیٹھ کر دوسری زندگی کی یاد بہت ہی خوشگوار معلوم ہوتی۔ لیکن یہ صورت حال زیادہ دیر نہ رہتی۔ کیونکہ یہ عورتیں کبھی اسٹیمر پر بیٹھی نہ تھیں اس لئے طرح طرح کے سوالات پوچھتیں:

''تجھے ڈر نہیں لگتا تھا؟''

میری سمجھ ہی میں نہ آتا کہ ڈر لگنے کی اس میں کون سی بات تھی؟

''اگر کسی گہری جگہ اسٹیمر پہونچ جاتا اور ڈوب جاتا تو؟''

میرے مالک ہنسنے لگے۔ اور اگرچہ مجھ کو معلوم تھا کہ اسٹیمر گہری جگہوں میں نہ الٹتے ہیں اور نہ ڈوبتے ہیں لیکن میں ان عورتوں کو قائل نہ کر سکا۔ بڑھیا کو یقین تھا کہ اسٹیمر پانی کی سطح پر نہیں تیرتا بلکہ اس کے پہیئے اس طرح دریا کے پیندے پر چلتے ہیں جیسے ٹھیلا گاڑی کے پہیئے سڑک پر۔

''اگر لوھے کا ہوتا ہے اسٹیمر تو پھر تیرتا کیونکر ہے؟ کلہاڑی تو نہیں تیرتی۔ کیوں؟''

''لیکن ڈوں گا تو تیرتا ہے!''

''واہ بھئی، کیا مقابلہ کیا ہے! ڈوں گا تو ننھا سا ہوتا ہے اور پھر اندر سے خالی بھی ہوتا ہے...''

جب میں نے انہیں سموری اور اس کی کتابوں کے متعلق بتایا تو انہوں نے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ بڑھیا کا دعوے تھا کہ صرف بیوقوف یا بے ایمان لوگ ہی کتابیں لکھتے ہیں۔

''اور مناجاتوں اور حضرت داؤد کی کتاب مقدس کے متعلق کیا خیال ہے؟''

''مناجات تو پاک کتابیں ہیں اور پھر بھی حضرت داؤد نے جب زبور کے مناجات لکھے تو پروردگار

سے معافی مانگی تھی۔''

''یہ کہاں لکھا ہے؟''

''یہ یہاں لکھا ہے میری ھتیلی پر! ابھی ایک زوروں کا چانٹا دوں گی سر پر تو تجھے معلوم ہوگا کہ کہاں لکھا ہے!''

وہ اپنے کو عقل کل سمجھتی تھی جیسے اسے سب کچھ معلوم ہے۔ اور اپنی تمام باتوں کو نہایت یقین کے ساتھ بیان کرتی تھی، جو اکثر حماقت کی ہوتی تھیں:

''پیچور کا گلی میں جو تاتاری مرا تھا نہ تو اس کی روح اس کے حلق سے باہر بہنے لگی۔ کالی سیاہ، جیسے تارکول!''

''لیکن روح تو ہوائی چیز ہوتی ہے'' میں نے کہا۔

''میں تاتاری کی روح کی بات کر رہی ہوں، احمق!'' اس نے بگڑ کر جواب دیا۔

بہو بھی کتابوں سے خائف رہتی تھی۔

''کتابیں پڑھنا نہایت خطرناک ہے، خاص کر کمسنی میں'' وہ کہتی۔ ''ہماری گلی میں ایک لڑکی رہتی تھی، اچھے شریف خاندان کی تھی بھی وہ۔ مگر پھر اس نے کتابیں پڑھنی شروع کر دیں۔ اور اتنا پڑھا اتنا پڑھا کہ اس کو پادری صاحب سے عشق ہو گیا! پھر پادری صاحب کی بیوی نے اس کی خوب خبر لی ہے۔ بس اللہ دے اور بندہ لے! بیچ سڑک پر، سب کے سامنے، خوب فضیحتا کیا۔ توبہ ہے...''

کبھی کبھی میں سموری کی کتابوں میں سے پڑھے ہوئے الفاظ بولا کرتا تھا۔ ان ہی کتابوں میں سے کسی میں میں نے یہ جملہ پڑھا تھا ''حقیقت بیانی تو یہ ہوگی کہ بارود کسی ایک شخص نے ایجاد نہیں کیا بلکہ وہ ایک طویل ارتقا کا نتیجہ تھا جو چھوٹی چھوٹی ایجادوں اور معمولی مشاہدوں سے مسلسل جاری تھا۔''

نہ جانے کیوں یہ فقرہ ''حقیقت بیانی تو یہ ہوگی کہ'' میرے دماغ میں بیٹھ گیا اور یہ فقرہ چونکہ مجھے نہایت زوردار لگتا تھا اس لئے میں اس کو استعمال کر گیا۔ اس کے استعمال کی مجھے بڑی قیمت دینی پڑی اور بلاوجہ کی کوفت۔ ایک نہایت ہی گھٹیا قسم کی کوفت، اس کی بدولت مجھے برداشت کرنی پڑی۔

ایک دن شام کو جب ان لوگوں نے مجھ سے کہا کہ اسٹیمر کے تجربات بیان کروں تو میں نے جواب دیا کہ ''حقیقت بیانی تو یہ ہوگی کہ کوئی خاص بات بیان کرنے کی ہے بھی نہیں....''

بس ان لوگوں نے میری بات پکڑ لی اور ٹرانا شروع کر دیا:

''یہ کیا ہے!؟ کیا کہا تو نے؟''

چاروں کے چاروں ہنسنے لگے۔

''اے پروردگار، حقیقت بیانی تو یہ ہوگی کہ!...'' وہ بار بار دوھراتے رہے۔

یہاں تک کہ میرے مالک نے بھی مجھ سے کہا کہ ''یہ بکواس ہے۔ حماقت کی بات!''

اس کے بعد بہت دنوں تک ان لوگوں نے میرا نام ہی ''حقیقت بیانی'' رکھ دیا تھا۔

''اے حقیقت بیانی! ذرا ادھر آؤ۔ دیکھو یہ بچے نے فرش میلا کر دیا ہے، ذرا اسے پونچھ دو تو حقیقت بیانی...''

اس بلا وجہ کی، بے کار چھیڑ سے مجھے تکلیف تو نہیں ہوتی تھی مگر اس پر تعجب ضرور ہوتا تھا۔

جتنا بھی کام ہو سکتا میں محنت سے جان توڑ کر کام کرتا کیونکہ اس ماحول میں دکھ اور رنج کی جو کہر میرے چاروں طرف چھائی اور لپٹی ہوئی تھی، اس کو بھولنے کا یہی ایک ذریعہ تھا۔ کام تھا بھی کافی۔ گھر میں دو ننھے بچے تھے اور چونکہ میری چڑ چڑی مالکنیں روز کھلائی کو نکالتی رہتی تھیں، اس لئے بچوں کی دیکھ بھال زیادہ تر میرے سر پڑی رہتی تھی۔ روزانہ میں پوتڑے دھوتا تھا اور ہفتہ میں ایک دن ''فوجی چشمے'' کے گھاٹ پر کپڑے دھونے جاتا تھا۔ وہاں دھوبنیں مجھ پر خوب ہنستی تھیں۔

''ارے یہ عورتوں کے کام تو کیوں کر رہا ہے رے؟''

بعض اوقات اس چھیڑ کا بدلہ لینے کے لئے میں گیلے کپڑوں سے ان کو خوب ساٹتا، وہ بھی الٹ کر مجھے ساٹتیں۔ اور ان کے ساتھ اس کھیل میں مجھے بڑا لطف آتا۔

یہ ''فوجی چشمہ'' ایک نالے میں بہتا تھا جو جا کر دریائے اوکا میں گرتا تھا۔ یہ نالہ شہر اور ایک بڑے میدان کے درمیان پڑتا تھا۔ اس میدان کا نام کسی پرانے سلاف دیوتا یاریلو کے نام پر تھا۔ اسٹیمر کے بعد ساتویں ہفتے میں لوگ اس میدان میں آ کر میلہ لگاتے تھے۔ نانی اماں نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے بچپن تک لوگ یاریلو کو مانتے تھے اور اس پر چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ ایک برے سے پہیئے کو تارکول سے تر کر کے اس کو آگ دی جاتی تھی اور پھر اس کو پہاڑ پر سے لڑھکایا جاتا تھا۔ ساتھ میں لوگ خوب چیختے چلاتے اور شور مچاتے تھے اگر وہ پہیہ لڑھکتا ہوا دریائے اوکا تک پہونچ جاتا تو اس سے یہ مراد لی جاتی تھی کہ یاریلو نے ان

کی عقیدت مندی کے اس مظاہرے کو قبول کر لیا: گرمی کا موسم اب بہت شاندار ہوگا اور لوگوں کے حصے میں بہت سی خوشیاں آئیں گی۔

زیادہ تر دھوبنیں اسی یار یلو میدان میں رہتی تھیں۔ وہ سب کی خوب نڈر اور بے حد زبان دراز تھیں۔ انہیں شہر کی زندگی کی ساری معلومات تھیں اور وہ سوداگروں، کارکوں اور ان افسروں کے متعلق باتیں کرتی تھیں جن کے یہاں وہ کام کرتی تھیں۔ وہ بیان سننے کے لائق اور بہت دلچسپ ہوتے تھے۔ جاڑوں کے زمانے میں ٹھنڈے برفیلے پانی میں کپڑے پچھاڑنے اور نچوڑنے کا کام بڑا سخت اور جان لیوا ہوتا تھا۔ ان عورتوں کے ہاتھ سردی سے اتنے ٹھنڈے پڑ جاتے تھے کہ ہاتھ کی جلد تڑخ جاتی تھی۔ وہ جھکی ہوئی پاٹ کے نزدیک کھڑی رہتی تھیں، یہ پٹرے پانی میں نکلے ہوئے تھے۔ اوپر سے تیز سرد ہوا اور برف سے بچنے کے لئے صرف ایک پرانا بوسیدہ چھپر سا ہوتا تھا جو دراڑوں سے پر تھا۔ عورتیں کپڑے نچوڑتیں۔ ان کے چہرے سرخ سرخ رہتے تھے۔ سخت پالے کی وجہ سے انگلیاں اکڑ جاتیں، ایک دوسرے کو تازہ ترین خبریں سناتی جاتیں اور ہر چیز سے نہایت بہادری کے ساتھ نپٹتی جاتیں۔

ان میں سے سب سے اچھی گفتگو کرنے والی نتالیا کوزلوفسکایا تھی، کوئی تیس سے اوپر عمر، شاداب چہرہ، مضبوط جسم، آنکھوں میں ہر وقت طنز کے شعلے لپکتے رہتے، زبان بڑی تیز تھی، ہر معاملے میں فرفر بولتی چلی جاتی۔ جب وہ بولنے پر آتی تو باقی سب عورتیں ہمیشہ نہایت توجہ سے اس کی بات سنتیں۔ ہر بات میں اس سے رائے لیتیں اور اس کی بہت عزت کرتیں کیونکہ وہ اپنے کام میں بڑی ماہر تھی، کپڑے صاف ستھرے پہنتی تھی اور پھر اپنی لڑکی کو اسکول بھیج کر پڑھوا بھی تو رہی تھی۔

جب وہ دو بوجھ گیلے کپڑے سر پر اٹھائے، جھکی ہوئی، پھسلوان رستے سے نیچے اترتی ہوتی تو لوگ اس سے نہایت اخلاق سے ملتے اور پوچھتے:

''کیوں۔ کیسی ہے تمہاری بیٹی؟''

''اچھی ہے۔ شکر ہے خدا کا۔ پڑھ رہی ہے!''

''ارے وہ تو دیکھتے ہی دیکھتے شریف زادیوں کی طرح ہو جائے گی؟''

''اس لئے تو میں نے اسے اسکول بھیجا ہے۔ آخر یہ شریف زادیاں آئیں کہاں سے؟ ہم ہی نے تو ان کو جنم دیا ہے، اور ہم ہی گندگی اور کوڑا سمجھے جاتی ہیں۔ ہم نے نہیں تو اور کس نے دیا ہے انہیں جنم؟

انسان جتنا ہی علم سیکھے اتنا ہی شریف بنے! خدا نے پیدا تو ننھا اور نادان کیا ہے، پر زمین سے اٹھاتا ہے تو آدمی بڑھا اور تجربہ کار بن جاتا ہے۔ تو بس پھر یہ تو اپنا کام ہے کہ پڑھو اور عقل سیکھو!''

جب وہ بولتی تھی تو باقی تمام لوگ خاموش ہو جاتے تھے اور اس کی یقین سے بھری ہوئی رواں تقریر سننے لگتے تھے۔ لوگ اس کی تعریف منہ پر بھی کرتے تھے اور پیٹھ پیچھے بھی۔ اس کی مضبوطی اور قوت برداشت اور اس کی عقل کی تعریف۔ لیکن حیرت یہ ہے نقش قدم پر چلتا کوئی نہ تھا۔ اس نے پرانے جوتوں کے اوپر کا حصہ کاٹ کر اپنی آستینوں تر بھی نہ ہوں۔ ہر شخص نے کہا کہ یہ نہایت ہوشیاری کی بات ہے لیکن ویسا کسی اور نے کیا نہیں، بلکہ جب میں اس طرح کی آستینیں پہن کر نمودار ہوا تو الٹے میرا مذاق اڑایا جانے لگا:

''اوہو ہو ہو۔ دیکھو ذرا، عورت ذات کی شاگردی کرتا ہے۔''

اور اس کی بیٹی کے متعلق کہتے:

''کیا اپنے کو سمجھتی ہے جیسے شریف زادی! اچھا اگر پڑھ لکھ بھی گئی تو پھر کیا! ایک شریف زادی ہی تو کیا اور بڑھ جائے گی! کون جانے پڑھائی بھی ختم کر پائے کہ نہ کر پائے، شاید پہلے ہی مر جائے۔ کون جانے، موت زندگی خدا کے ہاتھ ہے...''

''آخر پڑھے لکھوں کی زندگی میں بھی کیا لعل ٹکے ہیں! اب بانحیلوف کی ہی لڑکی کو لو۔ اتنا پڑھا مغز کھپایا، اور آخر میں کیا بنی کہ بس معمولی سی استانی۔ اور استانی بننے کے یہ معنی ہیں کہ شادی کو تو سات سلام! استانیاں ہمیشہ کنواری رہتی ہیں!''

''ارے پڑھو یا نہ پڑھو، کوئی نہ کوئی مرد تو پکڑ ہی لے گا، پکڑنے کو کچھ ہونا چاہئے...''

ان لوگوں کو خود اپنی ہی جنس کے متعلق اس بے حیائی سے بات کرتے دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا اور بڑا عجب سا لگتا۔ مجھے معلوم تھا کہ سپاہی، ملاح اور مزدور کو اپنی قوت مردانہ کے متعلق اور اس بات کے متعلق ڈینگیں مارتے سنا تھا کہ وہ عورتوں کو بیوقوف بنانے میں کتنے تیز ہیں۔ مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا کہ ان کو ''عورت'' سے دشمنی ہے۔ لیکن جب کبھی میں کسی مرد کو اپنی فتوحات بیان کرتے سنتا تو ان کی کہانیوں میں مجھے کچھ ایسی بات محسوس ہو جاتی جس سے ظاہر ہو جاتا کہ ان کی باتوں میں شیخی اور مبالغہ زیادہ ہے اور حقیقت کم۔

یہ دھوبنیں ایک دوسرے کو اپنے معاشقوں کا حال تو نہیں سناتی تھیں لیکن جب کبھی وہ مردوں کے متعلق بات کرتیں تو بڑے مضحکہ آمیز تمسخر اور کچھ ایسے انتقامی جذبے کے ساتھ کہ جس سے واقعی یہ خیال صحیح محسوس ہونے لگتا کہ عورت ایک ایسی طاقت ہے جس کا مقابلہ مشکل ہے۔

نتالیا ایک دن کہنے لگی ''چاہے عورت سے کتنا ہی بچنا چاہو لیکن گھوم پھر کر پھر اس آ جاتا ہے معاملہ۔''

ایک کھوسٹ بڑھیا ٹراتی ہوئی آواز میں بولی ''سولہ آنے پکی بات! بڑے بڑے پادری اور خدا پرست درویش خدا کو چھوڑ چھاڑ کر ہمارے اوپر گی پڑتے ہیں!...''

یہ باتیں ہوتی جاتیں اور پانی آہیں بھرتا بہتا رہتا، گیلے کپڑے پچھاڑے جاتے اور نالے کے اس گندے سوراخ میں جہاں کہ گندگی کو برف بھی نہیں چھپا پاتی تھی، یہ بے حیائی کی بے ہودہ بات چیت چلتی رہتی، جو ایک زبردست راز سے متعلق تھی۔ اس راز کے متعلق جو سارے انسانوں، سارے قبیلوں اور ذاتوں کی تخلیق کا منبع اور مرکز تھا! اس قسم کی بات چیت سے میں جھینپتا بھی تھا، اس سے مجھے نفرت بھی محسوس ہوتی تھی اور میرے خیالات اور احساسات ان معاشقوں سے دور بھاگنے کی کوشش کرتے تھے جو میرے چاروں طرف اس قدر ہٹ دھرمی سے چھائے رہتے تھے۔ بہت عرصے تک عشق کا تصور میرے ذہن میں ان گندے اور فحش معاملات سے چپکا رہا۔

پھر بھی نالے میں، دھوبنوں کے ساتھ، یا باورچی خانوں میں امیروں اور افسروں کے نوکروں کے ساتھ یا تہہ خانوں میں مزدوروں کے ساتھ مجھے زندگی اس گھر کی زندگی سے بہت زیادہ دلچسپ لگتی تھی جہاں میں نوکر تھا۔ وہاں تو بس ٹھنڈے، جمے جمائے فقرے اور جملے بولے جاتے، واقعات جو ہوتے وہ بھی بس ایک پچپچاتی ہوئی یکسانیت اور اکتاہٹ طاری کرتی رہتے۔ میرے مالکوں کی زندگی بس ایک ہی چکر میں گھومتی رہتی تھی۔ کھانا، سونا، بیمار پڑنا اور پھر جھنجھلا جھنجھلا کر کھانے، سونے کی تیاریاں وغیرہ! ہر دم وہ گناہ اور موت کی باتیں کرتے رہتے تھے (جس سے انک و بے انتہا ڈر تھا) اور ان موضوعات سے اس طرح چپکے رہتے جیسے چکی کے پاٹ میں مستقل زیرے چپکے رہتے ہیں جنہیں ہر وقت پس جانے کا خطرہ دامنگیر رہتا ہے۔

میں اپنے فرصت کے وقت بر ہر سائبان میں چلا اور لکڑیاں پھاڑتا تا کہ اکیلا رہ سکوں۔ لیکن شاذ ہی

کبھی مجھے تنہائی نصیب ہوتی، کیونکہ افسروں کے ملازمین آ بیٹھتے اور احاطے میں رہنے والوں پر تبصرے ہونے لگتے۔

عام طور پر تو ایرموخین یا سیدوروف آ جاتے۔ ایرموخین کالوگا کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ لمبا قد کندھے جھکے ہوئے، چھوٹا سا سر، دھندلی آنکھیں۔ سارا جسم موٹی موٹی سخت مچھلیوں کا کا بنا ہوا تھا۔ وہ بڑا کاہل الوجود تھا اور تکلیف بدہ حد تک احمق۔ اس کے حرکات وسکنات میں سستی بھری ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ گڑبڑاتا رہتا تھا۔ کسی عورت پر نظر پڑتی تو بدبداتا ہوا آگے کوڈھے پڑتا جیسے اس کے قدموں پر ہی تو جا کے دم لے گا۔ ہمارے احاطے میں تمام لوگوں کی عقل دنگ تھی کہ وہ کس تیزی سے نوکرانیوں اور باروچنوں کو چٹ کر جاتا۔ سب اس پر رشک کرتے تھے اور اس کی ریچھ سی طاقت سے مرعوب تھے۔

سیدوروف علاقہ تولا کا رہنے والا تھا، دبلا پتلا سا آدمی، ہمیشہ اداس رہتا، آہستہ آہستہ بات کرتا، دھیمے سے کھانستا، آنکھیں خوفزدہ سی جلتی رہتیں۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی تاریک کونے کی طرف نگاہ جمائے دیکھتا رہتا تھا۔ چاہے مدھم آواز میں بات کرتا ہو، چاہے چپ چاپ بیٹھا ہو، آنکھیں ہمیشہ سب سے تاریک کونے میں گڑی رہتیں۔

''کیا دیکھ رہے ہو بھئی؟''

''شاید کوئی چوہا نکل بھاگے... مجھے چوہے بہت اچھے لگتے ہیں، اتنے تیز اور خاموش ہوتے ہیں ننھے ننھے سے...''

میں ان ملازمین کے خطوط لکھا کرتا تھا، معشوقوں کے نام یا دیہات میں گھر والوں کے نام۔ اس کام میں مجھے لطف آتا تھا، خاص کر سیدوروف کے خطوط لکھنے میں۔ ہر سنیچر کو وہ شہر تولا خط بھیجتا تھا اپنی بہن کے نام۔

وہ مجھے اپنے باورچی خانے میں بلاتا اور میرے پاس میز کے نزدیک بیٹھ کر اپنے ترشے ہوئے بالوں پر زور زور سے ہاتھ پھیرتا اور میرے کان میں پھر پھر بہن کے نام۔

وہ مجھے اپنے باورچی خانے میں بلاتا اور میرے پاس میز کے نزدیک بیٹھ کر اپنے ترشے ہوئے بالوں پر زور زور سے ہاتھ پھیرتا اور میرے کان میں پھر پھر کرتا:

''اچھا تو شروع کریں! پہلے تو جیسے تم جانتے ہو لکھا ہی جاتا ہے: 'جناب ہمشیرہ صاحبہ خدا کرے کہ

آپ ہمیشہ ہمیشہ تندرست رہیں اور بہ خیریت رہیں،۔ وغیرہ وغیرہ۔لکھ لیا؟ اچھا۔اب لکھوُ آپ نے جو مجھے روبل بھیجا تھا وہ وصول پایا مگر آپ نے کیوں اتنی تکلیف کی، پھر بھی اب آپ نے بھیج دیا ہے تو آپ کا شکریہ! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ہم لوگ یہاں مزے میں ہیں،۔ ویسے ہم لوگ یہاں مزے میں تو خاک پتھر نہیں ہیں، کتوں کی سی زندگی ہے، مگر اب یہ ان کو لکھنے کی کیا ضرورت ہے، ہاں تو لکھوُ ہم لوگ مزے میں ہیں!' بات یہ ہے کہ ابھی وہ بہت چھوٹی ہے، چودہ برس کی ہے کل۔ اس کو سب بات جاننے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ اچھا اب جو تم کو سکھایا گیا ہو خط میں لکھی جانے والی بات، وہ لکھ دو سب کچھ...''

وہ میرے بائیں کندھے جھک جاتا اور اس کی گرم گرم پھونکیں میرے چہرے پر رینگتی رہتیں اور وہ پھس پھس کہتا جاتا بڑے اصرار سے:

''یہ بھی لکھ دینا بھیا کہ لونڈوں کو نہ آس پاس پھٹکنے دے، نہ اپنی چھاتیوں کو ہاتھ لگانے دے، نہ اور کچھ کرنے دے! لکھو کہ اگر کوئی چکنی چکنی باتیں کرے تو ہرگز اس کے پھسلانے میں نہ آنا، وہ تجھے لوٹ لے گا اور تباہ کر کے چلا جائے گا...''

وہ کوشش کرتا رہتا کہ کھانسی نہ آئے، اس کا سرمئی چہرہ سرخ ہو جاتا، گال باہر کو پھول نکلتے، آنکھوں میں پانی آ جاتا اور وہ کرسی پر پہلو بدلنے لگتا اور مجھ سے ٹکرا جاتا۔

''افوہ بھئی، تم میرا ہاتھ ہلا رہے ہو!''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تم لکھونا!...اور یہ جو جنٹلمین لوگ ہوتے ہیں ان سے سب سے زیادہ ہوشیار رہنا۔ یہ لوگ ایک ہی بار میں لڑکیوں کو الو بنا لیتے ہیں۔ان کو باتیں بنانا خوب آتا ہے اور ایک بار کسی نے ان کی بات کا اعتبار کیا کہ بس پھر قحبہ خانے کے علاوہ اور کہیں ٹھکانا نہیں مل گا۔ اگر ایک روبل بچ جائے تو پادری صاحب کو دے دینا، وہ اسے حفاظت سے رکھ لینے گے بشرطیکہ وہ اچھے آدمی ہوں، لیکن بہتر تو یہ ہے کہ زمین میں گاڑ دیا جائے۔ خیال رکھنا کہ گاڑتے وقت کوئی نہ دیکھے اور یاد رکھنا کہ کہاں گاڑا تھا۔''

اوپر ہمارے سر پر لگی ہوئی کھڑکی کے قبضے چوں چوں کرتے جاتے اور وہ میرے کان میں پھس پھس کرتا جاتا۔ اس کی پھس پھس بے حد تکلیف دہ ہوتی۔ میں نے نظریں گھما کر کالک سے سیاہ تندور کو اور برتنوں کی الماری کو دیکھا، جس پر مکھیوں کی گندگی تھی۔ باورچی خانے بے حد گندہ تھا، کھٹملوں سے بھرا،

دھوئیں سے سڑتا اور کراسن تیل اور چربی کی چراند سے اٹا ہوا۔ تندور پر، لکڑیوں کے ڈھیروں پر تیل چٹے سرسراتے پھرتے تھے۔ میری روح پر بے حد اداسی چھا جاتی تھی اور اس بے چارے سپاہی اور اس کی بہن کی حالت پر رونا آ رہا تھا۔ یہ بھی کیا کوئی زندگی تھی؟

میں سیدوروف کی پھس پھس سے بے نیاز لکھتا چلا گیا۔ میں نے لکھا تھا کہ زندگی کتنی اکتائی ہوئی اور تکلیف دہ تھی۔ اور سیدوروف ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا:

''تم نے بہت کچھ لکھا، شکریہ! اب اس کو ٹھیک معلوم ہو جائے گا کہ کن چیزوں سے ڈرنا چاہیئے...''

میں نے بگڑ کر جواب دیا ''ڈرنا تو کسی چیز سے نہ چاہیئے۔'' حالانکہ میں خود بہت سی چیزوں سے ڈرتا تھا۔

سپاہی ہنسا، کھنکارا:

''احمق! ڈرے بغیر کیسے رہا جا سکتا ہے؟ اور ان افسروں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ اور خدا کے متعلق؟ اور بھی تو بہت چیزیں ہیں!''

جب اس کی بہن کا خط آتا وہ پریشان ہو کر کہتا:

''آؤ، جلدی سے ذرا پڑھ دو!...''

خط نہایت ہی بیکار اور مختصر ہوتا تھا۔ نہایت ہی بدخط لکھا ہوا جو پڑھا بھی نہ جاتا تھا لیکن وہ اس کو تین تین مرتبہ مجھ سے پڑھواتا۔

وہ نیک دل اور رحم دل انسان تھا لیکن عورتوں کی طرف اس کا رویہ بھی باقی لوگوں کی طرح تھا۔ کتے کی طرح وحشی اور سادہ۔ میں تو ارادی یا غیر ارادی دونوں طریقے سے اپنی آنکھوں کے سامنے جلد جلد ہونے والے واقعات کو دیکھتا ہی رہتا تھا۔ مجھے نظر آتا تھا کہ سیدوروف اپنی سپاہی کی سخت زندگی کا ذکر کر کے عورتوں کے جذبہ ہمدردی کو بیدار کرتا تھا، اور جھوٹ موٹ کی محبت جتا کر ان کا دماغ خراب کرتا تھا اور پھر جب اریموخین سے اپنی فتح کا ذکر کرتا تو منہ بگاڑ بگاڑ کر زمین پر تھوکتا جاتا جیسے کوفت ہوتی اور میں سپاہی سے پوچھتا کہ وہ سب جھوٹ کیوں بولتے ہیں، عورتوں کو دھوکا دے کر ان کا تماشا کیوں بناتے ہیں۔ ایک شخص کسی عورت کو حاصل کر کے پھر اسے دوسرے کو کیوں پکڑا دیتا ہے۔ کیوں اکثر ان عورتوں کو مارتے بھی ہیں؟

وہ صرف آہستہ سے ہنستا اور کہتا:

''ارے ان باتوں پر مت پریشان ہو۔ یہ سارا قصہ ہی خراب ہے، گناہ! تم ابھی بچے ہو ان باتوں کو کیا جانو...''

لیکن ایک دن میں اس سے ایک ایسا جواب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جسے میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔

''تو تمہارا خیال ہے کہ اس عورت کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں اسے بیوقوف بنا رہا ہوں؟'' اس نے آنکھ ماری اور کھانستے ہوئے کہا۔ ''وہ تو خود چاہتی ہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں اسے بے وقوف بناؤں۔ ان باتوں کے متعلق سب جھوٹ ہی بولتے ہیں کیونکہ ان کو سچ بات کہتے یوں شرمندگی محسوس ہوتی ہے کہ ان معاملات میں کوئی کسی سچ سچ محبت نہیں کرتا۔ سب معاملہ بس لطف اٹھانے بھر تک ہوتا ہے! یہ بات ہی شرمناک ہے! ذرا ٹھہر جاؤ تو پھر تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا! رات کو یہ بات کی جاتی ہے اور اگر دن ہی کو کرنا ہو تو پھر کوٹھری یا کوئی اور اندھیرا کونہ تلاش کیا جاتا ہے۔ اس لئے تو خدا نے آدم اور حوا کو جنت سے نکال باہر کیا اور اسی گناہ کے عوض میں تو ساری مخلوق دکھی ہے...''

یہ بات اس نے اتنی اچھی طرح اور اس غم گینی اور دکھ بھرے انداز میں کہی کہ اس کے ''معاشقوں'' کا ازالہ ہو گیا۔ ایرموخین کے مقابلے میں سیدوروف سے میری دوستی بھی زیادہ تھی۔ ایرموخین سے تو مجھے نفرت تھی اور میں اسے مذاق اڑا کر عاجز کرنے اور چڑھانے کی ہر ممکن کوشش کیا کرتا تھا۔ میری یہ کوشش اکثر میاب ہوا کرتی تھی اور وہ اکثر غصے میں بھرا، مجھ کو پکڑ کر پیٹنے کے لئے احاطے بھی میں دوڑا یا کرتا اور اکثر اپنے بے تکے پن کی وجہ سے مجھے پکڑنے میں ناکام رہتا۔

''پھر یہ بات ممنوع بھی ہے'' سیدوروف کہتا۔

مجھے معلوم تھا کہ یہ بات ممنوع ہے لیکن میں یہ ماننے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا کہ یہ چیز انسانوں کے دکھ کا سبب تھی۔ میں انہیں دکھی دیکھتا تھا لیکن مجھے یقین نہ آتا تھا کیونکہ میں نے اکثر ان لوگوں کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تھا جو واقعی محبت کرتے تھے اور وہاں مجھے ایسا عجیب و غریب جذبہ جھلکتا نظر آتا تھا کہ میرے دل میں محبت کرنے والوں کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا تھا۔ آہ! دلوں کی سرخوشی جو صرف محبت کے نور سے پید ہوتی ہے۔ اس کو دیکھنا بھی مجسم مسرت کو دیکھنا تھا!

مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں زندگی اور بھی زیادہ اکتائی ہوئی اور مصائب جو ہوگئی تھی، میں روز روز جس قسم کے مظاہرے اور تعلقات اور چیزوں کی صوتیں دیکھتا تو اس سے زندگی کی سختی اور بھی نمایاں ہوتی۔ اور مجھے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے یہ حالات، جن سے مجھے روز سامنا پڑتا ہے، یہی سب کچھ ہی اور اب ان میں بہتر کی کوئی امید نہیں، یہ حالات کبھی نہیں بدلینے گے۔

لیکن ایک دن ان سپاہیوں نے مجھے سے ایک ایسی بات کہی جس کا مجھ پر بہت گہرا اثر ہوا۔ ہمارے مکان کے ایک فلیٹ میں ایک شخص رہتا تھا جو شہر کی سب سے بڑی درزی کی دوکان میں کٹر ماسٹر تھا۔ وہ خاموش حلیم الطبع آدمی تھا، اور روسی نہیں تھا۔ اس کی بیوی چھوٹے سے قد کی عورت تھی، بال بچے کوئی تھے نہیں، رات دن کتابیں پڑھا کرتی تھی۔ ہمارے احاطے کے شوروشر میں کوٹھریوں میں بسے ہوئے شرابیوں کے دھوم دھڑکے میں یہ بالکل خاموش اور الگ تھلگ زندگی گزارتے تھے۔ وہ لوگ بھی زیادہ کہیں جاتے آتے نہ تھے، نہ ان کے یہاں کوئی آتا تھا۔ بس چھٹیوں کے دن تھیٹر میں آتے تھے۔

شوہر صبح تڑکے سے لے کر رات کو دیر تک دوکان پر کام کے سلسلے میں رہتا تھا، بیوی جو بالکل کم عمر لڑکی سی لگتی تھی، ہفتہ میں دو دن سہ پہر کے وقت لائبریری جاتی تھی، کتابیں لینے۔ میں اکثر اس کو چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے، جھومتے جھامتے، سڑک پر آتے جاتے دیکھتا تھا، اس کے ہاتھوں پر نفیس دستانے ہوتے، کتابیں پیٹی سے بندھی ہوئی اس کے کندھے سے اس لٹکتی رہتیں جیسے کوئی لڑکی اسکول جا رہی ہو۔ سیدھی سادی، شاداب، صاف ستھری۔ اس کا چہرہ چڑیوں جیسا تھا اور آنکھیں بڑی طرار! وہ اتنی پیاری تھی جیسے سنگار میز پر سجائی جانے والی چینی کی گڑیا۔ سپاہی کہتے ہیں کہ اس کے دھنے پہلو کی ایک پسلی غائب ہے اور اسی لئے وہ دھنی طرف کو ذرا سا جھک کر چلتی تھی۔ لیکن مجھے اس کا یہ ٹیڑھا پن اچھا لگتا تھا اور اس سے اس میں اور ہمارے احاطے میں رہنے والی افسروں کی بیویوں میں فوراً تخصیص ہو جاتی تھی۔ یہ عورتیں اپنی سریلی اونچی آوازوں، شوخ اور طرحدار کپڑوں کے باوجود بڈھی اور اجڑی ہوئی لگتی تھیں جیسے وہ مدت سے غیر ضروری چیزوں اور کوڑے کباڑ کے ساتھ کسی تاریک کونے میں ڈھیر ہوں۔ ہمارے پڑوسیوں کا خیال تھا کہ کٹر ماسٹر کی بیوی کا دماغ صحیح حالت میں نہیں تھا، وہ کہتے تھے کہ پڑھتے پڑھتے اس کی دماغ کی یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ اب وہ گھر گرہستی نہیں سنبھال سکتی تھی۔ اس کا شوہر خود بازار سے سودا خریدتا تھا اور باورچن کو کھانے کا آرڈر بھی وہی دیتا تھا۔ ان کی باورچن ایک بھاری بھرکم سی، غیر روسی عورت تھی جو ہر

وقت ناک بھوؤں چڑھائے رہتی۔ اس کی ایک سرخ آنکھ سوجی ہوئی تھی اور اس میں سے مستقل پانی بہتا رہتا تھا۔ دوسری آنکھ تقریباً بند رہتی تھی۔ اور لوگ کہتے تھے کہ مالکہ کو خود تو اتنی بھی تمیز نہ تھی کہ بڑا گوشت کونسا ہے اور چھوٹا کونسا۔ اور ایک دن اس نے پالک کی جگہ میتھی خرید کر اپنا بڑا مذاق اڑوایا۔ سوچئے تو ذرا کسی قدر شرمناک بات تھی یہ!

یہ تینوں کے تینوں اس مکان میں بالکل ہی اجنبی سے لگتے تھے۔ ایسا لگتا جیسے کابک کے ایک خانے میں اتفاق سے آن ٹپکے ہوں، ان پدیوں کی طرح جو سردیوں کی سخت ہواؤں سے بچنے کے لئے یکایک کسی کھڑکی سے انسانوں کے گھر میں گھس آتیں۔ کسی گندے، انسانی مکان میں جہاں دم گھٹا جاتا ہے۔

پھر افسروں کے ملازموں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ افسر لوگ کٹر ماسٹر کی بیوی سے ایک کمینہ اور بدتمیزی کا کھیل جاری کئے رہتے تھے۔ تقریباً روزانہ ہی ان میں سے کوئی اس کو ایک خط بھیج دیتا تھا جس میں اپنے عشق اور درد دل کا اظہار ہوتا تھا اور اس کے حسن کی تعریفیں ہوتی تھیں۔ وہ جواب میں لکھ بھیجتی کہ اس کو معاف رکھا جائے اور یہ ظاہر کرتی کہ اس کی وجہ سے ان کو ناحق کوفت ہو رہی ہے اور یہ کہ خدا انہیں اس عشق کی مصیبت سے نجات دے۔ جب یہ خط پہونچتا تو سب افسر لوگ اکٹھا ہو کر ایک ساتھ اس کو پڑھتے اور خوب ہنسی ہوتی، پھر ایک اور خط تصنیف کرتے اور میں سے کوئی شخص اس پر دستخط کرتا۔

مجھے یہ بتاتے وقت وہ ملازمین بھی ہنستے اور اس عورت کا ذکر اچھالتے۔

مجھے یہ بتاتے وقت وہ ملازمین بھی ہنستے اور اس عورت کا ذکر اچھالتے۔

''بے وقوف لنگڑی، احمق کی بچی!'' ایرموخیین اپنی بھاری آواز میں کہتا۔

''سب عورتوں کو اچھا لگتا ہے کہ ان کو بے وقوف بنایا جائے'' سید وروف چیں چیں کرتا ہوا اس کے ساتھ دیتا ''سب سمجھتی ہیں یہ عورتیں...''

مجھے اس بات کا یقین نہیں آتا تھا کہ کٹر ماسٹر کی بیوی سمجھتی تھی کہ اس کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے اور میں نے ارادہ کر لیا کہ اس کو ان معاملات کی اطلاع پہونچاؤں گا۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ ان کی باورچن نیچے تہہ خانے میں گئی۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور پچھلی سیڑھیوں سے ان کے فلیٹ پر چڑھ گیا۔ باورچی خانے میں داخل ہوا، وہاں کوئی نہ تھا۔ سیدھا کھانے

والے کمرے میں پہونچا، وہاں کٹر ماسٹر کی بیوی میز کے کنارے بیٹھی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایک بھاری سی سنہری رنگ کی پیالی تھی، دوسری میں ایک کھلی ہوئی کتاب۔ وہ مجھے دیکھ کر ڈر گئی اور ڈر کے مارے کتاب کو اپنے سینے پر دبا کر آہستہ سے چلائی:

''کون ہے! آگستہ! ارے کون ہو تم؟''

میں نے گڑ بڑا کے بہت سے الفاظ ایک دم سے کہہ دئے۔ میں ڈر رہا تھا کہ وہ کتاب یا پیالی مجھے پر دے مارے گی۔ وہ ایک بڑی سی عنابی رنگ کی آرام کرسی پر بیٹھی تھی اور نیلے رنگ کا ڈریسنگ گاؤن پہنے تھی، جس کے دامن پر جھالر لگی تھی، کف اور گلے کے پاس لیس ٹکی تھی۔ گھنے گھنگریالے بھورے بال کندھوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ گرجے میں لگی ہوئی کسی فرشتے کی تصویر کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی کرسی پر پیچھے کی طرف ٹیک لگائی، پہلے تو مجھے غصہ بھری گول گول آنکھوں سے گھورا لیکن پھر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ نرمی آگئی اور حیران مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

جب میں اس سے سب کچھ کہہ چکا اور میری ہمت جواب دے گئی تو جانے کو مڑا۔ وہ ایک دم بولی

''ٹھہرو!''

پیالی کشتی میں رکھی، کتاب میز پر ڈال دی، اپنے دونوں ہاتھ ملا لئے اور اس طرح گہری آواز میں بولی جیسے کوئی بڑا بزرگ ہو:

''تم کیسے عجیب لڑکے ہو... ادھر آؤ!''

میں ہچکچاتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اسے اپنی ٹھنڈی انگلیوں سے سہلاتے ہوئے پوچھا:

''کسی نے تمہیں بھیجا تو نہیں ہے کہ آ کر مجھ سے یہ بات کہو۔ کیوں؟ بھیجا ہے ان لوگوں نے؟ نہیں؟ اچھا، اچھا مجھے تمہارا یقین آ گیا، تم نے خود ہی سوچا یوں ہی سہی...''

میرا ہاتھ چھوڑ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور چوٹ کھائی ہوئی مدھم آواز میں بولی:

''اچھا تو یہ بیہودہ سپاہی میرے متعلق یہ سب سوچتے اور کہتے ہیں!''

میں نے سنجیدگی سے رائے دی:

''بہتر ہو کہ آپ اس مکان سے اٹھ جائیں۔''

''کیوں؟''

یہ لوگ آپ کو بدنام کر کے تباہ کر دیں گے۔''

وہ بڑے مزے میں ہنسی، پھر پوچھنے لگی:

''پڑھنا جانتے ہو؟ کتابیں پڑھنی پسند ہے تم کو؟''

''مجھے پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔''

''اگر تمہیں پڑھنے کا شوق ہو گا تو وقت کہیں نہ کہیں سے نکال ہی لو گے! بہر حال تمہارا بہت شکریہ!''

اس نے اپنے منا سا ہاتھ بڑھایا جس میں ایک چاندی کا سکہ دبا ہوا تھا۔ اس ٹھنڈے شکرانے کو قبول کرنے کو میرا جی نہ چاہتا تھا لیکن انکار کرنے کی بھی جرات نہ تھی آتے وقت میں نے سیڑھی کے کھمبے پر اس سکے کو رکھ دیا۔

اس ملاقات سے مجھ پر ایک انوکھا اور گہرا اثر ہوا۔ ایسا لگتا تھا جیسے زندگی کی تاریک رات میں یکا یک اجالا ہو گیا اور اس کے بعد کافی عرصے تک میں اس وسیع اور خوبصورت کمرے اور کٹر ماسٹر کی ننھی سی، نیلی لباس میں لپٹی ہوئی، فرشتوں کی سی بیوی کو یاد کر کے بڑی مسرت محسوس کرتا رہا۔ اس ماحول میں ہر چیز پر ایک حسن چھایا تھا، جس سے میں بالکل نا آشنا تھا۔ اس کے قدموں تلے ایک بھاری سنہرا قالین بچھا تھا، چمکیلی کھڑکی سے جاڑوں کا دن اندر جھانک رہا تھا، جیسے اس حسین وجود سے اپنے آپ کو گرمی پہونچانے کی کوشش کر رہا ہو۔

مجھے تمنا ہوئی کہ ایک بار پھر اس کو دیکھوں۔ اگر میں جا کر کوئی کتاب مانگوں تو کیسا رہے؟

چنانچہ میں گیا اور اس کو ٹھیک اسی جگہ پر بیٹھا پایا، ہاتھ میں کتاب تھی۔ لیکن اس بار اس کا چہرہ ایک کتھئی رنگ کے رومال سے بندھا ہوا تھا اور ایک آنکھ پر سوجن تھی۔ اس نے مجھے ایک کتاب دی جس کی جلد کالی تھی اور منہ ہی منہ میں کچھ کہا جو میرے سمجھ میں نہیں آیا۔ میں مایوس کتاب لئے واپس ہوا۔ کتاب میں کاربولک ایسڈ اور عرق بادیان کی بو آرہی تھی۔ گھر پہنچ کر میں نے اس کتاب پر کاغذ چڑھایا اور پھر ایک صاف قمیص میں لپیٹ کر اوپر دو چھتی میں چھپا دی کہ کہیں میرے مالکوں کے ہاتھ میں نہ پڑ جائے اور وہ اس کو ضائع نہ کر دیں۔

میرے مالک ''نیوا'' نامی رسالہ خریدتے تھے اور وہ بھی صرف لباس کے نمونوں کے لئے اوران انعاموں کے لئے جو میگزین کے ساتھ ملتے تھے۔ رسالہ تو وہ کبھی نہیں پڑھتے تھے، بس تصویریں دیکھ کر اسے کپڑے الماری کے اوپر خواب گاہ میں رکھ دیتے تھے تا کہ سال کے آخر میں سب کی جلدیں بندھوالیں اور ''باتصویر جائزہ'' کے ساتھ اس کو پلنگ کے نیچے ٹھونس دیا جائے۔ جب بھی میں خواب گاہ کا فرش دھوتا تو یہ رسالے میلے پانی میں بھیگ جاتے۔ میرے مالک اپنے لئے رسالہ ''روسی قاصد'' کرتے تھے۔ اکثر شام کو اسے پڑھنے بیٹھتے تو کہتے:

''شیطان ہی جانے، یہ لوگ کیا لکھا کرتے ہیں! کیا بوریت ہے...''

سنیچر کے دن کپڑے دوچھتی میں الگنی پر پھیلاتے وقت مجھے وہ کتاب یاد آئی۔ میں نے اسے نکالا، کھولا اور پہلی سطر پڑھی: ''مکانات بھی انسانوں کی طرح ہوتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے خط وخال الگ الگ ہوتے ہیں''۔ اس بات کی سچائی ایک دم میرے دل کو لگ گئی۔ میں دوچھتی کے روزن پر بیٹھا پڑھتا ہی رہا، پڑھتا رہا یہاں تک سردی کے مارے وہاں سے اٹھنا پڑا۔ اس رات جب میرے مالک لوگ گرجا گئے تو میں کتاب لے کر باورچی خانے میں بیٹھ گیا اور اس کے گھسے ہوئے صفحات میں کھو گیا، جو خزاں کے پتوں کی طرح زرد تھے۔ یہ صفحے مجھے ایک اور ہی دنیا میں اٹھا لے گے جہاں کے نام اور تھے، رشتے اور تھے جہاں میری ملاقات شاندار بہادروں سے اور ذلیل بدمعاشوں سے ہوئی اور ایسے لوگ جو میرے جانے پہچانے لوگوں سے بالکل مختلف تھے۔ یہ مانٹپن کی دوسری تمام ناولوں کی طرح طویل ناول تھی جس میں رواں دواں اجنبی زندگی بیان کی گئی تھی۔ ناول میں ہر بات نہایت حیرت انگیز طور پر روشن تھی گویا کہ سطروں کے درمیان چراغ سے جلتے تھے جو ہر نیک وبد کو اجاگر کر دیتے تھے، جو پڑھنے والے کو محبت اور نفرت دونوں میں سہارا دیتے تھے اور اس کو صورت حال کے الجھاؤ سے آگے کی طرف بڑھائے لئے جاتے تھے اور اس شکنجے میں پھنسے ہوئے لوگ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ پڑھنے والے کے دل میں بے طرح ہوک اٹھتی تھی کہ کسی کی مدد کرے اور کسی کا ہاتھ پکڑتے اور وہ یہ بالکل بھول جاتا تھا کہ یہ ساری زندگی جو اس طرح یکا یک اس پر واضح ہوگئی تھی محض کتابی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس غضب کے تصادم اور تضاد نظر آتے تھے کہ پڑھنے والا دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتا تھا۔ ایک لمحہ اگر خوشی ہے تو دوسرے لمحہ مایوسی۔

میں پڑھنے میں اس قدر کھو گیا کہ جب دروازے کی گھنٹی بجی تو میری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ کس نے گھنٹی بجائی اور کیوں بجائی۔

شمع تقریباً جل چکی تھی اور جس شمدان کو میں نے آج ہی صبح مانجھ کر صاف کیا تھا، وہ تمام موم سے بھر گیا تھا۔ مقدس شبیہ کے آگے جو چراغ جل رہا تھا اور جس کی نگرانی کرنا میرا فرض تھا، اپنی جگہ پر سے پھسل کر بجھ چکا تھا۔ میں باورچی خانے میں بوکھلایا ہوا ادھر ادھر دوڑنے لگا اور اپنے جرم کے نشانات چھپانے کے لئے کتاب کو جلدی سے تندور کے نیچے کھسکایا اور چراغ کو ٹھیک کرنے لگا۔

خواب گاہ سے کھلائی دوڑتی ہوئی نکلی:

''ارے کیا بہرا ہے؟ گھنٹی نہیں سنائی دے رہی تجھے؟''

میں جلدی سے باہری دروازے کی طرف بھاگا۔

''اونگھ رہا تھا؟'' میرے مالک سختی سے بولے۔ ان کی بیوی شکایت کرنے لگیں کہ میری وجہ سے وہ باہر سردی میں کھڑی کھڑی ٹھٹھر گئیں۔ اور ماں نے تو خیر میری خبر ہی لے ڈالی۔ جیسے ہی وہ باورچی خانے میں داخل ہوئی اس کی نظر جلی ہوئی شمع پر پڑی اور مجھ سے پوچھنے لگی کہ میں کیا کر رہا تھا۔

میں اس خوف سے کہ کہیں کتاب ان لوگوں کے ہاتھ نہ لگ جائے ایسا گھبرایا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، ایسا لگتا تھا جیسے کسی بہت اونچی جگہ سے گر پڑا ہوں اور گھگھی بندھ گئی ہے۔ بڑھیا نے چیخنا شروع کر دیا کہ اگر خبر نہ لی گئی تو میں کسی دن سارا گھر پھونک کے دھر دوں گا۔ اور جب میرے مالک اور بہو کھانا کھانے آئے تو کہنے لگی:

''ذرا دیکھو۔ ایک پوری کی پوری شمع ختم کر کے دھر دی ہے اس نے! اور ابھی کیا ہے ابھی تو سارا گھر پھونکے گا...''

وہ چاروں کھانا کھاتے رہے اور مجھے ڈانٹتے رہے جس میں میرے تمام ارادی اور غیر ارادی جرائم کا ذکر ہوا۔ اور مجھے خبردار کرتے رہے کہ میرا انجام نہایت برا ہونے والا ہے لیکن میں جانتا تھا کہ ان کے الفاظ نہ تو کسی بغض کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں، نہ میری بہتری ان کو منظور ہے۔ وہ تو بس اکتاہٹ کا نتیجہ ہیں اور کچھ نہیں تو یہی سہی۔ اور اس طرح وہ لوگ ان لوگوں کے مقابلے میں جن کا کتاب میں ذکر تھا، کس قدر بے وقوف اور بے کار لگ رہے تھے۔

جب کھا پی کر خوب بھر چکے تو گھسٹتے ہوئے بستروں میں جا گھسے۔ بڑھیا نے پہلے تو خدا سے کچھ بغض بھری شکایتیں کیں پھر رینگتی ہوئی تندور پر گئی اور خاموش ہوگئی، تب میں نے تندور کے نیچے سے اپنی کتاب نکالی اور کھڑکی کے پاس جا بیٹھا۔ پورا چاند نکلا ہوا تھا، رات خوب چمکدار تھی لیکن پھر بھی کتاب کا چھاپہ اتنا باریک تھا کہ حروف سوجھتے نہ تھے۔ میرے پڑھنے کا شوق دبنے والا نہیں تھا، چنانچہ میں نے پہلے تو الماری پر سے ایک تانبے کی چمکتی ہوئی تھالی اتاری اور کوشش کی کہ چاند کی روشنی کا عکس اس سے پلٹ کر کتاب پر پڑنے لگے لیکن اس سے نتیجہ اور بھی برا نکلا، کتاب پر اور اندھیرا ہوگیا۔ پھر میں کونے پر لگی ہوئی بنچ پر کھڑا ہوگیا اور مقدس شبیہ والے چراغ سے پڑھنے لگا۔ تھکان کے مارے میں پھسل کر بنچ پر لیٹ گیا اور مجھے نیند آگئی۔ بڑھیا کے تھپڑوں اور چیخوں سے جاگ پڑا۔ وہ ننگے پیر کھڑی تھی، بس صرف قمیص پہنے، غصے سے سر دھن رہی تھی۔ چہرہ لال انگارہ ہو رہا تھا اور میری کتاب لئے اس سے میری پیٹھ پر دھڑا دھڑ رسید کر رہی تھی۔

''ارے افوہ! اماں، چلو بھی کیا چخ چخ لگا رکھی ہے! تمہارے ساتھ تو زندگی عذاب ہے!'' وکٹر اپنے ٹنڈ پر سے چیخا۔

میں سوچا ''لو اب کتاب کا خاتمہ ہوا، ضرور اسے چیر پھاڑ کر برابر کرے گی!''

دوسرے دن صبح ناشتے کے وقت میرا مقدمہ کھلا۔ میرے مالک نے سختی سے پوچھا:

''یہ کتاب تمہیں کہاں سے ملی ہے؟''

عورتیں مجھ پر چیخنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جا رہی تھیں۔ اور وکٹر نے کتاب کو اٹھا کر سونگھا اور کہا:

''ا...و...ہوں عطر کی خوشبو! سچ مچ کے عطر کی خوشبو، واہ بھئی...''

جب میں نے کہا کہ کتاب پادری صاحب کی ہے تو وہ لوگ تعجب سے اس کتاب کو دیکھنے لے اور اس بات پر برا مانا کہ اب پادری لوگ بھی ناول پڑھنے لگے۔ بہر حال اس بات نے ان کو کسی قدر خاموش کر دیا اگر چہ میرے مالک نے مجھے پھر بھی خبردار کیا کہ کتابیں پڑھنا نہایت خطرناک اور نقصان دہ ہے۔ کہنے لگے:

''وہ کتابیں ہی پڑھنے والے تھے جنہوں نے ریل کی پٹری اڑا دی اور کوشش کی تھی کہ مار

ڈالا جائے...''

بہوڈر کر بولی'' آپ کا دماغ تو نہیں خراب ہوا ہے؟ یہ سب کیا اس کے دماغ میں بھر رہے ہیں؟''

میں ماٹچپن کی وہ ناول لئے ہوئے سپاہی کے پاس گیا اور اس کو سارا ماجرا سنایا۔ سید وروف نے ایک لفظ کہے بغیر کتاب لی، ایک چھوٹا سا صندوق کھولا، ایک صاف تولیہ نکالا اور کتاب کو اس میں لپیٹ کر صندوق میں چھپا دیا۔

''ان لوگوں کو جانے دو، کچھ خیال نہ کرو، جب تمہیں پڑھنا ہو تو یہاں میری کوٹھری میں بیٹھ کر اطمینان سے پڑھ لیا کرو۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ اگر کسی ایسے وقت آؤ جب میں نہ ہوں، تو مقدس شبیہہ کے پیچھے کنجی رکھی ہے... لے کر صندوق کھول لینا اور خوب جی بھر کر پڑھنا۔''

میرے مالکوں نے جو رویہ میری کتاب کی طرف اختیار کیا تھا اس کی بدولت پڑھنا میرے لئے ایک محبوب اور اہم راز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ یہ واقعہ بھی مجھے دلچسپ معلوم نہیں ہوا کہ کچھ پڑھے لکھوں نے کہیں ریل کی پٹری اڑا دی تھی اور کسی کو مار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ میں ابھی تک اقبالِ گناہ کے وقت پادری نے جو مجھے بتایا تھا وہ بھولا نہیں تھا، اور جس طالبِ علم کو میں نے تہہ خانے میں کتاب پڑھتے دیکھا وہ بھی مجھے یاد تھا۔ سموریٔ نے جو'' صحیح قسم کی کتابوں'' کا ذکر کیا تھا وہ بھی بھولا نہیں تھا اور نانا ابا نے جو'' آزاد رووں'' کے متعلق باتیں کہی تھیں کہ وہ سیاہ کتابیں پڑھتے ہیں اور کالا جادو سیکھتے ہیں، وہ بھی ذہن میں تھا:

''اور زار الیکساندر پاولووچ کے عہد فرخندہ میں امیروں وزیروں نے'' کالے جادو والوں اور آزاد رووں'' سے ساز باز کی تاکہ پوری روسی قوم کو پاپائے روم یعنی جیوٹس کے حوالے کر دیں لیکن اس وقع پر جنرل اراکچیف رنگ میں بھنگ کر دیتا ہے، سب کو گرفتار کر کے پورے گروہ کو سائبیریا بھیج دیتا ہے، اور ان کے عہدے یا خطابات کی کوئی رعایت نہیں کرتا۔ وہاں پھر وہ آخر کار کیڑوں مکوڑوں کی طرح سڑ سڑ کر مر گئے...''

مجھے ''وہ چھتری جس میں ستارے چھٹکے ہوئے ہیں'' بھی یاد تھے اور ''گرواسی'' اور وہ سنجیدہ طنز آمیز الفاظ ''اے نادان مخلوقو، تم ہماری مرضی میں دخل دیتے ہو، تمہارے پھسڈی دماغ کبھی یہاں تک نہیں پہونچ سکتے۔''

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی زبردست راز کی چوکھٹ پر کھڑا ہوں۔ اس احساس نے مجھ پر ایک وجدانی کیفیت طاری کردی۔ میرا دل بیقرار تھا کہ کسی طرح کتاب کو ختم کر چکوں کیونکہ مجھے تھا کہ وہ سیدوروف کے یہاں سے کہیں ادھر ادھر نہ ہو جائے یا خراب نہ ہو جائے۔ پھر میں اس سے کیا کہوں گا!

بڑھیا مجھ پر کڑی نگرانی رکھتی تھی کہ میں سپاہی کے پاس نہ جاؤں اور ہر وقت مجھ پر تن تن تن کرتی رہتی تھی:

''کتاب کا کیڑا! یہ کتابیں سکھاتی ہی کیا ہیں سوائے آوارہ گردی کے! اب اس عورت کو دیکھو جو اپنا سارا وقت کتابیں پڑھنے میں جھونکتی ہے! بازار تک جانے کی مصرف کی نہیں ہے! ہمیشہ افسروں سے پھنسی رہتی ہے۔ کیا ہم نہیں جانتے کہ افسروں کے دوپہر میں اپنے یہاں گھسائے رہتی ہے...''

میرا جی چاہے کہ چیخ پڑوں کہ ''یہ جھوٹ ہے! اس کا کسی افسر وفسر سے تعلق نہیں...''

لیکن میں کٹر ماسٹر کی بیوی کی طرف داری کیونکر کر سکتا تھا۔ اگر کہیں بڑھیا سمجھ گئی کہ کتاب اس کی ہے تو بہت برا ہوگا۔

کئی دن تک میں بے حد دکھ میں مبتلا رہا۔ دماغ کھویا کھویا رہتا، نیند نہ آتی کیونکہ مجھے ہر وقت اس مانٹپن کی ناول کی پڑی رہتی تھی۔ ایک دن احاطے میں کٹر ماسٹر کی باورچن نے مجھے روکا اور آہستہ سے کہا:

''وہ کتاب واپس کر جانا۔''

میں کھانے کے بعد کتاب واپس کرنے گیا جب میرے مالک سب قیلولہ کر رہے تھے۔ کٹر ماسٹر کی بیوی کے سامنے پہونچا تو بہت ہی اداس اور پریشان تھا۔

اس دن میں نے اس کو بالکل اس طرح پایا جس طرح پہلے دن پایا تھا، سوائے اس کے کہ وہ لباس دوسرا پہنے ہوئے تھی۔ سرمئی سایہ اور سیاہ مخمل کی جیکٹ اور گلے میں ایک چھوٹی سی فیروزے کی بنی ہوئی صلیب لگی تھی۔ مجھے اس وقت وہ بالکل ایک بلبل کی طرح معلوم ہوئی۔

جب میں نے اس سے کہا کہ مجھے کتاب ختم کرنے کا وقت نہیں ملا اور یہ کہ مجھے کتاب پڑھنے نہیں

دیتے تو اپنے اوپر ظلم کے خیال اور اس کو پھر سے دیکھنے کی خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں ڈر گیا اور بولا کہمیں نے مالکوں سے جھوٹ کہہ دیا ہے کہ کتاب تم سے نہیں بلکہ پادری صاحب سے لی ہے۔

میں اس کی خوشامد کرنے لگا:

''ارے کہیں لکھئے گا بھی مت! مہربانی کر کے نہ لکھے گا! وہ لوگ صرف آپ پر ہنسیں گے اور آپ کو برا بھلا کہیں گے۔ ہمارے گھر میں کوئی آپ کو پسند نہیں کرتا، سب آپ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور آپ کو بیوقوف کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کی ایک پسلی غائب ہے...''

میرے منہ سے الفاظ یکے بعد دیگرے نکلتے ہی چلے گئے اور جب میں ان کو کہہ کر ختم کر چکا تب مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ ایسے الفاظ تھے کہ اس کو برے لگ سکتے تھے۔ اس نے اپنا اوپر کا لب دانتوں میں دبا لیا اور ہاتھ زانو پر اس طرح مارا جیسے گھوڑے پر سوار ہو۔ میں نے شرم کیمارے سر جھکا لیا۔ یہ حالت تھیک ہ بس زمین پھٹے اور میں سما جاؤں لیکن پھر فوراً ہی وہ ایک کرسی میں دھنس گئی اور زور زور سے ہنسنے لگی:

''افوہ، کیا حماقت ہے... کیا ہی حماقت ہے! بھلا میں اس کو کیا کرتی؟'' وہ مجھے گھورتے ہوئے اپنے آپ سے بولی، پھر ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگی ''تم بڑے ہی عجیب لڑکے ہو۔ بڑے ہی عجیب...''

میں نے اس کے پاس لگے ہوئے آئینے ک طرف دیکھا۔ آئینے میں ایک چہرہ نظر آیا۔ گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی، چوڑی ناک، ماتھے پر ایک بڑا سا نیل اور بکھرے ہوئے بال، و مدت سے کٹے نہیں تھے۔ کیا یہی وہ چہرہ تھا جسے ''بڑا ہی عجیب لڑکا'' کہا گیا تھا... یقیناً اس ''بڑے ہی عجیب لڑکے'' کا اور اس نازک سی چینی کی گڑیا کا کوئی مقابلہ نہ تھا...

''میں نے تمہیں جو پیسے دئے تھے وہ تم نے نہیں لئے، کیوں نہیں لئے؟''

''مجھے ضرورت نہیں تھی۔''

اس نے ٹھنڈی سانس بھری:

''اچھا بھئی تو پھر مجبوری ہے! اگر وہ لوگ تمہیں پڑھنے کی اجازت دیں تو پھر آنا، میں تمہیں ضرور کتابیں دے دوں گی...''

اس وقت بھی سنگار میز پر تین کتابیں رکھی تھیں۔ جو میں نے ابھی واپس کی تھی وہ سب سے زیادہ

موٹی تھی۔ میں اسے حسوت سے تکتا رہا۔ کٹر ماسٹر کی بیوی نے اپنا ننھا سا گلابی ہاتھ بڑھایا اور کہا:

''اچھا۔ تو پھر خدا حافظ!''

میں نے بڑے احتیاط سے اس کے ہاتھ کو چھوا اور جلدی سے واپس ہوا۔

شاید لوگ جو اس کے متعلق کہتے تھے کہ وہ کچھ سمجھتی نہیں ہے، وہ سچ ہی ہوگا۔ مثلاً ابھی اس نے اپنے دیئے ہوئے بیس کوپک والے سکے کا ذکر کیا تو کہا ''پیسے''۔ ننھے بچوں کی طرح۔ لیکن مجھے اس کی یہ بات اچھی لگی...

9

اب یاد کرتا ہوں تو ہنسی بھی آتی ہے اور دکھ بھی ہوتا ہے کہ مجھے اپنے پڑھنے کے شوق کے پیچھے کتنی تکلیف، کتنی پریشانی اور کتنی ذلت اٹھانی پڑی!

مجھے ایسا لگتا تھا کہ کٹر ماسٹر کی بیوی کی جو کتابیں تھیں وہ سب کی سب بے حد قیمتی تھیں اور اس ڈر کے مارے کہ بڑھیا کہیں ان کو ڈھونڈ کر جلا نہ دے، میں نے یہ کوشش کرنی شروع کی کہ ان کتابوں کا خیال ہی چھوڑ دوں۔ اس لئے میں جس دوکان سے ناشتے کے لئے ڈبل روٹی خریدا کرتا تھا وہاں سے میں نے چھوٹی چھوٹی شوخ رنگوں کی کتابیں خریدنی شروع کر دیں۔

یہ دوکاندار اچھا آدمی نہیں تھا۔ موٹے موٹے ہونٹ، چہرے پر ہر وقت پسینے کے قطرے دکھائی دیتے، پھولا ہوا، گندے ہوئے آٹے کا سا چہرہ، جس پر کنٹھ مالا کی وجہ سے دانے اور دھبے پڑے ہوئے تھے۔ پیلی پیلی آنکھیں اور پھولے ہاتھ، انگلیوں کی پوریں جیسے ٹھونٹھ۔

شام کے وقت اس کی دوکان ہماری گلی کے لڑکوں اور خوشباش لڑکیوں کی پناہ گاہ بنتی تھی۔ میرے مالک کا چھوٹا بھائی تقریباً ہر شام ہی وہاں جا کر تاش کھیلتا اور بیئر پیتا تھا۔ مجھے اکثر شام کو اسے بلانے کیلئے بھیجا جاتا تھا۔ اور کئی بار میں نے دیکھا کہ دوکان کے پیچھے والے ٹھساٹھس بھرے ہوئے کمرے میں، دوکاندار کی بے وقوف بیوی بھڑکیلے کپڑے پہنے، وکٹر یا کسی اور نوجوان کے گھٹنوں پر بیٹھی ہے۔ ظاہر ہے کہ دوکان دار اس بات کا برا نہیں مانتا۔ نہ ہی وہ اس وقت برا مانتا تھا جب اس کی بہن کو جو گاہکوں کو سودا دینے میں اس کی مدد کرتی تھی، فوجی یا کوئی یا جو لوگ بھی چاہتے لپٹا لیتے۔ دوکان میں دوکانداری کا

سامان بہت کم تھا اور دوکان دار اس بات کی تاویل یوں کرتا تھا کہ ابھی نیا نیا کاروبار ہے اور دوکان ٹھیک سے نہیں چل نکلی ہے۔ حالانکہ اس نے خزاں ہی میں دوکان کھولی تھی۔ اور اپنے گاہکوں کو گندی گندی اور فحش تصویریں دکھاتا تھا اور جس کا دل چاہتا، اس کے یہاں سے کتابوں وغیرہ میں سے فحش اشعار اتار لیتا تھا۔

میں نے میتشا ایفستے گنییف کی پھیکی سیٹھی کتابیں پڑھیں اور ان کے لئے مجھے فی کتاب ایک کوپک پڑھوائی دینا پڑا۔ یہ دام مجھے مہنگے لگے۔ پھر کتابوں سے کوئی لطف بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔ مثلاً ''گواک۔ موت تک وفادار'' ''فرانسل وینیشائی'' ''جنگ روسیاں یا کبارد بنیاں یا مسلمان حسینہ جو اپنے شوہر کے جنازے پر ختم ہو گئی'' وغیرہ۔ اس طرح کا ادب نہ صرف یہ کہ مجھے پسند نہ آتا تھا بلکہ اکثر مجھے اس پر غصہ آنے لگتا کہ جیسے یہ کتابیں ایسی ناممکن باتوں کو لچر زبان میں بیان کر کے مجھے الو بنا رہی ہیں۔

ایسی کتابیں جیسے ''تیر انداز'' ''یوری میلوسلافسکی'' ''پراسرار پادری'' ''یپانچہ، تاتاری گھوڑ سوار'' وغیرہ مجھ کو نسبتاً اچھی لگتی تھیں، ان سے کچھ نہ کچھ ذہن نشین ت و ہو جاتا۔ لیکن سب سے زیادہ میں ''ولیوں کی زندگی'' سے متاثر ہوا۔ یہ بے شک ایک چیز تھی جو سنجیدہ بھی تھی اور انسان کو قائل بھی کرتی تھی، اور کبھی کبھی جذبات میں بہت ہلچل مچا دیتی تھی۔ نہ جانے کیوں جتنے بھی شہید مرد تھے وہ سب مجھے ''بہت خوب'' کی یاد دلاتے تھے۔ جتنی شہید عورتیں تھیں سب نانی اماں کی طرح لگتی تھیں اور جتنے راہب تھے، وہ سب نانا ابا جیسے دکھائی دیتے تھے مگر صرف اس وقت کے نانا ابا جب وہ اپنے ٹھیک موڈ میں ہوں۔

میں اپنی پڑھائی او پر دو چھتی پر چڑھ کر کیا کرتا تھا، یا باہر سائبان میں جب لکڑیاں چیرنے جاتا۔ یہ دونوں جگہیں ایک ہی سی تکلیف دہ اور سرد رہتی تھیں۔ اگر کتاب خاص طور پر دلچسپ ہوتی یا مجھے اس کو ختم کرنے کی جلدی ہوتی تو میں رات کو اٹھ بیٹھتا اور شمع کی روشنی میں پڑھا کرتا۔ لیکن بڑھیا یہ دیکھ لیتی کہ موم بتیاں رات کو گھٹ جاتی ہیں اور پھر اس نے موم بتیوں کو ایک لکڑی کے ٹکڑے سے ناپنا شروع کیا۔ یہ ٹکڑا وہ ہمیشہ چھپا کر رکھتی تھی۔ میں عام طور پر تو اس ٹکڑے کو ڈھونڈ نکالتا تھا۔ اور اسے چھانٹ کر جلی ہوئی موم بتیوں کے برابر کر دیتا تھا۔ لیکن اگر کبھی میں ایسا نہ کر پاتا اور صبح کو وہ موم بتی اور ٹکڑے میں فرق پاتی تو پھر باورچی خانے میں اودھم مچا دیتی۔ اور ایک دن وکٹر اپنے ٹنڈ پر سے بگڑ کر چیخا:

''افوہ اماں، اب بس کرو اپنا بھونکنا! تمہارے ساتھ تو زندگی عذاب ہے! ہاں ہاں جلاتا تو ہے وہ موم

بتی۔ پڑھتا جو ہے کتابیں وہاں اسٹور سے لاتا ہے۔ میں نے اسے خود دیکھا ہے! جاؤ، دوچھتی میں ڈھونڈو...''

بڑھیا دوچھتی کی طرف لپکی، ایک چھوٹی سی کتاب ہاتھ آئی جسے اس نے پرزے پرزے کردیا۔

ظاہر ہے کہ اس سے مجھے صدمہ پہنچا لیکن اس نے میرے پڑھنے کے اشتیاق کو اور ہوا دی۔ مجھے یقین تھا کہ میں تو میں تھا اگر کوئی ولی بھی اس گھر میں اتر آئے تو یہ میری مالکنیں ان کو اپنے طور طریقے سکھانے لگتیں، اور جیسا خود مناسب سمجھتیں ویسا ان کو ڈھالنے کی کوشش کرتیں۔ اور یہ سب وہ اس لئے کرتیں کہ ان کے سامنے اور کوئی بہتر کام کرنے کو تھا ہی نہیں۔ اگر وہ چیخنا بند کردیتیں، لوگوں کے متعلق فیصلے صادر کرنا اور لوگوں کا مذاق اڑانا بند کردیتیں تو وہ گونگی ہو جاتیں، نہ انہیں اپنی خبر رہتی نہ کوئی اور بات منہ سے نکلتی۔ آخر اپنے آپ سے بخوبی واقف ہونے کیلئے انسان کو دوسروں سے رشتے کا شعوری احساس ہونا لازم ہوتا ہے لیکن میرے مالکوں کے نزدیک ان کا دنیا سے صرف ایک رشتہ تھا۔ استاد کا اور جج کا۔ اور اگر کوئی شخص بالکل ان کے نقش قدم پر چلنے لگتا تو اس پر بھی ہنسنے سے وہ نہیں چوکتے۔ انکی فطرت ہی اس قسم کی تھی۔

میں پڑھنے کے واسطے طرح طرح کی پناہ گاہوں میں پناہ لیتا تھا۔ کئی بار بڑھیا نے میری کتابیں ضائع کردیں جس کے معنی یہ تھے کہ آخر کار میرے اوپر دوکاندار کا قرض خوب بڑھ گیا۔ سینتالیس کوپک ہو گئے! اس نے ادائیگی کا تقاضہ کیا اور دھمکی دی کہ اگر ادا نہ ہوں گے تو جب میں روٹی خریدنے آؤں گا تو میرے مالکوں کے روپیوں میں سے کاٹ لے گا۔

''پھر کیا ہوگا!'' اس نے مجھے ستاتے ہوئے کہا۔

اس شخص سے مجھے متلی ہوتی تھی۔ یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ اس کو بھی اس کا احساس ہے کیونکہ مجھے طرح طرح کی دھمکیوں سے پریشان کرکے خاص طور پر بہت خوش ہوتا تھا۔ جب بھی میں دوکان میں داخل ہوتا اس کے دھبے دار چہرے پر ایک چکنی مسکراہٹ پھیل جاتی اور پیار سے پوچھتا:

''میرا قرض لائے ہو؟''

''نہیں۔''

اس سے اس کو کوفت ہوتی، چہرے پر بل آجاتے۔

''تمہیں؟ آخر تمہارا کیا کروں؟ پولیس کو لگاؤں تمہارے پیچھے کہ تمہیں بہا کر کسی جیل خانے میں لے جائے؟''

میرے پاس روپیہ حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کیونکہ تنخواہ تو نانا ابا لے جایا کرتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ جب میں نے دوکان دار سے کہا کہ تھوڑا انتظار کرے تو اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ پھولا ہوا، چکنا ہاتھ جیسے پان کیک۔ اور بولا:

''اسے چوم لو تو انتظار کروں گا۔''

میں نے دوکان کے تختے پر سے ایک بھاری سا باٹ اٹھایا اور اس کے سر کا نشانہ بنایا۔ وہ جھکائی دے گیا اور چیخا:

''ہیں ہیں، یہ کیا کرتے ہو؟ میں تو مذاق کر رہا تھا!''

مجھے معلوم تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا تھا اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ چاہے چوری ہی کرنی پڑے مگر اس کا روپیہ ادا کر کے اپنی جان چھڑاؤں گا۔ صبح کے وقت جب میں اپنے مالک کے کوٹ پر برش کیا کرتا تھا تو اس کی جیبوں میں اکثر ریزگاری کھنکھناتی تھی، کبھی کبھی پیسے فرش پر بھی گر پڑتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک سکہ لڑھکتا ہوا زینے کے نیچے چلا گیا جہاں لکڑیوں کا ڈھیر تھا۔ میں اپنی مالک کو بتانا ہی بھول گیا۔ یہاں تک کہ کچھ دنوں بعد مجھے لکڑیوں کے نیچے سے بیس کوپک والا ایک سکہ ملا۔ جب میں نے سکہ مالک کو دیا تو بیوی بولیں:

''دیکھا؟ جیب میں ریزگاری رکھا کرو!''

''ارے یہ نہیں چرائے گا'' انہوں نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

اب جو میں نے پیسے چرانے کا ارادہ کیا تو مجھے انکے وہ الفاظ یاد آئے اور پھر ان کی وہ مسکراہٹ جس میں اتنا بھروسہ تھا۔ میرے لئے سخت مشکل آ پڑی۔ کئی بار میں نے جیب سے ریزگاری نکالی، ریزگاری گنی، مگر اس میں سے کچھ لے نہ سکا۔ تین دن تک میرے ذہن میں سخت کشمکش رہی۔ پھر معاملات نہایت آسانی سے ٹھیک ہو گئے۔

ایک دن میرے مالک نے اچانک مجھ سے پوچھا:

''پیشکوف، تمہیں آج کل کیا ہو گیا ہے؟ کچھ پریشان ہو جیسے آپے میں نہیں ہو۔ کیا طبیعت خراب

ہے؟''

میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے کیا چیز پریشان کر رہی ہے۔ وہ ناک بھوؤں چڑھا کر بولے:

''دیکھو کتابوں کا یہ انجام ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح وہ انسان کو نقصان پہنچا کر ہی رہتی ہیں...''

لیکن انہوں نے مجھے پچاس کوپک دے دئے اور مجھے خبردار کر دیا:

''دیکھو میری ماں یا میری بیوی کو پتہ نہ چل پائے ورنہ مصیبت آ جائے گی!''

پھر ذرا مزے میں ہنس کر بولے:

''تم ہو بڑے ہی ڈھیٹ! خدا سمجھے تم سے! ٹھیک ہے۔ مگر بہتر ہے کہ کتابیں پڑھنا چھوڑ ہی دو۔ نیا سال آئے گا تو میں ایک اچھے روزنامہ اخبار کو چندہ بھیج دوں گا پھر جی بھر کے پڑھا کرنا...''

انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اب روز شام کی چائے اور رات کے کھانے کے درمیان اپنے مالکوں کو اخبار پڑھ کر سنایا کرتا جس کا نام ''ماسکو نامہ'' تھا۔ اس میں واشکوف، راکشانین، رودنیکوفسکی کے ناول قسط وار چھپا کرتے تھے۔ ان مصنفین کی کتابیں ان ہی لوگوں کے لئے تھیں جو اکتاہٹ سے مرے جاتے تھے۔

مجھے بآواز بلند پڑھنا پسند نہیں تھا کیونکہ اس طرح موضوع تحریر میری سمجھ میں پوری طرح نہیں آتا تھا۔ لیکن میرے سامعین بڑے غور سے سنتے تھے جیسے نہایت مشتاق اور مرعوب ہوں۔ تحریر میں جو مار دھاڑ بیان ہوتی، اس پر کبھی سانس کھینچتے، کبھی چیخ پڑتے اور بڑے فخر سے ایک دوسرے سے کہتے:

''اور ہم لوگوں کو دیکھو کہ اتنی پرسکون اور پرامن زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور باہر کیا ہو رہا ہے اس سے ذرہ برابر واسطہ نہیں رکھتے، شکر ہے خدا کا!''

وہ لوگ ہمیشہ تمام واقعات کو گڈمڈ کر دیتے تھے۔ مشہور ڈاکو چورکن کے کارناموں کو کوچبان فوما کروچینا سے بھڑا دیتے۔ ناموں کی گڑبڑ تو مستقل جاری رہتی اور جب میں صحیح کرتا تو تعجب سے کہتے:

''افوہ، اس لڑکے نے کیا حافظ پایا ہے۔''

اکثر ''ماسکو نامہ'' میں لیوند گراوے کے اشعار بھی شائع ہوتے۔ مجھے یہ اشعار بہت پسند آتے تھے، فوراً اپنی نوٹ بک میں اتار لیتا تھا۔ لیکن میری مالکنیں شاعر لکھتا ہے۔''

''ارے اس کے لئے کیا فرق پڑتا ہے۔ شراب کے نشے میں دھت رہتا ہے، دماغ بھی تو کمزور پڑ چکا ہے اس کا۔''

مجھے استروژ کین کی اور کاونٹ میمنٹ موری کی نظمیں پڑھنے میں بھی لطف آتا تھا لیکن بڑھیا اور جوان دونوں عورتیں ہمیشہ اس بات پر اصرار کرتی رہتی تھیں کہ شاعری بالکل بیکار بکواس ہے۔

''صرف ایکٹر لوگ یا مسخرے شعر پڑھتے ہیں۔''

جاڑوں کی وہ راتیں میرے لئے کس قدر گراں تھیں۔ اس چھوٹے سے، گھٹے ہوئے کمرے میں میرے سب مالکوں کی نظریں مجھ پر گڑی رہتی تھیں۔ کھڑکی سے پرے خاموش رات کی حکومت ہوتی۔ خاموش جیسے موت۔ کبھی کبھار دور سے پالے کے چٹخنے کی آواز آتی۔ لیکن یہ لوگ میز کے چاروں طرف اس طرح خاموش بیٹھے رہتے جیسے برف میں جمی ہوئی مچھلیاں۔ ہوا دیواروں اور کھڑکیوں کے شیشوں پر اپنے پنجے مارتی، چیختی ہوئی چمنیوں میں سے نیچے اترتی، چھجوں پر سر مارتی۔ بچوں والے کمرے سے بچوں کے رونے کی آواز آتی۔ میرا دل چاہتا کہ پھسل کر کہیں تاریک کونے میں دبک جاؤں اور بھیڑیئے کی طرح روؤں۔

میز کے ایک سرے پر عورتیں بیٹھتیں۔ وہ یا تو سیتی رہتیں یا موزے بنتی رہتیں۔ دوسرے سرے پر وکٹر جھکا ہوا ہوتا۔ وہ نقشہ کھینچتا یا اس کی نقل کر رہا ہوتا۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ طبیعت کو مار کر کام کر رہا ہے، وہ ذرا ذرا سی دیر بعد چیختا:

''ارے مت ہلاؤ میز! تم لوگوں کے ساتھ تو زندگی عذاب ہے۔ تھوتھن نکالے، آ گئیں بس کھٹ کھٹ کرنے۔ سلائیاں ہلاتی...''

ایک کنارے کو میرے مالک بیٹھے ہوتے۔ ایک بڑی سی لکڑی کی فریم لئے وہ ایک میز پوش پر کراس اسٹچ کا نمونہ کاڑھ رہے تھے۔ ان کی پھرتیلی انگلیاں آگے کو بڑھتی جاتیں اور ان کے نیچے سے سرخ سرخ کیکڑے، نیلی نیلی مچھلیاں، زرد زرد تتلیاں اور خزاں کی سرخ سرخ پتیاں نمودار ہوتی جاتیں۔ انہوں نے یہ نمونہ خود ہی بنایا تھا اور تین سال سے وہ جاڑوں میں اس میں لگا کرتے تھے۔ اب وہ اس سے بالکل عاجز آ گئے تھے اور اکثر دن کے وقت جب میں اور کاموں میں مصروف نہ ہوتا تو مجھ سے کہتے:

''پیشکوف، ذرا جٹو تو میز پوش میں۔''

میں بھاری سوئی ہاتھ میں لے کر جٹ پڑتا۔ اپنے مالک پر مجھ ترس آیا کرتا تھا اور ہر ممکن طریقے سے ان کی مدد کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنی نقشہ کشی چھوڑ دیں گے، کشیدہ کاری چھوڑ دیں گے، تاش کھیلنا چھوڑ دیں گے اور کوئی اور کام شروع کر دیں گے۔ کوئی دلچسپ کام۔ کوئی ایسا کام جس کے بارے میں وہ اکثر سوچا کرتے تھے جب کہ وہ کبھی کبھی ایک دم سے اپنا کام رکھ دیتے تھے اور اس کو اس طرح دیکھنے اور تکنے لگتے جیسے اس پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔ ان کے بال بکھر بکھر کر بھوؤں پر آجاتے اور وہ خانقاہ میں تعلیم پانے والے سعادت مند لڑکے کی طرح دکھائی دیتے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' ان کی بیوی پوچھتیں۔

''کوئی خاص بات تو نہیں ہے'' وہ اپنا کام پھر سے اٹھاتے ہوئے کہتے۔

میں دل ہی دل میں حیران ہوتا کہ آفریں ہے! بھلا آپ کسی انسان سے یہ کیسے پوچھ سکتے ہیں کہ وہ کیا سوچ رہا ہے؟ اور وہ ایسے سوال کا جواب بھی کیا دے سکتا تھا کہ اس وقت اس کی نگاہیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ بیک وقت بہت سی چیزوں کا خیال آتا ہے۔ وہ چیزیں جو آنکھوں کے سامنے ہیں، وہ چیزیں جو کل یا ایک سال پہلے نظر آئی تھیں۔ ہاں یہ سب چیزیں۔ نقوش جو مبہم اور گڈمڈ ہوتے ہیں، برابر چلتے رہتے ہیں، برابر بدلتے رہتے ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا کہ ''ماسکونامہ'' کے مضامین پوری شام کو کافی نہ ہوتے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ خواب گاہ میں پلنگ کے نیچے جو رسالہ پڑے ہیں ان کو پڑھا جائے۔

''ان میں پڑھنے کو کیا رکھا ہے؟'' بہو نے مشکوک انداز میں پوچھا۔ ''اس میں کیا دھرا ہے سوائے تصویروں کے...''

لیکن اس ڈھیر میں صرف ''باتصویر جائزہ'' ہی کے رسالے نہیں تھے۔ رسالہ ''چنگاری'' بھی تھا جن میں سے ہم لوگوں نے سالیاس کی تصنیف ''کاونٹ تاتین بالتیسکی'' کا قصہ پڑھنا شروع کیا۔ میرے مالک کو اس کہانی کا احمق ہیرو بہت پسند آیا۔ وہ اس نوجوان کی غمگین داستان پر اتنا ہنسے کہ آنکھوں سے آنسو ڈھل کر گالوں پر بہہ نکلے۔ ''اوھو، اوھو، کس قدر عجیب!'' وہ چیخ چیخ کر کہتے جاتے۔

ان کی بیوی بولیں ''سب بنائی ہوئی بات ہے''۔ دراصل وہ اپنی رائے کی انفرادیت اور آزادی ظاہر کرنے کے لئے یہ بات کہہ رہی تھیں۔

پلنگ کے نیچے سے نکالے ہوئے ان رسالوں نے مجھے بہت فائدہ پہونچایا۔ ان کی ہی وجہ سے مجھے یہ حق حاصل ہوا کہ رسالوں کو باورچی خانے میں لیجاؤں اور رات کو پڑھوں۔

میری خوش قسمتی سے جب کھلائی ادھر ادھر پینے پلانے چلی جاتی تو بڑھیا بچوں والے کمرے میں سونے چلی جاتی تھی۔ وکٹر کو میرے پڑھنے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ جب سب لوگ سو جاتے تھے تو وہ کپڑے پہنتا اور چپکے سے نکل لیتا۔ میری مالکن ہمیشہ موم بتی دوسرے کمرے میں لے جاتی تھی، اس لئے میرے پاس روشنی نہیں رہتی تھی۔ چونکہ میرے پاس موم بتی خریدنے کو پیسے نہیں تھے اس لئے میں چپکے چپکے شمع دانوں پر گرا ہوا موم مچھلیوں کے خالی ڈبے میں اکٹھا کیا کرتا تھا، اس پر تھوڑا سا مقدس شبیہہ والا چراغ کا تیل ڈال دیتا تھا اور دھاگے کی بتی باٹ کر لگا دیا کرتا تھا، اس کو میں تندور پر رکھ دیتا اور نیچے بیٹھ کر پڑھتا۔

جب کبھی میں ان بڑی بڑی کتابوں کا صفحہ الٹتا تو چراغ کی سرخ لو تھرتھراتی جیسے اب بجھی کہ تب بجھی۔ بتی دھیرے دھیرے بدبودار موم گہری اترتی جاتی اور دھواں آنکھوں میں کڑواتا۔ لیکن یہ سب تکلیفیں اس خوشی کے مقابلے میں کیا حقیقت رکھتی تھیں جب کہ میں تصویریں دیکھتا اور ان کے نیچے لکھی ہوئی تشریحوں کو پڑھتا۔

دنیا کے متعلق میری نگاہ وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ اس میں شاندار شہروں کی سجاوٹ، بلند پہاڑوں کی رفعت اور سمندر کے ساحلوں کی خوبصورتی سما گئی۔ زندگی ایک عجیب وغریب پھیلاؤ حاصل کرتی جا رہی تھی۔ اور جیسے جیسے مجھے زندگی کی وسیع تر دلچسپیوں، پھیلے ہوئے شہروں اور طرح طرح کے انسانوں کے علم ہوتا جاتا تھا یہ دنیا حسین تر نظر آتی جاتی تھی۔ اب جو میں والگا کے اس پار وسعتوں کو دیکھتا تو جانتا تھا کہ وہاں خلا نہیں ہے۔ پہلے جب میں اس طرف دیکھتا تھا تو ہمیشہ مجھ پر ایک عجیب سی اداسی چھا جاتی تھی: وادیاں زمین پر سپاٹ نظر آتی تھیں، جن میں خال خال اگی ہوئی جھاڑیوں کے سیاہ دھبے نظر کو کچھ تسکین بخشتے تھے۔ وادیوں سے پرے کھردرے جنگل ہوتے تھے اور ان پر چھایا ہوا آسمان۔ ٹھنڈا، ابر آلود۔ دنیا کس قدر ویران اور سنسان معلوم ہوتی تھی! میرا دل بھی ویران لگتا تھا، ایک مبہم سی نرم سی اداسی دل پر چھائی رہتی تھی۔ اور بس یہ جی چاہتا تھا کہ آنکھیں بند کرلوں۔ اس سنسان اور اجاڑ دنیا میں امید کا کہاں گذر تھا۔ یہ سنسان اور اجاڑ دنیا جو خون دل کو نچوڑ ڈالتی تھی، اس کی ہر آرزو کو چھین لیتی تھی۔

رسالوں میں تصویروں کے نیچے جو کچھ لکھا ہوتا تھا، وہ سادی زبان میں دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں کے متعلق بتایا تھا، اوران میں گذشتہ اور موجودہ زمانے کے مختلف واقعات کا بیان رہتا تھا۔ ان میں سے بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں اور اس سے مجھے جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ بعض اوقات میرے دماغ میں عجیب عجیب الفاظ کا پھانس چبھ جاتا تھا جیسے 'مابعدالطبیعیات، خدائی حکومت،' اصول ہاں ماننے والا'۔ ان الفاظ کے بارے میں سوچتے سوچتے میں مر جاتا تھا۔ یہ الفاظ میرے ذہن میں پھلتے پھولتے رہتے یہاں تک کہ وہ باقی تمام تصورات اور خیالات پر چھا جاتے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ اگر ان الفاظ کے معنی دریافت نہیں کئے تو پھر میرے سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ بس یہی الفاظ ہیں جو اصل راز کا راستہ روکے کھڑے ہیں۔ اکثر پورے پورے جملے میرے ذہن میں چپک کر رہ جاتے جیسے انگلی میں پھانس۔ میں کسی اور بات کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے کچھ عجیب سے اشعار پڑھے تھے:

صحراوں میں عطیلہ کا گھوڑا دوڑ رہا ہے،
بکتر پہنے ہے ہنوں کا سردار
مقبرہ کی طرح خاموش اور سیاہ

اور اس سردار کے پیچھے پیچھے جنگ جو سپاہیوں کا ایک سیاہ بادل سے گھوڑوں پر سوار امنڈتا چلا آتا تھا:

''کہاں ہے روم؟ بتاؤ کہاں ہے وہ شاندار روم؟''

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ روم ایک شہر ہے لیکن یہ ہن لوگ کون تھے، اب یہ مجھے معلوم کرنا تھا۔

ایک موقع مناسب دیکھ کر میں نے اپنے مالک سے پوچھا۔

وہ ذرا حیران ہوکر بولے ''ہن لوگ؟ بھئی، شیطان ہی جانے کون تھے وہ۔ کون جانے۔ بکواس!''

پھر سر ہلا کر افسوس کے ساتھ کہنے لگے:

''پیشکوف، تم نے نہ جانے اپنے دماغ میں کیا کیا کوڑا ابھر لیا ہے!''

بہر حال برائی ہو یا بھلائی میں تو معلوم کرنے پر تلا ہوا تھا۔

میں نے سوچا کہ سولوویوف جو فوج کا پادری تھا، اس کو ضرور معلوم ہوگا کہ یہ ہن لوگ کون تھے۔

چنانچہ احاطے میں جب اس سے مڈبھیڑ ہوئی تو میں نے سوال کیا۔

سولوویف کا رنگ پیلا رہتا تھا اور وہ کچھ بیمار تھا ویسے بھی وہ ہمیشہ چڑ چڑا رہتا تھا۔ آنکھیں لال رہتی تھیں، بھوئیں اڑ چکی تھیں، پیلی سی چھوٹی سی داڑھی تھی۔ اپنا سیاہ عصا مٹی پر مارتے ہوئے بولا:

''اچھا کوئی تھے۔ پھر تمہیں اس سے کیا مطلب؟''

جب میں نے لفٹنٹ نیستیروف سے دریافت کیا تو وہ بگڑ کر زور سے چیخے:

''کیا۔آ۔آ۔آ؟!''

میں نے سوچا کہ عطار کے یہاں چلوں، اس سے پوچھا جائے۔ وہ ہمیشہ مجھے سے دیکھتا ہے۔

پاویل گولد برگ نے جو عطار تھا، میری بات کا جواب دیا۔ اس نے مجھے بتایا ''ہن لوگ۔ یہ ایک خانہ بدوش سی قوم ہوتی تھی۔ قوغیز قوم کی طرح۔ اب وہ لوگ نہیں ہوتے۔ ان کی نسل ختم ہوگئی۔''

مجھے سخت مایوسی اور کوفت ہوئی۔ اس لئے نہیں کہ ہنوں کی نسل ختم ہوگئی تھی بلکہ اس لئے کہ یہ لفظ جس نے مجھے اتنا پریشان کیا تھا، اس کے معنی اس قدر معمولی تھے اور میرے لئے تو ظاہر ہے کہ بالکل ہی غیر اہم تھے۔

لیکن میں ہنوں کا نہایت شکر گذار ہوا ان کے متعلق اس تجربہ کے بعد اب الفاظ مجھ کو پریشان نہیں کرتے تھے، اور عطیلہ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہئے کیونکہ اس کی بدولت مجھے گولد برگ عطار سے دوستی کرنی نصیب ہوئی۔

یہ آدمی ہر علمی لفظ کے آسان معنی جانتا تھا اور جیسے ہر راز کی کنجی اس کے پاس تھی۔ دو انگلیوں سے وہ عینک ٹھیک کرتا، موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے مجھے غور سے دیکھتا اور اس طرح مجھ سے بات کرنی شروع کرتا جیسے میرے دماغ میں کیلیں بٹھا رہا ہے۔

''دیکھ میرے ننھے دوست، الفاظ بھی ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے درخت کی پتیاں اور اگر یہ معلوم کرنا چاہو کہ پتیاں جیسے ہیں، ویسی کس طرح بن گئیں تو یہ جاننا ضرور کچھ نہ کچھ فائدہ اور کچھ نہ کچھ لطف اٹھا سکتے ہو...''

مجھے اکثر اس عطار کی دوکان پر سودا اور میگنیشیا لینے جانا ہوتا تھا کیونکہ ہمارے یہاں سے بڑوں کے پیٹ میں جلن برابر ہوا کرتی تھی۔ بچوں کے لئے بھی دوا اور مالش کا تیل لانا ہوتا تھا۔ چنانچہ اس عطار کی

مختصر نصیحتوں کی بدولت کتابوں کی طرف میرا رویہ اور بھی سنجیدہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ کتابیں میرے لئے ایسی ناگزیر ہو گئیں جیسے شرابی کیلئے وادکا۔

ان کتابوں نے مجھے ایک نئی دنیا دکھائی۔ ایک ایسی دنیا جس میں بڑی بڑی آرزوئیں اور بڑے بڑے جذبات بھرے تھے جو انسان کو یا تو بہادری کی طرف لے جاتے تھے یا جرائم کی طرف۔ اور مجھے یہ نظر آنے لگا کہ میرے ماحول میں جو لوگ تھے، ان میں نہ بہادری کی ہمت تھی نہ جرم کرنے کی۔ جو زندگی کتابوں میں بیان کی گئی تھی، اس سے ان کی زندگی بالکل الگ تھی اور ان لوگوں کی زندگی میں کوئی دلچسپ چیز ڈھونڈے نہ ملتی تھی۔ ایک بات میرے ذہن میں اچھی طرح جم چکی تھی۔ میں ان کی سی زندگی نہیں بسر کرنا چاہتا تھا...

تصویروں کے نیچے جو کچھ لکھا ہوتا تھا، اس سے مجھے یہ پتہ چلا تھا کہ پراگ اور لندن اور پیرس میں کوڑے کچرے سے بھرے ہوئے گڈھے نہیں تھے اور شہر کے بیچ میں گندے نالے نہیں بہتے تھے۔ وہاں سیدھی اور کشادہ سڑکیں تھیں اور طرح طرح کے مکان اور گرجا گھر۔ وہاں چھ مہینے اس شدت کی سردی نہیں پڑتی تھی کہ لوگوں کو گھر کے اندر بیٹھ رہنا پڑے، نہ وہاں روزوں کا زمانہ اتنا سخت ہوتا ہے کہ انسان نمکین کرم کلے، نمکین چھتریوں، جو کے آٹے اور بدبودار قسم کے السی کے تیل میں پکے ہوئے آلوؤں کے سوا اور کچھ کھا ہی نہ سکیں۔

روزوں کے زمانے میں کتابیں پڑھنا ممنوع ہے۔ مجھ سے تصویری رسالے لئے گئے اور کچھ پر یہ خالی خولی روزوں کی بھوکی پیاسی زندگی پھر لا دی گئی۔ اب جب کہ میں اس زندگی کا اس زندگی سے مقابلہ کر سکتا تھا جو کہ کتابوں میں بیان کی گئی تھی تو یہ زندگی اور بھی بدہئیت اور اکتائی ہوئی لگتی تھی۔ پڑھنے کے اثر سے اب میں اپنے آپ میں پہلے سے زیادہ توانائی محسوس کر سکتا تھا۔ اس لئے کام بھی زیادہ قوت ارادی سے اور پل کے ڈھٹائی سے کرتا تھا۔ کیونکہ اب میرے ذہن کے سامنے ایک منزل تھی۔ جتنی جلدی میں کام ختم کر لیتا اتنا ہی زیادہ مجھ کو اپنے پڑھنے کے لئے وقت مل سکتا تھا۔ کتابیں چھن جانے پر میں بے جان اور بے دم ہو جاتا۔ مجھے بھولنے کی بیماری ستانے لگی جس سے پہلے میں آشنا نہ تھا۔

مجھے یاد ہے کہ اسی طرح بے جان اور بے رنگ زمانے میں ایک پراسرار واقعہ ہوا تھا۔

ایک رات جب سب لوگ اپنے اپنے بستر پر چلے گئے تو خانقاہ کا بڑا گھنٹہ یکا یک بڑے زوروں

سے گھنگھنانے لگا۔ فوراً سب اٹھ بیٹھے اور نیم برھنہ عالم میں کھڑکیوں کی طرف لپکے۔

''خطرے کی گھنٹی ہے؟ کیا آگ لگ گئی ہے؟'' وہ ایک دوسرے سے پوچھتے جا رہے تھے۔

پاس پڑوس کے مکانوں سے بھی لوگوں کی چلت پھرت کی آوازیں اور کواڑ کھلنے اور بند ہونے کی دھڑ ادھڑ سنائی دے رہی تھی۔ احاطے میں کوئی شخص گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے دوڑ رہا تھا۔ بڑھیا چیخنے لگی کہ ارے گرجے میں چوری ہوگئی لیکن میرے مالک نے اس کو ڈانٹ کر چپ کر دیا:

''کیا اماں، چپ بھی رہو۔ ارے کسی کو بھی نظر آ سکتا ہے کہ یہ خطرے کی گھنٹی نہیں ہے!'' ''تو پھر بڑے پادری صاحب کا انتقال ہو گیا ہوگا...''

وکٹر اپنے ٹنڈ پر سے کودا اور کپڑے پہنتے ہوئے بولا:

''مجھے پتہ ہے کیا ہوا۔ مجھے پتہ ہے!''

میرے مالک نے مجھے اوپر بھیجا کہ چھت پر جا کر دیکھو کہ آگ کی سرخی تو کہیں نہیں دکھائی دے رہی۔ میں دوڑتا ہوا دوچھتی کے روزن سے گذر کر چھت پر پہونچا۔ کہیں سرخی یا روشنی نہیں تھی، البتہ کا بڑا گھنٹہ رات کے سناٹے اور برفیلی ہوا کو چیرتا ہوا برابر گھنگھنائے جا رہا تھا۔ نیچے زمین پر نیند کا ماتا شہر پھیلا ہوا تھا۔ اندھیرے میں چرمراتی ہوئی برف پر لوگ بھاگ رہے تھے۔ لیکن وہ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ گاڑیوں کے پہیوں کی بھی آواز آ رہی تھی، گھنٹہ برابر بھیانک انداز سے بج رہا تھا۔ میں نیچے دوڑا۔

''کوئی آگ واگ نہیں ہے۔''

''تھو!'' میرے مالک کے منہ سے نکلا۔ وہ ٹوپی اور کوٹ بھی پہن چکے تھے۔ کالر اوپر کو اٹھا کر انہوں نے گھبراہٹ میں اپنے پیر جوتوں کے غلاف میں ڈالے۔

''ارے مت جاؤ! مت جاؤ...'' ان کی بیوی نے التجا کی۔

''یہ حماقت ہے!''

وکٹر بھی ٹوپی اور کوٹ پہن چکا تھا اور ہر ایک کو چھیڑ رہا تھا:

''مجھے پتہ ہے کہ کیا بات ہے...''

جب دونوں بھائی چلے گئے تو عورتوں نے مجھ سے ساوار گرم کرنے کو کہا اور خود کھڑکی پر جم گئیں۔ لیکن فوراً ہی میرے مالک نے باہر کی گھنٹی بجائی، خاموشی سے دوڑتے ہوئے سیڑھی چڑھتے، بڑے کمرے

کا دروازہ کھولا اور بھاری آواز میں بولے:

''زار کو کسی نے قتل کر دیا!''

''سچ ؟قتل کر دیا؟'' بڑی مالکن چلائی۔

''ہاں ہاں قتل کر دیا، مجھ کو ایک افسر نے بتایا...اب کیا ہوگا ؟''

اس کے فوراً ہی بعد وکٹر نے گھنٹی بجائی اور داخل ہوا اور کپڑے اتارتے ہوئے بگڑ کر بولا:

''اور لیجئے! میں سمجھا تھا جنگ چھڑ گئی!''

اس کے بعد سب لوگ چائے پینے بیٹھ گئے۔اور بڑی محتاط اور دبی آوازوں میں گفتگو کرنے لگے۔ باہر بھی سناٹا چھا گیا تھا۔گھنٹی بجنا بند ہوگئی۔ دو دن مسلسل لوگ اس طرح چپکے چپکے باتیں کرتے رہے۔ ادھر ادھر آتے جاتے رہے، لوگ ملنے کو بھی آئے اور جانے کیا کیا تفصیلیں بیان ہوتی رہیں۔ میں سخت کوشش کرتا رہا کہ میری سمجھ میں آجائے کہ یہ ہوا کیا ہے؟ لیکن میرے مالکوں نے اخبار مجھ سے چھپا دیا اور جب میں نے سیدوروف سے پوچھا کہ لوگوں نے زار کو کیوں مار ڈالا تو انے آہستہ سے جواب دیا:

''اس بات پر گفتگو کرنا ممنوع ہے...''

یہ معاملہ بہت جلد لوگوں کے ذہن سے اتر گیا، روزانہ کی زندگی کے دھندلکے اس پر چھا گئے اور اس واقعے کے فوراً ہی بعد مجھے ایک نہایت ہی خراب تجربے سے گزرنا پڑا۔

اتوار کے دن سب لوگ صبح کی عبادت میں گرجے گئے ہوئے تھے اور میں سماوار کھولانے کو رکھنے کے بعد فلیٹ کی صفائی میں مصروف تھا۔ بڑا بچہ باورچی خانے میں پہونچ گیا، سماوار کی ٹونٹی گھما کر کھولی اور اسے لے کر میز کے نیچے بیٹھ اس سے کھیلنے لگا۔ سماوار کے پائپ دہکتے انگاروں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس لئے جب پانی بہہ گیا تو سارے سماوار کے جوڑ کھل گئے۔ دوسرے کمرے سے میں نے سماوار کی یہ عجیب وغریب آواز سنی جیسے وہ سخت غصے میں بھنبھنا رہا ہو۔ دوڑا ہوا میں باورچی خانے میں پہونچا اور یہ دیکھ کر پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ سماوار بالکل نیلا ہوگیا اور کانپ جس میں ٹونٹی لگی ہوئی تھی اس کے جور کھل گئے اور وہ مایوسی کے عالم میں سرنہوڑائے کھڑا تھا، ڈھکنا ٹیڑھا ہو گیا تھا، ہنڈلوں کے نیچے سے پگھلا ہوا رانگا ٹپک رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نیلا اور سیاہ سماوار نشے میں دھت ہے۔ جب میں نے اس پر ٹھنڈا پانی پھینکا تو اس نے زور زور سے شائیں شائیں کی اور بڑے افسوس ناک عالم میں فرش پر بکھر گیا۔

اس وقت گھنٹی بجی۔ جب میں نے دروازہ کھولا تو بڑھیا نے پہلا سوال یہی کیا کہ کیا سماوار ابل چکا ہے؟ میں نے مختصر جواب دے دیا:

''جی ہاں ابل گیا ہے۔''

ظاہر ہے کہ یہ جواب میں نے صرف خوف اور شرمندگی کی وجہ سے دیا تھا لیکن اس کے معنی یہ لئے گئے کہ میں نے مذاق کرنے کی ذلیل کوشش کی تھی۔ اور اس لئے میری سزا بڑھا دی گئی۔ مجھ پر مار پڑی۔ بڑھیا نے کئی تنکوں کی جھاڑو سی باندھ کر مجھ پیٹا۔ یہ تنکے دیوار کی ٹہنیوں کے تھے۔ اس بار چوٹ زیادہ نہیں لگی تھی لیکن میرے گوشت میں بے شمار پھانسیں اٹک گئی تھیں۔ شام تک میری پیٹھ سوج کر تکیہ ہوگئی اور دوسرے دن دوپہر کو میرے مالک کو مجھ لے کر ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔

یہ ڈاکٹر بڑی مضحکہ خیز حد تک لمبا اور دبلا تھا۔ مجھے دیکھنے کے بعد گہری آواز میں بولا:

''مجھے اس ظالمانہ برتاؤ کے متعلق سرکاری رپورٹ لکھنی ہوگی۔''

میرے مالک کا منہ سرخ ہو گیا اور انہوں نے شرم سے اپنی گردن جھکا لی اور پاؤں گھسیٹتے ہوئے ڈاکٹر سے کچھ بڑبڑانے لگے۔ ڈاکٹر ان کے سر کے اوپر سے دور خلا میں دیکھنے لگا اور اختصار سے جواب دیا۔

''نہیں کرسکتا۔ ممکن نہیں۔''

پھر وہ میری طرف مڑا:

''تم شکایت لکھوانا چاہتے ہو؟''

میری پیٹھ میں درد ہو رہا تھا لیکن میں نے کہا:

''جی نہیں۔ میں نہیں چاہتا۔ آپ بس جلدی سے میرا کچھ علاج کر دیں...''

پھر وہ لوگ مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے گئے اور میز پر لٹایا اور ڈاکٹر نے ایک چمٹیا سے میری پھانسیں نکالنی شروع کیں۔ چمٹیا ٹھنڈی تھی اور یہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ پھانس نکالتے وقت ڈاکٹر صاحب مذاق بھی کرتے جاتے تھے:

''وہ بھئی، کیا ان لوگوں نے تمہاری چمڑی کی خوب ہی گت بنائی ہے، اب آئندہ سے بالکل موم جامہ ہو جاؤ گے، پانی کا اثر نہ ہوگا...''

اس نے اپنا کام ختم کیا جس سے مجھے گدگدی ہو رہی تھی۔ اس نے کہا:

''تو میں نے بیالیس نکالے ننھے! یاد رکھو! ہاں بے شک یہ بات اس لائق ہے کہ اب تم اپنے ساتھوں میں اس کا ذکر کر کے اتراؤ! کل آ کے پٹی بدلوا جانا۔ کیا یہ لوگ اکثر پیٹتے ہیں تم کو؟''

میں نے ایک منٹ سوچ کر جواب دیا:

''پہلے تو اور زیادہ مارتے تھے...''

ڈاکٹر اپنی بھاری آواز میں بڑے زور سے ہنسا:

''اچھا تو ترقی ہو رہی ہے! ہر بات میں کوئی نہ کوئی فائدہ ہوتا ہے!''

جب وہ مجھے لے کر مالک کے پاس پہونچے تو بدلے:

''لو۔ یہ رہا۔ بالکل نیا ہو گیا ہے! کل اسے پھر بھیج دینا۔ پٹی بدل دیں گے ہم۔ شکر کرو کہ لونڈا مسخرا ہے...''

جب ہم گھوڑا گاڑی میں بیٹھے واپس جا رہے تھے میرے مالک کہنے لگے:

''میری بھی بہت پٹائی ہوئی تھی، پیشکوف۔ آخر اس کا کیا علاج کیا جائے افوہ! کیا بتاؤں کہ مجھ کو کیسی مار پڑتی تھی بھیا! تمہارے پاس کم از کم میں تو ہوں ہمدردی کرنے کے لئے، مجھ سے تو کوئی بھی ہمدردی نہیں کرتا تھا۔ کبھی کوئی نہیں! جدھر دیکھو لوگوں کے ٹھٹ لگے ہیں۔ مگر کسی حرامی کے دل میں میرے لئے درد نہیں۔ آہ، کیا لڑاکو مرغیاں تھیں سب کی سب...''

جب تک ہم لوگ چلتے رہے وہ برستے رہے۔ مجھے ان پر ترس آیا اور ان کا بہت شکر گذار ہوا کہ مجھ سے انہوں نے اس مہربانی سے بات کی۔

جب ہم لوگ گھر پہونچے تو میرا استقبال اس طرح ہوا جیسے میں ہیرو تھا، جو کوئی معرکہ فتح کر کے آیا تھا۔ عورتوں نے مجھ سے سارا قصہ سنا کہ ڈاکٹر نے کیا کہا اور پھانسیں کیونکر نکلوائیں۔ میری داستان کو وہ بار بار 'آہ' 'اوہ' کہہ کر ٹوکتی تھیں اور ہونٹ چاٹ چاٹ کر، بھوئیں تان تان کر اس دردناک تفصیل کو سنتی جاتی تھیں۔ میں حیران تھا کہ بیماری اور دکھ اور تکلیف سے ان کو مریضانہ دلچسپی کیوں ہے؟

میں نے جب دیکھا کہ وہ لوگ اس بات سے خاص طور پر خوش تھے کہ میں نے سرکاری طور پر ان کی شکایت درج کروانے سے انکار کر دیا تھا تو میں نے ان سے اجازت مانگی کہ کٹر ماسٹر کی بیوی سے

پڑھنے کے لئے کتابیں لے آیا کروں۔ اس صورت حال میں ان کی ہمت نہ تھی کہ وہ انکار کرتے، لیکن بڑھیا نے پھر بھی چیخ کر کہا:

''تو آخر ہے نا شیطان ہی کا بچہ!'' چنانچہ دوسرے دن میں کٹر ماسٹر کی بیوی کے سامنے کھڑا تھا اور وہ مجھ سے محبت سے کہہ رہی تھی:

''ارے لو، ان لوگوں نے تو مجھ سے کہا تھا کہ تم بیمار ہو اور ہسپتال بھیجے گئے ہو۔ دیکھو تو ذرا کس قدر صاف جھوٹ ہوتی ہیں یہ سنی سنائی باتیں بھی۔''

میں چپ رہا۔ میں اس سے سچ بات کہتے شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ آخر اس سے اتنی غم گین اور گنوار قسم کی بات کہی بھی کیوں جائے؟ میرے لئے اتنی خوشی بھی بہت تھی کہ کم از کم وہ ایک ہستی تو تھی جو اوروں کی طرح نہ تھی۔

میں نے بڑے ڈوما کی موٹی موٹی کتابیں پڑھنی شروع کیں، پانسا دی تریل، ماٹپن، زاکونے، گابرائیو، ایمار اور بوا گوبے کی کتابیں بھی پڑھیں۔ میں ان کتابوں کو بڑی تیز رفتاری سے پڑھ رہا تھا اور ان سے مجھے بڑی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ کیونکہ پڑھتے وقت مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں ایک نئی اور انوکھی زندگی کے دھارے میں بہہ رہا ہوں۔ میرے ذہن میں لطیف جذبات بیدار ہوتے، جسم میں زیادہ توانائی محسوس ہوتی۔ پھر میرا خودساختہ چراغ جلنا شروع ہو گیا تھا اور میں رات رات بھر پڑھتا رہتا تھا۔ آنکھیں دکھنے لگتیں بڑھیا خوش ہو کر کہتی:

''ابھی کیا ہے ٹھہرو، کتاب کے کیڑے! دیدے پھوٹ جائیں گے۔ اندھا ہو کے بیٹھے گا!''

بہت جلد میں یہ سمجھ گیا کہ ان ساری دلچسپ کتابوں میں پلاٹ، پس منظر وغیرہ کے فرق کے باوجود ایک ہی بات تھی جو سبھی میں کہی جاتی تھی یعنی: اچھے انسان ہمیشہ دکھی رہتے ہیں اور برے لوگ ان کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ برے انسان ہمیشہ زیادہ ہوشیار اور زیادہ خوش نصیب ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی ایسی انجانی طاقت ہے جو ہمیشہ برائی پر غالب آجاتی ہے اور شر کے مقابلے میں خیر کی فتح ہوتی ہے۔ پھر ان کتابوں میں جو ''محبت'' کا ذکر ہوتا تھا اور جس طرح سے سب مرد اور عورتیں اس سلسلے میں ایک ہی الفاظ بولتے تھے، اس سے میں عاجز رہتا تھا۔ اس میں اکتاہٹ تو جو تھی سو تھی ہی لیکن ایسی گھسی پٹی معمولی باتوں سے دل میں مبہم شکوک پیدا ہونے لگتے تھے۔

کبھی کبھی میں کتاب کے چند ہی صفحے پڑھنے کے بعد اندازہ لگانے لگتا تھا کہ کس کی جیت ہوگی اور کس کی ہار۔ جیسے ہی پلاٹ کے پیچ وتاب ذرا واضح ہونے لگتے، میں اس کو اپنے تصور کی مدد سے کھول ڈالنے پر ڈٹ جاتا۔ کتاب الگ رکھ کر میں اس پر اس طرح غور کرتا جیسے ریاضی کے کسی سوال پر غور کیا جاتا ہے اور اکثر میرا جواب صحیح نکلتا کہ کونسا کردار جنت میں جائے گا اور کونسا جہنم میں۔

لیکن ان باتوں کے علاوہ مجھ پر ایک حقیقت اور بھی کھلی۔ ایک دوسری قسم کی زندگی کے پیچ وخم دکھائی دینے لگے اور کچھ اور رشتے میرے ذہن میں واضح ہونے لگے۔ مثلاً میں نے یہ دیکھا کہ پیرس میں بگھی چلانے والا، مزدور، فوجی سپاہی اور یہ سب پچ رنگے لوگ اس طرح کے نہیں تھے، جس طرح کی نیژنی، قازان یا پیرم میں ہوتے تھے۔ وہ جب بڑے آدمیوں سے گفتگو کرتے تھے تو زیادہ دلیری کے ساتھ اور ان کی موجودگی میں بھی اپنی آزادی اور بے تکلفی کو بڑی حد تک برقرار رکھتے تھے۔ مثلاً وہاں کے کسی فوجی سپاہی کو لے لیجئے۔ ویسا کوئی سپاہی مجھے یہاں نظر نہیں آتا تھا۔ نہ سیدوروف، نہ وہ اسٹیمر والا سپاہی، نہ ایرموخین۔ یقیناً وہاں کا سپاہی یہاں والوں سے زیادہ انسان تھا۔ اس میں تھی کوئی نہ کوئی بات جو سمورئی سے ملتی جلتی تھی، لیکن وہ گنوارپن اور وحشت میں اس سے کم تھا۔ یا کسی دوکاندار کو دیکھئے۔ وہ بھی میرے جان پہچان کے تمام دوکانداروں سے بہتر نظر آتا تھا۔ ان کتابوں کے پادری بھی ویسے نہیں تھے جیسے ہم کو بھگتنے پڑتے تھے، وہ عوام سے زیادہ محبت اور زیادہ ہمدردی رکھتے تھے۔ دوسرے ملکوں میں جو زندگی ان کتابوں میں بیان کی گئی تھی، وہ یقیناً اس زندگی سے زیادہ دلچسپ اور آرام دہ تھی جس سے واقف ہوں۔ دوسرے ملکوں میں لوگ اتنا زیادہ اور اس وحشیانہ طریقے سے نہیں لڑتے تھے اور کسی غریب انسان کو اس طرح نہیں ستاتے تھے جس طرح اس سپاہی کو اسٹیمر پر ستایا گیا تھا۔ میری بڑھیا مالکن کی طرح بغض بھری دعائیں خدا سے نہیں مانگی جاتی تھیں۔

میں نے خاص طور پر اس بات پر غور کیا کہ جب بدمعاشوں کے گھٹیا کردار اور لالچی طبیعت کے لوگوں کا ذکر ہوتا تو ان کتابوں میں یہ دکھایا جاتا تھا کہ ان لوگوں کی طبیعت میں بے سبب ظلم نہیں تھا۔ لوگوں کی توہین اور تضحیک کی وہ تڑپ نہیں تھی جو مجھے اپنے یہاں اتنی زیادہ نظر آتی تھی۔ ان کتابوں کے بدمعاش جو ظالم ضرور تھے مگر ایک عمل مثبت سے اور ان کی بیدردی کا سبب ہمیشہ سمجھ میں آسکتا تھا۔ لیکن میں نے اپنے یہاں احمقانہ، بے مقصد ظلم دیکھا تھا۔ ظلم جو صرف لطف اٹھانے کی خاطر کیا جاتا تھا، جس کا کوئی

مقصد اور کوئی سبب نہ کھلتا تھا۔

ہر نئی کتاب اس چیز کو اور بھی مضبوطی سے ذہن میں بٹھاتی تھی کہ روس کی زندگی اور ملکوں کی زندگی میں بڑا فرق ہے۔ اور اس سے مجھے سخت بے اطمینانی اور بے چینی کا احساس ہوتا تھا۔ یہ شبہ بھی بڑھتا جاتا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ زرد زرد صفحے جنہیں میں الٹ رہا ہوں، جھوٹ تو نہیں بیان کرتے؟

پھر گانکورٹ کی ناول ''زمگانو برادران'' میرے ہاتھ لگی۔ میں اسے ایک رات میں چاٹ گیا۔ اور وہ مجھے اتنی اچھی لگی، اتنی نادر لگی کہ اس غم بھری اور سلیس داستان کو پھر سے پڑھا۔ اس میں نہ کوئی الجھا ہوا پلاٹ تھا، نہ کوئی تصنع کی سجاوٹ اور دلکشی تھی۔ پہلے تو وہ ایسی خشک محسوس ہوئی جیسی ''ولیوں کی زندگی''۔ شروع میں اس کی زبان سے بھی مجھے مایوسی سی ہوئی کیونکہ وہ نہایت سادہ، غیر موصع اور حقیقت پسندانہ تھی۔ لیکن اس کے مختصر مگر زوردار جملے سیدھے میرے دل کو لگ گئے اور ان کے ذریعہ ان دونٹ بھائیوں کی زندگی کا ڈرامہ کچھ اس طرح اجاگر ہوا کہ میں خوشی کے مارے کانپنے لگا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور یہاں تک بہتے گئے کہ مجھے ایسا لگنے لگا کہ میرا دل پھٹ جائے گا، خاص کر اس مقام پر جہاں بے چارہ ٹوٹی ہوئی ٹانگوں والا نٹ بھائی کسی نہ کسی طرح دوچھتی میں چڑھتا ہے اور وہاں دیکھتا ہے کہ اس کا چھوٹا بھائی چھپ کر پرانے خاندانی فن، نٹ بازی کی کوشش کر رہا ہے۔

جب میں نے یہ حیرت انگیز کتاب کٹر ماسٹر کی بیوی کی واپس کی تو اس سے درخواست کی کہ مجھے ایک اور کتاب دے جو بالکل ایسی ہو۔

وہ ہنس پڑی:

''بالکل ایسی ہی سے کیا مطلب ہے تمہارا؟''

میں اس کی ہنسی سے گھبرا گیا اور اس کو بتا نہیں پایا کہ میں کیا چاہتا تھا۔ وہ بولی:

''یہ کتاب تو بالکل پھیکی ہے۔ ٹھیرو میں تمہارے لئے ایک اور نکالتی ہوں۔ اس سے بہت اچھی کوئی دلچسپ چیز...''

چند دن بعد اس نے مجھے گرین وڈ کی کتاب ''ایک آوارہ لڑکے کی سچی داستان'' دی۔ کتاب کا نام سرورق پر دیکھ کر میرے دل پر گھونسہ لگا۔ دراصل مجھے اپنا خیال آ گیا تھا۔ لیکن پہلے ہی صفحے کو پڑھ کر میں مسکرانے لگا یہاں تک کہ شروع سے لے کر آخر تک اسی مسکراہٹ کے ساتھ پڑھ گیا۔ بعض بعض صفحے دو دو

تین تین بار پڑھے۔

توغیر ممالک میں بھی ننھے لڑکوں کی زندگی بھی کبھی کبھی مصیبت بن جاتی تھی! حقیقت تو یہ ہے کہ اس کتاب کے دیکھتے تو میری زندگی کہیں زیادہ آرام دہ تھی۔ گویا دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ ہمت ہارنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی!

گرین وڈ پڑھنے سے میرے دل کو بڑی ڈھارس پہنچی۔ اور اس کے فوراً بعد میں نے ایک ایسی کتاب پائی جو سچ مچ، صحیح قسم کی کتاب تھی۔ ''یوگینی گرانڈ''!

بوڑھے گرانڈے میں مجھے اپنے نانا ابا کی ہلکی سی جھلک آتی تھی۔ مجھے اس بات سے کوفت ہوئی کہ کتاب اتنی چھوٹی تھی لیکن اس اختصار پر بھی اس میں کتنی زیادہ حقیقت اور سچائی تھی! ویسے زندگی نے ضرورت سے زیادہ ہی مجھے ان حقیقتوں کا عرفان کرادیا تھا لیکن کتاب نے ان پر ایک اور ہی پہلو سے روشنی ڈالی تھی۔ یہ روشنی ٹہراؤ کے ساتھ، سکون کے ساتھ، ٹھنڈے دل سے کئے ہوئے مشاہدے کی تھی۔ گانکورٹ کے علاوہ اور میں نے جتنے بھی مصنفین کو پڑھا تھا وہ اسی سختی اور ہنگامہ خیزی کے ساتھ لوگوں کے متعلق رائیں اور فیصلے دیا کرتے تھے جیسے میرے مالک۔ جس سے اکثر اوقات پڑھنے والے کو کہانی کے مجرم سے ہمدردی ہو جاتی تھی اور نیک اچھے والے کردار سے پڑھنے والا عاجز ہمدردی ہو جاتی تھی اور نیک اچھے والے کردار سے پڑھنے والا عاجز آجاتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر اکثر کوفت ہوتی تھی کہ کوئی انسان چاہے کتنا ہی غور وفکر اور محنت کر کے اپنی منزل تک پہنچنا چاہتا ہو وہ ہمیشہ اس میں ناکام رہتا ہے کیونکہ یہ بااخلاق، شریف نیک لوگ شروع صفحے سے جو اس کے آگے ڈھٹائی سے اڑتے تو آخر صفحے تک اڑے رہتے۔ جیسے کوئی پتھر کی دیوار جس سے سوائے سر ٹکرانے کے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کیا جائے۔ یقیناً شر ٹکرانے کے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کیا جائے۔ یقیناً شر کے ناپاک ارادے اسی دیوار سے ٹکرا کر پرزے پرزے ہو جاتے تھے لیکن پتھر کوئی ایسی چیز نہیں جس سے انسان کبھی بھی محبت کر سکے۔ دیوار چاہے کتنی ہی خوبصورت اور مضبوط کیوں نہ ہو اگر آپ کو اس کے دوسری طرف اگے ہوئے سیب تک ہاتھ بڑھانا ہے تو پھر اس میں لگے ہوئے حسین پتھروں کی خوبصورتی میں کھو کر نہیں رہ سکتے۔ اور مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا تھا کہ زندگی میں جو چیزیں سب سے زیادہ حقیقی ہیں، سب سے زیادہ سچی ہیں اور سب سے زیادہ اہم ہیں، وہ ان ہی بااخلاق اور نیک اور شریف لوگوں کے پیچھے چھپی ہیں...

بالزاک اور گانکورٹ اور گرین وڈ کے یہاں نہ بدمعاش ہوتے تھے نہ نیک، نہ ہیرو، نہ موذی۔ وہاں بس سیدھے سادے انسان ہوتے تھے جو بے حد شاندار طریقے پر جی بھر کر زندگی سے بھرپور تھے اور اس بات پر کسی کو ہرگز شک نہیں ہوسکتا تھا کہ جو کچھ وہ کہتے یا کرتے تھے وہ سچ مچ اسی طرح ہوتا تھا جس طرح وہ کہتے یا کرتے تھے۔

اس طرح مجھے معلوم ہوا کہ ایک اچھی کتاب پڑھنے سے کتنی زبردست مسرت حاصل ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ کتاب کس طرح حاصل کی جائے؟ کون میری مدد کرتا؟ کٹر ماسٹر کی بیوی تو نہیں کرسکتی تھی۔

اس نے مجھے ارسن ہاوسے کی کتاب ''ہاتھوں میں پھول، سونا اور خون'' اور بیلاؤ، پال ڈی کاک اور پال فیول کی کتابیں دیتے ہوئے کہا ''یہ لو۔ یہ اچھی کتابیں ہیں۔'' لیکن اب ایسی کتابیں میرے گلے اترنی مشکل تھیں۔

کٹر ماسٹر کی بیوی کو ماریٹ اور ورنر کے ناول پسند تھے۔ میں ان کو پڑھ کر بور ہو جاتا تھا۔ نہ مجھے اسپائلی ہیگن کی چیزیں پسند آتی تھیں لیکن ایور باخ کی کہانیاں البتہ بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ سوئے اور ہیوگو کو کتابوں نے مجھے بہت زیادہ متاثر نہیں کیا۔ ان پر سر والٹر اسکاٹ کو ترجیح دیتا تھا۔ مجھے ایسی کتابوں کی ضرورت تھی جن کو پڑھنے سے میرے روح جھنجھنا اٹھے اور مجھے خوشی نصیب ہو، جیسے کہ حیرت انگیز بالزک کی چیزیں تھیں۔ اب مجھے کٹر ماسٹر کی چینی کی گڑیا جیسی بیوی میں بھی دلچسپ بہت کم ہوتی جاتی تھی۔

ویسے جب اس کے یہاں جاتا تو صاف قمیص پہن لیتا، بالوں میں کنگھی کر لیتا اور ممکن طریقے سے اپنے آپ کو اس لائق بناتا کہ اس کے سامنے جاسکوں، کامیاب ہوتا تھا یا نہیں یہ تو مشکوک ہے۔ بہر حال میں انتظار کرتا رہا کہ وہ میری سفید پوشی دیکھ کر مجھ سے زیادہ بے تکلفی اور سادگی سے بات کرے گی جب اس درخشاں چہرے پر یہ چکنی مکنی نقلی مسکراہٹ نہ ہوگی۔ مسکرا کر میٹھے اور تھکے ہوئے لہجے میں کہتی:

''پڑھ لی تم نے؟ پسند آئی؟''

''جی نہیں۔''

وہ باریک بھوئیں ذرا اٹھائی اور ٹھنڈی سانس بھر کر اسی ہلکی سی خنخناتی ہوئی آواز میں کہتی جس سے اب میں خوب آشنا ہو گیا تھا:

''کیوں نہیں؟''

''اس کے متعلق میں پہلے بھی پڑھ چکا ہوں۔''

''کس کے متعلق؟''

''محبت کے...''

وہ آنکھیں میچتی اور بڑی شیریں ہنسی ہنستی۔

''ارے واہ! میں مرگئی، لیکن محبت کے متعلق تو سب ہی کتابوں میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہے!''

بڑی سی آرام کرسی میں بیٹھی بیٹھی وہ اپنے ننھے ننھے پنجوں کو سمور کی سلیپروں میں ہلاتی رہتی، جماہی لیتی، نیلے ڈریسنگ گاؤن کو کندھوں پر اوراوپر کھینچتی اور گھٹنوں پر رکھی ہوئی کتاب پر اپنی گلابی گلابی نازک انگلیوں سے طبلہ بجاتی۔

میرا دل چاہتا اس سے کہوں کہ ''آپ یہاں اٹھ کیوں نہیں جاتیں؟ یہ افسر لوگ اب تک آپ کو محبت نامے لکھتے رہتے ہیں اور آپ کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں...''

لیکن دل کی بات زبان پر لانے کی ہمت نہ ہوتی اور میں ہاتھ میں ایک اور موٹی سی کتاب۔محبت کے متعلق۔سنبھالے، دل مسوستا، باہر نکل آتا۔

احاطے میں اس عورت کے متعلق افواہیں دن بدن زیادہ تمسخر آمیز اور گھٹیا ہوتی جاتی تھیں۔میرے لئے اس گندی گفتگو کو سننا نہایت ہی تکلیف دہ تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ سب غلط ہے۔جب وہ میرے سامنے نہ ہوتی تو مجھے اس پر بہت ترس آتا، اس کے لئے خطرے کا بھی احساس ہوتا لیکن جب اس کے سامنے جاتا، اس کی تیز نظروں، نازک مختصر سے جسم کے حسین خط وخال کو دیکھتا، اس کے مسکراتے چہرے پر نظر ڈالتا تو میری ہمدردی اور خوف کہر کی طرح مٹ جاتے۔

موسم بہار میں وہ یکا یک وہاں سے کہیں اور چلی گئی اور چند دن بعد اس کا شوہر بھی چلا گیا۔

ان کے جانے کے بعد، ابھی نئے کرایہ دار نہیں آئے تھے کہ ایک بار میں اس خالی مکان میں گیا۔ ننگی ننگی خالی دیواروں پر کچھ کیلیں ٹیڑھی لگی ہوئی تھیں، کہیں کہیں جہاں تصویریں ٹنگی تھیں، اب ان کے نشان رہ گئے تھے کیلوں کے خالی سوراخ تھے اور جگہ جگہ پلاسٹر اکھڑ گیا تھا۔فرش پر رنگین چیتھڑے اور چمکیلے کاغذ کے ٹکڑے ادھر ادھر پڑے تھے، دواؤں کی گولیوں کی خالی ڈبیاں اور عطر کی خالی شیشیاں اور ان سب کے درمیان ایک پیتل کی ہیر پن پڑی چمک رہی تھی۔

میرا دل غم سے بیٹھ گیا۔ دل چاہتا تھا ایک با۔ چاہے صرف ایک ہی بار۔ وہ کٹر ماسٹر کی بیوی مجھ کو مل جائے اور میں اس سے یہ کہہ سکوں: دیکھو، میں تمہارا کتنا شکر گزار ہوں...

کٹر ماسٹر اور اس کی بیوی کے جانے سے پہلے ہی ہمارے نیچے کا فلیٹ بھر گیا تھا۔ اس میں سیاہ آنکھوں والی نوجوان عورت اور اس کی چھوٹی سی لڑکی اور اس کی ماں آ کر بس گئی تھیں۔ یہ بڑھیا جس کے سارے بال سفید تھے ہر وقت سگریٹ پیا کرتی جو یاقوتی ہولڈر میں لگا ہوتا تھا۔ نوجوان عورت بڑی خوبصورت، مضبوط اور مغرور تھی، آواز بھاری اور دلکش تھی۔ لوگوں سے بولتے وقت کچھ اس ادا سے سر پیچھے کو جھٹکاتی اور آنکھیں سکیڑتی تھی کہ معلوم ہوتا جیسے لوگ بہت دور ہیں اور اس کو ٹھیک سے نظر نہیں آ رہے ہیں۔ تقریباً روز ہی اس کا کالا فوجی نوکر تیوفیائف ایک بھورے گھوڑے کو اس کے فلیٹ کی برساتی کے برابر لا کر کھڑا کرتا۔ اس گھوڑے کی ٹانگیں پتلی پتلی تھیں۔ پھر وہ نوجوان عورت نکلتی، سرمئی رنگ کا لبادہ اوڑھے، ہاتھوں پر سفید لمبے دستانے چڑھائے، بھورے جوتے پہنے۔ دامن سنبھالتی، جواہرات جڑی ہوئی چابک ایک ہاتھ میں لئے، دوسرے ہاتھ سے گھوڑے کے نتھنوں کو پیار سے تھپتھپاتی۔ گھوڑا دانت نکالتا، روشن آنکھیں گھماتا اور آہستہ آہستہ زمین پر ٹاپ مارتا۔ گھوڑے کا سارا جسم اشتیاق سے کانپنے لگتا۔

عورت اس کی خوبصورت خمیدہ گردن کو تھپتھپاتی ہوئی آہستہ آہستہ بدبداتی جاتی ''رابی، رابی۔''

پھر وہ تیوفیائف کے گھٹنے پر پاؤں رکھتی اور بڑی چستی سے اچک کر زین پر بیٹھ جاتی اور گھوڑا بڑے غرور سے پشتے پر دوڑنے لگتا۔ وہ گھوڑے پر بڑے وقار اور چستی سے جم جاتی۔ لگتا جیسے اس کا جسم زین سے چپکا ہوا ہو۔

وہ خوبصورت تھی۔ اس کا حسن تھا جو ہمیشہ انوکھا اور ملکوتی دکھائی دیتا ہے۔ اس کا حسن دیکھ کر ہمیشہ دل نشاط و نور سے بھر جاتا تھا۔ جب میں اس کو دیکھتا تو سوچتا کہ ڈیانا ڈی پواتئے، ملکہ مارگٹ، لا والیئر اور تاریخی ناولوں کی دوسری سحر کار ہیروئین بھی ایسی ہی رہی ہوں گی۔

ہمارے شہر میں فوجیوں کا جو دستہ رہتا تھا، اس کے افسران ہمیشہ اس عورت کے چاروں طرف اکٹھے رہتے تھے۔ شام کے وقت وہ لوگ اس کے گھر آتے، پیانو بجاتے، وائلن اور چھتارا بجاتے، ناچتے گاتے۔ میجر اولیسوف تو اپنی ننھی ننھی ٹانگوں پر اس کے سامنے ایسا ایسا تھرکتے کہ سب ہی سے بازی لے جاتے۔ وہ موٹے سے آدمی تھے، بال سفید تھے اور جسم میں ایک عجیب سی چپچپاہٹ محسوس ہوتی تھی، چہرہ

سرخ رہتا تھا۔ وہ چھتارا خوب بجاتے تھے اور ان کا رویہ کچھ ایسا رہتا تھا جیسے اس نوجوان عورت کے خاکسار، فرمانبردار، فدوی قسم کے غلام ہوں۔

اس عورت کی گولگوتھنا، گھنگریالے بالوں والی لڑکی جو پانچ سال کی تھی، وہ بھی اتنی ہی خوبصورت تھی کہ نگاہیں خیرہ ہوتی تھیں۔ اس کی بڑی بڑی نیلی آنکھوں کی نظروں میں سکون اور سنجیدگی اور امید کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں اور اس کے چہرے سے ایک غیر طفلانہ سی سنجیدگی پھوٹتی رہتی تھی۔

صبح تڑکے سے لیکر شام تک نانی گھر کے کام میں مصروف رہتی تھیں۔ ان کی مدد کرنے کے لئے تیوفیائف تھا جو خاموش اور ناک بچی کے لئے الگ کوئی کھلائی نہیں تھی اور وہ یوں ہی تقریباً بغیر کسی نگرانی کے پل رہی تھی۔ سارے سارے دن وہ برساتی میں یا سامنے پڑے ہوئے لکڑیوں کے انبار پر کھیلتی رہتی۔ شام کو میں اکثر باہر جا کر اس کے کھیلا کرتا۔ مجھے اس سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ وہ بھی مجھ سے جلد ہی مانوس ہو گئی تھی، اور میں جب اسے پریوں کی کہانی تو وہ سنتے سنتے میری گود میں سو جاتی۔ جب وہ سو جاتی تو میں اس کو اٹھا کر پلنگ پر لٹا آتا۔ پھر معاملہ یہاں تک بڑھا کہ اگر میں اس کو رات کو خدا حافظ کہنے نہ آتا تو وہ سونے ہی سے انکار کر دیتی تھی۔ جب میں اس کے کمرے میں داخل ہوتا وہ ایک گولگوتھنا ہاتھ بڑی شان سے اٹھاتی اور کہتی:

''اچھا خدا حافظ۔ اب کل ملیں گے۔ نانی اماں اسی طرح کہتے ہیں نا؟''

''خدا تمہارا نگہبان!'' نانی اماں نکیلی ناک اور منہ سے دھوئیں کی پتلی پتلی دھاریں چھوڑتی ہوئی کہتیں۔

''اچھا اب خدا کل تک تمہارا نگہبان ہو۔ اب ہم سوتے ہیں'، ننھی کہتی اور اپنے جھالر لگے ہوئے لحاف میں گھس جاتی۔

''صرف کل تک کے لئے نہیں۔ ہمیشہ خدا نگہبان رہے!'' اس کی نانی اماں صحیح کرتیں۔

''تو کل تو ہمیشہ ہی ہوتا ہے۔''

اس کو لفظ ''کل'' سے بڑی محبت تھی اور جو چیز بھی اس کو پسند آتی، اسے مستقبل تک پہونچا دیتی تھی۔ زمین میں پھولوں کا ایک گچا یا ٹہنیاں لگا دیتی اور کہتی:

''کل یہاں باغ ہو جائے گا...''

''کبھی نہ کبھی کل ہم گھوڑا خریدیں گے اور امی کی طرح سواری کرنے جایا کریں گے...''

وہ ذہین تھی لیکن اس میں چنچل پن زیادہ نہ تھا۔ اکثر کھیلتے کھیلتے بیچ میں رک جاتی، سوچنے لگتی اور پھر اچانک پوچھ بیٹھتی:

''یہ پادریوں کے بال عورتوں کی طرح کیوں ہوتے ہیں؟''

ایک دن اس کی انگلیوں میں تیز دھار والی گھاس چبھ گئی تو اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولی:

''خبردار، میں خدا سے دعا مانگوں گی۔ وہ تمہیں سزا دے گا! وہ سب کو سزا دے سکتا ہے۔ امی کو بھی...''

بعض وقت اس پر ایک خاموش اداسی سی چھا جاتی۔ میرے قریب گھس کر بیٹھتی اپنی بڑی بڑی نیلی اور امید بھری آنکھیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتی اور کہتی:

''نانی اماں کبھی کبھی خفا ہوتی ہیں، مگر امی کبھی خفا نہیں ہوتیں۔ وہ ہمیشہ ہنستی رہتی ہیں۔ امی سے ہر کوئی پیار کرتا ہے کیونکہ امی کو وقت ہی نہیں ملتا... سب لوگ انہیں سے ملنے آتے ہیں اور ان ہی کو دیکھتے رہتے ہیں کیونکہ وہ خوبصورت ہیں نا۔ امی بہت اچھی ہیں، اسی لئے تو اولیسوف کہتے ہیں: بڑی اچھی امی ہیں۔''

میں اس بچی کی باتیں سن کر خوش ہوتا تھا کیونکہ وہ ایک ایسی دنیا کی باتیں تھیں جو مجھے کبھی نصیب ہی نہ ہوئی تھیں۔ وہ بڑے شوق سے اپنی امی کی باتیں خوب کرتی تھی اور اس طرح میرے ذہن میں ایک نئی زندگی کے دروازے کھل گئے تھے جس سے مجھے ملکہ مارگٹ کی کہانی یاد آتی تھی۔ اس بات سے کتابوں پر میرا بھروسہ اور بھی مضبوط ہو گیا، زندگی سے دلچسپی اور بڑھ گئی۔

ایک شام میں بچی کو لئے برساتی میں بیٹھا تھا، وہ میری گود میں سو رہی تھی۔ میں اپنے مالکوں کا انتظار کر رہا تھا جو والگا کے کنارے سیر کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں اس بچے کی ماں گھوڑے پر سوار پہنچی، زین سے بڑے چستی سے اتری اور سر پیچھے کو جھٹکتی ہوئی بولی:

''کیا سو گئی؟''

''جی ہاں۔''

''اچھا...''

پھر تیوفیا ئف سپاہی دوڑتا ہوا آیا اور گھوڑے کو لے گیا۔ عورت نے اپنے چابک پیٹی میں کھونسی اور اپنے ہاتھ بڑھائے ''لاؤ۔ مجھے دے دو اسے!''

''میں ہی خود پہنچا دوں!''

''اوں؟!'' وہ چیخی اور زور سے پیر پٹخے جیسے میں بھی اسی کا گھوڑا تھا۔ بچی جاگ گئی، آنکھیں جھپکاتی ہوئی ماں کی طرف ہاتھ بڑھادئے۔ دونوں اندر چلی گئیں۔

ویسے مجھے اس بات کی عادت تھی کہ مجھے پر لوگ چیخیں لیکن یہ دیکھ کر کہ یہ عورت بھی اس طرح چیختی ہے، مجھے بہت کوفت ہوئی۔ لوگ اس کی بات مان ہی لیتے چاہے اس نے یہ بات کتنے ہی مدھم لہجے میں کہی ہو۔

چند منٹ بعد بھینگی نوکرانی مجھے بلانے پہنچی کیونکہ بچی ضد کر رہی تھی کہ مجھے خدا حافظ کہے بغیر وہ سوئے گی ہی نہیں۔

میں ذرا فخریہ انداز میں ڈرائینگ روم میں داخل ہوا، جہاں وہ حسینہ اپنی بچی کو گود میں لئے پھرتی اور نرمی سے اس کے کپڑے تبدیل کر رہی تھی۔

''لو یہ آ گیا۔ یہ آ گیا تمہارا جنگلی۔''

''یہ جنگلی نہیں ہے۔ یہ میرا دوست ہے۔''

''اچھا؟ بہت خوب! آؤ تمہارے دوست کو کوئی تحفہ دیں؟ ہیں؟ دیں؟''

''ہاں ہاں۔ ضرور دیں!''

''اچھی بات ہے۔ تم جاؤ سوؤ۔ میں اسے کوئی چیز دیتی ہوں۔''

ننھی بچی نے اپنے ہاتھ بڑھایا؛

''کل تک کے لئے خدا حافظ۔ اور کل تک کے لئے خدا تمہارا نگہبان ہو...''

اس کی امی حیران ہو کر بولیں:

''یہ تمہیں کس نے سکھایا۔ نانی اماں نے؟''

''جب بچی چلی گئی تو عورت نے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

''کہو بھئی، تمہیں کیا دیں؟''

میں نے جواب دیا کہ مجھے اور تو کچھ نہیں چاہئے تھا۔مگر شاید وہ م جھے کوئی کتاب دے سکینگی ؟ پڑھنے کے لئے۔

اس نے اپنی نرم گرم مہکتی ہوئی انگلیوں سے میری ٹھنڈی اٹھائی اور بڑی دلکشی سے مسکرا کر کہا:

''اچھا! تو تمہیں پڑھنے کا شوق ہے؟ کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں تم نے؟''

جب وہ مسکراتی تھی تو اور بھی زیادہ پیاری لگتی تھی۔گھبراہٹ میں میں نے یوں ہی دو چار ناولوں کے نام لے دئے۔

''ان میں تمہیں کیا بات اچھی لگی؟'' اس نے میز پر ہاتھ رکھے دھیرے دھیرے انگلیاں ہلاتے ہوئے کہا۔

اس میں سے پھولوں کی تیز اور لطیف خوشبو پھوٹ رہی تھی۔اور ساتھ ہی گھوڑے کے پسینے کی بو اس خوشبو میں ایک عجیب طریقے سے گھل مل گئی تھی۔اس نے اپنی لمبی لمبی پلکوں کے نیچے سے مجھے غور سے دیکھا۔ایک عجیب طریقے سے، کچھ سوچتے ہوئے۔اس طرح میری طرف کبھی کسی نے نہ دیکھا تھا۔

کمرے میں نہایت خوب صورت اور نازک فرنیچر اس قدر زیادہ بھرا تھا کہ کمرہ چڑیا کے گھونسلے کی طرح ننھا سا لگتا تھا۔کھڑکیاں بیلوں اور پودوں کی موجودگی سے چھپ گئی تھی۔دونوں وقت ملنے کی سرخی تندور کے برف جیسے سفید پتھر کی سلوں پر پڑ رہی تھی۔تندور کے پاس ہی ایک چمکدار سیاہ رکھا تھا۔پرانے پرانے فرمان جن پر پرانے سلاف خط میں کچھ لکھا تھا، گلٹ کے فریموں میں لگے ہوئے دیواروں سے ٹنگے تھے اور ان میں سے ہر ایک سے ڈوری لٹک رہی تھی۔ڈوری کے آخر میں ایک بڑی سی مہر تھی۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب چیزیں بھی اسی احترام اور عاجزی سے اس خاتون کو تک رہی تھیں جس احترام سے میں تک رہا تھا۔

مجھ سے جس طرح بھی ہو سکا میں نے اس کا بتایا کہ زندگی بڑی مشکل تھی، اس میں بڑی یکسانیت اور اکتاہٹ تھی لیکن کتاب پڑھتے وقت انسان تھوڑی دیر کو یہ سب بھول جاتا ہے۔

''اچھا! یہ بات ہے!'' وہ اٹھتے ہوئے زور سے بولی۔''اچھی بات کہتے ہو۔اور، اور میرا خیال ہے صحیح بھی کہتے ہو...لیکن کیا کیا جائے؟ میں تو تمہیں بڑی خوشی سے کتابیں دیتی لیکن اس وقت کوئی کتابیں ہیں ہی نہیں...مگر...اچھا، دیکھو یہ لے جا سکتے ہو تم...''

اس نے کوچ پر پڑی ہوئی ایک پرانی سی کتاب اٹھائی جس کی زرد رنگ کی جلد تھی۔

''اس کو ختم کر لو گے تو دوسری جلد لے جانا۔ اس کی چار جلدیں ہیں...''

میں شہزادہ میشچیرسکی کی لکھی ہوئی ''اسرار سینٹ پیٹرسبرگ'' لے کر نکل آیا اور اسے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیا۔ لیکن جلدی ہی یہ ظاہر ہو گیا کہ سینٹ پیٹرسبرگ کے اسرار تو میڈرڈ یا لندن یا پیرس کے اسرار سے بھی زیادہ بور تھے۔ کتاب میں جو ایک بات مجھے پسند آئی، وہ ''عصا اور آزادی'' کی کہانی تھی۔

آزادی نے کہا ''میں تم سے اچھی ہوں کیونکہ میں تم سے زیادہ عقلمند ہوں۔''

عصا نے جواب دیا:

''نہیں میں تم سے زیادہ اچھا ہوں کیونکہ میں تم سے زیادہ مضبوط ہوں۔''

ان دونوں نے کچھ دیر بحث کی، پھر جھگڑنا شروع کر دیا۔ عصا نے آزادی کی خوب کندی کی اور۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ آزادی ہسپتال میں جا کر مر گئی۔

اس کتاب میں ایک کردار ایسا تھا جو ہر چیز سے انکار کرتا تھا۔ اور مجھے یاد ہے کہ شہزادے میشچیرسکی کے بیان کے مطابق 'منکر' ایک ایسا خطرناک شخص ہوتا تھا جو اگر کسی مرغ کی طرف ایک نظر دیکھ لیتا تھا تو وہ وہیں مر کر گر پڑتا تھا۔ اس سے میری سمجھ میں صرف یہ آیا کہ منکر نہایت ہی ہتک آمیز اور غیر شریفانہ لفظ ہے، لیکن اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں سمجھا۔ اور اس بات سے مجھے کافی کوفت رہی کہ میری سمجھ میں اور کچھ نہیں آیا۔ کیونکہ ظاہر تھا کہ اتنی کم علمی کی صورت میں اچھی کتابوں کو کیا سمجھ سکتا تھا! اور یہ شک میرے دل میں ایک لمحے کو بھی نہیں پیدا ہوا کہ ممکن ہے کہ یہ کتاب ہی اچھی نہ ہو۔ ایسی خوبصورت اور معزز خاتون بری کتاب کب پڑھ سکتی تھی!

جب میں نے میشچیرسکی کا یہ ناول واپس کیا تو اس نے پوچھا:

''اچھی لگی تمہیں یہ کتاب؟''

میرے لئے یہ قبول کرنا مشکل تھا کہ اچھی نہیں لگی کیونکہ میں کسی حالت میں بھی اس کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔

لیکن وہ صرف ہنس پڑی اور ایک دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی جو خواب گاہ کو جاتا تھا، جس سے وہ فوراً ہی نکلی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کتاب تھی جس کی نیلی چمڑے کی جلد تھی۔

''لو۔اس کتاب کے پڑھنے میں تمہیں لطف آئے گا۔دیکھو میلی مت کرنا!''

یہ کتاب پوشکن کی نظموں کا مجموعہ تھی۔ میں اس ایک ہی سانس میں پڑھ گیا، میرے دل میں وہ پیاس اور تڑپ تھی کہ کیا بتاؤں۔ جیسے انسان ان دیکھے حسین اور پرفضا مقام پر پہنچ گیا ہو اور اس کا دل چاہتا ہو کہ ایک ہی جنبش میں سارے حسن ورعنائی کو اپنی نگاہوں میں بسا لے۔ جیسے دلدل سے نکل کر کوئی ایسی وادی میں پہنچ جائے جہاں دھوپ چمک رہی ہو اور پھول رنگ و رعنائی بکھیر رہے ہوں، جہاں انسان ایک منٹ تو بالکل مسحور ہو کر رہ جائے، اور پھر اس کنارے سے اس کنارے بھاگتا پھرے اور جب اس کے قدم سبزہ پر پڑیں تو ہر بار ایک نئی مسرت کا احساس ہو۔

میں پوشکن کے اشعار کی سادگی اور نغمگی پر اس قدر حیران رہ گیا کہ اس کے بعد بہت عرصے تک نثر میرے لئے بالکل غیر فطری اور بے معنی سی چیز بن کر رہ گئی اور مجھے نثر پڑھنے سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ پوشکن کی نظم ''روسلان اور لودمیلا'' کی تمہید میں نانی اماں کی بہترین کہانیوں کا سا جو ہر لطیف تھا۔ اور بعض اشعار کے کمال حسن سے تو میں ششدر رہ گیا۔

''انجانے راستوں پر
انجانے درندوں کے قدموں کے نشان''

جب میں نے ان حیرت انگیز مصرعوں کو پڑھا اور دوہرا رہا تھا تو میرے تصور میں وہ تمام دھندلے راستے آئے، جن سے میں اس قدر اچھی طرح واقف تھا، اور وہ پراسرار نشان جو سبزہ پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس سبزہ پر شبنم ابھی تک پارے کی طرح دمک رہی تھی۔ بھرپور غنائیت رکھنے والے اشعار بڑی آسانی سے ذہن نشین ہو جاتے تھے، بیان کیا تھا ایک جادو تھا۔ میں ان کو پڑھ کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا۔ اور میری زندگی ان کو پڑھنے کے بعد خوشگوار اور آسان تر معلوم ہوتی تھی۔ بلاشبہ یہ اشعار ایک نئی زندگی کے پیغامبر تھے۔ آہ پڑھنا بھی کس قدر مسرت بخش صلاحیت ہے!

پوشکن کے سحر انگیز اشعار میں جو داستانیں لکھی ہیں وہ اس کی اور تخلیقات کے مقابلے میں میرے دل اور شعور سے زیادہ نزدیک تھیں۔ بار بار پڑھ کر میں نے ان کو زبانی یاد کر لیا۔ پھر جب بھی میں سونے لیٹتا تو آنکھیں بند کئے منہ ہی منہ میں شعر دھراتا رہتا یہاں تک کہ نیند آجاتی۔ کبھی کبھی میں افسروں کے ملازمین کو بھی وہ اشعار ترنم سے سناتا۔ وہ لوگ حیران رہ جاتے اور ہنس ہنس کر اور بڑی محبت سے گالیاں

بکتے جاتے۔ سید وروف میرے سر پر ہاتھ پھیرتا اور کہتا:

''اف کس قدر اچھے ہیں یہ اشعار!'' میرے مالکوں کو بھی پتہ چل گیا کہ آج کل مجھ پر یہ وجدانی کیفیت طاری ہے۔ بڑھیا نے اپنی پھٹکار شروع کی:

''یہ تو اپنے پڑھنے میں ایسا مست ہے کہ چار دن ہو گئے ہیں اور سماوار کے مانجھنے کی نوبت ہی نہیں آئی، اٹھائی گیرا۔ چکھاؤں بیلن کا مزا...'' لیکن بیلن میرے آگے کیا حقیقت رکھتا تھا۔ اب تو میرے پاس اپنا بچاؤ کرنے کے لئے اشعار تھے:

''اور وہ کھوسٹ چڑیل جس کا دل سیاہ تھا!''

اس حسین عورت کی عزت میری نظروں میں اور بھی بڑھ گئی۔ تو وہ اس قسم کی کتابیں پڑھتی تھی! وہ کوئی آپ کی کٹر ماسٹر کی بیوی کی طرح چینی کی گڑیا نہیں تھی...

جب میں نے کتاب لے جا کر اس کو بادل ناخواستہ واپس کی تو اس نے بڑے یقین کے ساتھ کہا:

''تمہیں یہ کتاب پسند آئی۔ تم نے کبھی پوشکن کے متعلق سنا بھی ہے؟''

میں نے کہا کہ نہیں کیونکہ اگرچہ میں نے کسی رسالے میں اس شاعر کا ذکر پڑھا تھا لیکن میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ خود کیا کہتی ہے۔

جب وہ مجھ سے پوشکن کی زندگی اور موت کا مختصر حال بتا چکی تو اس نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا:

''کیوں، دیکھا تم نے عورت کا عشق کس قدر خطرناک چیز ہے؟''

اس کی مسکراہٹ موسم بہار کے روز روشن کی طرح تاب ناک تھی۔

جتنی کتابیں میں نے پڑھی تھیں ان سب کے مطابق بھی یہ چیز خطرناک تھی۔ لیکن خوب تھی۔ چنانچہ میں نے جواب دیا:

''ہاں خطرناک تو ہے مگر محبت تو سب ہی کرتے ہیں!

آخر عورت بھی تو دکھ اٹھاتی ہے...''

اس نے اپنی جھکی ہوئی پلکوں سے ایک دزدیدہ نظر مجھ پر ڈالی۔ اسی طرح سے وہ ہر چیز کی طرف دیکھتی تھی۔ پھر بڑی سنجیدگی سے بولی:

''سچ مچ؟ کیا تم اس بات کے معنی بھی سمجھتے ہو؟ اگر سمجھتے ہو تو میں چاہتی ہوں۔ ان کو کبھی مت

بھولنا!''

پھر وہ مجھ سے پوچھنے لگی کہ کون کون سی نظمیں مجھے خاص طور پر پسند آئی تھیں۔

میں سمجھاتے ہوئے بیان کرنے لگا اور خوب ہاتھ ہلا ہلا کر کے نظموں کو دھرانے لگا۔ وہ سنجیدہ خاموشی کے ساتھ سنتی رہی اور پھر اٹھ کر ٹہلنے لگی اور سوچتے ہوئے بولی:

''ارے میرے بندر، تجھے تو اسکول جانا چاہئے! میں اس مسئلے پر غور کروں گی۔ یہ جن لوگوں کے یہاں تم کام کرتے ہو یہ تمہارے کچھ رشتے میں بھی لگتے ہیں؟''

جب میں نے جواب دیا کہ ہاں لگتے ہیں تو ایک دم سے بولی:

''ہوں!''۔ گویا یہ میرا قصور تھا۔

پھر اس نے مجھے برانژے کی نظموں کا شاندار باتصویر مجموعہ دیا۔ اس کی جلد سرخ چمڑے کی تھی اور اوراق کے کناروں پر سونے کا پانی پھرا ہوا۔ ان نظموں میں طنزیہ تلخی اور بے پناہ مزاح کا کچھ ایسا میل تھا کہ مجھ پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ جب میں نے اس کی نظم ''بڈھا بھکاری'' پڑی تو ان تلخ الفاظ کے اثر سے خون جمنے لگا:

اے بھلے آدمیو! مجھے قدموں تلے کچل کیوں نہیں دیتے،
ذلیل کیڑے کی طرح مجھے پیس کیوں نہیں دیتے،
آہ! کاش مجھے انسان کی بہتری کے لئے،
انسان کے فائدے کے لئے محنت کرنا سکھا دیتے،
یہ کیڑے چیونٹی کی طرح کارآمد کرنا سکھا دیتے،
ہم بھائیوں کی طرح تم سے محبت کرتے،
آہ! اب ایک آوارہ گرد اٹھائی گیرا ہو کر،
ہم تمہارے دشمن بن کر مر رہے ہیں!

اور اس کے فوراً ہی بعد مجھے اس کی نظم ''روتے خاوند'' پر اتنی ہنسی آئی کہ آنکھوں میں پانی آ گیا۔ خاص طور پر برانژے کا یہ کہنا میرے ذہن پر نقش ہو گیا:

سیدھی سادی روحوں کے لئے کیا مشکل ہے،

ہنسنے اور جینے کا فن سیکھ لینا!

برانژے کو پڑھکر میری طبیعت میں بڑی چونچال آ گئی، شرارت کرنے کو جی چاہنے لگا تھا اور خواہش ہوتی تھی کہ تمام لوگوں پر تیز اور زہریلے فقرے چست کروں! اور جلد ہی میں نے اس فن میں مہارت حاصل کرلی۔

میں نے برانژے کی نظموں کی یاد کرلی تھیں، اور جب کبھی افسروں کے ملازمین کے یہاں باورچی خانے میں پہونچنے کا موقع مل جاتا تو ان کو بڑے جوش وخروش سے دھرا دیا کرتا تھا۔ لیکن جلدہ مجھے یہ چھوڑنا پڑا کیونکہ ایک بار میں نے یہ شعر پڑھ دیا:

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن

بس اس پر عورتوں کے متعلق ایک نہایت بیہودہ سی بحث چل نکلی۔ مجھے اپنی سخت ہتک محسوس ہوئی چنانچہ میں نے غصے میں ایرموخین کے سر پر ایک کڑاھی کھینچ ماری۔ پھر سیدوروف نے اور دوسرے ملازمین نے مل کر مجھے اس کے ریچھ کے سے پنجوں سے نجات دلائی۔ اس کے بعد پھر کبھی میری ہمت نہ ہوئی کہ افسروں کے باورچی خانے کی طرف جاؤں۔

مجھے باہر سیر کرنے جانے کی اجازت بھی نہ تھی، ویسے یہ بھی واقعہ تھا کہ مجھے سیر کرنے کی فرصت بھی نہیں ملتی تھی۔ کام بڑھ گیا تھا کیونکہ نوکرانی کا کام، چوکیدار کے کام اور اوپر کے کام کے علاوہ میرے سپرد یہ کام بھی کر دیا گیا تھا کہ ایک بڑی سی فریم میں کیلوں سے کپڑا اجڑوں، ان پر سب نقشے چپکاؤں، جو کچھ وہ عمارتوں کے اندازاً کے بل وغیرہ کی جانچ پڑتال کروں۔ میرے مالک مشین کی طرح صبح سے شام تک کام میں جتے رہتے تھے۔

اس زمانے میں میلے والے میدان کی سب پبلک عمارتیں چند سوداگروں نے خرید لیں۔ دوکانوں کی قطاریں جلدی جلدی پھر سے بنائی جانے لگیں۔ میرے مالک نے بھی پرانی دوکانوں کی مرمت اور نئی دوکانیں بنانے کا ٹھیکہ لیا۔ انہوں نے نقشے بنائے کہ سیدھے ستون کیسے بنیں گے اور چھجے کیسے بنیں گے وغیرہ وغیرہ۔ میں ان نقشوں کے ایک لفافے کے ساتھ لے کر ایک بڑھے معمار کے ہاں جاتا، اس لفافے میں پچیس روبل کا نوٹ ہوتا تھا۔ معمار صاحب نوٹ لے کر نقشوں پر لکھتے تھے: ’’نقشوں کو اصل عمارت کے ساتھ مقابلہ کر کے جانچ کر لی گئی ہے، تمام کام دستخط کنندہ ہذا کی ذاتی نگرانی میں پورا کیا گیا ہے‘‘۔

ظاہر ہے کہ اصلی عمارت سے مقابلہ کر کے کوئی جانچ نہیں کی جاتی تھی اور وہ حضرت خود بھی عمارت کے بننے کی ذاتی نگرانی کرنے کی لائق نہ تھے کیونکہ ان کی صحت اتنی خراب تھی کہ گھر سے باہر ہی نہیں نکل پاتے تھے۔

اس طرح میں میلے کے انسپکٹر کے یہاں بھی، ضروری لوگوں کے یہاں بھی قسم قسم کی رشوتیں لے کر بھیجا جاتا تھا اور بقول میرے مالک کے ان لوگوں سے ''قانون شکنی کے مختلف پرمٹ'' لاتا تھا۔ ان سب کاموں کے انعام میں مجھے یہ رعایت دی گئی تھی کہ جب میرے مالک لوگ ملنے ملانے باہر جائیں تو میں شام کو احاطے میں بیٹھ کر انکا انتظار کروں۔ ایسے موقعے شاذ و نادر ہی آتے تھے لیکن جب ایسا موقع آ پڑتا تھا وہ لوگ آدھی رات تک کہیں لوٹتے تھے اور مجھے کوئی گھنٹوں کی فرصت مل جاتی تھی۔ فرصت کے ان گھنٹوں میں میں یا تو برساتی میں بیٹھتا یا باہر اس کے سامنے لکڑیوں کے ڈھیر پر، اور وہاں سے ان حسین خاتون کے گھر کی کھڑکیوں سے اندر دیکھتا رہتا اور وہ رنگیلی موسیقی اور گفتگو سنتا جو ان کے یہاں برابر جاری رہتی تھی۔

کھڑکیاں کھلی رہتی تھیں۔ پودوں اور پھولوں کے پردے میں سے مجھے افسروں کے چست جسم نظر آتے جو کمروں میں ادھر ادھر گھومتے رہتے تھے اور وہ گول ڈبل روٹی میجر بیگم صاحبہ کی دم کے پیچھے لگا نظر آتا۔ وہ خاتون ہمیشہ حیرت انگیز طور پر سادے اور خوبصورت کپڑے پہنے ہوا میں تیرتی نظر آتی تھیں۔

میں اپنے جی ہی جی میں اس کو ملکہ مارگٹ کہا کرتا۔ اور کھڑکیاں سے دیکھ دیکھ کر سوچتا: ''تو یہ ہے وہ رنگین زندگی جسکی عکاسی فرانسیسی ناولوں میں کی گئی ہے۔'' اور میں اکثر اداس ہو جاتا۔ میرا طفلانہ رشک ابھر پڑتا کہ یہ مرد ملکہ مارگٹ کے چاروں طرف یوں منڈلا رہے ہیں جیسے پھول پر شہد کی مکھیاں۔

ان میں ایک افسر تھا۔ لمبا قد، سنجیدہ صورت، ماتھے پر زخم کا نشان، گہری آنکھیں۔ یہ اوروں کی بہ نسبت کم آتا تھا اور جب آتا تو اپنا وائلن ساتھ لاتا جیسے وہ خوب بجاتا تھا۔ اس قدر اچھی طرح بجاتا تھا کہ وہ راہ چلتے رک کر سننے لگتے، ہماری گلی سے لوگ آ آ کر لکڑیوں کے ڈھیر پر بیٹھ جاتے اور سنا کرتے، یہاں تک کہ میرے مالک اگر گھر پر ہوتے تو وہ بھی اپنی کھڑکیاں کھول دیتے تھے، موسیقی سنتے اور وائلن نواز کی تعریفیں کرتے۔ یہ بہت بڑی بات تھی کیونکہ مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے گرجے کے پادری صاحب کے علاوہ کبھی کسی کی تعریف کی ہو۔ اور جہاں تک ذوق کا سوال ہے مجھے معلوم تھا کہ ان کو اس موسیقی سے کیا

کسی بھی موسیقی کے مقابلے میں مچھلی کا سموسہ زیادہ پسند آتا۔

بعض اوقات وہ افسر گاتا یا ترنم سے شعر پڑھتا۔ اس کی آواز میں بڑا درد تھا، پڑھتے وقت لمبی آہیں کھینچتا اور ماتھے کو ہاتھوں پر ٹیک لیتا۔ ایک دن جب میں کھڑکی کے نیچے ننھی بچی سے کھیل رہا تھا، ملکہ مارگٹ نے اس سے گانے کی فرمائش کی۔ پہلے تو وہ انکار کرتا رہا اور پھر بڑی سنجیدگی اور یقین کے ساتھ بولا:

نغمے کو حسن کی ضرورت ہے
پر حسن کو نغمے کی کیا احتیاج...

مجھے یہ مصرعے پسند آئے اور نہ جانے کیوں مجھے اس افسر پر ترس آنے لگا۔

جب میں خاتون پیانو پر بیٹھتی اور کمرے میں کوئی اور نہ ہوتا تو اس وقت مجھے اس کو دیکھنے کا سب سے زیادہ اشتیاق ہوتا تھا۔ موسیقی سے مجھ پر خمار سا چھا جاتا تھا۔ اور پھر تو مجھے اس کھڑکی کے سوا کچھ نہیں سوجھتا تھا، جس کے آگے اس عورت کا لچک دار جسم ہوتا تھا جو لیمپ کی زرد روشنی میں تصویر سا نظر آتا تھا، اس کی ناز آفریں صورت، وہ ترچھا رخ اور وہ اس کے دست سیمیں جو پرندوں کی طرح پیانو کے پردے پر پھڑ پھڑاتے ہوتے۔

میں اسے دیکھتا رہتا، اداس سنگیت کو سنتا رہتا اور ذہن میں عجیب وغریب خوابوں کے تانے بانے بنتا جاتا: کسی دن مجھے کوئی مدفون خزانہ مل جائے تو سب اس کو دے دوں، پھر وہ خوب ٹھاٹ سے رہے! اگر میں جنرل اسکوبیلیف ہوتا تو پھر ترکوں پر حملہ کر دیتا اور ان محل تعمیر کرواتا۔ بس کسی طرح اس مکان سے اٹھ جائے، وہ اس گلی سے چلی جائے، جہاں ہر شخص اس کے متعلق بیہودہ گندی افواہیں پھیلا رہتا ہے۔

ہمارے عمارت میں تمام پڑوس والے، تمام ملازم اور تمام کرایہ دار۔ خاص کر میرے مالک۔ اتنے کمینے پن کے ساتھ ملکہ مارگٹ کا ذکر کرتے تھے جیسے وہ کٹر ماسٹر کی بیوی کا کیا کرتے تھے۔ ہاں اس کا ذکر ذرا احتیاط سے، دبی زبان، آنکھ بچا کر کرتے تھے۔

شاید اس سے ڈرتے رہے ہوں کیونکہ وہ ایک بہت بڑے آدمی کی بیوہ تھی۔ سپاہی تیوفیائف نے مجھے ایک بار بتایا تھا (اور وہ پڑھا لکھا تھا، بائبل پڑھا کرتا تھا) کہ ان کے یہاں دیواروں پر جو فریم کئے ہوئے فرمان ٹنگے ہوئے تھے، وہ پرانے روسی زاروں کے فرمان تھے جو اس کے شوہر کے اجداد کو مختلف

موقعوں پر دئے گئے تھے۔ان دینے والوں میں زار گودونوف،الیکسئی اور پیٹر اعظم بھی تھے۔شاید لوگوں کو خوف لگتا تھا کہ وہ انہیں اپنی جواہرات جڑی ہوئی چابک رسید کرنا شروع کردے گی۔مشہور بھی تھا کہ ایک بار اس نے اسی چابک سے ایک کافی بڑے افسر کی خبر لی تھی۔

لیکن یہ پھس پھس بھی آواز بلند سے کچھ کم بیہودہ نہ تھی۔میری خاتون ایک ایسے مخالفت کے بادل میں گھری ہوئی تھی جو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا اور جس سے مجھے سخت تکلیف بھی تھی۔مثلاً وکٹر نے ایک دن کہا کہ وہ آدھی رات کے بعد گھر واپس آرہا تھا تو اس نے ملکہ مارگٹ کی خواب گاہ میں جھانک کر دیکھا اور وہ وہاں صوفے پر صرف رات کا لباس پہنے بیٹھی تھی اور میجر اس کے سامنے دوزانو جھکا ہوا اس کے پاؤں کے ناخن تراش رہا تھا اور اسفنج سے انگلیاں صاف کر رہا تھا۔

بڑھیا مالکن نے زور سے تھوکا اور اس کو ڈانٹنا شروع کیا۔چھوٹی مالکن سرخ ہوگئی اور چیخی:

''توبہ ہے وکٹر!شرم نہیں آتی تجھے!ارے یہ شریف لوگ اور حرکتیں ایسی کمین!''

میرے مالک مسکرا کر چپ ہو رہے،میں دل میں ان کا مشکور ہوا کہ وہ چپ ہی رہے حالانکہ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اس کواگہار میں وہ بھی نہ اپنی آواز شامل کردیں۔عورتوں نے ہائے وائے کر کر کے وکٹر سے سب تفصیلیں پوچھیں۔کہ وہ عورت کس طرح بیٹھی تھی اور میجر کیسے جھکا ہوا تھا۔اور وکٹر چن چن کر ان کونوالے پھینکتا رہا:

''میجر کا منہ بالکل لال ہو رہا تھا اور اس کی زبان لٹکی ہوئی تھی...''

مجھے اس میں کوئی شرم کی بات نظر نہ آئی کہ میجر نے ان خاتون کے ناخن کاٹے۔لیکن اس بات کا مجھے یقین نہ آیا کہ میجر کی زبان لٹک رہی تھی،میرے نزدیک یہ ایک نہایت ہی بیہودہ قسم کا جھوٹ تھا۔چنانچہ میں نے کہا:

''اگر یہ بات ایسی ہی گندی تھی تو آپ کھڑکی میں سے جھانکے ہی کیوں؟ آپ کوئی بچہ تو ہیں نہیں...''

اس پر بے شک ان سب نے مل کر مجھے ڈانٹا لیکن میں نے ڈانٹ کی کوئی پروانہ کی۔میرا تو بس یہی جی چاہتا تھا کہ دوڑ کر نیچے جاؤں اور میجر کی طرح میں بھی دوزانو ہو کر اپنی ملکہ سے کہوں''اس گھر سے اٹھ جائیے۔مہربانی کر کے یہاں سے چلی جائیے!''

اب جب کہ مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ دنیا میں اور قسم کے احساسات و خیالات ہیں، اور طرح کے لوگ بھی ہیں، اور رنگ کی بھی زندگی ہے تو مجھے یہ گھر اور اس کے سارے مکین اور بھی زیادہ کھلنے لگے۔ اس گھر میں گندی افواہوں کا ایک ایسا جال بچھا تھا، جس سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا تھا۔ رجمنٹ کے پادری صاحب جو غریب اور بیمار سے آدمی تھے، یہاں عیاش اور شرابی مشہور تھے، اور ان کے خیال کے مطابق سب افسر لوگ اور ان کی بیویاں بدکار تھیں۔ ویسے فوجی سپاہی جب عورتوں کا ذکر کرتے تھے تو ان میں بھی نا قابل برداشت یکسانیت ہوتی تھی۔ لیکن اپنے مالکوں سے مجھے سب سے زیادہ نفرت تھی۔ جو فیصلے وہ دوسروں کے متعلق جاری کرتے رہتے تھے، ان کی حقیقت مجھے خوب معلوم تھی۔ لوگوں کے چیتھڑے اڑانا ہی ایک ایسی تفریح تھی جو مفت حاصل ہو سکتی تھی۔ اس لئے وہ یہی کیا کرتے تھے۔ یہی ان کی واحد تفریح تھی۔ جیسے اپنی زندگی کے نیک پھیکے پن اور بے رنگی کا بدلہ دوسروں سے لے رہے ہوں۔

جس وقت وہ ملکہ مارگٹ کے متعلق بیہودہ قصے کہتے تو مجھے ایسا غصہ اٹا جو میری عمر کے لئے بالکل مناسب نہ تھا۔ ان افواہ اڑانے والوں کے خلاف میرا خون کھولنے لگتا اور ایک نا قابل برداشت جنون سا اٹھتا کہ ان کو خوب عاجز کروں، خوب ان سے لڑوں۔ اگر کبھی کبھی مجھے اپنے اوپر اور تمام انسانوں پر ترس بھی آتا۔ یہ ترس کا جذبہ نفرت سے بھی زیادہ نا قابل برداشت ہوتا تھا۔

میں اپنی ملک مارگٹ کو ان سے زیادہ جانتا تھا اور ہر وقت مجھے کھٹکا لگا رہتا کہ کہیں ان کو پتہ نہ لگ جائے کہ میں جانتا ہوں۔

اتوار اور تہوار کی صبح جب کہ پورا خاندان صبح کی دعا کے لئے گرجا چلا جاتا تو میں اپنی ملکہ سے ملنے جاتا تھا۔ وہ مجھے اپنے بیڈ روم میں بلا لیتی اور پھر میں چھوٹی سی آرام کرسی پر بیٹھتا جس پر سنہرا ریشم جڑا تھا، ننھی بچی فوراً میری گود میں چڑھ جاتی اور میں اس کو گود میں لئے لئے اس کی ماں کو اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کے بارے میں بتاتا رہتا۔

میری ملکہ ایک چوڑے سے بستر پر لیٹی رہتی، دونوں چھوٹے چھوتے نازک ہاتھ گالوں کے نیچے ہوتے، جسم پر بھی اسی طرح کا سنہرا کپڑا ہوتا۔ یہی رنگ اس کے سونے کے کمرے میں ہر چیز کا تھا۔ سیاہ گھنے بالوں کی چوٹی کبھی چمپئی کندھے پر پڑی رہتی، کبھی پلنگ کی پٹی پر سے نیچے گر کر فرش کو چھوتی رہتی۔

میری بات سنتے وقت وہ نرم نگاہی سے میری طرف دیکھتی، ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھتی:

''سچ مچ، واقعی؟''

مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی یہ مسکراہٹ بھی کسی ملکہ کی باوقار مسکراہٹ کی مانند ہوتی تھی۔ گہری، محبت بھری آواز میں گفتگو کرتی اور مجھے محسوس ہوتا کہ جیسے وہ ہمیشہ بس ایک ہی بات کہتی ہے:

''مجھے معلوم ہے کہ میں بہت سے اور لوگوں سے زیادہ اچھی اور پاک ہوں، اس لئے مجھے ان کی پروانہیں۔''

کبھی کبھی وہ مجھے ایک نیچی سی کرسی پر آئینے کے سامنے بیٹھی بالوں میں کنگھی کرتی ہوئی ملتی۔ اس کے بال نانی اماں کے بالوں کی طرح لمبے لمبے اور گھنے تھے۔ وہ اس کے گھٹنوں اور کرسی کے ہتھوں پر پھیلے رہتے اور کرسی کی پیٹھ پر سے ہو کر قریب قریب زمین تک پہونچتے تھے۔ آئینے میں مجھے اس کی سپید اور سخت چھاتیاں نظر آتیں، وہ میرے سامنے چولی اور موزے بڑی بے تکلفی سے پہن لیا کرتی تھی لیکن اس کی برہنگی نے میرے دل میں کبھی کوئی گندہ خیال نہیں پیدا کیا۔ مجھے اس کے حسن کو دیکھ کر ایک بڑے فخر کی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ اس میں سے تازہ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو آیا کرتی تھی اور یہ چیز اس کے متعلق گندے خیالات کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتی تھی۔

میں مضبوط تھا، تندرست تھا اور جنسی تعلقات کے راز سے بھی واقف تھا۔ لیکن میں نے لوگوں کو جنس کے متعلق اس گندگی سے، بیدلی سے اور چٹخارے لےلیکر باتیں کرتے سنا تھا کہ میں کبھی اس عورت کو کسی مرد کے آغوش میں تصور نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے یقین نہیں آسکتا تھا کہ اس عورت پر بھی کرسکتا تھا۔ مجھے یقین نہیں آسکتا تھا کہ اس عورت پر بھی کسی کو بے شرمی کے ساتھ ہاتھ ڈالنے کا حق ہوسکتا ہے، یا کوئی ایسی بھی آغوش ہوسکتی ہے جو اس جسم پر اپنا حق جتائے بلکہ مجھے یہ یقین تھا کہ باورچی خانوں اور سائبانوں میں جو عشق کئے جاتے ہیں، وہ ملکہ مارگٹ سے بالکل ہی الگ کوئی چیز ہیں، کہ ملکہ مارگٹ کوئی مختلف قسم کا عشق ضرور جانتی ہوگی جو ایک اور ہی پاکیزہ اور بلند مسرت بخشتا ہوگا۔

لیکن اس روز دن ڈھلے میں اس کے ڈرائنگ روم میں پہنچا تو اس کا گونجتا ہوا قہقہہ اور کسی مرد کی آواز سنکر ایک دم رک گیا۔

''ٹھہرو تو...'' مرد کی آواز میں خوشامد تھی۔ ''یا خدا۔ یقین نہیں آتا!''

مجھے چاہئے تھا کہ چلا جاتا، یہ میں جانتا تھا، لیکن جیسے کسی نے ساری طاقت سلب کرلی تھی، وہیں کھڑا

کا کھڑا رہ گیا...

''کون ہے؟'' ملکہ نے آواز دی۔ ''اچھا،تم ہو؟ اندر آ جاؤ...''

کمرے کی ہوا پھولوں کی خوشبو سے بوجھل تھی۔ نیم تاریکی تھی کیونکہ کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے...ملکہ مارگٹ پلنگ پر لیٹی تھی اور ٹھڈی تک چادر سے اس کا جسم ڈھکا تھا۔اس کے پاس دیوار کی طرف پیٹھ کئے وہ افسر بیٹھا تھا جو وائلن بجایا کرتا تھا۔ وہ ایک قمیص پہنے تھا جس کا گریبان کھلا ہوا تھا اور دھنے کندھے سے لے کر بائیں طرف سینے تک زخم کا ایک لمبا نشان تھا جو اس قدر سرخ تھا کہ نیم تاریکی میں بھی صاف نظر آ رہا تھا۔افسر کے بال برے مضحکہ خیز طور پر الجھے ہوئے تھے اور پہلی مرتبہ میں نے اس کے اداس، زخم کا نشان پڑے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی۔ وہ عجیب طرح سے مسکراتا تھا اور اس کی بڑی بڑی عورتوں کی سی آنکھوں ملکہ مارگٹ کو یوں تک رہی تھیں۔ جیسے انہوں نے اس کا حسن بس آج ہی دیکھا ہے۔

''یہ میرے دوست ہیں'' ملکہ مارگٹ نے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھ سے مخاطب تھی یا افسر سے۔

''اس قدر ڈرے ہوئے کیوں؟ آؤ،قریب آؤ...'' مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آواز کہیں دور سے آ رہی ہے۔

میں قریب آ گیا تو اس نے اپنا ایک برہنہ گرم بازو میرے گلے میں حمائل کر دیا اور کہنے لگی:

''جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو تمہیں بھی مسرت نصیب ہو گی...اب جاؤ!''

جو کتاب میں واپس کرنے لایا تھا وہ الماری پر رکھ کر میں نے دوسری کتاب نکالی اور باہر آ گیا جیسے خواب میں چل رہا ہوں۔

میرا دل جیسے یکا یک بھیچ گیا تھا بلاشبہ مجھ کو کبھی ایک لمحے کو بھی خیال نہ آیا تھا کہ میری ملکہ بھی معمولی عورتوں کی طرح عشق کرتی ہوگی، نہ میں افسر کے متعلق اس طرح سوچ سکتا تھا۔اس کی مسکراہٹ میری نظروں میں گھوم رہی تھی۔ وہ کس طرح بالکل بچوں کی مانند خوشی سے مسکرا رہا تھا، جیسے ایک دم حیران رہ گیا ہو اور اس کا اداس چہرہ کس قدر بدل گیا تھا، اس کو ضرور ملکہ سے محبت ہو رہی ہو گی۔کون اس سے محبت کئے بغیر رہ سکتا تھا؟ وہ آدمی کس قدر حسین انداز سے وائلن بجاتا تھا اور کس درد اور احساس بھرے ترنم سے شعر

پڑھتا تھا...

لیکن یہی حقیقت کہ میں اپنے آپ کو تسلیاں دے رہا تھا، اس بات کا ثبوت تھی معاملہ ٹھیک نہیں تھا اور میں نے جو کچھ دیکھا تھا اور ملکہ مارگٹ کی طرف جو رویہ اختیار کیا تھا، اس میں کہیں کچھ نہ کچھ غلطی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے میرا کچھ کھو گیا اور کئی دن تک میں بے حد غم گین رہا۔

...ایک دن میں کچھ سخت قسم کی شرارت کر بیٹھا۔ اس میں کہیں کچھ نہ کچھ غلطی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے میرا کچھ کھو گیا اوکئی دن تک میں بے حد غم گین رہا۔

...ایک دن میں کچھ سخت قسم کی شرارت کر بیٹھا۔ اس کے بعد اپنی ملکہ سے دوسری کتاب مانگنے گیا تو اس نے سختی سے مجھ سے کہا:

''تم تو بڑے بے کہے، شریرلڑکے معلوم ہوتے ہو! میں تو تمہیں ایسا نہیں سمجھتی تھی...''

یہ بات تو میری برداشت سے باہر تھی، میں پھوٹ پڑا اور اس کو بتانے لگا کہ لوگ جب اس کو طرح طرح کی بری باتیں کہتے ہیں تو زندگی میرے لئے کس قدر تکلیف دہ ہو جاتی ہے اور کس قدر دکھی ہو جاتا ہوں۔ وہ میرے سامنے کھڑی تھی، میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے۔ پہلے تو وہ سنجیدگی اور غور سے میری باتیں سنتی رہی لیکن فوراً ہی وہ ہنس پڑی اور مجھے آہستہ سے دھکیلا۔

''اچھا اچھا، بس ہوا! میں یہ سب جانتی ہوں۔ جانتی ہوں!''

پھر اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور بڑی شفقت سے بولی:

''دیکھو اس بکواس کی طرف جتنی ہی کم توجہ دو گے نا، اتنا ہی تمہارے لئے مفید ہے... اونہہ، توبہ... ہاتھ ٹھیک سے نہیں دھوتے ہو کیا؟...''

کاش وہ یہ جملہ نہ کہتی۔ اگر اس کو بھی پیتل کی چیزیں مانجھ کر چمکانی پڑتیں، فرش رگڑ رگڑ کر دھونا ہوتا، پوتڑے پچھاڑنے پڑتے تو میرا خیال ہے کہ اس کے ہاتھ بھی مجھ سے کچھ بہتر نظر نہ آتے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ بولی:

''اگر کوئی اچھی طرح رہتا ہے، زندگی بسر کرنے کا طریقہ جانتا ہے تو لوگ اس سے حسد اور نفرت کرتے ہیں اور اگر اچھی طرح نہیں رہتا تو اس کو حقارت سے دیکھتے ہیں، پھوہڑ کہتے ہیں!''

پھر مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے اس نے میری آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا اور مسکرا

دی:

''تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟''

''ہاں۔''

''بہت زیادہ؟''

''ہاں۔''

''لیکن کیسے؟''

''معلوم نہیں۔''

''شکریہ۔ تم بہت پیارے ہو! لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں تو مجھے اچھا لگتا ہے...''

وہ ذرا سا ہنسی اور پھر کچھ کہنے ہی والی تھی۔ لیکن ایک آہ بھر کر چپ ہوگئی اور اسی طرح مجھے اپنی باہوں میں لئے رہی۔

''تم مجھے سے ملنے زیادہ آیا کرونا۔ جب بھی آسکو تو شوق سے آؤ...''

میں نے اس بلاوے کا خوب فائدہ اٹھایا اور اس کی دوستی سے بہت کچھ پایا۔ جب میرے مالک دن کے کھانے کے بعد قیلولہ کرنے لیٹتے تو میں نیچے چلا جاتا اور وہ گھر پر ہوتی تو گھنٹے بھر تک اس کے پاس بیٹھا رہتا۔

وہ اپنی گلابی گلابی لچکدار انگلیوں سے اپنے خوشبودار بالوں میں پنیں کھونستی جاتی اور مجھے سمجھاتی جاتی:

''تمہیں روسی کتابیں پڑھنی چاہئیں، تمہیں اپنی روسی زندگی وے واقفیت حاصل کرنی چاہئے۔''

پھر وہ روسی مصنفین کے نام بتاتی اور پوچھتی:

''ان لوگوں کا نام تمہیں یادر ہے گا نا؟''

اکثر سوچتے ہوئے جھنجھلا کر کہتی:

''توبہ ہے! تم کو تو پڑھنا چاہئے۔ اور میں ہوں کہ بھول بھول جاتی ہوں...''

اس کے پاس کچھ دیر بیٹھنے کے بعد جب میں اوپر واپس جاتا تو میرے ہاتھ میں ایک نئی کتاب اور دل ودماغ میں پاکیزگی کا احساس ہوتا تھا۔

میں نے اکساکوف کی ''رسالہ خاندان'' مسرت بخش روسی نظم ''جنگلوں میں'' وہ حیرت انگیز ''شکاری کی ڈائری'' اوران کے علاوہ گریبینکا اور سولوگوب کی بہت سی کتابیں، وینیویتینوف، اودوئفسکی اور تیوتچیف کی نظمیں پڑھ ڈالی تھیں۔ان کتابوں نے میرے دل سے تلخ اور بے نور حقیقت دھو دی اور بڑی پاکیزگی پیدا کردی۔اب مجھے معلوم ہوا کہ اچھی کتاب کیا چیز ہے!اور یہ بھی کہ وہ میرے لئے کس قدر ضروری تھیں۔انہوں نے مجھے یہ اعتماد بخشا کہ میں دنیا میں تنہا نہیں ہوں اور ضرور جدو جہد کر کے اپنا راستہ خود نکال سکتا ہوں!

نانی اماں جب مجھ سے ملنے آتیں تو میں ان کو بڑے مجنونانہ شوق کے ساتھ ملکہ مارگٹ کا حال سناتا۔وہ تمباکو کی ایک لمبی سی ناس لے کر یقین کے ساتھ بولیں:

''یہ تو بڑی اچھی بات معلوم ہوئی!ہاں بیشک اس دنیا میں بہت سے اچھے انسان موجود ہیں، اتنا ہی ہے کہ ان کو تلاش کیجئے تو یقیناً ملیں گے!''

''نہیں نہیں۔آپ نہ جایئے گا...''

''اچھا اچھا،نہیں جاؤں گی...اے پروردگار، کس قدر اچھی ہے زندگی!میرا جی چاہتا ہے نہ جانے کتنے زمانوں تک جیئے ہی چلی جاؤں!''

ملکہ مارگٹ کو مجھے اسکول بھیجنا نصیب نہ ہوا۔ایسٹر کے بعد والے ساتویں اتوار کو ایک ناخوشگوار واقعہ ہوا جس سے میں بالکل ہل گیا۔

چھٹیوں سے ذرا پہلے میری آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔ پپوٹے اتنے سوج گئے کہ میری آنکھیں پوری ڈھک گئیں۔میرے مالکوں کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں اندھا نہ ہو جاؤں اور مجھے بھی ایسا ہی لگا۔وہ لوگ مجھے عورتوں کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔جس کا نام ہینرخ رودزیوچ تھا۔اس نے میرے پپوٹوں کے اندر کی طرف نشتر دیا۔اور کئی دن تک مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لیٹنا پڑا۔میں اندھیرے اور تاریخی میں پڑا تڑپتا رہتا تھا۔چنانچہ اس اتوار کی شام کو میری پٹی کھولی گئی اور میں اپنے بستر سے اٹھا۔افوہ!ایسا معلوم ہوتا تھا۔اندھے ہونے سے زیادہ اور کوئی مصیبت نہیں ہے، یہ ایک ایسی بدنصیبی ہے جس کی دلخراشی بیان نہیں ہوسکتی، جو اپنے مظلوم اور مجبور کو دنیا کے نوبٹے دس حصے سے محروم کر دیتی ہے۔

اس اتوار کو بڑی چہل پہل تھی۔ چنانچہ مجھے بھی بیمار ہونے کی وجہ سے اپنے کاموں سے جلدی

فرصت مل گئی اور دو پہر کو میں افسروں کے ملازمین سے ملنے کیلئے اس باورچی خانے سے اور باورچی خانے گھومنے لگا۔ سب ہی نشے میں دھت تھے، سوائے تیوفیائف کے۔ وہ حسب دستور خاموش اور سنجیدہ تھا۔ شام ہوتے ہوتے ایرموخین نے ایک لاٹھی سیدوروف کے سر پر دے ماری، وہ بے ہوش ہو کر گلیارے کے پاس گر پڑا اور ایرموخین ڈر کے مارے بھاگ کر نالے میں چھپ گیا۔

احاطے میں فوراً یہ خبر پھیل گئی کہ سیدوروف کو کسی نے مار ڈالا۔ برساتی کی سیڑھیوں کے پاس ایک چھوٹی سی بھیڑ اکٹھی ہو گئی اور اس بیچارے سپاہی کو گھورنے لگے جو دروازے اور باورچی خانے کے بیچ میں دھلیز پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ لوگ پھسپھسا رہے تھے کہ پولیس کو بلایا جائے لیکن پولیس کو بلانے کوئی نہ گیا اور نہ ہی کسی کی اتنی ہمت ہوئی کہ اسے ہاتھ لگائے۔

اتنے میں دھوبن نتالیا کوزلوفسکایا آ پہنچی۔ وہ ایک نئی کلسنی رنگ کی فراک پہنے تھی، کندھوں پر سفید رومال بندھا تھا۔ غصے میں بھری، لوگوں کو دھکیلتی وہ دروازے کے اندر گھس آئی، لاش کے پاس اکڑوں بیٹھ گئی اور زور سے چیخی:

''ارے بے وقوف، یہ زندہ ہے! ذرا سا پانی تو لاؤ کوئی...''

لوگوں نے اس کو خبردار کیا:

''دیکھو ہر کسی کے پھٹے میں پاؤں نہ دیتی پھرو!''

وہ چلائی جیسے آگ لگ گئی ہو:

''میں نے کہا۔ پانی لاؤ!'' پھر بڑی باقاعدگی سے اس نے اپنی نئی فراک گھٹنے کے اوپر سمیٹی، اندر پہنا ہوا پیٹی کوٹ نیچے کو گھسیٹا اور سپاہی کا خون بہتا ہوا سر اپنی گھٹنے پر رکھ لیا۔

آہستہ آہستہ سب بزدل اور معترض تماشائی کھسکنے شروع ہوئے، دیوڑھی سے آتی ہوئی دھندلی روشنی میں مجھے دھوبن کے سفید گول چہرے میں اس کی چمکتی ہوئی اشک ریز آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ میں ایک بالٹی میں پانی لایا۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ سیدوروف کے سر اور سینے پر پانی ڈالو۔

''لیکن دیکھو مجھے بھگو نہ دینا۔ میں ایک جگہ ملاقات کرنے جا رہی ہوں...'' مجھے ہوشیار کرتے ہوئے بولی۔

سپاہی کو ہوش آ گیا۔ اس نے اپنی دھندلی آنکھیں کھولیں اور کراہنے لگا۔

''اٹھاؤ اسے۔'' نتالیا نے اس کے بغلوں میں ہاتھ دئے لیکن دور کئے رہی تاکہ اس کے اپنے کپڑے نہ گندے ہو جائیں۔ ہم دونوں اسے اٹھا کر اندر باورچی خانے میں لے گئے اور پلنگ پر لیٹا دیا۔ دھوبن نے ایک گیلے کپڑے سے اس کا منہ پونچھا اور کہنے لگی ''اس کپڑے کو بھگو بھگو کر اس کے سر پر رکھتے رہو۔ میں باہر جا کر اس دوسرے گدھے کو دیکھتی ہوں کہاں مر گیا۔ کمبخت کہیں کے، عقل گھاس چرنے گئی ہے، پینگے اور بھر بھگتیں گے باوا کی سسرال۔''

اس کے پیٹی کوٹ پر کچھ دھبے لگ گئے تھے، اس لئے اس نے پیٹی کوٹ اتارا اور لات سے ایک کونے میں اچھال دیا، نیچے کو ہاتھ پھیر پھیر کر اپنی نئی کلف دی ہوئی فراک کی شکنیں برابر کیں اور باہر چلی گئی۔

سدوروف لمبا لمبا لیٹا، ہچکیاں لے لے کر کراہ رہا تھا اور اس کے سر سے سیاہ گرم خون بہہ بہہ کر میرے پاؤں پر ٹپک رہا تھا۔ مجھے اس سے کوفت ہو رہی تھی لیکن ڈر کے مارے پاؤں نہیں کھسکا پا رہا تھا۔

ویسے بھی مجھے سخت مایوسی ہو رہی تھی۔ باہر تمام چیزوں پر اتوار کی رنگینی چھائی ہوئی تھی، برساتیوں اور پھاٹکوں پر برچ کے نئے نئے پودے سجائے گئے تھے۔ سرسبز و شاداب ڈالیاں ہر ستون سے باندھی گئی تھیں، گلی سے چہل پہل، ہنسی ٹھٹے کی آوازیں آ رہی تھیں، ہر شئے نئی نویلی لگتی تھی، ہر شئے پر شباب آیا ہوا تھا۔ صبح تڑکے مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے بہار ہمیشہ کو قیام کرنے کے لئے آ گئی ہے، اور اب اس کے بعد زندگی زیادہ پاکیزہ، زیادہ روشن اور زیادہ رنگین ہو گئی۔

اتنے میں سیدوروف نے قے کی اور باورچی خانہ گرم وادکا کے بھبکے اور پیاز کی بو سے اٹ گیا۔ کبھی کبھی کھڑکی کی شیشوں پر مبہم چپٹے چہرے اور پھیلی ہوئی ناکیں نظر آتیں اور ان کے دونوں طرف رکھی ہوئی ہتھیلیاں اور پنجے ایسے دکھائی دیتے جیسے چہروں کے دونوں طرف بھیانک، بڑے بڑے، مکروہ قسم کے کان ہیں۔

جب سیدوروف کا دماغ ذرا ٹھکانے ہوا تو بولا:

''کیا میں گر پڑا؟ اریموخین؟ واہ بھئی، تم خوب دوست نکلے...''

پھر کھانسنے لگا اور نشے میں دھت آنسو بہا بہا کر رونے لگا:

''میری ننھی بہن... آہ، میری بیچاری ننھی سی غریب بہن...''

وہ اسی حالت میں بھیگا ہوا لت پت، بدبو کرتا، اٹھ کھڑا ہوا چکرایا اور پھر بستر پر گر کر آنکھیں گول گول گھماتا ہوا بولا:

''تو اس نے مجھے مار ہی ڈالا...''

مجھے اس بات پر ہنسی آ گئی۔ اس نے مجھے دھندلی آنکھوں سے گھورا:

''تو کسی بات پر ہنس رہا ہے، شیطان؟ میں یہاں مرا پڑا ہوں اور تجھے ہنسی سوجھ رہی ہے۔''

وہ مجھے دونوں ہاتھوں سے دھکیلنے لگا۔ وہ بڑبڑاتا جا رہا تھا:

''بلایا، بلا کر بٹھایا، بٹھا کر اٹھایا، اٹھا کر نکالا!''

میں بولا:

''بند کرو بکواس اپنی!''

وہ غصے میں گرجنے لگا:

''مجھے کو تو قتل کر دیا گیا ہے اور تو...''

اس نے اپنے بھاری بے جان سے جھولتے ہوئے گندے ہاتھ سے میری آنکھوں پر ایک طمانچہ مارا۔ میں نے ایک چیخ ماری اور اندھا دھند دوڑتا ہوا احاطے میں بھاگا جہاں نتالیا سے ٹکر ہوئی۔ وہ ایرموخین کا بازو پکڑے اسے گھسیٹتی ہوئی لا رہی تھی:

''چل ادھر، چل! گھوڑا کہیں کا!'' پھر مجھے دیکھ کر بولی:

''کیا گڑبڑ ہے؟''

''وہ لڑ رہا ہے...''

''لڑ رہا ہے؟'' نتالیا نے حیران ہو کر ایرموخین کو کھینچتے ہوئے کہا:

''ارے اس بار تو خدا کا شکر کرو کہ تم بچ گئے!''

میں نے ٹھنڈے پانی سے آنکھیں دھوئیں۔ پھر جا کر گلیارے سے جھانکا تو مجھے نظر آیا کہ دونوں سپاہی عورتوں کی طرح گلے مل کر رو رہے ہیں اور صلح ہو گئی ہے۔ پھر دونوں نے مل کر نتالیا کو گلے لگانا چاہا لیکن اس نے دونوں کو تھپڑ رسید کر کے بھگا دیا۔

''مجھ کو اپنے پنجے نہ لگانا، کتے کہیں کے! ہاں، تم لوگ کیا سمجھتے ہو مجھے، کوئی تمہاری ان دلاریوں کی

طرح نہیں ہوں۔ چلو لیٹو اور سو جاؤ ذرا سا۔ نہیں تو پھر تمہارے مالک لوگ آتے ہوں گے! چلو، ورنہ اچھا نہ ہوگا!''

اس نے دونوں کو بچوں کی طرح بستر پر لٹا دیا اور جب دونوں خراٹے لینے لگے تو ڈیوڑھی سے نکلی۔

''ذرا دیکھو تو میری فراک کی گت! سب چنٹیں پڑ گئی ہیں اور مجھے ملنے کے لئے جانا ہے۔ اس نے مارا تو کو؟ گدھا کہیں کا! بے وقوف! یہ ہیں وادکا کے نتیجے۔ کبھی شراب نہ پینا میرا بچہ! کبھی اس کی عادت نہ ڈالنا...''

بعد میں پھاٹک کے قریب لگی ہوئی بنچ پر میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور اس سے پوچھنے لگا کہ اس کو شرابیوں سے ڈر کیوں نہیں لگتا۔

''مجھے کو شرابیوں سے کیا، ہوش مندوں سے بھی ڈر نہیں لگتا۔ یہاں رکھتی ہوں لوگوں کو!'' اس نے سرخ ہاتھ کی مٹھی باندھتے ہوئے کہا: ''وہ بھی ایسا ہی کرتا تھا۔ وہ جو مر گیا میاں۔ وہ پیتا تھا تو بس پیتا ہی چلا جاتا تھا۔ میں دھر کے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتی تھی اور جہاں نیند میں عاقل ہوا کہ پتلون اتاری اس کی اور مضبوط سی چھڑی سے جھڑائی شروع کر دی۔ پھر پیئیگا، پھر جائیگا میا کے یہاں۔ ارے بھلے آدمی، گھر میں بیوی موجود ہے تو اس کے پاس نہ مر۔ جب چاہے سولے۔ کیوں ادھر ادھر کے پیالے پیتا پھرتا ہے۔ اتنا پیٹتی اتنا پیٹتی کہ میرے ہاتھ رہ جاتے! پھر تو وہ موم کی ناک بن جاتا!''

مجھے وہ پہلی عورت یاد آئی۔ حوا، جس نے خود پروردگار کو بھی چکمہ دے دیا تھا۔ آہستہ سے بولا:

''تم مضبوط بھی تو ہو بھئی۔''

نتالیا نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا:

''عورت کو مرد سے زیادہ طاقت درکار ہوتی ہے کیونکہ اس کو دوہری طاقت چاہئے لیکن خدا نے عورت کے ساتھ زیادتی کی ہے!''

وہ بڑے اطمینان سے بغیر بغض و کینہ کے بات کر رہی تھی۔ دونوں ہاتھ اپنی بھاری بھاری چھاتیوں پر باندھے اور دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے تھی اور اس کی اداس آنکھیں پشتے پر جمی ہوئی تھیں جو کوڑے کرکٹ، پتھر اور ڈھیلوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب میں اس کی سمجھداری کی باتیں غور سے سن رہا تھا تو مجھے وقت کے گذرنے کا کوئی احساس نہ ہوا اور یکا یک میں نے دیکھا کہ میرے مالک اور ان کے ہاتھ کا سہارا

لئے انکی بیوی دور پشتے کے پاس سے چلے آ رہے ہیں۔ وہ لوگ بڑی اکڑ کے ساتھ چل رہے تھے جیسے کوئی بڑا سا مرغا اور مرغی۔ ہم دونوں کو گھورتے اور آپس میں کچھ پھس پھس کرتے چلے آ رہے تھے۔

میں نے دوڑ کر صدر دروازہ کھولا۔ جب ہم لوگ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، میری مالکن نے جلے کٹے انداز میں کہا:

''کیوں، دھوبن سے عشق لڑا رہے تھے، یہی سب نیچے والی خاتوں کے پاس جا کر سیکھتے ہو؟''

یہ بات اتنی احمقانہ تھی کہ اس پر برا کون مانتا لیکن مجھے تکلیف تب ہوئی جب میرے مالک بھی ذرا سن کر بولے:

''ٹھیک ہے۔ اب تو وقت بھی آ گیا ہے۔ یہی عمر ہے۔ ہے نا!...''

دوسرے دن جب میں سائبان میں لکڑیاں لینے گیا تو میں نے دیکھا کہ دروازے کے پاس ایک خالی پرس پڑا ہوا ہے۔ میں نے بیسیوں بار یہ پرس سیدوروف کے پاس دیکھا تھا۔ اسلئے میں نے فوراً پرس لے جا کر اسے دے دیا۔ اس نے اپنی انگلیاں اندر ڈال کر کہا:

''اور پیسے کہاں ہیں؟ ایک روبل اور تیس کوپک۔ لاؤ ادھر!''

وہ اپنے سر پر ایک تولیہ لپیٹے تھا، چہرہ پیلا اور ستا ہوا لگتا تھا اور غصے سے اپنی سوجی ہوئی آنکھیں جھپکانے لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جب پرس مجھے ملا تھا وہ بالکل خالی تھا۔ اتنے میں ایرموخین آ پہونچا اور اس کو یقین دلانے لگا کہ میں چور ہوں۔ میری طرف اشارہ کر کے بولا:

''ضرور اسی نے لیا ہے۔ مالک کے پاس لے جاؤ اسے۔ ایک سپاہی تھوڑا ہی دوسرے سپاہی کی چیز چرا سکتا ہے!''

مجھے اس کی بات سے گمان ہوا کہ ضرور اسی نے روپئے پار کئے ہیں اور پرس ہمارے سائبان کے پاس ڈال دیا ہوگا۔ اس لئے میں نے الٹ کر اس کے منہ پر کہا:

''یہ جھوٹ ہے! چور تم ہو!''

غصے اور ڈر کے مارے اس کا کھردرا چہرہ کھسیا کے ذرا سا نکل آیا۔ وہ چیخنے لگا:

''ثابت کرو!''

اور اس سے مجھے اپنے اندازے کے مطابق صحیح ہونے کا پورا یقین ہو گیا۔

اب میں ثابت کیسے کرتا؟ وہ زور سے گرجا اور مجھے گھسیٹتا ہوا احاطے میں لے گیا۔ سیدوروف بھی چلاتا ہوا پیچھے پیچھے چلا۔ چاروں طرف کھڑکیاں سے گردنیں جھانکنے لگیں۔ ملکہ مارگٹ کی ماں اپنے رفیق سگریٹ ک منہ میں دبائے بڑے اطمینان سے کھڑی یہ سب ماجرا دیکھ رہی تھی۔ مجھے یہ خیال آیا کہ اپنی ملکہ کی آنکھوں میں گر گیا۔ اس خیال سے میرے ہوش وحواس جاتے رہے۔

مجھے یاد ہے کہ وہ دونوں سپاہی ہاتھ پکڑے مجھے ملکوں کے پاس لے گئے۔ اور میرے مالک میرے خلاف جرم کا بیان سنتے ہوئے ایک دوسرے کو سر ہلا ہلا کر اشارے کر رہے تھے۔ بہو بڑے اعتماد سے بولیں:

''یہ ضرور اسی کی حرکت ہے۔ میں نے اسے کل رات پھاٹک پر دھوبن سے بڑا میٹھا بنتے دیکھا تھا۔ ضرور اس کے پاس پیسے رہے ہوں گے، پیسے بغیر کیا وہ کچھ دے دے گی...''

اریموخین چیخا:

''ہاں ہاں ٹھیک ہے!''

میرے دماغ پر بھوت سوار ہو گیا، غصے سے کون کھولنے لگا اور میں نے بہو کو خوب الٹی سیدھی سنائیں جس کے عوض میں خوب مار کھائی۔

لیکن اس مار سے جو تکلیف ہوئی وہ تو کم تھی۔ اصل تکلیف تو یہ تھی کہ اب ملکہ مارگٹ مجھے سمجھے گی؟ اس کی نگاہوں میں اب کس طرح اپنی صفائی پیش کروں گا؟ یہ میرے لئے بڑا ہی تلخ اور سخت وقت تھا۔

خوش قسمتی سے ان سپاہیوں نے فوراً ہی احاطے بھر میں اور گلی بھی میں یہ بات پھیلا دی۔ اس شام جب میں دوچھتی میں لیٹا تھا تو یکا یک نتالیا دھوبن کی آواز آنے لگی۔ وہ نیچے کھڑکی ہوئی چیخ رہی تھی:

''میں کیوں اپنا منہ بند رکھوں جی! ادھر آیئے جناب عالی۔ چلئے، چلئے ادھر! میں کہتی ہوں چل ادھر! نہیں تو ابھی تیرے مالک سے جا کر کہتی ہوں اور پھر وہ تجھے بتائے گا کہ کیا ہے کیا نہیں ہے۔ ہاں، چل ادھر!''

مجھے ایک دم سے یہ خیال ہوا کہ اس شوروغل سے کچھ میرا تعلق ضرور ہے کیونکہ ہماری ہی ڈیوڑھی کے قریب کھڑکی چیخ رہی تھی اور اس کی آواز کی شدت اور فتح مندی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

''تم نے مجھے کل کتنے پیسے دکھائے تھے؟ اور کہاں سے تم کو ملے تھے وہ پیسے؟ ہاں۔ ذرا ہم بھی تو

سنیں۔''

سید وروف اداس لہجے میں کہہ رہا تھا:

''اف اریموخین، ہائے اریموخین...''اس کی بات سن کر مارے خوشی کے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔

دھوبن کی چیخ پھر سنائی دی:

''اور اس لڑکے بیچارے کا نام لگایا اور اس کو مار کھلوائی!''

میرا جی چاہتا تھا کہ بھاگتا ہوا نیچے جاؤں اور خوشی سے ناچ ناچ کر دھوبن کے ہاتھوں کے بوسے لوں لیکن اسی وقت میں نے سنا کہ بہو چلائی، غالباً کھڑکی میں سے:

''لڑکی کو جو مار پڑی وہ اس کی زبان درازی پر پڑی تھی۔تم ہی ایک بڑی اس کی حمائتی بن کر آئی ہو کہ چرایا کہ کیا کیا، رنڈی!''

''تم خود رنڈی ہو بیگم صاحبہ! اور موٹی بھینس بھی ہو۔ہاں میں کہتی ہوں بیگم صاحبہ، آپ اگر برا نہ مانیں...''

ان دونوں کی لڑائی میرے کانوں کو بہترین موسیقی محسوس ہو رہی تھی۔نتالیا کے لئے شکر گذراری کا جذبہ میرے دل میں اتنا بڑھا کہ اسے روکتے روکتے میرا دل گھٹنے لگا۔دکھ اور احسان مندی کے ملے جلے احساسات سے گرم گرم آنسو بہنے لگے۔

پھر میرے مالک آہستہ آہستہ زینہ چڑھتے ہوئے اوپر دوچھتی میں آئے اور میرے قریب ایک جھکی ہوئی شہتیر پر بیٹھے، ہاتھ سے اپنے بال پیچھے کی طرف چپکاتے ہوئے بولے:[

''کہو بھائی پیشکوف، تم ہو بڑے ہی بدنصیب!''

میں نے جواب دئے بغیر کروٹ بدل لی۔

''لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں ہو سکتا ہے کہ تم نے نہایت گستاخ قسمکی بدزبانی کی۔''

میں نے آہستہ سے جواب دیا:

''جیسے ہی میں اٹھنے کے لائق ہو جاؤں گا یہاں سے چلا جاؤں گا...''

وہ کچھ دیر چپ چاپ سگریٹ پیتے رہے پھر سگریٹ کے ٹوٹے کو غور سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولے:

''یہ تمہارا معاملہ ہے بھئی! جو چاہو کرو، اب بچہ تو ہو ہی نہیں۔ سمجھدار ہو، تم بہتر جانتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا چاہئے...''

پھر وہ اٹھے اور نیچے چلے گئے۔ حسب دستور مجھے ان سے ہمدردی ہوئی۔

چار دن بعد میں نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔

میرا بے تحاشہ جی چاہتا تھا کہ ملکہ مارگٹ سے خدا حافظ کہوں لیکن ان سے جا کر ملنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے امید تھی کہ شاید خود ہی مجھے بلا بھیجے۔

جب ننھی بچی سے رخصت ہونے لگا تو اس سے البتہ کہا:

''امی سے کہنا کہ میں نے ان کا بہت بہت شکریہ، بہت، بہت بہت شکریہ کہا ہے! یاد رکھو گی نا؟''

''ہاں'' اس نے بڑی محبت سے مسکرا کر کہا۔ ''کل تک کے لئے خدا حافظ؟''

تقریباً بیس سال بعد میری اس بچی سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ ایک فوجی افسر کی بیوی تھی...

11

پھر میں نے مشعلچی کا کام شروع کیا۔ اب کی بار مجھے جس اسٹیمر پر نوکری ملی تھی اس کا نام ''پرم'' تھا۔ یہ اسٹیمر بہت بڑا تھا، راج ہنس کی طرح سفید اور خوب تیز چلتا تھا۔

اب کے میری نوکری دراصل مشعلچی کے بھی نیچے تھی، یوں کہنا چاہئے کہ میں باورچی خانے کا چھوکرا تھا۔ سات روبل ماہوار تنخواہ تھی۔ باورچی کو ہر طرح کی مدد دینا اور دوڑ بھاگ کا کام میرے سپرد تھا۔

ایک موٹا آدمی جہاز کا خانساماں تھا، غرور میں پھولا رہتا، چندیا صاف جیسے ربر کی گیند۔ ہاتھ پیچھے باندھے سارے دن عرشے پر بھاری بھاری قدموں سے ٹہلا کرتا جیسے بھری دھوپ میں سور کہیں چھاؤں تلاش کرتا پھر رہا ہو۔ اس کی بیوی کھانا وغیرہ نکلواتی تھی۔ چالیس سے زیادہ عمر، خوبصورت تھی لیکن گھسی پٹی سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اتنا زیادہ پوڈر تھوپتی تھی کہ ہر وقت اس کے گالوں پر سے اڑ اڑ کر اس کے بھڑکیلے لباس پر چکنی مٹی کی طرح پڑتا اور جمتا رہتا تھا۔

باورچی خانے میں باورچی ایوان ایوانووچ کی حکومت تھی۔ اس کا عرف عام ''ننھا بھالو'' تھا۔ وہ چھوٹے قد کا گدبدا آدمی تھا، بالکل چھیلا، طوطے کی سی ناک، شرارت بھری آنکھیں۔ مٹک مٹک کر چلتا،

ہر دم کلف دئے ہوئے کالر پہنتا اور روز شیو بناتا جس سے اس کے گالوں پر نیلاہٹ چھائی رہتی۔ اسکی سیاہ مونچھوں کی نوکیں اوپر مڑی رہتی تھیں، اور جب بھی اسے مہلت ملتی تو اپنی جھلسی ہوئی سرخ انگلیوں سے ان کو مروڑتا اور اترا اترا کے ایک چھوٹے سے گول دستی آئینے میں اپنا منہ دیکھتا جاتا۔

اسٹیمر پر سب سے زیادہ دلچسپ ہستی یاکوف شوموف کی تھی۔ وہ جو خلاصی تھا یعنی بھٹی جھونکتا تھا، وہ کسان تھا، خوب چوڑے چوکور کندھے، اوپر کو اٹھی ہوئی ناک، گھنی بھوؤں کے نیچے سے ریچھ کی سی آنکھیں جھانکتی رہتی تھیں۔ گالوں پر گھنگھریالی داڑھی جو دلدل کی کائی کی طرح لگتی تھی۔ سر پر اتنے گھنے بال کہ اس میں اس کی ٹیڑھی ٹیڑھی انگلیاں بھی مشکل سے گھس سکتی تھیں۔

وہ بڑا کامیاب جواری تھا اور غضب کا کھاؤ۔ بھوکے کتے کی طرح وہ باورچی خانے کے چاروں طرف منڈلاتا رہتا اور گوشت اور ہڈیاں مانگا کرتا۔ شام کو ننھے بھالو، کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتا اور خوب ڈیں گے ہانکتا۔

بچپن میں ریازان کے ایک گڈریے کے یہاں بھیڑیں چراتا تھا، پھر ایک گزرتے ہوئے راہب صاحب اس کو پھسلا کر خانقاہ میں لے آئے اور وہاں وہ امیدوار کی حیثیت سے چار سال تک رہا۔

ڈینگ ہانکتے ہوئے وہ کہتا:

''ارے، اب اچھی طرح سے راہب ہو سکتا تھا مگر وہ تو پینزا کی رہنے والی ایک پاکباز خاتون اس گرجے میں آگھسیں، بس میرا دماغ خراب ہوگیا۔ بڑی ہی لے مرنے والی چن منی عورت تھی وہ۔ کہتی رہتی ''ہائے کیا اچھا آدمی ہے، کیا مضبوط آدمی ہے اور مجھ کو دیکھو ایماندار اور شریف عورت ہوں، اکیلی گھر چلاتی ہوں، تم آکر میرا کچھ کام کر دیا کرو نا، آخر گھر کا کوئی مرد تو ہونا چاہئے نا۔ میرا اپنا گھر ہے۔ میں پرندوں کے پر بیچتی ہوں۔''

''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا چنانچہ اس نے مجھے اپنے گھر کا نگہبان بنا لیا اور میں نے اسے اپنی معشوقہ بنالیا اور تین سال تک اس کی روٹی توڑتا رہا۔''

'ننھا بھالو، اپنی ناک پر ایک مہاسے کو چھوتے ہوئے بیچ میں بول پڑا:

''تم بڑے ڈھیٹ جھوٹے ہو، اگر لوگ جھوٹ بول کر کمائی کر سکتے تو ہمارے یہاں تو روپے کی ریل پیل ہوتی!''

یاکوف بیٹھا بیٹھا جگالی کرتا رہتا۔ بھوری بھوری جھائیاں اس کے کلوں پر اوپر نیچے ہوتی رہتیں، بال دار کان ہلتے رہتے۔ باورچی کے اس ٹوکنے کے بعد وہ اپنی پھرتیلی اور متوازن آواز میں اپنی بات جاری رکھتا:

''وہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی، اس لئے میں اس سے بور ہو گیا، عاجز آ گیا اس سے۔ ہاں۔ عاجز آ گیا، تو میں نے اس کی بھتیجی کے معاملہ چالو کر دیا اور اس پر جو یہ ماجرا کھلا تو سیدھے گردن میں ہاتھ ڈال کر کھڑے کھڑے نکال باہر کیا...''

باورچی بھی یاکوف کی سی متوازن آواز میں کہتا ہے:

''خوب کیا۔ تھی تمہارے جوڑ ہی کی۔''

خلاصی نے ایک شکر کی ٹکیہ منہ میں رکھی اور اپنی بات جاری رکھی:

''تو اس طرح میں کچھ دن تو ہوا میں چکر کاٹتا رہا۔ پھر ولادیمیر شہر کے ایک بڈھے سوداگر سے میری ملاقات ہو گئی۔ اور پھر وہ اور میں آدھی دنیا کے چاروں طرف آوارہ گردی کرتے رہے، کبھی ان پہاڑوں پر جاتے جو بلقان کہلاتے ہیں اور پھر ترکوں اور رومانیوں اور یونانیوں اور آسٹریا اور تمام قسم کے لوگوں کو دیکھ ڈالا... ایک سے خریدنا اور دوسرے کے ہاتھ بیچنا۔

''چوری بھی کی؟'' باورچی نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں، ان بڑے میاں نے چوری نہیں کی۔ وہ تو مجھ سے بھی کہتے تھے کہ غیر زمین پر ایمانداری سے قدم اٹھانا۔ یہاں کا قانون ہے ایک ذرہ بھی چھوا تو جان سے گئے۔ ویسے میں نے چوری کی کوشش تو کی تھی مگر وہ کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ میں نے یہ کیا تھا کہ ایک سوداگر کے اصطبل سے گھوڑا نکال کر لے جا رہا تھا تو بھئی وہ بات بنی نہیں۔ پکڑا گیا اور ظاہر ہے کہ پٹائی ہوئی، جب پیٹ پاٹ چکے تو پولیس میں لے گئے۔ اصل میں ہم دو آدمی تھے۔ ایک تو واقعی اصل قسم کا گھوڑا چور تھا اور میں تو بس یوں ہی اس کے ساتھ چلا گیا تھا کہ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ اس وقت میں اس سوداگر کے یہاں کام بھی کر رہا تھا جس کے یہاں میں نے چوری کی تھی، حمام میں تندور بٹھانے کا کام۔ اتنے میں سوداگر بیمار پڑ گیا اور مجھے خواب مین دیکھ دیکھ کر ڈرنے لگا۔ ڈر کے مارے وہ افسران بالا کے یہاں گیا اور بولا: ''اسے چھوڑ دو''۔ یعنی مجھے۔ ''اسے چھوڑ دو۔ دیکھو نہ اب یہ میرے خوابوں میں آتا ہے اور اسے معاف نہیں کروں گا تو غالباً مر جاؤں گا میں۔

یقیناً یہ کوئی جادوگر ہے'' یعنی کہ میں جادوگر ہوں۔ تو صاحب وہ سوداگر ذرا بڑا مشہور آدمی تھا۔ اس لئے پولیس نے مجھے چھوڑ دیا...''

''یہی تو غلطی کی'' باورچی بولا۔ ''تجھ کو ہرگز نہ چھوڑنا چاہئے تھا۔ تمہارے تو گلے میں چکی کا پاٹ باندھ کر تمہیں دریا میں تین دن تک ڈبو کے رکھنا چاہئے تھا کہ بھیگ کر ساری شیخی نچڑ جاتی۔ ساری حماقت ٹپک جاتی۔''

یاکوف نے جلدی سے اس کو لقمہ دیا:

''ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ مجھ میں ہے تو حماقت۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایک پورے گاؤں بھر کی حماقت مجھ میں موجود ہے...''

باورچی نے اپنے کالر کے اندر انگلی ڈال کر زور سے کالر کھینچا اور عاجز ہوتے ہوئے کہا:

''اونہہ، چوٹا کہیں کا! یہاں ادھر ادھر تھورتا، نگلتا، بہتا پھرتا ہے۔ خواہ مخواہ! بتا اچھا تیری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ کیوں جی رہا ہے کمبخت؟''

خلاصی اپنے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہتا:

''یہ تو مجھے نہیں معلوم! جیسے اور دنیا زندہ ہے ویسے ہی میں بھی زندہ ہوں۔ کچھ لوگ لیٹے رہتے ہیں، کچھ چلتے پھرتے رہتے ہیں اور منیم لوگ پیٹھ سے تکیہ لگائے حساب کتاب کرتے رہتے ہیں لیکن تو سب ہی کھاتے ہیں آخر۔''

اس پر باورچی اور چڑ تا:

''تو بس سور ہے سور! اور کچھ نہ کہے تجھے! بلکہ راتب ہے سور کا!''

یاکوف حیران ہو کر کہتا:

''لیکن تم بگڑتے کیوں ہو؟ ہم کسان لوگ تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ایسا خفا نہ ہوئیے۔ آخر تمہاری خفگی سے کوئی میں عقلمند تو نہیں ہو جاؤں گا...''

میں بہت جلد اس آدمی سے محبت کرنے لگا۔ میں اسے حیرانی سے دیکھا کرتا اور منہ کھولے اس کی باتیں سنا کرتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اس نے اپنے وجود کے اندر زندگی کے تجربوں کی ایک مضبوط عمارت کھڑی کر رکھی ہے۔ وہ ہر ایک کو ''تم'' کہہ کر مخاطب کرتا، گھنی بھوؤں کے نیچے سے اسی ایک صاف

سیدھی نظر سے سب کو دیکھتا، سب کو پرکھتا۔ کپتان ہو یا خانساماں یا فرسٹ کلاس کیا اتراتے ہوئے اکڑے ہوئے مسافر، جہاز کے ملاح، کھانے کے کمروں کے ویٹر، تیسرے درجے کے مسافر، سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتا۔

کبھی کبھی وہ کپتان یا مستری کے سامنے کھڑا کیا جاتا تھا۔ اس کے لمبے بندروں کے سے ہاتھ پیچھے ہوتے۔ یہ لوگ اس کو ڈانٹتے کہ سستی کرتے ہو یا تاش میں کسی کے سب پیسے کیوں مار لئے۔ اور وہ خاموش کھڑا رہتا تھا۔ یہ بات بالکل صاف نظر آتی تھی کہ اس پر ڈانٹ کا مطلق اثر نہیں ہو رہا ہے۔ اگلی بندرگاہ پر اسٹیمر سے اتار دئے جانے کی دھمکی سے بھی وہ ذرا نہ گھبراتا تھا۔

یاکوف میں باقی لوگوں سے مختلف کچھ بات تھی، کچھ 'بہت خوب' والی بات۔ اور یہ بھی بالکل ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اس بات کا بھی یقین ہے کہ وہ باقی لوگوں سے الگ کوئی چیز ہے اور لوگ اس کو سمجھ نہیں سکتے۔

میں نے اسے کبھی منہ بگاڑتے یا اداس بیٹھے نہیں دیکھا۔ نہ یہ دیکھا کہ وہ ذرا دیر تک چپ رہ گیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ غیر ارادی طور پر الفاظ اس کے مونچھ داڑھی سے گھرے ہوئے منہ سے ایک لامتناہی چشمے کی طرح بہہ رہے ہیں۔ جب اس پر ڈانٹ پڑتی یا اسے کوئی دلچسپ کہانی سنائی جاتی تو اس کے ہونٹ کچھ اس طرح ہلتے گویا خاموشی سے اسے دوہرا رہا ہے، یا شاید آہستہ آہستہ اپنے دل کی بات کہہ رہا ہے۔ روز جب اس کا کام ختم ہو جاتا تو وہ پسینے میں شرابور، تیل سے چکٹا، ننگے پاؤں، انجن والے کمرے سے باہر نکلتا، گریبان کھلی ہوئی، بھیگی قمیص سے اس کا سینہ جھانکتا نظر آتا جس پر گھنے گھنگھریالے بال تھے۔ اور بس پھر فوراً ہی اس کی بھاری، متوازن آواز عرشے پر گونجنے لگتی اور الفاظ یوں بکھرتے جاتے جیسے بارش کے قطرے مسلسل تڑاتڑ، تڑاتڑ گر رہے ہوں:

''اماں سلام، کہاں جاؤ گی؟ چستوپول؟ میں اس جگہ کو جانتا ہوں، وہاں ایک امیر تاتاری کسان تھا نا، عثمان عبداللہ۔ اس کے یہاں میں نے کھیتی باڑی کا کام کیا ہے۔ اس بڈھے کی تین بیویاں تھیں۔ اس کا جسم ٹھوس اور بھاری بھرکم تھا۔ لال لال چہرہ تھا اس کا۔ اس کی ایک کمسن بیوی بڑی لے مرنے والی تاتاری حسینہ تھی۔ میں اس کے ساتھ منہ کالا کیا کرتا تھا۔''

وہ ہر جگہ رہ چکا تھا اور جتنی بھی عورتوں سے اس کی ملاقات ہوئی تھی ان سب سے اس کے ناجائز

تعلقات رہ چکے تھے۔ وہ ہر بات بڑے اطمینان سے یاد کرتا، بڑی محبت سے بیان کرتا جیسے کسی نے آج تک اس کو نہ کوئی تکلیف پہونچائی تھی، نہ برا بھلا کہا تھا۔ ایک منٹ بعد اس کی یہی کہانی کہیں دنبالے سے سنائی دیتی:

''چلو کوئی تاش کھیلتا ہے؟ پتہ پٹ، یا تین ہاتھ یا گھڑی تاش بھی کیا ہی سکون بخش چیز ہے، بس بیٹھ جاؤ اور روپیہ رولتے جاؤ سوداگروں کی طرح...''

میں نے غور کیا تو دیکھا کہ وہ شاذ ہی کبھی یہ الفاظ مثلاً 'اچھا، 'برا' 'بدمعاش' استعمال کرتا تھا، تقریباً ہمیشہ وہ چیزوں کے لئے 'آرامدہ، 'عجیب وغریب' وغیرہ استعمال کرتا تھا۔ اس کے واسطے کوئی خوبصورت عورت بس لے مرنے والی چن منی ہوا کرتی تھی، جس دن دھوپ نکلتی تو وہ دن 'آرام دہ' ہوتا تھا۔ اس کا محبوب تکیہ کلام تھا: ''تھڑی ہے!''

لوگ اس کو کاہل اور سست سمجھتے تھے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس بدبودار اور دھکتے ہوئے تہہ خانے میں بھٹی میں کوئلہ جھونکتا تھا اور تمام لوگوں کی طرح بڑی مستعدی سے کام کرتا تھا۔ لیکن وہ اور خلاصیوں کی طرح تھکن کی شکایت بھی کبھی نہیں کرتا تھا۔

ایک دن ایک مسافر بڑھیا کا پرس کھوگیا۔ وہ شام بڑی صاف ستھری اور پرسکون تھی، لوگوں کا موڈ بھی اتفاق سے اچھا تھا۔ کپتان نے بڑھیا کو پانچ روبل دئے اور باقی مسافروں نے بھی اس کے لئے چندہ کیا۔ جب لوگوں نے بڑھیا کو چندے کے روپئے دئے تو اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور دوہری ہوکر بولی: ''آہ، تم لوگ سلامت رہو، میرے عزیزو! تم نے چندہ جو کیا تو میرے پرس کے روپؤں سے بھی تین روبل اور دس کوپک زیادہ مجھ کو بخش دئے ہیں!''

کسی نے ایک مست تان لگائی:

''لے لو نانی اماں، شکریہ ادا کرو سب کا! دو ایک روبل بڑھتی ہوں گے تو کسی کام ہی میں آئیں گے...''

کسی نے جملہ چست کیا:

''ارے لے لو۔ روپئے کچھ انسان تو ہیں نہیں جو بیکار رہوں۔''

لیکن یاکوف بڑھیا کے پاس پہونچا اور بڑی سنجیدگی سے اپنی تجویز پیش کی:

''لاؤ، وہ فاضل پیسے مجھے دے دو۔ میں تاش کھیلوں گا!''

چاروں طرف سے لوگ یہ سمجھ کر ہنسنے لگے کہ خلاصی مذاق کر رہا ہے۔ مگر وہ گھبرائی ہوئی بڑھیا کے سامنے اپنی سی ہانکتا رہا:

''آؤ بھی نانی اماں! آخر تم روپئے کا کا کروں گی؟ قبر میں تو پیر لٹکائے بیٹھی ہو۔ لڑھک جاؤں گی...''

تب تو لوگ اس پر بگڑنے لگے اور اسے بھگا دیا اور وہ مجھ سے حیران ہو کر کہنے لگا:

''کیا ہی عجیب خلقت ہے بھئی! آخر دوسرے کے معاملے میں اپنی ٹانگ کیوں اڑاتے ہیں یہ لوگ؟ ارے وہ تو خود ہی کہہ رہی تھی کہ مجھے فاضل پیسوں کی ضرورت نہیں! اب یہ تین روبل آجاتے تو میرے لئے کس قدر آرام دہ ہوتے...''

ایسا لگتا تھا کہ اس کو روپیہ کی صورت دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ بات کرتا جاتا اور ہاتھ میں لئے ہوئے چاندی یا تانبے کے سکے کو پتلون پر رگڑ رگڑ کر چمکاتا جاتا، پھر اپنی اوپر کو اٹھی ہوئی ناک سے بالکل لگا کر گھنی بھوؤں کو چڑھاتے ہوئے اس کی چمک کو غور سے دیکھتا۔ لیکن وہ لالچی بالکل نہ تھا۔

ایک دن اس نے مجھے پتہ پٹ کھیلنے کی دعوت دی، مجھے کھیلنا آتا ہی نہیں تھا۔ حیران ہو کر بولا:

''تم نہیں جانتے؟ یہ کیا بات ہوئی؟ اور تم پڑھے لکھے ہو کر نہیں جانتے؟ اب تو تم کو سکھانا پڑا۔ آؤ ہم لوگ کھیلیں، ویسے ہی، خالی مزے کے لئے، شکر کی ٹکیوں کی بازی لگائیں؟''

اس نے مجھ سے پاؤ بھر شکر جیت لی، جنہیں وہ ایک ایک کر کے گال میں دباتا جاتا تھا۔ جب اسے یقین آگیا کہ اب مجھ کو کھیل آگیا ہے تو بولا:

''لاؤ۔ اب سچ مچ کھیلیں، پیسوں سے! کچھ پیسے ہیں؟''

''پانچ روبل ہیں۔''

''میرے پاس دو اور کچھ ریز گاری ہوگی۔''

ظاہر ہے کہ اس نے فوراً ہی میرے سب پیسے جیتے لئے۔ میں نے سوچا کہ لاؤ کچھ تلافی کروں، اپنا سردیوں کا کوٹ پانچ روبل پر بازی میں لگا دیا، پھر ہارا۔ پھر نئے جوتے تین روبل میں لگا دئے، پھر ہارا۔ تب یاکوف جھنجھلا گیا:

''تم بھی کوئی کھلاڑی ہو۔ اس قدر گرم ہوتے ہو، لے لو اپنا کوٹ اور جوتا! مجھے نہیں چاہئے۔ اور اپنا روپئہ بھی لے لو۔ مگر چار روبل۔ ایک میں رکھوں گا، میں نے تمہیں کھیل جو سکھایا ہے، اس کی سکھوائی... تم برا تو نہیں مانو گے؟''

میں اس کا نہایت شکر گذار تھا۔ برا ماننا کیسا!

اور جب میں نے شکر گذاری کا اظہار کیا تو جواب ملا:

''تھڑی ہے۔ کھیل تو کھیل ٹھہرا، جس کے معنی بس لطف کے لئے۔ لیکن تم تو ایسا اس میں پل پڑے جیسے معرکہ ہو رہا ہو۔ معرکہ میں بھی انسان کو نہیں گرم ہونا چاہئے۔ بس ٹھنڈی نظر سے تاک کے مارنا چاہئے۔ آخر اتنے گرم ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ تم جوان ہے۔ ذرا اپنے کو لگام لگائے رکھا کرو۔ ایک بار نشانہ چوکا، پانچ بار چوکا، سات بار چوکا۔ تھڑی ہے۔ پیچھے ہٹ جاؤ اور ذرا ٹھنڈے ہو کر پھر حملہ کرو۔ کھیل کھیلنے کا طریقہ یہ ہے!''

مجھے وہ دن بہ دن زیادہ اچھا اور زیادہ برا لگتا جاتا تھا۔ کبھی کبھی جب وہ بات کرتا تو مجھے اس میں اپنی نانی اماں کی جھلک آتی۔ اس میں بہت سی باتیں ایسی تھیں جو میرے دل کو کھینچتی تھیں۔ لیکن اس کے اوپر انسانوں سے بے پرواہی برتنے کی ایک موٹی سی تہہ چڑھی ہوئی تھی جو مجھے اچھی نہیں لگتی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پوری زندگی میں یہ تہہ رفتہ رفتہ کر کے اتنی موٹی ہوئی ہے۔

ایک دن سہہ پہر کے وقت سکنڈ کلاس کا ایک مسافر۔ موٹا سوداگر جو پیرم کا رہنے والا تھا۔ نشے میں دھت ہو گیا اور جہاز پر سے پانی میں گر پڑا اور چکراتا ہوا پانی پر تھرتھراتے سنہرے راستے پر تیرنے لگا۔ اسٹیمر کے انجن فوراً بند کر دئے گئے او جہاز روک دیا گیا، اس کے پہیوں سے بے تحاشہ جھاگ نکل رہا تھا جو ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں خون کے رنگ جیسا معلوم ہوتا تھا۔ اور اس ابلتے ہوئے خون میں ایک سیاہ جسم چکر کھا رہا تھا اور چکر کھاتا ہوا دور ہوتا جا رہا تھا۔ پانی کے اندر سے دلدوز چیخوں کی آواز آ رہی تھی۔ اسٹیمر کے مسافر بھی چیخ رہے تھے اور دھکم دھکا کرتے ہوئے جہاز کے دنبالے میں جمع ہو گئے تھے۔ ڈوبنے والے کا سرخ اور گنجا دوست، جو خود بھی نشے میں دھت تھا، چیختا ہوا بھیڑ پر گھونسے چلا رہا تھا:

''ہٹ جاؤ! ہٹ جاؤ! میں ابھی اسے جا لوں گا...''

دو ملاح پانی میں کود چکے تھے اور تیرتے ہوئے ڈوبتے ہوئے آدمی کے نزدیک ہوتے جا رہے

تھے۔ کشتی نیچے اتاری جا رہی تھی۔ ملاحوں کی صداؤں اور عورتوں کی چیخوں پر ایک اور آواز حاوی تھی۔ یا کوف کی بھاری متوازن آواز:

''وہ تو بہر حال ڈوبے گا ہی، کیونکہ کوٹ جو پہنے ہے وہ! اب مثلاً عورتوں کو لو۔ وہ مردوں سے پہلے کیوں ڈوبتی ہیں؟ سایہ جو پہنتی ہیں اس لئے۔ جیسے ہی عورت پانی کی سطح پر چھوٹی کہ باٹ کی طرح تہہ میں پہونچی...دیکھو! ڈوب گیا نا۔ میں کیا کہتا تھا...''

اور سچ سچ وہ سوداگر ڈوب گیا۔ تقریباً دو گھنٹے تک اس کی لاش کی بڑی تلاش کی گئی لیکن سب بے سود۔ اس کا دوست جس کی عقل اب ٹھکانے کی گئی لیکن سب بے سود۔ اس کا دوست جس کی عقل اب ٹھکانے آ گئی تھی، بڑی پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا اور بڑبڑا رہا تھا:

''دیکھو تو کیا ہو گیا! اب کیا ہوگا؟ اب کیا کیا جائے؟ اب میں اس کے بال بچوں کو، خاندان والوں کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ اگر اس کے خاندان کی بات نہ ہوتی تو...''

یا کوف پیچھے ہاتھ باندھے، اس کے سامنے کھڑے، ہمدردی کے الفاظ حاضر کر رہے تھے:

''کیا کیا جائے سوداگر صاحب! اس دنیا میں کسی کو بھی معلوم نہیں کہ انجام کس طرح ہوتا ہے۔ ارے یہاں تک ہوتا ہے کہ بس ایک ککرمتا کھانے کا بہانہ ہو جاتا ہے اور۔ پھر لیجئے قبر میں پہونچ گئے۔ اب ہزاروں انسان ککرمتے کھا کر تگڑے ہوتے ہیں اور ایک کھاتا ہے تو موت کی نیند سو جاتا ہے! اور غور کیجئے تو ککرمتے کی حقیقت ہی کیا ہے؟''

چکی کے پاٹ کی طرح تگڑا اور چوڑا چکلا وہ سوداگر کے سامنے کھڑا اس پر الفاظ کے دانے بکھیر رہا تھا۔ پہلے تو سوداگر چپکے چپکے روتا رہا اور اپنی چوڑی چکلی ہتھیلی سے داڑھی پر بہتے ہوئے آنسو پونچھتا رہا لیکن جب یا کوف کے الفاظ کے معنی اس کے سمجھ میں آئے تو وہ گھٹ کر غرانے لگا:

''دور ہو شیطان! تو کیوں میری جان کھینچے لئے لے رہا ہے؟ ایماندارو! اس کو یہاں سے دفان کرو ورنہ کچھ الٹی سیدھی ہو جائے تو میں نہیں جانتا!''

بعض وقت تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ خلاصی بالکل بدھو ہے لیکن کبھی کبھی بلکہ زیادہ تر یہ گمان ہوتا کہ وہ جان بوجھ کر بدھو بننے کا بہانہ کر رہا ہے۔ میں یہ جاننے کو مرا جاتا تھا کہ اس نے کیا کچھ دیکھا ہے، کیسی کیسی زمین کی سیر کی ہے۔ لیکن مجھے اس میں کامیابی کم ہی ہوتی تھی۔ سر پیچھے کو جھکا کر، ریچھ کی سی

آنکھوں کو ذرا بند کر کے وہ اپنے لجلجے چہرے کو تھپتھپاتا اور ریں ریں ریں ریں کر کے اپنی یادوں کو دہراتا جاتا:

''ارے اب لوگ تو ہر جگہ ہیں میرے بھائی، جیسے چیونٹیاں۔ لوگ یہاں بھی، لوگ وہاں بھی۔ ڈھیروں! اور یہ تو ہے ہی کہ زیادہ تر تو کسان ہیں۔ ساری خدا کی خدائی میں بکھرے بچھے پڑے ہیں جیسے خزان کے پتے! کون بلغاری؟ ہاں ہاں بلغاریوں کو بھی میں نے دیکھا اور یونانیوں کو بھی اور سربین اور رومانیوں کو بھی۔ قسم قسم کے خانہ بدوش ہوتے ہیں۔ ہر طرح کے! کیسے ہوتے ہیں؟ ہوتے کیسے؟ شہر میں شہری ہوتے ہیں اور دیہات میں دیہاتی جیسے ہمارے یہاں ہوتے ہیں۔ بہت ہی ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ کوئی ہماری زبان بولتے ہیں لیکن بری طرح۔ جیسے کہ تاتاری یا مردوین۔ یونانی ہم لوگوں کی طرح بات نہیں کرتے، بس جوان کے بھیجے میں آتا ہے بڑبڑ بڑبڑ بکے جاتے ہیں، ویسے سننے میں تو الفاظ لگتے ہیں لیکن جانے کیا کہتے رہتے ہیں۔ ان سے انگلیوں کی زبان میں بات کرنی چاہئے۔ میرے وہ جو سوداگر بڑے میاں تھے نا وہ سمجھتے تھے کہ وہ بھی یونانی زبان سمجھتے ہیں۔ ادھر سے ادھر کہتے پھرتے 'کالا مارا'' کالا مارو، بڑا چالاک تھا وہ۔ اور ان کو بس چت کر دیا کرتا تھا!... ارے، یہ کیا ہے؟ پھر پوچھتے ہو کہ کیسے تھے وہ لوگ؟ ارے بدھو ہوتے کیسے۔ ہاں ہاں پختہ رنگ کے ہوتے ہیں اور رومانی لوگ بھی پختہ رنگ کے ہوتے ہیں۔ سب ایک ہی مذہب کو مانتے ہیں۔ بلغاری بھی پختہ رنگ کے ہوتے ہیں مگر بالکل ہم لوگوں کی طرح دعا پڑھتے ہیں اور جو یونانیوں کو پوچھو تو وہ ترکیوں کی طرح ہوتے ہیں...''

مجھے محسوس ہوتا کہ اس نے مجھے پوری بات بتائی نہیں ہے اور غالباً کوئی ایسی بات ہے جسے وہ چھپا رہا ہے۔

تصویری رسالوں سے مجھ کو یہ معلوم ہوا تھا کہ یونان کے دارالسلطنت کا نام اتھینس ہے جو ایک نہایت خوبصورت اور قدیم شہر ہے۔ لیکن یاکوف نے بڑے شبہہ سے سر ہلایا اور اتھینس کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔

''تم سے جھوٹ بولا گیا ہے میرے بھائی! اتھینس کہیں نہیں ہے اتھیاں ضرور ہے۔ اور وہ بھی شہر نہیں بلکہ ایک پہاڑ ہے جس پر ایک خانقاہ بنی ہوئی ہے۔ وہ اتھیاں کا کوہ تبرک کہلاتا ہے۔ تصویر بھی ملتی ہے اس کی۔ وہ بڑے میاں بیچا کرتے تھے۔ اور دریائے ڈنیوب پر شہر بلگراد بھی ہے جیسے یاروسلاول یا

نیڑنی ہے۔ ان کے شہر کوئی ایسے خاص نہیں ہوتے لیکن گاؤں۔ ان کی بات الگ ہوتی ہے! اور عورتیں بھی۔ بس، ایسی لے مرنے والی کہ کیا کہا جائے۔ میں تو ایک کے پیچھے وہاں رہ ہی پڑا تھا بس۔ دیکھو کیا نام تھا اس کا؟...''

وہ زور زور سے منہ پر ہاتھ ملنے لگا، سخت داڑھی کھر کھر کھر بولنے لگی اور گلے کے بالکل اندر سے کچھ ایسی ہنسی کی آواز آئی جیسے تڑخی ہوئی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔

''افوہ، انسان کیسا بھول جاتا ہے، بہت سی باتوں کو! اور حالت یہ تھی کہ میں اور وہ... جب میں آنے لگا تو وہ خوب روئی اور میں بھی رویا۔ اب مانو چاہے نہ مانو...''

پھر بڑی بے حیائی سے نہایت اطمینان کے ساتھ وہ مجھے عورت کو قابو میں کرنے کے طریقے بتانے لگا۔

ہم دونوں دنبالے میں بیٹھے تھے زم گرم، چاندنی رات بہتی ہوئی ہم لوگوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس چمکیلے پانی کے بائیں طرف کو وادیاں مشکل سے ہی نظر آتی تھیں اور دھنی طرف کے پہاڑوں میں جھلملاتی ہوئی روشنیاں یوں لگتی تھیں جیسے بہت سے ستارے بھٹک گئے ہوں۔ ہر چیز حرکت میں تھی، ہر چیز میں بیداری کی تھرتھراہٹ تھی جیسے چاروں طرف ایک خاموش مگر بھرپور زندگی چھائی ہو۔ اور اس اداس خاموشی میں یاکوف کی گھر گھراتی ہوئی باتیں ابھر رہی تھیں۔

''بس ایسا ہوتا تھا کہ جہاں وہ جاگتی، اپنے بازو پھیلا دیتی...''

یاکوف کی باتیں بے باکی کی تو لگتی تھیں لیکن ان سے نفرت نہیں محسوس ہوتی تھی کیونکہ ان میں کسی جگہ نہ تو شیخی تھی اور نہ بے رحمی۔ اس میں سادگی تھی اور ایک خاص قسم کی اداسی۔ اور آسمان پر چاند اسی طرح عریاں تھا اور اسے بھی دیکھ کر میرے دل پر اداسی اور ہیجان کی وہی کیفیت طاری ہوتی تھی جو یاکوف کی باتیں سن کر۔ مجھے صرف اچھی باتیں یاد آرہی تھیں۔ سب سے اچھی باتیں۔ مثلاً ملکہ مارگٹ اور یہ شعر جو اپنی حقیقت بیانی کی وجہ سے کبھی بھولتا نہ تھا:

نغمے کو حسن کی ضرورت ہے
پر حسن کو نغمے کی کیا احتیاج...

میں نے اپنے کھوئے کھوئے موڈ کو اس طرح جھٹک کر پھینکا جیسے کوئی نیند کی سستی کو دور کرے اور

پھر خلاصی سے اصرار کرنے لگا کہ وہ مجھے زندگی کے متعلق بتائے جو کچھ اس نے دیکھا تھا، اس کے بارے میں کچھ سنایئے۔

''ارے تو عجیب چڑا ہے'' وہ کہنے لگا۔ ''اب آخر تجھے کیا بتاؤں؟ میں نے تو سب ہی کچھ دیکھا۔ پوچھو خانقاہیں دیکھیں؟ دیکھیں، شراب خانے دیکھے؟ دیکھے، شریفوں کی زندگی بھی دیکھی ہے اور گنواروں کی بھی۔ ارے بہت کچھ دیکھا، بہت کچھ پایا اور کچھ نہیں پایا....

وہ بہت آہستہ آہستہ اپنے ذہن میں یادوں کو کریدتا تھا جیسے کسی گہرے چشمے پر کسی ہلتے ہوئے پل پر سے گزر رہا ہو:

''اب مثلاً یہی لو۔ اب میں ہوں کہ گھوڑا چرانے کے الزام میں حوالات میں بند ہوں۔ اور میں دل میں سوچتا ہوں کہ لے بھائی اب کی بار تو یقیناً سائبیریا جانے کی باری ہے! اور پولیس کا جو افسر ہے وہ تندوروں کو تڑوا رہا ہے کیونکہ نئے مکان میں تندوروں سے دھواں نکلنے لگا ہے۔ تو میں اس سے کہتا ہوں کہ حضور عالی، اگر حکم ہو تو میں ابھی اس کو ایک دم ٹھیک کر دوں اور جناب کی یہ خدمت بجا لاؤں۔'' وہ بس ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ جاتا ''چپ رہو! کیا بکتے ہو۔ شہر کا بہترین کاریگر اس کی موت نہیں کر سکتا...'' لیکن میں کہتا ہوں ''جناب بعض وقت کسی احمق سے وہ کارنامہ ہوتا ہے جو بڑے بڑے حاکم نہیں کر سکتے۔'' بات یہ ہے کہ مجھے سائبیریا صاف نظر آ رہا تھا سامنے اس لئے اتنی ہمت پیدا ہو گئی تھی۔ ''اچھی بات ہے'' وہ کہتے ہیں ''کرو کوشش! لیکن یاد رکھو اگر پہلے سے زیادہ دھواں دینے لگیں گے تندور، تو تمہارا قیمہ کر دوں گا!'' تو بھائی دو دن کے اندر اندر وہ تندور میں نے مرمت کر دیا۔ اب وہ ہے کہ جامے میں نہیں سماتا خوشی کے مارے اور مجھ پر ٹوٹ پڑا غصے میں: ''خرد ماغ' بے وقوف! اے ایسا کاریگر ہو کر تو ادھر ادھر گھوڑے چراتا پھرتا ہے۔ بتا یہ کیا بات ہے، کیوں یہ حرکتیں کرتا ہے تو؟'' تو میں کہتا ہوں ''جناب کیا کروں۔ بس حماقت!'' وہ کہتا ہے ''ہاں ٹھیک کہتا ہے تو۔ بس صرف حماقت، کس قدر افسر! اور بھلا اس پیشے میں ترس کا کیا کام لیکن وہ تھا کہ مجھ پر ترس کھائے جا رہا تھا...''

''اچھا تو پھر؟...'' میں نے کہا۔

''پھر کچھ نہیں۔ بس اس نے مجھ پر ترس کھایا۔ اور کیا چاہتے ہو تم؟''

''لیکن وہ تم پر ترس کیوں کھانے لگا؟ تم تو چٹان کی طرح مضبوط ہو!''

یاکوف مزے میں ہنسنے لگا:

''ارے تو عجیب چڈا ہے! تو چٹان کی کیا بات کرتا ہے؟ تو تو پتھر پر بھی ترس کھا۔ پتھر تو اپنا الگ فرض ادا کرتا ہے۔ آخر پتھر ہی توڑ توڑ کر سڑکیں بنائی جاتی ہیں۔ دنیا میں ہر چیز کی ایک اپنی وقعت ہوتی ہے، ہرایک چیز کا کچھ نہ کچھ استعمال ہوتا ہے۔ اب مٹی کو لے لو، مٹی کی کیا حقیقت؟ لیکن گھاس مٹی ہی سے اگتی ہے...''

جب خلاصی اس قسم کی گفتگو کرنی شروع کر دیتا تو مجھ پر یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا کہ اس کا علم اور دانش میری عقل اور سمجھ سے باہر ہے اور بہت زیادہ وسیع ہے۔

چنانچہ میں بات کا رخ بدلتا:

''باورچی کے متعلق کیا خیال ہے تمہارا''

''کون؟ نتھا بھالو؟'' وہ بے نیازی سے پوچھتا۔ ''اس کے متعلق میں کیا خیال کرسکتا ہوں؟ سوچنے کو رکھا کیا ہے؟''

یہ بات سچ بھی ہے۔ ایوان ایوانووچ کی ہستی اتنی چکنی اور سجل تھی کہ خیالات کے ٹکنے کا کوئی ذریعہ ہی نہ تھا۔ صرف ایک بات اس میں ایسی تھی جس سے مجھے بھی کسی قدر دلچسپی تھی: اسے خلاصی سے نفرت تھی، ہمیشہ اس پر چیختا چلاتا رہتا تھا مگر پھر بھی اسے چائے پینے بلاتا رہتا تھا۔

ایک دن اس نے یاکوف سے کہا

''اگر میں زمیندار ہوتا اور تم میرے آسامی ہوتے تو سال کے بارہوں مہینے تمہاری کھال کھنچوایا کرتا۔ اٹھائی گیرا، آوارہ گرد کہیں کا!''

یاکوف نے بڑی سنجیدگی سے کہا:

بارہوں مہینے۔ یہ تو بہت ہے!''

لیکن اس مستقل ڈانٹ پھٹکار کے باوجود وہ یاکوف کو ہر وقت کچھ نہ کچھ کھلاتا رہتا تھا۔ وہ بڑی سختی سے یاکوف کی طرف ہاتھ بڑھاتا اور کہتا:

''لے، بدمعاش!''

یاکوف آہستہ آہستہ چباتے ہوئے جواب دیتا:

''ایوان ایوانو وچ، تمہارا شکریہ۔ تمہاری بدولت ہی میری ہڈیوں میں دم ہے۔''

لیکن اس سارے دم کا فائدہ کیا ہے، کاہل الوجود؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ ارے ابھی تو مجھے بہت دن زندہ رہنا ہے...''

کاہے کو جینا چاہتا ہے شیطان!''

''شیطان کا بھی زندہ رہنے کو تو جی چاہتا ہی ہے کیوں؟ کیا تمہیں زندگی میں کچھ لطف نہیں آتا؟ زندگی بڑی مزیدار اور آرام دہ چیز ہے، ایوان ایوانو وچ...''

''دیکھا، ہے نا؟ دماغ میں بھوسہ!''

یاکوف نے حیران ہو کر پوچھا:

''یہ کون سا محاورہ ہے؟''

ننھا بھالو، مجھ سے مخاطب ہوا:

''ارے یہ دیکھو ذرا۔ ہم اور تم دن بھر اس چولھے میں منہ دئے بھنکتے رہتے ہیں اور یہ بیٹھا سور کی طرح تھورتا رہتا ہے!''

''اپنی اپنی قسمت ہے'' خلاصی بڑے اطمینان سے اپنی غذا چباتے ہوئے کہتے۔

مجھے معلوم تھا کہ انجن کی بھٹی جھونکنا تندور یا چولھے جھونکنے سے زیادہ مشکل تھا۔ ایک دو بار میں نے یاکوف کے ساتھ کام کرنے کی کوشش کی تھی اور میری سمجھ میں یہ آتا تھا کہ وہ لوگوں کو بتاتا کیوں نہیں کہ اس کا کام زیادہ مشکل تھا۔ اس کا یہ رویہ میرے اس خیال کو اور بھی زیادہ پختہ کرتا تھا کہ واقعی وہ کوئی خاص بات جانتا ہے...

ہر شخص اس پر لعنت ملامت کرتا تھا۔ کپتان، مستری صدر ملاح وغیرہ۔ جس کو بھی اس سے واسطہ پڑتا وہ اس کی شکایت ضرور کرتا۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ لوگ اسے نکال باہر کیوں نہیں کر دیتے؟ اس کے ساتھی خلاصی اس سے البتہ مہربانی سے پیش آتے تھے حالانکہ اس کے تاش کھیلنے اور ڈینگ مارنے کا وہ بھی مذاق اڑاتے تھے۔ ایک بار میں نے ان لوگوں سے پوچھا:

''کیوں، یاکوف اچھا آدمی ہے نا؟''

''یاکوف؟ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ برا نہیں مانتا کسی بات کا، چاہے تو جلتے انگارے اس کے گریبان

میں ڈال دو تب بھی برا نہیں مانیں گا...''

باوجود یہ کہ وہ بھٹیوں پر اتنی سخت محنت کرتا تھا اور اتنا کھاتا تھا، وہ بہت کم سوتا تھا جیسے ہی اس کی باری ختم ہوتی وہ عرشے پر آجاتا میلا، پسینے میں تر، اکثر بغیر کپڑے تبدیل کئے، اور ساری ساری رات مسافروں سے باتیں کر کے یا تاش کھیل کے، آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دیتا۔

اس کا وجود میرے لئے ایک مقفل صندوق کی مانند تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا رہتا تھا کہ اس صندوق میں کوئی ایسی چیز بند ہے جو میرے لئے ناگزیر ہے اور میں اس بات پر شدت سے اتارو ہو رہا تھا کہ اس صندوق کی کنجی ڈھونڈ کر ہی رہوں گا۔

وہ مجھے اپنی بھوؤں کے نیچے ڈھکی ہوئی آنکھوں سے غور سے دیکھتے ہوئے کہتا:

''میری سمجھ میں نہیں آتا بھائی کہ آخر یہ کیا شیطانی سوار ہے کہ میرے پیچھے پڑے ہو۔ دنیا کے بارے میں سننا چاہتے ہو؟ ہاں یہ ٹھیک تو ہے کہ میں نے بہت دنیا گھومی ہے لیکن پھر تمہیں کیا؟ تم واقعی عجیب چڑے ہو! اچھا سنو ایک دن جو مجھ پر بیتی وہ سن لو۔''

پھر اس نے مجھے یہ کہانی سنائی کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ قصبے میں ایک نوجوان جج رہتا تھا۔ اس جج کو تپ دق کی بیماری تھی۔ اس کی بیوی جرمن تھی، خوب تندرست تھی، بال بچہ بھی کوئی نہیں تھا۔ تو اسے ایک وجیہہ سوداگر سے عشق ہو گیا۔ اس سوداگر کے ہاں ایک خوبصورت بیوی پہلے ہی سے موجود تھی، تین بچے بھی تھے۔ اب سوداگر کو جو پتہ چلا کہ یہ جرمن عورت اس سے عشق کرتی ہے تو اس نے جرمن عورت کا مذاق اڑانے کی ٹھانی۔ اسے رات کو ملنے کے لئے اپنے باغ میں بلایا اور اپنے دو دوستوں کو وہیں آس پاس کے جھاڑیوں میں چھپا دیا۔

''تو اب بس پھر ہوا معاملہ شروع! وہ جرمن عورت آئی، بیچاری حیران پریشان، سوداگر کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس کی ہے، بس وہ زبان ہلائے اور وہ اسکی ہو جائے گی۔ لیکن وہ اس سے کہتا ہے کہ محترمہ، میں تو آپ کو اپنی نہیں بنا سکتا کیونکہ میں تو شادی شدہ آدمی ٹھہرا۔ البتہ میں اپنے دو دوستوں کو آپ کی خدمت میں حاضر کر سکتا ہوں۔ ایک کنوارا ہے، دوسرا رنڈوا۔ عورت ایک چیخ مارتی ہے اور اس کو ایسا دھکا دیتی ہے کہ وہ بنچ پر قلابازی کھا کر گر جاتا ہے۔ اور پھر وہ اس کے کدو پر لاتیں رسید کرتی ہے! میں ہی اس کو باغ میں بلا کے لایا تھا کیونکہ میں جج صاحب کا ملازم خاص تھا۔ میں احاطے کی دیوار کی ایک دراڑ سے جھانک

رہا ہوں اور یہ سب گڑ بڑ دیکھ رہا ہوں۔ پھر سوداگر کے دونوں دوست کود کر جھاڑیوں میں سے نکل آئے اور اس پر جھپٹ کر، اس کے بال پکڑ کر گھسیٹنے لگے۔ تو میں بھی جست مار کر دیوار سے دھم سے کودتا ہوں اور ان لوگوں کو دھکیلتا ہوں۔ ''یہ کوئی طریقہ نہیں ہے سوداگر صاحب'' میں کہتا ہوں۔ ''یہ خاتون اس سوداگر پر بھروسہ کر کے یہاں آئی ہیں اور یہ ان کو ذلیل کرتا ہے۔'' میں اس کو وہاں سے لے کر چلا اور ان لوگوں نے پیچھے سے میرے سر پر اینٹیں ماریں... اس خاتون کو بہت برا لگا۔ احاطے میں ادھر سے ادھر ٹہلتی پھریں کہ اب کیا کریں۔ اور مجھ سے کہتی ہیں ''میں چلی جاؤں گی۔ میں اپنے جرمن لوگوں کے پاس چلی جاؤں گی۔ جیسے ہی میرا شوہر مر جائے گا ویسے ہی چلی جاؤں گی!'' اور میں کہتا ہوں ہاں، ٹھیک ہے۔ ضرور چلی جائیگا! تو بس پھر جب جج صاحب کا انتقال ہوا تو چلی گئیں۔ بیچاری بڑی نیک اور سمجھدار تھیں۔ اور جج بھی شریف آدمی تھا۔ خدا اسے غریق رحمت کرے!''

میں اس کہانی کی اہمیت کی تہہ تک نہیں پہونچ سکا اور میں حیران اور خاموش رہ جاتا۔ یہ ٹھیک ہے اس میں ایک ایسی بات بیان کی گئی تھی جس میں وہی ظالمانہ اور احمقانہ عناصر تھے جن سے میں آشنا تھا مگر وہ کون سی کہنے کی باتیں تھیں بھلا!

یاکوف نے پوچھا:

''کہو، کہانی پسند آئی؟''

میں بوکھلا کر بکنے لگا۔ لیکن اس نے بڑے اطمینان سے تفصیلی تشریح کی:

''ایسے جو لوگ ہوتے ہیں نا، کھاتے پیتے اور آرام کے رسیا تو ان کا جی چاہتا ہے کہ کبھی کبھی مذاق بھی کریں لیکن ہمیشہ بات بنتی بھی نہیں۔ لوگ سنجیدہ اور کاروباری ہیں۔ سوداگری کے لئے ذرا دماغ چاہئے۔ اور دماغ کا کام ٹھہرا کتانے والا، بس ذرا تفریح کو جی چاہتا ہے۔''

جہاز کی دم کے پاس سے دریا جھاگ کے بادلوں میں پیچھے چھوٹتا جا رہا تھا، پانی کے بہنے کی آہٹ سنائی دیتی تھی۔ سیاہ سیاہ کنارے دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ عرشے پر سے مسافروں کے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ ایک لمبی سی پتلی دبلی عوت سیاہ لباس پہنے، سفید بالوں والا سر کھلا ہوا، بنچوں، نیند کی آغوش میں لپٹے لپٹائے لوگ کے بیچ میں سے نکل کر جا رہی تھی۔ خلاصی نے مجھے کہنی سے ٹھوکا دیا:

''دیکھو اس کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔''

مجھے ایسا لگا جیسے وہ دوسروں کے دکھ سے لطف لیتا ہو۔

وہ ہمیشہ مجھے کہانیاں سناتا رہتا تھا اور میں بڑے غور سے سنتا رہتا۔ مجھے آج بھی اس کی سب کہانیاں یاد ہیں لیکن یہ یاد نہیں کہ اس نے کوئی ایسی کہانی بھی کہی ہو جس میں خوشی اور زندہ دلی ہو۔ وہ کتابوں سے بھی زیادہ ٹھنڈے دل سے اور بے نیازی سے بات کرتا تھا۔ بلکہ کتابوں میں تو کبھی کبھی مصنف کے احساسات کا پتہ بھی چلتا ہے۔ خوشی کا، غصے کا، رنج کا یا تمسخر کا۔ لیکن یہ خلاصی کبھی نہ کسی کا مذاق اڑاتا نہ کسی کے متعلق کوئی فیصلہ دیتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے نہ تو کوئی بات بری لگتی ہے اور نہ اسے مسرت بخشتی ہے بس اس طرح بات کرتا جیسے عدالت میں کوئی بے نیازی سے گواہی دیتا ہو اور جج ہو یا دعوے دار سب اس کے لئے ایک ہی سی اجنبی حیثیت رکھتے ہوں...اس کی یہ بے نیازی مجے کھلتی تھی، میرے دل پر بوجھ سا پڑتا اور مجھے اس پر غصے آنے لگتا تھا۔

زندگی اس کے سامنے بس یوں ناچتی تھی جیسے بائلر کی بھٹیوں میں آگ۔ اور وہ کھڑا ہوا لکڑی کے ھتوڑے کو اپنے ریچھ جیسے پنجے میں پکڑے اس کے ڈھکنے کو ذرا سا ٹھونک دیتا اور ایندھن یا کم کرنے لگتا یا زیادہ۔

''کیا تمہیں کسی نے کبھی ستایا نہیں؟'' میں پوچھتا۔

''مجھے کون ستاتا؟ میں تو اتنا مضبوط ہوں کہ کسی کو بھی چاروں خانے چت پٹک سکتا ہوں...''

''یہ میرا مطلب نہیں ہے۔ مطلب ہے تمہارے دل پر کوئی چوٹ پہنچی ہے کبھی؟ مطلب ہے تمہاری روح میں...''

''روح کو کیسے چوٹ پہنچائی جاسکتی ہے۔ روح پر چوٹ تھوڑا ہی لگتی ہے، روح کو تو آپ ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے...''

عرشے کے تمام مسافر، جہاز کے عملے کے سارے لوگ اور ہر شخص روح کے متعلق بھی اکثر اور اسی قدر بات کرتے تھے جس قدر وہ کھیت یا زمین کے متعلق، یا اپنے کام ک متعلق یا روٹی یا عورت کے متعلق کرتے تھے۔ سیدھے سادے انسانوں کی بولی میں روح ایک چلتا ہوا لفظ ہے جیسے پیسہ۔ مجھے اس بات کا رنج ہوتا تھا کہ چکٹی چکٹی زبانیں اس قدر جلد اس لفظ کو اپنے قابو میں کر لیتی تھیں اور ہر بار جب کوئی دیہاتی سچ مچ یا مذاق میں گالیاں بکتا تو وہ روح پر سب سے پہلے لعنت بھیجتا اور یہ چیز سیدھی میرے دل میں تیر کی

طرح لگتی۔

مجھے یاد تھا کہ نانی اماں ہمیشہ کس قدر احترام سے روح کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ روح کا تصور میرے ذہن میں ایک ایسے خانہ حکمت کی طرح تھا جس میں محبت، خوشی اور حسن، یہ تمام چیزیں پناہ لیتی ہوں۔ اور میں پختہ عقیدہ رکھتا تھا کہ جب کوئی اچھا انسان مرتا ہے تو سفید پاکیزہ فرشتے اس کی روح کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر نیلے آسمانوں کی طرح لے جاتے ہیں، نانی اماں کے رحیم وکریم پروردگار کی طرف اور وہ اس کو محبت سے قبول کرتا ہے:

''آہ میری پاک روح! میری محبوب روح! نیچے دنیا میں بہت تکلیف ہوئی؟ بہت تیرے احساسات مجروح ہوئے؟ کیوں؟''

اور پھر وہ اس روح کو مقرب فرشتوں کے سے چھ پر عنائت فرماتا ہے۔

یاکوف شوموف بھی نانی اماں کی مانند بہت کم اور بہت ہچکچاتے ہوئے اور بڑے احترام کے ساتھ روح کا ذکر کرتا تھا۔ جب خفا ہوتا تو روح پر کبھی لعنت نہ بھیجتا اور اگر دوسروں کو ایسا کہتے سنتا تو خاموش ہو جاتا، بھاری سرخ بیل سی گردن پر سر جھک کر لٹک جاتا۔ جب میں اس سے پوچھتا کہ روح کیا ہے تو وہ کہتا:

''روح نفس خدا ہے...''

لیکن مجھے اس سے اطمینان نہ ہوتا اور سوالات کر کر کے اصرار کرتا، پھر وہ آنکھیں جھکا لیتا اور کہتا:

''ارے بھائی، روح کے متعلق تو خود راھبوں اور پادریوں کو بھی زیادہ نہیں معلوم۔ یہ تو ایک راز ہے...''

میں برابر اس آدمی کے متعلق غور کرتا، مستقل اپنی تمام کوشش اس کو سمجھنے کے لئے استعمال کرتا لیکن سب بے سود ثابت ہوتا۔ مجھے یاکوف، صرف یاکوف نظر آتا۔ اس کا بھاری بھدا جسم جیسے باقی تمام چیزوں کو چھپائے ہوئے تھا۔

خانساماں کی بیوی کچھ اس طرح مجھ پر مہربان نظر آنے لگی جو نہایت مشکوک تھا۔ روز صبح میں اس کا منہ ہاتھ دھلاتا حالانکہ قاعدہ سے یہ لوشا کا کام تھا جو سیکنڈ کلاس کی صاف ستھری ہنس مکھ نوکرانی تھی۔ جب میں آکر پتلے سے کیبن میں خانساماں کی بیوی کے بالکل پاس کھڑا ہوتا تو وہ کمر تک ننگی ہوتی تھی اور مجھے

اس کے پھیکے جسم سے نفرت ہونے لگتی جو خمیری آٹے کی طرح تھل تھل پل پل تھا۔ اور میں غیر ارادی طور پر ملکہ مارگٹ کے کسے ہوئے جسم سے اس کا مقابلہ کرنے لگتا۔ خانساماں کی بیوی ہمیشہ کچھ نہ کچھ بڑبڑاتی رہتی، کبھی تمسخر، کبھی طنز، کبھی غصہ۔

وہ کیا کہتی تھی یہ تو میں نے نہیں سمجھ پاتا تھا لیکن اس کے معنی میں خوب سمجھتا تھا۔ یہ معنی نہایت بے حیائی کے اور ذلیل قسم کے ہوتے تھے لیکن مجھ پر ان کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا کیونکہ میں ذہنی طور پر نہ صرف خانساماں کی بیوی سے بلکہ اسٹیمر پر ہونے والی ہر بات سے بالکل الگ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرے اور میرے چاروں طرف کے ماحول کے درمیان ایک بڑی سی کائی لگی ہوئی چٹان کھڑی ہے، اس نے مجھے اس پوری دنیا سے الگ کر رکھا تھا جو دن رات اپنی منزل کی طرف تیر رہی تھی۔

لوشا کے تمسخر آمیز الفاظ جیسے خواب مین سنائی دیتے:

''یہ خانساماں کی بیوی تم پر بری طرح مرتی ہے۔ ارے جب تک موقعہ ہے خوب مزے کرونا...''

اور صرف وہی میرا مذاق نہیں اڑاتی تھی بلکہ کھانے کے کمرے کے تمام ملازمین جانتے تھے کہ خانساماں کی بیوی کو عشق ہو گیا ہے۔ باورچی منہ بنا کر کہتا:

اور صرف وہی میرا مذاق نہیں اڑاتی تھی بلکہ کھانے کے کمرے کے تمام ملازمین جانتے تھے کہ خانساماں کی بیوی کو عشق ہو گیا ہے۔ باورچی منہ بنا کر کہتا:

''یہ محترمہ سب کچھ تو کھا چکی ہیں۔ چکھ چکی ہیں، اب ذرا فرانسیسی پیسٹری کا بھی لطف لینا چاہتی ہیں۔ پیشکوف بیٹا! ذرا آنکھیں کھولے رکھنا ورنہ مصیبت میں پھنسو گے!...''

یاکوف نے کاروباری انداز میں پدرانہ مشورہ دیا:

''یقیناً، اگر تم دو تین سال اور بڑے ہوتے تو میں کہتا کہ ہاں بھئی اور بات ہے۔ لیکن اب تمہاری عمر میں۔ بہتر یہی ہے کہ نہ پھسلو! ویسے بھئی تم جانو، جیسا تمہارا جی چاہے...''

''چھوڑو بھی۔ یہ کیا بیہودگی ہے...'' میں نے کہا۔

''ہاں یقیناً، بیہودگی ہے...''

لیکن ایک ہی منٹ بعد وہ اپنے الجھے بالوں میں انگلیاں پھیر کر چکنے گول گول سے الفاظ چھیٹنے لگا جیسے دانہ بویا جاتا ہے:

''بھئی یہ بھی سوچنا چاہئے کہ اس پر کیا گذرتی ہے۔ بات یہ ہے کہ وہاں، یعنی اس کی طرف، ٹھنڈک بہت ہے، اکتاہٹ بھی بہت ہے... آخر پیار محبت کی گرمی کی ضرورت تو کتے کو بھی ہوتی ہے۔ اور پھر وہ بیچاری تو انسان ہے! عورت تو بس پیار دلار پر اس طرح پھبکتی ہے۔ جیسے برسات میں چھتریاں! بیشک اسے شرم تو آتی ہے مگر کیا کرے بیچاری۔ یہ جسم بڑا پاپی ہے اور بس کیا کیا جائے...''

میں نے غور سے جھانک کر اس کی پراسرار آنکھوں میں دیکھا اور پوچھا:

''تو تمہیں اس پر ترس آتا ہے؟''

''مجھے؟ وہ کیا میری میا لگتی ہے؟ اور بعض لوگوں کو تو اپنی ماں پر بھی ترس نہیں آتا... تم بھی عجیب چڑے ہو!'' اور وہ ہنسنے لگا۔ ٹوٹی ہوئی گھنٹیوں کی سی گھنگھناہٹ دار ہنسی۔

کبھی کبھی میں اس کو غور سے دیکھتا تھا تو ایسا لگتا جیسے خاموش اور سنسان خلا میں کھو گیا ہوں، کسی اتھاہ تاریک گڈھے میں گر پڑا ہوں۔

''یاکوف، سب لوگوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔ تم کیوں نہیں کرتے؟''

''پر کس لئے؟ جب چاہوں تب عورت مجھ کو مل سکتی ہے، خدا کے فضل سے یہ آسان بات ہے... شادی کر لے انسان تو گھر بیٹھنا پڑے، جتائی بوائی کرنی پڑے۔ میری زمین کوئی ایسی اچھی بھی نہیں ہے۔ اور زیادہ ہے بھی نہیں۔ جو کچھ تھی وہ چچا مار بیٹھے۔ بات یہ ہوئی کہ میرا بھائی جو فوج سے واپس آیا تو اس کا چچا سے جھگڑا ہو گیا۔ اس نے چچا کو دھمکی دی کہ قانونی قدم اٹھائے گا اور چچا کے سر پر لاٹھی بھی ماری۔ خون نکلنے لگا۔ تو اس کو ڈیڑھ سال کی جیل ہو گئی۔ اور جب قید سے چھوٹ کر آیا تو چھوٹا ہوا قیدی جو کرتا ہے وہی اس نے کیا، چنانچہ پھر واپس جیل خانے پہنچ گیا۔ اس کی بیوی بڑی لے مرنے والی منی چنی تھی!... لیکن ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا! ایک بار انسان نے شادی کی کہ پھر کوئی چارہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ بیٹھو اور قہر درویش بجان درویش کرو۔ لیکن سپاہی تو اپنی زندگی پر خود حکومت بھی نہیں کر سکتا۔''

''تم خدا سے دعا مانگتے ہو؟''

''ارے تم بھی عجیب چڑے ہو! ضرور مانگتا ہوں دعا...''

''کیسے؟''

''کئی طرح سے۔''

''تمہیں کون کون سی دعائیں آتی ہیں؟''

''مجھے کوئی خاص دعا نہیں آتی۔ بس یوں کہتا ہوں۔ اے خداوند یسوع مسیح، سب جانداروں پر رحم کر، مرے ہوؤں کو سکون دے، ہمیں بیماریوں سے بچا اور... اور بس۔ کچھ اور باتیں...''

اور باتیں کون سی؟''

''ارے انہہ، اب مجھے کیا معلوم۔ وہ تو جو کچھ کہو سب خدا سنتا ہی ہے!''

وہ مجھ سے بڑی نرمی سے پیش آتا تھا اور جیسے میرے متعلق کچھ کرید سی رکھتا ہو، گویا میں کوئی ذہین کتے کا پلا تھا جو مزے دار کرتب کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ شام کا وقت ہے، میں اس کے پاس بیٹھا ہوں۔ اس میں سے حسب دستور تیل، دھوئیں اور پیاز کی بو آ رہی ہے۔ اسے پیاز بے حد پسند تھی، اس طرح کچر کچر کچی کھاتا تھا جیسے سیب چبا رہا ہو اور وہ ایک دم سے کہتا ہے:

''آؤ الیوشا، کچھ نظمیں ہو جائیں!''

مجھے بہت سی نظمیں زبانی یاد تھیں اور ان کے علاوہ میرے پاس ایک موٹی سی بیاض تھی جس میں میں نے اپنی پسندیدہ نظمیں لکھ چھوڑی تھیں۔ میں اس کو ''روسلان اور لودمیلا'' سناتا اور وہ بے حس و حرکت سنتا رہتا۔ نہ ادھر نہ ادھر دیکھتا، نہ کچھ کہتا۔ بلکہ اپنی بھاری سانس بھی روکے رکھتا۔ پھر جب نظم ختم ہوتی تو آہستہ سے کہتا:

''کیا ہی لے مرنے والی داستان ہے! یہ تم نے خود سوچی ہے؟ پوشکن؟ پوشکن کہا نا تم نے؟ ہے ایک بھلا مانس موخین پوشکن، میں نے انہیں ایک بار دیکھا تھا...''

''نہیں، یہ وہ نہیں ہیں۔ اس پوشکن کو تو بہت دن ہوئے لوگوں نے مار ڈالا۔''

''کیوں؟''

میں نے ملکہ مارگٹ سے جس طرح چھوٹے چھوٹے جملوں میں یہ داستان سنی تھی ویسی ہی بیان کر دی۔ جب بیان کر چکا تو یاکوف بڑے اطمینان سے بولا:

''ہاں عورتوں کی بدولت بہت سے لوگوں کی شامت آ جاتی ہے...''

میں اکثر اس کو کتابوں کی کہانیاں سنایا کرتا۔ یہ کہانیاں دراصل چھوٹے چھوٹے حصے ہوتے تھے جو سب آپس میں الجھے ہوئے تھے اور ایک لمبی طویل کہانی کے تانے بانے میں بنے ہوئے ہوتے تھے۔

طویل کہانی جو بڑی حسین اور پر جوش ہوتی تھی، جس میں غصے کا دھواں ہوتا تھا، مجنونانہ حرکتیں اور سر پھری بہادری کا ذکر ہوتا تھا، جس میں شریف ہیرو ہوتے تھے، قسمتیں نہایت بلند اور اقبال بڑے اونچے ہوتے تھے، جس میں ڈوئیل اور موت اور حسین الفاظ اور مکروہ حرکتیں سب ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہوتی تھیں۔ میں رکا مبولے کا ذکر کرتا تھا اور رلا مولے اور حسینی بال اور کلونا کی بہادری کی بات اس میں جوڑتا تھا، لوئی گیارہوں کا بیان کرتا اور اس میں گرانڈے کے باپ کی صفتیں لگا دیتا، کار نے او تلیتا ئف اور ہنری چہارم اس طرح میرے ذہن میں گڈمڈ ہوتے کہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا۔ اپنے جوش میں میں لوگوں کے کردار اور واقعات کی ترتیب بدل دیتا اور اس طرح میں ایک ایسی دنیا بناتا جس میں میری اس طرح بلاشرکت غیرے حکومت ہوتی جیسے کہ نانا ابا کے خدا کی حکومت ہوتی۔ میں قادر مطلق ہوتا، جو اپنی مرضی کے مطابق جب چاہتا ہے انسانوں سے کھیلنا شروع کر دیتا۔ کتابی دنیا کی یہ گڑبڑ میرے چاروں طرف ایک ایسا شفاف سا فانوس بناتی تھی جو نا قابل شکست ہوتا تھا اور جو مجھے اپنے ماحول کی زندگی میں گھلی ہوئی زہریلی گندگی اور بے شمار متعدی امراض سے محفوظ رکھتا تھا۔ لیکن جس کی شفاف حد بندی سے میں زندگی کی حقیقتیں دیکھ سکتا تھا اور مجھے زندہ انسانوں کو دیکھنے اور سمجھنے کی خواہش کو دبانے کی ضرورت نہ تھی۔

کتابوں نے مجھے بہت سی چیزوں کے لئے بالکل بے حس بنا دیا تھا، میں جانتا تھا کہ عشق و محبت کیا چیز ہے اس لئے میں قحبہ خانے نہیں جا سکتا تھا۔ اس دھوکہ بازی اور خود فریبی سے میرے دل میں نفرت پیدا ہوئی اور جو لوگ اس چیز سے لطف لیتے تھے ان پر ترس۔ رکا مبولے کے کردار نے مجھے سکھایا کہ فلسفیانہ طریقے سے اس قسم کے حالات کا مقابلہ کروں۔ ڈوما کے جو ہیرو تھے انہوں نے مجھ میں یہ آرزو پیدا کی کہ اپنی زندگی کو کسی اہم اور بلند اور عظیم مقصد کے لئے وقف کروں۔ میرا سب سے محبوب کردار ہنری چہارم کا تھا جو نہایت باش اور زندہ دل آدمی تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ برانژے نے یہ شعر کہے ہوں گے تو ضرور ہنری چہارم اس کے ذہن میں رہا ہوگا:

وہ سارے غریبوں کی دعوت کرتا تھا،
خود بھی شراب پیتا تھا، پلاتا بھی تھا،
مگر حکمراں کیوں نہ رنگین ہو،
جب سب رعایا بھی ایسی ہی ہو!

ان ناولوں میں ہنری چہارم کو ایک نیک انسان دکھایا گیا تھا جو اپنے سب عوام کو بہت محبوب تھا اور اس کی فطرت میں جو چمکدار دھوپ کی سی روشنی، توانائی اور تابندگی دکھائی گئی تھی، اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ فرانس دنیا کے حسین ترین ملکوں میں سے ایک ہے، جہاں جرأت اور شجاعت جنم لیتی ہے، جہاں دیہات میں گنوارا لباس پہننے والے بھی اس قدر شریف ہیں جس قدر کہ خلعتیں پہننے والے امیر وزیر۔ انڑ پتو اتنا ہی شجاع تھا جتنا ڈی ارتنیان۔ جب ہنری کی موت ہوئی تو میں پھوٹ پھوٹ کر رویا جیسے کوئی جنازے پر روتا ہے اور میں نے روالیاک پر خوب دانت پیسے۔ چنانچہ میں نے خلاصی کو جتنی کہانیاں سنائیں ان میں سے زیادہ تر کا ہیرو ہنری کو ہی بنایا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ کہانیاں سن سن کر یاکوف کو بھی ہنری اور ملک فرانس دونوں سے محبت ہوگئی۔

''یہ خوب بادشاہ تھا ہنری'' وہ کہتا۔ ''خوب آدمی تھا یعنی کہ اس کے ساتھ تو بیٹھ کر مچھلی کا شکار بھی کھیلا جا سکتا تھا یا جو جی چاہے۔''

یاکوف کو کسی بات پر زیادہ جوش نہ آتا تھا نہ ہی وہ کبھی سوالات کر کے کہانی کو بیچ میں ٹوکتا، خاموشی سے سنتا رہتا، بھویں سکیڑے، چہرے پر ایسا تاثر رہتا جو کسی دم نہ بدلتا جیسے کوئی قدیم چٹان۔ کائی لگی ہوئی چٹان اپنی جگہ پر جمی ہو۔ لیکن ہاں اگر کسی وجہ سے میں رک جاتا تو وہ فوراً کہتا:

''ختم ہوگئی؟''

''نہیں۔ ابھی تو نہیں۔''

''تو پھر کہو نہ۔ رک کیوں گئے!''

ایک مرتبہ جب ہم لوگ فرانسیسیوں کے متعلق بات کر رہے تھے تو اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا:

''بہت اچھے ٹھنڈے رہے تھے نا وہ لوگ...''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اب جیسے ہم تم ہیں ہمیشہ گرمی میں رہتے ہیں، گرم رہتے ہیں کیونکہ دوڑ بھاگ کرتے ہیں، کام کرتے ہیں، محنت کرتے ہیں۔ مگر وہ لوگ ٹھنڈے ٹھنڈے اور اچھے اچھے رہتے محنت کرتے ہیں۔ مگر وہ لوگ ٹھنڈے ٹھنڈے اور اچھے اچھے رہتے تھے۔ کچھ کرنے کو نہیں تھا بس شراب پینا، سیر کرنا۔ یہ بھی زندگی بسر کرنے کا کیا مزے دار طریقہ ہے!''

''کام وہ لوگ بھی کرتے تھے''میں نے کہا۔

''لیکن جو کہانیاں تم نے سنائی ہیں ان سے تو یہ نہیں معلوم پڑتا''اس نے نہایت صحیح اعتراض کیا اور اس وقت ایک دم سے مجھ پر یہ کھلا کہ جو کتابیں میں نے پڑھی تھیں اس میں بہت زیادہ کتابیں ایسی جو واقعی یہ نہیں بتاتی تھیں کہ عوام کس طرح محنت کرتے تھے، مشقت اٹھاتے تھے یا یہ کہ وہ کون تھے جن کی محنتوں کے سہارے ان بہادروں کی شجاعت کی یہ عظیم عمارت کھڑی تھی۔

''اچھا، بھئی اب سوچتے ہیں کہ ذرا ایک جھپکی لے لیں''یاکوف کروٹ لے کر بولا اور پل بھر بعد اس کے خراٹے بھی سنائی دینے لگے۔

خزاں کے موسم میں جب دریائے کاما کے ساحل سرخی مائل بھورے نظر آنے لگے، درختوں پر زردی چھا گئی اور سورج کی ترچھی شعاعیں پھیکی پڑنے لگیں تو یاکوف یکایک اسٹیمر چھوڑ کر چلا گیا۔ پچھلی ہی شام کو اس نے مجھ سے کہا تھا:

''الیوشا، پرسوں ہم اور تم پیرم کی بندرگاہ پر اتریں گے ضرور! وہاں حمام میں خوب نہائیں گے، بھاپ لیں گے خوب بھر کے اور پھر وہاں سے کسی ایسے شراب خانے میں چلیں گے جہاں ذرا گانا بجانا بھی ہو۔ بڑا لطف آئیگا۔ ہائے جب وہ ساز بجتا تو مجھے کتنا اچھا لگتا تھا۔''

لیکن ہوا یوں کہ سارا پول میں ایک موٹا تھل تھل آدمی اسٹیمر پر سوار ہوا۔ اس کے چہرے پر مونچھ داڑھی نہیں تھی، چہرہ بھی عورتوں کی طرح لگتا تھا، وہ ایک لمبا سا کوٹ پہنے تھا اور کنٹوپ جس سے اس کی صورت اور بھی عورتوں کی طرح لگنے لگی تھی۔ اس نے فوراً باورچی خانے کے پاس ہی کے کونے میں ایک میز کا انتخاب کیا جہاں کافی گرمی تھی، چائے منگوائی اور کوٹ یا ٹوپی اتارے بغیر چائے پینے لگا۔ وہ پسینے میں نہا رہا تھا۔

خزاں کے بادل چھائے ہوئے تھے اور ان میں سے ہلکی ہلکی پھوار رس رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جب بھی وہ آدمی اپنے چارخانے دار رومال پسینہ آتا ہے تو بارش تیز ہو جاتی ہے۔

پھر جلد ہی یاکوف اس کے پاس بیٹھا نظر آنے لگا اور وہ دونوں مل کر ایک جنتری میں نقشہ دیکھنے لگے۔ اس مسافر نے انگلی سے کچھ نشان بنایا اور خلاصی بڑے اطمینان سے بولا:

''تو پھر کیا؟ میرے ایسے آدمی کے لئے یہ کونسی ایسی بڑی بات ہے۔ تھڑی ہے اس پر...''

''شاباش'' مسافر نے باریک آواز میں کہا اور جنتری کو اٹھا کر اپنے پاؤں کے پاس رکھے ہوئے چمڑے کے تھیلے میں ٹھونس دیا۔ پھر وہ دونوں مل کر آہستہ آہستہ بات کرتے اور چائے پیتے رہے۔

جب یا کوف کی بھئی جھوکنے کی باری آئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ یہ آدمی کون ہے۔ وہ ذرا سا ہنس کر بولا:

''بالکل گل بنفشہ لگتا ہے۔ ہے نا؟ لگتا ہے نا؟ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ زنخا ہے۔ سائبیریا کا رہنے والا ہے۔ بہت دور سے آیا ہے عجیب چڑا ہے یہ بھی منصوبے بناتا ہے اور ان پر عمل کرتا ہے...''

یہ کہہ کر وہ چل دیا، اس کے ننگے پاؤں عرشے پر دھپ دھپ پڑ رہے تھے۔ سخت اور سیاہ ایڑیاں جیسے کھر۔ چلتے چلتے وہ رکا اور مڑ کر پسلیاں کھجاتا ہوا بولا:

''میں نے تو بھائی اپنے آپ کو اس کے ہاتھ کرائے پر دے دیا۔ جیسے ہی پیرم پہونچیں گے، میں اسٹیمر سے اتر پڑوں گا اور پھر الوداع، الیوشا! پہلے تو ہم لوگ ریل سے چلیں گے۔ پھر ایک دریائی سفر ہوگا، پھر گھوڑے کی، سواری کرنی ہوگی، پانچ ہفتے میں سفر طے ہوگا۔ ذرا دیکھو انسان دینگتا کتنی دور جا نکلتا ہے...''

میں یا کوف کے اس اچانک فیصلے پر حیران رہ گیا۔ بولا:

''تم اس جانتے ہو؟''

''ارے میں کیسے جان سکتا ہوں؟ میں نے کبھی اسے دیکھا ہی نہیں اور جہاں کا یہ رہنے والا ہے، وہاں میں کبھی گیا ہی نہیں ہوں...''

اگلی صبح یا کوف ایک چھوٹا سا چکٹا، بھیڑ کیا کھال کا کوٹ، تنکوں کی پچکی ہوئی ہیٹ جو کبھی 'ننھے بھالو کی ہوا کرتی تھی، اور چھال کے بنے ہوئے کھردرے جوتے پہنے نمودار ہوا۔ اس نے آہنی انگلیوں سے میرا ہاتھ دبایا اور کہا:

''آؤ چلتے ہو میرے ساتھ۔ کیوں؟ وہ گل بنفشہ تمہیں بھی لے چلیں گا۔ بس میرے کہنے کی دیر ہے۔ کہوں تو کہہ دوں؟ بہت کرے گا تو وہ چیز کاٹ ڈالے گا جس کے بغیر بھی تمہارا کام چل سکتا ہے۔ اور اس کے عوض میں تم کو پیسے دے دے گا۔ جب یہ لوگ کسی کو آختہ کرتے ہیں تو انہیں بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اس کی باقاعدہ قیمت بھی ملتی ہے۔''

وہ زنحا عرشے پر کھڑا تھا، بغل میں ایک سفید بنڈل دبا ہوا۔ دھندلی آنکھوں سے وہ یاکوف کو تک رہا تھا اور اس کا جسم ایسا بھاری اور پھولا ہوا لگ رہا تھا جیسے کوئی آدمی پانی میں ڈوب کر پھول گیا ہو۔ میں نے منہ ہی منہ میں اس پر لعنت بھیجی اور یاکوف نے ایک بار پھر میرا ہاتھ اپنی آہنی انگلیوں میں پکڑ لیا۔

''تھڑی ہے اس پر! ہر شخص خدا کی درگاہ میں اپنے طور پر دعائیں مانگتا ہے۔ تو پھر تمہیں کیا؟ اچھا بھئی، الوداع! خدا کرے تم خوش رہو!''

اور اس طرح یاکوف شوموف چلا گیا۔ ریچھ کی طرح بھاری بھاری قدم اٹھاتا، جھومتا۔ اور میرا دل طرح طرح کے جذبات سے چھلنی ہوا جا رہا تھا۔ مجھے یاکوف پر ترس آ رہا تھا، غصہ بھی۔ اور مجھے یاد ہے کہ اس وقت مجھے اس کے لئے خطرے کا بھی احساس ہوا تھا اور اس سے رشک بھی پیدا ہوا تھا کہ آخر وہ دور دراز مقام کے لئے یوں اچانک کیسے روانہ ہو گیا؟

آخر کس قسم کا آدمی تھا یہ۔ یہ یاکوف شوموف؟

12

موسم خزاں کے آخر میں جب اسٹیمر رک گئے تو میں مقدس شبیہوں کی ایک دوکاں میں کام سیکھنے لگا۔ وہاں مقدس شبیہوں اور تصویروں کو رنگا جاتا تھا۔ لیکن ابھی سیکھتے ہوئے دوسرا ہی دن ہوا تھا کہ میری شرابی اور گلگلی بوڑھی مالکن نے مجھ سے کہا:

''دیکھو آج کل دن چھوٹے ہوتے ہیں اور راتیں لمبی، اس لئے تم صبح کو تو دوکان میں مال بیچنے میں مدد کر دیا کرو اور رات کو سیکھا کرو!''

اس نے مجھے ایک چھوٹے سے قد کے پھرتیلے اسسٹنٹ کے حوالے کیا جو خوبصورت اور جوان تھا۔ جاڑوں میں منہ اندھیرے ہی ہم دونوں ایلینکا گلی سے ہوتے ہوئے پورا شہر پار کرتے ہوئے نچلے بازار پہونچتے جہاں بازار کی دوسری منزل میں دوکانیں تھیں۔ اوپر کی دوکانوں میں ہماری یہ دوکان پہلے گودام ہوا کرتی تھی، چھوٹی سی اور اندھیری سی تھی۔ لوہے کا دروازہ لگا تھا اور ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جو چھجے میں کھلتی تھی۔ یہ چھجہ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیلا ہوا تھا اور اس پر ٹین کا چھپر تھا۔ ہماری دوکان میں بڑی چھوٹی مقدس شبیہیں، مقدس تصویریں اور ان کو لگانے کی فریمیں اٹم اٹ بھری پڑی تھیں،

بعض سادی اور بعض میں نقش ونگار کھدے ہوئے یا رنگے ہوئے۔ اس دوکان میں مذہبی کتابوں کا بھی اسٹاک تھا۔ ان کی جلدیں زرد چمڑے کی تھیں اور قدیم سلاف خط میں لکھی ہوئی تھیں۔ ہمارے پہلو ہی میں مقدس شبیہوں اور مذہبی کتابوں کی ایک اور دوکان تھی۔ اسے جو سوداگر چلاتا تھا، اس کی داڑھی سیاہ تھی۔ یہ سوداگر ایک ایسے بڑے آدمی کا رشتہ دار تھا جو دریائے والگا کے اس پار کیرژینیتس علاقے میں بہت مشہور تھا اور پرانے عیسائی مذہب کا بڑا کٹر پیرو تھا۔ اس دوکاندار کا ایک لڑکا بھی تھا۔ کچھ عجب ٹھٹھرا ہوا سا، میرے برابر عمر ہوگی لیکن بڑے بوڑھوں کی سی صورت اور ہر وقت گھومتی ہوئی، چوہے جیسی آنکھیں۔

میرا کام یہ تھا کہ دوکان کھولنے کے بعد سب سے قریب کے شراب خانے میں جا کر گرم پانی لے آؤں۔ تب ہم دونوں چائے پیتے اور چائے پی کر میں دوکان کی چیزیں ٹھیک ٹھاک کر کے جماتا اور ہر چیز کی جھاڑ پونچھ اور صفائی ستھرائی کرتا۔ جب سب چیزیں اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھی جائیں تو پھر میرا یہ کام تھا کہ چھجے میں کھڑا رہوں اور اس کی کوشش کروں کہ گاہک لوگ ہمارے پہلو کی دوکان میں جانے کے بجائے ہمارے یہاں آئیں۔

دوکان کے اسسٹنٹ نے مجھ سے کہا تھا:

''گاہک لوگ بڑے بےوقوف ہوتے ہیں۔ ان کو اس سے کیا بحث کہ کیا خرید رہے ہیں، بس اگر سستا مال ہے تو ٹھیک ہے۔ ان کو اس کی زیادہ تمیز نہیں ہوتی کہ کون سی چیز بڑھیا اور کون سی چیز گھٹیا ہے!''

وہ مجھے سبق دیتے وقت وقت بڑی پھرتی سے تصویروں کے تختوں کو آپس میں ٹکراتا اور اپنے ماہر ہونے پر اتارتا:

''دیکھو یہ کیا بڑھیاں کام ہے۔ بہت سستا ہے، چار انچ لمبا، تین انچ چوڑا۔ ان داموں بے حد سستا۔ یہ دیکھو چھ انچ اور سات انچ... اتنی قیمت میں کہاں مل سکتا ہے؟ دیکھو ان اولیا کو جانتے ہو؟ اچھا اب یاد رکھنے کی کوشش کرو۔ یہ وانیفاتی ہے جو شرابیوں کو شراب نجات دلانے والا ولی ہے۔ یہ شہید واروارا ہے۔ دانت کے درد اور ناگہاں موت سے حفاظت کرنے والی۔ یہ واسیلی مجذوب۔ بخار اور سرسام کے لئے... اور پاک مریم کے مختلف روپ جانتے ہو؟ یہ غمگین پاک مریم، یہ تین ہاتھوں والی پاک مریم، یہ پاک مریم گریاں اور اشک بار، یہ تین ہاتھوں والی پاک مریم، یہ پاک مریم گریاں اور اشک بار، یہ پاک مریم بہ تسکین غم من۔''

یہ مجھے پاک مریم کی مختلف قسم کی شبیہوں اور تصویروں کے متعلق سب باتیں فوراً پاک مریم کی مختلف قسم کی شبیہوں اور تصویروں کے متعلق سب باتیں فوراً یاد ہوگئیں اور یہ بھی یاد ہوگیا کہ سائیز کے اور کام کے اعتبار سے کس مقدس شبیہہ کی کتنی قیمت ہے لیکن مختلف اولیا کے جو مختلف فائدے تھے وہ مجھے کسی طرح یاد ہی نہیں ہوتے تھے۔

دوکان کا اسسٹنٹ جب بھی دیکھتا کہ میں دوکان کے دروازے پر خیالات میں غرق بیٹھا ہوں تو فوراً میری ان معلومات کا امتحان لینے لگتا:

''دردزہ کے وقت مشکل کشائی کرنے والے ولی کون ہیں؟''

اگر میرا جواب غلط ہوتا تو بڑی حقارت سے کہتا:

''یہ تیری کھوپڑی کس مصرف کی ہے رہے؟''

گاہکوں کو خریداری پر آمادہ کرنا ایک اور مصیبت تھی۔ دراصل تو مجھے صلیبی شبیہیں بھدی لگتی تھیں اور میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ انہیں گاہکوں کے سر تھوپوں۔ نانی اماں کی کہانیاں نے تو مجھ پر یہ تاثر چھوڑا تھا کہ پاک مریم نوجوان اور نیک اور خوبصورت تھیں۔ رسالوں میں بھی وہ تصویروں میں حسین نظر آتی تھیں۔ لیکن ان بتوں اور تصویروں میں وہ کھوسٹ اور بھیانک لگتی تھیں، لمبی انکسی کی سی ناک، لکڑی کے سے اکڑے ہوئے ہاتھ۔

جب بازار لگتا یعنی بدھ اور جمعہ کو تو ہم لوگوں کی بکری اچھی ہو جاتی تھی۔ ہمارے زینوں پر مسلسل دیہاتیوں کے قدم چڑھتے رہتے، بوڑھی عورتیں اور کبھی کبھی پورے کے پورے خاندان۔ یہ سب ہی پرانے مذہب کے پیرو ہوتے تھے، والگا کے اس پار جنگلات سے آتے تھے اور شہر کی ہر چیز کو شبہہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ دور سے مجھے کوئی اینڈا آدمی نظر آتا، بھیڑ کی کھال کے لبادے میں لپٹا، گھر کی بنی ہوئی کھادی پہنے، آہستہ آہستہ جھجھے سے چلتا ہوا آتا جیسے ڈر رہا ہو کہ کہیں گر نہ پڑے، اور مجھے اس کو گھیرتے شرم اور گھبراہٹ محسوس ہوتی۔ بڑی مشکل سیاپنے تئیں کو گھسیٹ گھساٹ کر میں اس کے سامنے کھڑا ہوتا اور ہوتا اور اس کے بھاری قدموں میں مچھر کی طرح بھنبھناتا، چکراتا چلتا:

''آیئے جناب! آپ کو کیا درکار ہے؟ مذہبی رسالے، دعاؤں کی کتابیں، تفریح اور تشریح والی انجیل، یفریم سیرین اور کیریل کی تصنیفیں! کم از کم دیکھنے کی تو تکلیف گوارہ کریں جناب! آپ جیسے بھی

صلیبی بت چاہیں گے آپ کو ملیں گے۔ الگ الگ دا، بہترین کام، طرح طرح کے بہترین رنگ! ہم لوگ آرڈر بھی لیتے ہیں جس ولی کی تصویر کہیے گا رنگ کر حاضر کر دی جائے گی، اگر کسی کے خاص ولی کی تصویر بنوانی ہو تحفے کے واسطے تو بن جائے گی، یا آپ کے خاندانی پیر کی تصویر، یا پاک مریم کی تصویر؟ ہماری دوکان میں روس بھر کا بہترین کام بنتا ہے! ہماری دوکان شہر بھر میں بہترین ہے!''

لیکن وہ بے اثر گاہک ایک بار تو خاموشی سے گھورتا جیسے میں کوئی کتا تھا، پھر یکا یک اپنے سخت ہاتھ سے مجھے ایک طرف کو دھکیل کر پڑوسی کی دوکان میں گھس جاتا اور ہمارا اسسٹنٹ اپنے بڑے بڑے کان ملتے ہوئے بھر کر کہتا:

''ہوں، تو تو نے ہاتھ سے کھو دیا نہ گاہک کو۔ ہنہنہہ، اچھا دوکان دار ہے...''

اور دوسری دوکان سے آنکھوں میں دھول جھونکتی ہوئی میٹھی آواز سنائی دیتی:

''ارے صاحب! ہم لوگ کوئی بھیڑ کی کھال نہیں بیچتے ہیں، چمڑے کے جوتے نہیں فروخت کرتے ہیں، ہم خدا کی برکت آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ جو سونے چاندی سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتی ہے، دنیاوی قیمتوں سے بہت زیادہ بلند ہوتی ہے...''

ہمارا اسسٹنٹ جل کے کہتا:

''جہنم میں جائے یہ سب! دیکھو ذرا کیسا وہ اس دیہاتی کے پھریری لگا رہا ہے کان میں! اس سے سبق سیکھ!''

میں اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ اگر میں نے کوئی کام شروع کر دیا ہے تو اب اس کو قاعدہ سے کروں۔ اس لئے میں نہایت شعوری کوشش کرتا کہ کاروبار کے گر سیکھوں۔ لیکن گاہکوں کو پھانس کر ان سے چیزیں خریدوانے کی صلاحیت مجھ میں نہ تھی۔ مجھے ہمیشہ ان خاموش، پریشان حال کسانوں اور بوڑھی چاھیا جیسی عورتوں پر ترس آنے لگتا تھا جن کے چہروں پر ہر وقت خوف اور زبوں حالی چھائی رہتی تھی جیسے کسی نے ابھی ان کو پھانسی کے تختے پر سے اتارا ہے۔ میرا دل برابر یہی چاہتا کہ ان کے کان میں کہہ دوں کہ مقدس شبیہوں کی اصلی حقیقت کیا ہے تا کہ ان کی کوئی چونی یا اٹھنی بچ ہی جائے۔ وہ مجھے اس قدر مفلس اور فاقہ زدہ لگتے تھے کہ میں یہ کبھی تصور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ مناجات کی کتاب کے لئے وہ ساڑھے تین روبل دیں گی۔ یہی کتاب سب سے زیادہ خریدی جاتی تھی۔

میں ان کی کتابوں کے متعلق معلومات یا مقدس شبیہوں پر بنے ہوئے کام کی پرکھ دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا۔ ایک دن ایک بالکل سفید بالوں والا بوڑھا جسے میں اپنی دوکان میں پھانسنے کی کوشش کر رہا تھا مجھ سے کہنے لگا:

''کیوں جھوٹ بولتے ہو میاں لڑکے! تمہاری دوکان روس کی بہترین دوکان کیسے ہو سکتی ہے؟ ماسکو میں روگوژین کی دوکان بہترین ہے!''

میں شرم کے مارے پیچھے ہٹ گیا اور وہ سیدھا نکل گیا اور پڑوس کی دوکان میں بھی نہیں داخل ہوا۔

اسسٹنٹ حقارت سے بولا:

''کیوں، دے گیا چرکا؟''

''ٹھیک ہے مگر آپ نے مجھے روگوژین کی دوکان کے متعلق کبھی نہیں بتایا تھا...''

اسسٹنٹ گالیاں دینے لگا:

''یہ اسی قسم کے گھنے چھچھوندر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ادھر ادھر سونگتے پھرتے ہیں اور سب معلوم کئے رہتے ہیں اور پھر شیخیاں بگھارتے ہیں۔ سانپ کہیں کے...''

یہ اسسٹنٹ خود بڑا شیخی خود اور اینٹھو آدمی تھا۔ اپنی صورت پر بہت اتراتا تھا، کسانوں سے اس کو نفرت تھی۔ اچھے موڈ کے لمحوں میں کہتا:

''میں سمجھدار آدمی ہوں اور مجھے صاف ستھر چیزوں سے اور خوشبو سے شوق ہے جیسے عود عطر، کیوڑا، ایسی چیزیں اور ذرا یہ ستم ظریفی دیکھو کہ میرے جیسا باذوق انسان اور ان کسانوں کے سامنے جھکتا اور دوھرا ہوتا پھرے۔ صرف اس لئے کہ دوکان کی جو مالکن ہے اس کی نفع کی چوٹی بنی رہے! نہ جانے کیسے میں یہ سب برداشت کرتا ہوں! آخر ان کسانوں کی ہستی ہی کیا ہے؟ سڑے ہوئے گنوار! زمین پر رینگتی ہوئی جوئیں! اور مجھے دیکھو کہ...''

وہ مارے کوفت کے اور آگے نہ کہہ سکتا۔ چپ ہو جاتا۔

لیکن مجھے یہ کسان لوگ اچھے لگتے تھے۔ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک چیستاں ہے، ایک پہیلی ہے جیسے کہ مجھے یاکوف کے متعلق محسوس ہوتا تھا۔

بھد بھد کرتا کوئی کسان دوکان میں داخل ہوتا، بھیڑ کی کھال کے اوپر بھی ایک لبادا لپیٹے، جھبرے

سمور کی ٹوپی اتارتا، دو انگلیوں سے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتا، آنکھیں کونے میں، مقدس شبیہہ پر جلتے ہوئے چراغ پر جمی رہتیں، پھر مڑتا، اس بات کی کوشش کرتا کہ جو مقدس شبیہہ پاک نہیں کی گئی تھی اس پر نظریں نہ پڑیں، اور آخر کار چپ چاپ چاروں طرف نظریں دوڑا کر کہتا:

''اچھا تو وہ مناجات کی کتاب دیکھیں!''

اپنے لبادے کی آستینیں چڑھا کر وہ سرورق کے حروف کو بڑے غور سے پڑھتا، مٹیالے تڑخے ہوئے لب خاموشی سے ہلتے جاتے:

''اس سے پرانا نسخوں کی قیمت تو ایک ہزار روبل ہوتی ہے، آپ جانیں...''

''ہاں ہم جانتے ہیں۔''

وہ اپنی انگلی میں تھوک لگا کر ورق الٹتا اور حاشیہ پر ایک سیاہ دھبہ ابھر آتا۔ اسسٹنٹ غصے میں اس کے سر پر ادھر کی طرف گھورتا اور کہتا:

''کلام پاک سب ایک ہی ہے۔ خدا کا کلام بدلتا نہیں۔ نہ نیا پرانا ہوتا ہے...''

''یہ سب ہم نے بہت سنا ہے! خدا تو اس کو نہیں بدلتا مگر نیکون نے تو اس کو بدلا ہے۔'' کتاب بند کر کے وہ کسان گاہک خاموشی سے باہر کھسک لیتا۔

کبھی کبھی یہ دور دراز جنگلوں کے رہنے والے اسسٹنٹ سے بحث کرتے اور مجھے صاف نظر آتا کہ مقدس تحریروں کے متعلق ان کو اسسٹنٹ سے زیادہ معلومات ہوتی تھیں۔ اور وہ کھسیا کر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا:

''بے دین وحشی کافی!''

میں یہ بھی دیکھتا تھا اگرچہ ماڈرن قسم کی مذہبی کتابیں کسانوں کو پسند نہیں آتی تھیں پھر بھی وہ ان کا احترام بہت کرتے تھے اور اس طرح ان کو ہاتھ میں لیتے جیسے وہ چڑیاں ہیں کہ موقع ملے گا تو اڑ جائیں گی۔ مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوتی تھی کیونکہ میرے لئے کتاب ایک عظیم الشان چیز تھی اور اب بھی ہے، جس میں لکھنے والے کی روح چھپی رہتی ہے۔ اور جب کبھی بھی میں کوئی کتاب پڑھتا تھا تو روح اس میں سے نکل کر مجھ سے باتیں کرنے لگتی۔

اکثر یہ کسان بوڑھے یا بڑھیا ہمارے یہاں پران کتابیں بیچنے بھی آتے تھے۔ یہ کتابیں نیکون کے

وقت سے پہلے کی ہوتی تھیں۔ یا پھر اسی طرح کی کتابوں کی نقلیں لاتے تھے جو ارغیزی اکیرژینیتس کے راھبوں کے ہاتھ کی نہایت خوش خط اور حسین لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ ولیوں وغیرہ کی زندگیوں کے قصے جن کو دمیتری روستوفسکی نے چھوا بھی نہیں تھا، قدیم قسم کی مقدس شبیہیں، ہر قسم کی سلیبیں اور تصویریں، پیتل کی مینا کاری کے سامان، سمندری علاقوں کے دھات کے کام، چاندی کی ڈوئیاں جو ماسکو کے شہزادوں ادھر ادھر کے شراب خانوں کو فیاضی کے موڈ میں بخشتے تھے۔ یہ وہ تمام چیزیں لاتے اور چپکے چوری بیچتے۔ ادھر ادھر گھبرائی گھبرائی نظروں سے دیکھتے جاتے۔

ہمارا اسسٹنٹ اور ہمارا پڑوسی دونوں اس طرح کی چیزوں کے انتظار میں رہتے اور کم سے کم دام پر خریدنے میں ایک دوسرے سے بازی لیجانے کی کوشش کرتے۔ قدیم سے قدیم قیمتی چیز کے لئے بھی ایک دو دس پچاس روبل سے زیادہ نہ دیتے، وہ قدیم مذہب کے دولت منہ پیروں کے ہاتھ ہزاروں روبل میں بیچتے۔

اسسٹنٹ مجھ سے سمجھا کے کہتا:

''ان بڈھی چڑیلوں اور ان بوڑھوں پر ذرا کڑی نگاہ رکھا کرو! انکی گٹھریوں میں خزانہ بھرا ہوتا ہے،، خزانہ۔''

جب کبھی اس طرح کوئی اچھی چیز بکنے آتی تو وہ مجھ کو بھیج کر پیوتر واسیلی وچ کو بلواتا۔ یہ شخص پرانی کتابوں، شبیہوں اور مجسموں اور ایسی ہی قدیم چیزوں کو پرکھنے میں بڑا ماہر تھا۔

وہ لانبے قد کا بوڑھا آدمی تھا، ذہین آنکھیں، خوشگوار صورت اور واسیلی مجذوب کی سی لمبی داڑھی۔ اسکے ایک پاؤں کی انگلیاں کٹی ہوئی تھی اس لئے ہمیشہ لمبے عصا کے سہارے لنگڑاتا ہوا چلتا تھا جاڑا ہو یا گرمی وہ ایک ہلکا سا کوٹ پہنتا تھا جو پادریوں کے عبا کی طرح ہوتا تھا، سر پر ہنڈیا کی شکل کی مخملی ٹوپی ہوتی تھی۔ عام طور پر تو وہ سیدھا ہو کر تیز تیز چلتا تھا لیکن دوکان میں داخل ہوتے ہی فوراً اس کے کنارے ڈھل جاتے تھے، آہستہ سے ٹھنڈی سانس بھرتا، بار بار سینے پر صلیب کا نشان دو انگلیوں سے بناتا۔ پرانے مذہب کے طریقے سے۔ اور دعائیں اور مناجات بدبدانے لگتا۔ بزرگی اور اتقا کے اس مظاہرے سے نایاب چیزیں بیچنے والوں کی روحیں متاثر ہو جاتیں اور ان پر رعب چھا جاتا، ان کو بھروسہ پیدا ہو جاتا۔

پھر وہ بڑے میاں پوچھتے:

''یہ آپ لوگ مجھ سے کیا دنیاوی بات چیت کرنے تشریف لائے ہیں؟''

''یہ شخص یہ صلیبی تصویر لایا ہے۔ کہتا ہے یہ استروگانوف کی صنعت کاری ہے۔''

''کس کی؟''

''یہ کہتا ہے کہ یہ استروگانوف کی بنائی ہوئی صلیبی تصویر ہے۔''

''اچھا، میں ذرا اونچا سنتا ہوں۔ خداوند نے میرے کانوں کو نیکون کے ماننے والوں کی بات سننے سے محفوظ کر دیا ہے۔ تعریف ہو خدا کی...''

پھر وہ اپنی ٹوپی اتارتا اور صلیبی تصویر کو ٹیڑھا پکڑ کر ادھر ادھر گھماتا، رنگ کی سطح کو غور سے دیکھتا، پہلوؤں سے دیکھتا، لکڑی کی کرسی کو چھوتا اور آنکھیں میچ کر بڑبڑاتا:

''نیکون کے بے دین پیروؤں نے جب دیکھا کہ ہم لوگ قدیم صنعت کاری کے بڑے قدردان ہیں تو شیطان نے ان کو یہ سکھایا کہ آج کل وہ لوگ بڑی خوبی کے ساتھ ان مقدس شبیہوں کی نقل کرنے لگے ہیں۔ ایک نظر دیکھو تو تصویر استروگانوف یا اوستیوگ کی بنائی ہوئی لگتی ہے یا سوزدال کی بھی معلوم ہو سکتی ہے لیکن دل کی نگاہیں فوراً اس کا جھوٹ سچ پہچان لیتی ہیں!''

اگر وہ کہہ دیتا تھا کہ وہ بت یا تصویر نقل ہے تو اس کے معنی یہ تھے کہ وہ ضرور اصلی اور نادر و نایاب ہے۔ اس طرح کے کئی اور مقررہ اشارے اور جملے تھے جن سے اسسٹنٹ کو پتہ چل جاتا تھا کہ وہ اس کو کتنا روپیہ دے۔ مجھے معلوم تھا کہ اسی فقرہ ''رنج و مایوسی'' کے معنی تھے دس روبل'' ''نیکون چیتا'' کے معنی تھے پچیس روبل۔ وہ لوگ جس طرح بیچنے والے کو دھوکہ دیتے تھے اسے دیکھ کر شرم آتی تھی لیکن وہ بوڑھا اس مزے سے چالیں چلتا تھا کہ میں اس کو دیکھ کر حیران رہ جاتا اور ایک عجیب سی کرید لگی رہتی کہ دیکھیں اب آگے کیا کہتا ہے۔

''یہ ج ونیکون کے پیرو ہیں نا، اس نیکون چیتے کے ماننے والے، کالا منہ ان کا، تو ان کو شیطان بہکا کر بہت سی حرکتیں کرواتا ہے۔ اب یہ دیکھئے، آپ یہ سمجھتے ہوں گے کہ یہ جس چیز پر پینٹ کیا گیا ہے کہ کپڑے وغیرہ بھی اسی ہاتھ نے بنائے ہوں گے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ غور سے دیکھئے، چہرہ دوسرے برش سے بنایا گیا ہے! وہ جو سیمون اوشاکوف جیسے پرانے استاد تھے (مانا کہ وہ کافر تھا) مگر وہ لوگ ساری تصویر خود ہی رنگتے تھے، کپڑے بھی، چہرہ بھی، یہاں تک کہ تختے کا حاشیہ بھی خود بھی بناتے تھے، سطح بھی خود ہی

رگڑتے تھے۔لیکن اب آج کل کے بد بخت بنانے والے ایسے کب ہیں!صلیبی تصویریں بنانا تو خدمت خداوندی ہوا کرتی تھی اوراب یہ بس کھانے کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے!''

آخر کار وہ تصویر کو یا بت کو اٹھا کر کونٹر پر رکھتا اور بڑی احتیاط سے ٹوپی پہنتے ہوئے کہتا:

''لعنت ہوان کی روحوں پر۔''

اس فقرے کے معنی تھے۔ضرور خریدلو!

مال بیچنے والا بڈھے کی معلومات اور میٹھی میٹھی باتوں کے ریلے میں بہتے ہوئے بڑے احترام سے پوچھتا:

''اچھا، جناب، یہ تو بتائے شبیہہ کیسی ہے؟''

''شبیہہ۔نیکون کے پیرووں کی بنائی ہوئی ہے۔''

''نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔اسی شبیہہ کے آگے تو دادا پردادا نے دعایں مانگی ہیں۔''

''نیکون تمہارے دادا سے پہلے گزر چکا ہے۔''

بڈھا شبیہہ بیچنے والے چہرے کے پاس لے جاتا اور سختی سے کہتا:

''دیکھو، اس میں کنواری کے چہرے پر کتنی رنگینی ہے۔اسے کیا مقدس تصویر کہتے ہیں؟ یہ بس تصویر ہے، فن محض۔نیکون کی شرارت کی گواہ۔اس کام میں کہیں روح نظر آتی ہے؟ کیا میں جھوٹ بولوں گا؟ میں بوڑھا آدمی ٹھہرا، میں ہوں سچائی کا خادم جس نے زندگی میں بڑی سختیاں جھیلی ہیں۔اب میں تو اپنے پروردگار کے یہاں جانے والا ہوں۔آخر مجھے اپنا ایمان بیچ کر کیا ملے گا!''

دندناتا ہوا وہ دوکان سے باہر نکل جاتا اور بری طرح لڑکھڑاتا جیسے اسے اس بات کا بے حد صدمہ ہو کہ اس کے فیصلے کو شبہہ کی نظر سے دیکھا گیا۔دوکان دار تصویر کی قیمت چند روبل ادا کر دیتا اور بیچنے والا پیوتر واسیلی وچ کو جھک کر آداب بجالاتا اور رخصت ہوجاتا۔مجھے فوراً چائے کے لئے گرم پانی لانے کے واسطے قریب کے شراب خانے کو دوڑایا جاتا۔جب میں واپس آتا تو بڑے میاں کو دیکھتا کہ خوب چاق چوبند اپنی خریدی ہوئی چیز کو بڑے پیار سے دیکھتے ہوئے اسسٹنٹ سے کہہ رہے ہیں:

''ذرا دیکھو تو اس کا حسن سادہ اور اس کی نزاکت ہر لکیر میں خوف خدا جیسے سمو دیا گیا ہے، جیسے سمو دیا گیا ہے، جیسے ہر خاکی عنصر ختم ہوگیا ہو۔روح ہی روح ہو۔پاکیزگی ہی پاکیزگی...''

اسسٹنٹ کی آنکھوں میں خوشی کی چنگاریاں پھوٹتیں، مسرت سے ناچتے ہوئے کہتا:

''کسی کی بنائی ہوئی؟''

''یہ ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ بچہ ہو، ناتجربہ کار۔''

''کوئی قدردان بھلا اس کو کتنے میں خرید لے گا؟''

''ابھی نہیں کہہ سکتا۔ کسی کو دکھاؤں گا...''

''ہائے پیوترواسیلی وچ...''

''اور اگر میں نے اس کو بیچ دیا تو پچاس روبل تم کو ملیں گے اور جو کچھ بچیں گے وہ میرے!''

''ہائے...''

''بس کرو، بس کرو اپنی ہائے وائے...''

پھر وہ دونوں چائے پیتے اور شرمناک طریقے سے آپس میں بھاؤ تاؤ کرتے جاتے اور ایک دوسرے کو چوروں جیسی نظروں سے دیکھتے جاتے۔ صاف ظاہر تھا کہ اسسٹنٹ بالکل ان بڑے میاں کے رحم وکرم پر ہے اور جب وہ چلے جاتے تو اسسٹنٹ مجھ سے کہتا ''دیکھو خبردار، مالکن کو اس خرید وفروخت کی بھنک نہ لگنے پائے!''

جب بکنے کی تمام شرطیں طے ہو جاتیں تو اسسٹنٹ کہتا:

''کیوں پیوترواسیلی وچ، شہر کی کوئی خبر ہے؟''

بوڑھا اپنے زرد ہاتھ سے مونچھوں پر تاؤ دیتا، اس کے چکنے چکنے ہونٹ کھل جاتے اور پھر وہ سوداگروں کی زندگی کے متعلق اور تجارت کی کامیاب خرید وفروخت کے بارے میں اور بیماریوں اور شادیوں، اور بیویوں کی دھوکہ بازیوں وغیرہ کے متعلق داستانیں سنانی شروع کرتا۔ وہ اس طرح ان کہانیوں کے تانے بانے بنتا جیسے کوئی تجربہ کار باورچی چھلنی سے کچھ چھان رہا ہو، ساتھ ساتھ ہنستا جاتا۔ اسسٹنٹ کا گول چہرہ رشک اور مسرت کی آگ سے سرخ ہو جاتا اور آنکھوں میں خواب کی سی دھند چھا جاتی اور وہ شکایت کے لہجے میں کہتا جاتا:

''افوہ! بعض لوگ بھی کیا خوب زندگی بسر کرتے ہیں اور میں ہوں کہ...''

''ہاں اپنی اپنی قسمت ہے'' بوڑھے کی آواز گونجتی۔ ''کسی کی قسمت کو فرشتے چاندی کی ہتوڑیوں

سے سجل بناتے ہیں اور کسی کو شیطان کھٹل کلہاڑی سے ...''

وہ مضبوط بوڑھا جس کے جسم کے مچھلیاں ابھی تک تنی ہوئی تھیں، تقریباً تمام چیزوں سے واقف تھا۔ شہر کی پوری زندگی کا اس کو علم رہتا تھا، سوداگروں، کلرکوں، پادریوں اور دوسرے شہریوں کے سارے راز اس معلوم رہتے تھے۔ اس کی نگاہیں عقاب کی طرح تیز تھیں اور اس کی طبیعت میں جیسے بھیڑے اور لومڑی کا میل تھا۔ میرا جی تو ہمیشہ یہ چاہتا کہ اس کے خوب طعنے دوں لیکن وہ کچھ اس طرح میری طرف دیکھا کرتا تھا جیسے دور کھڑا ہوا دھند میں سے جھانک رہا ہو اور اس نظر کے سامنے میں ہمیشہ ہتھیار ڈال دیتا تھا کیونکہ سچ مچ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے چاروں طرف کوئی بہت گہری کھائی کھدی ہوئی ہے کسی نے اس نزدیک جانے کی کوشش کی اور اوندھے منہ سے اس میں گرا اور یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ یاکوف شوموف خلاصی اور اس بوڑھے میں کچھ بات مشترک تھی۔

اسسٹنٹ پر اس بوڑھے کی ہوشیاری کا جادو پوری طرح حاوی تھا، وہ اس کے منہ پر بھی اور پیٹھ پیچھے بھی اس بات کا اظہار بھی کیا کرتا تھا۔ لیکن اپنے موقعے سے اسسٹنٹ بڑے میاں کو ناراض کرنا اور ستانا چاہتا۔ کبھی کبھی وہ بڈھے سے نظریں چار کرتے ہوئے کہتا:

''افوہ، کیا آپ انسانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں!''

بڑے میاں بڑے اطمینان سے ہنسے:

''صرف خدا ہی ایک ایسی ہستی ہے جو انسانوں کو بے وقوف نہیں بناتا۔ ہماری دنیا احمقوں سے بھری پڑی ہے۔ اگر آپ کسی احمق کو احمق نہیں بنا سکتے تو اس احمق کے وجود سے فائدہ ہی کیا؟''

اسسٹنٹ نے بگڑ کر کہا:

''سب کسان بے وقوف نہیں ہوتے۔ سوداگر بھی آخر کسانوں میں سے ہی بنتے ہیں!''

''ہم ان کسانوں کی بات ہی نہیں کر رہے ہیں جو سوداگر بن جاتے ہیں۔ احمق لوگ کبھی فریب کار ہو ہی نہیں سکتے۔ بے وقوف لوگ تو ولی ہوتے ہیں مگر بغیر دماغ کے ولی!''

اور چنانچہ بڑے میاں اپنی بات کو کھینچتے جاتے، ان کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ انسان عاجز آ کر بحث چھوڑ دے۔ ایسا لگتا کہ انکو بھڑکانا ناممکن تھا۔ یا تو انہیں غصہ آتا ہی نہیں تھا یا پھر وہ اسے نہایت کامیابی کے ساتھ چھپا لیجاتے تھے۔

لیکن مجھ کو تو کبھی کبھی خود چھیڑتے میرے بالکل نزدیک آکر داڑھی کے اندر ہنستے اور کہتے:

''ہاں تو اس فرانسیسی ادیب کا کیا نام ہے۔انسان؟''

ناموں کو بگاڑ کر بولنے کا جوان کا طریقہ تھا اس پر میرا خون کھولنے لگتا تھا لیکن میں اپنے آپ کو قابو میں کر کے جواب دیتا ''پنسادے تیرال!''

''کیسا تیراک؟''

''احمق نہ بنئے! آپ بچہ نہیں ہیں۔''

''ہاں ہاں، ٹھیک کہتے ہو۔ میں تو واقعی بچہ نہیں ہوں۔اچھا تو یہ کیا پڑھ رہے ہو؟''

''یفریم سیرین۔''

''کون بہتر لکھتا ہے۔یفریم سیرین یا وہ کہانیاں لکھنے والے؟''

میں چپ رہا۔

وہ اصرار کرنے لگا:

''یہ کہانیاں لکھنے والے کیا لکھتے ہیں؟''

''جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کے متعلق لکھتے ہیں''

''کتوں اور گھوڑوں کے متعلق؟ اور بھی تو ہوتے ہیں!''

اسٹنٹ کھی کھی کرنے لگتا اور غصے سے میرے منہ میں جھاگ بھر آتا۔جی چاہتا بھاگ نکلوں لیکن بڑی مشکلوں سے اپنے آپ کو روک پاتا! اگر باہر جانے کی کوشش کرتا تو اسسٹنٹ کہتا:

''کہاں جا رہے ہو؟''

اور بڈھا میری صبر آزمائی کرتا رہتا:

''اچھا یہ پہیلی بوجھو! بڑا اعلی دماغ ہے یہ تمہارا! تمہارے سامنے ایک ہزار ننگے انسان کھڑے ہیں۔ پانچ سو مرد، پانچ سو عورتیں، اوران ہی میں آدم اور ہوا کو بھی ملا دیا گیا ہے۔تو تم کیسے پہچانو گے کہ آدم اور حوا کون سے ہیں؟''

کچھ دیر میرے پیچھے پڑے کے بعد وہ فتح مندی کے ساتھ خود ہی جواب دیتا:

''ارے خالی الذہن احمق! ان دونوں کو تو خدا نے بنایا تھا نا۔ پیدا تھوڑا ہی ہوئے تھے وہ۔تو اس

کے معنی یہ ہیں کہ ان کے ناف نہیں تھی!''

اس بڈھے کو اس قسم کی اتنی ''پہیلیاں'' آتی تھیں کہ جس کی حد نہیں۔ اور وہ مجھے سنا سنا کر پریشان کیا کرتا تھا۔

میں نے جب دوکان میں نوکری کی تو شروع میں اسسٹنٹ کو کچھ کہانیاں ان کتابوں کی سنائی تھیں جو میں نے پڑھی تھیں۔ اب مجھے اس کا بھگتان بھگتنا پڑا۔ اسسٹنٹ نے وہ سب پیوتر واسیلی وچ کو سنا دیں اور جان بوجھ کر بگاڑ بگاڑ کر اس میں الٹے سیدھے معنی پہنا کر اور بڈھے نے بھی گندے گندے سوالات پوچھ پوچھ کر اس کو اور تقویت پہنچائی۔ میرے محبوب یوگینی تر انڈے، لودمیلا اور ہنری چہارم پر ان کی گندی زبانوں نے خوب کیچڑ اچھالا۔

مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ کمینے پن سے یہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ صرف اکتاہٹ کا نتیجہ ہے اور کوئی بہتر کام ان کے پاس کرنے کو نہیں۔ لیکن اس سے مجھے کیا فائدہ؟ وہ سور کی طرح اپنی ہی گندگی میں لوٹتے اور چاروں طرف جو ایسی خوبصورت چیزیں ہوتیں جو ان کو عجیب لگتیں، جو ان کی سمجھ میں نہ آتیں، ان کو گندہ کر کے ان پر خاک ڈال کے سور ہی کی طرح خوشی سے خرخر کرتے اور اس کو بڑا مذاق سمجھتے۔

یہ پورا کا پورا بازار، اپنے سوداگروں اور دوکان کے اسسٹنٹوں سمیت ایک عجیب وغریب قسم کی زندگی کا حامل تھا۔ یہ لوگ بچوں جیسی شرارتیں کرتے تھے جو نہایت تکلیف دہ ہوتی تھیں۔ اگر کوئی کسان پہلے پہل ہمارے شہر میں آتا اور کسی جگہ کا پتہ پوچھتا تو یہ لوگ ہمیشہ اس کو غلط طرف کا راستہ بنا دیتے۔ اور اب یہ شرارت اتنی عام ہوگئی تھی کہ اب اس میں کسی کو مزا بھی نہیں آتا تھا۔ دوکاندار لوگ دو چوہے پکڑتے اور ان کی دمیں آپس میں باندھ دیتے۔ بیچارے جانور مخالف سمتوں کی طرف کھینچتے، کاٹتے، پنجوں سے نوچتے اور یہ لوگ کھڑے دیکھتے رہتے۔ بعض اوقات تو ان مظلوم جانوروں پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دیتے۔ یا کوئی خالی ٹین لے کر کسی کتے کی دم میں باندھ دیتے۔ جانور پنپناتا ہوا، چیختا ہوا، گھبرایا ہوا دوڑتا پھرتا۔ ٹین اس کے پیچھے دھڑ ادھڑ لڑھکتا جاتا اور تماشائی ہنسی سے لوٹ لوٹ جاتے۔

اس طرح کی اور بہت سی شرارتیں ہوتی رہتی تھیں گویا ہر شخص۔ اور خاص کر دیہات سے آنے والے کسان۔ اسی لئے پیدا ہوئے تھے کہ بازار میں تماشے کا سامان بنیں۔ یہ دوکاندار اور ان کے اسسٹنٹ ہر وقت موقع کی تاک میں رہتے تھے کہ کسی کا مذاق اڑائیں یا کسی کو دکھ یا تکلیف پہونچائیں۔

اور مجھے اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ میں نے جو کتابیں پڑھی تھیں اس میں اس رجحان کا کہیں ذکر نہیں تھا۔

اس بازار میں ایک احمقانہ شرارت خاص طور پر مجھے قابل نفرت اور تکلیف دہ معلوم ہوئی۔

ہماری دوکان کے نیچے اون اور فلٹ کے جوتوں کی ایک دوکان تھی۔ اس دوکان میں ایک اسسٹنٹ تھا۔ بے حد کھاؤ اور پیٹو۔ اس کی اس صفت کی شہرت تمام نچلے بازار میں پھیلی ہوئی تھی۔ جس دوکان پر وہ نوکر تھا اس کا مالک اپنے نوکر کی اس صفت پر اس طرح فخر کیا کرتا تھا جیسے لوگ اپنے شکاری کتوں کی درندگی یا اپنے گھوڑے کی طاقت پر کرتے ہیں۔ اکثر وہ پڑوسی دوکانداروں سے شرطیں بدا کرتا تھا:

''چلو کون دس روبل کی شرط لگاتا ہے؟ میں کسی سے بھی شرط بد سکتا ہوں کہ میشکا دو گھنٹے کے اندر اندر دس پاؤنڈ سور کا گوشت کھا سکتا ہے۔!''

لیکن میشکا کی اس صلاحیت پر شک کس کو ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اور دوکانداروں نے کہا:

''ہم شرط نہیں لگائیں گے لیکن ہم گوشت خرید دیں گے۔ چلو لگاؤ اس کو! ہم لوگ دیکھتے ہیں۔''

''مگر دس پاؤنڈ صرف گوشت ہو۔ ہڈیاں نہ ہوں!''

کچھ دیر اس موقع پر ریں ریں ریں کر کے بحث ہوتی رہی۔ پھر اندھیرے گودام سے ایک دبلا سا آدمی نکلا، گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی، داڑھی صفاچٹ، لمبا سا سوتی کوٹ پہنے، جسم پر تمام اون کے جھونز لپٹے ہوئے، کمر میں سرخ پٹکہ بندھا۔ اس نے بڑے احترام کے ساتھ چھوٹے سے سر سے ٹوپی اتاری، اپنے مالک کے گوشت بھر خشخشی داڑھی والے گول چہرے کو دھندل دھنسی ہوئی آنکھوں سے بغور دیکھا۔

''کیوں بھائی، اتنے گوشت کو پار کر دو گے؟''

میشکا نے بڑے ٹھہری ہوئی پرسکون آواز میں پوچھا:

''کتنی دیر میں؟''

''دو گھنٹے میں۔''

''مشکل ہے!''

''ارے تمہارے لئے کیا مشکل ہے؟''

''دو چار گلاس بیئر بھی چڑھوا دیجئے اس کے ساتھ!''

''شروع ہو گیا!'' اس کے مالک نے اپنے پڑوسی کی طرف فخریہ انداز میں دیکھا۔ ''اور یہ نہ سمجھنا کہ یہ خالی پیٹ پر کھا رہا ہے، ارے نہیں! ابھی صبح سیر بھر کی روٹیاں کھائی تھیں اور دوپہر کو بھی ڈٹ چکا ہے۔''

چنانچہ لوگ گوشت لائے اور تماشائی اکٹھے ہوئے۔ سب کے سب ہی سوداگر تھے۔ جاڑوں کے بھاری لگ رہے تھے، توندیں نکلی ہوئی، ننھی ننھی آنکھیں چربیلے چہروں میں غائب، اکتاہٹ کی چھاپ سب کی صورتوں پر۔

آستینوں میں ہاتھ گھسائے، وہ اس پیٹو کے چاروں طرف ایک تنگ سا دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ پیٹو کے ہاتھ میں اب ایک چھری اور ایک جئی کی ڈبل روٹی نظر آ رہی تھی۔ پہلے اس نے بار بار جلدی جلدی اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا، پھر اون کے گٹھر پر بیٹھ گیا، ایک پٹی پر گوشت رکھا اور اسے خالی نظروں سے اشتیاق کے ساتھ گھورنے لگا۔

پھر اس نے ایک باریک قاش روٹی کی کاٹی، ایک موٹی سی قاش گوشت کی اور ایک کو دوسرے پر رکھ کر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر منہ تک اٹھایا۔ کانپتے ہوئے ہونٹ، کتے کی طرح زبان نکال کر چاٹے اور پھر ایک دم سے اس کے جبڑے گوشت پر بیٹھ گئے۔

''لو شروع کر دیا اس نے!''

''وقت دیکھو۔''

سب آنکھیں اس پیٹو پر جمی تھیں، اس کے ہلتے ہوئے جبڑوں پر، کانوں کے پاس ادھر ادھر ہوتے ہوئے جبڑوں کی گول ہڈیوں پر، نکیلی ٹھڈی کے زیر و بم پر۔ کبھی کبھی لوگ بھنبھناتی ہوئی آواز میں رائیں دیتے:

''ریچھ کی طرح چبائے ڈال رہا ہے!''

''کبھی ریچھ کو دیکھا بھی ہے چباتے؟''

''میں کیا کوئی جنگلوں کا رہنے والا ہوں جو ریچھ کو چباتے دیکھتا؟ مثل سنی ہے کہ ریچھ کی طرح چبا رہا ہے۔''

''مثل یون نہیں ہے۔ وہ یوں ہے۔ سور کی طرح چبا رہا ہے۔''

''سور کب سور کو کھا سکتا ہے؟''...''

وہ لوگ بے جان طور پر ہنسنے لگے اور پھر کسی لال بجھکڑ نے کہا:

''سور سب کچھ کھا سکتا ہے۔ اپنی اولاد کو، اپنی بہن کو بھی...''

رفتہ رفتہ اس پیٹو کا چہرہ سرخ ہونے لگا، کان نیلے پڑنے لگے، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں کے ڈھیلے باہر کو ابلنے لگے، سانس چڑھنے لگی۔ لیکن ٹھڈی کا زیر و بم اسی طرح برابر مسلسل قائم رہا۔

''چلے چلو میشکا، جلدی کرو۔ بس اب ٹائم ختم ہو رہا ہے!'' وہ چیخ چیخ کر اس کو اکساتے رہے۔

میشکا نے باقی گوشت کو گھبرا کر دیکھا لیکن بیئر کا ایک گھونٹ پی کر چبانا پھر مسلسل جاری کر دیا۔

تماشائیوں میں اور جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ بار بار وہ گھڑی دیکھتے جیسے میشکا کا مالک لئے ہوئے تھا اور پھر انہوں نے ایک دوسرے کو خبردار اور آگاہ کرنا شروع کیا:

''دیکھو یہ سوئیاں نہ ادھر سے ادھر کر دیں، گھڑی ان سے کوئی اور لے لے!''

''ذرا میشکا کو دیکھتے رہنا کچھ آستینوں میں نہ بھرنا شروع کر دے!''

''وقت پر تو نہیں ختم کر سکے گا۔''

''میں پچیس روبل کی شرط بدتا ہوں'' میشکا کے مالک نے بڑی بے پرواہی سے کہا ''دیکھو میشکا میری عزت رکھنا!'' شرط کو تو کسی نے اہمیت نہ دی اور قبول نہیں کیا، البتہ میشکا کے مالک کو سب لوگ اکسانے لگے۔

میشکا برابر چبائے جا رہا تھا، چبائے جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ بھی گوشت کے رنگ کا سرخ ہو گیا تھا، اس کی پتلی سی ہڈیالی ناک سے آہ فریاد کی لمبی لمبی سانسیں نکل رہی تھیں۔ اس کو دیکھ کر وحشت سی ہوتی تھی اور مجھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اب کسی پل بھی وہ ایک دم چیخ اٹھے گا:

''رحم، رحم! اب رحم کرو...''

یا اگر اس کا گلا اوپر تک گوشت سے بھر جائے گا تو وہ ایک دم سے تماشائیوں کے قدموں کے پاس گر پڑے گا اور اس کا دم نکل جائے گا۔

آخر کار اس نے گوشت ختم کر دیا۔ تماشائیوں کی طرف گول گول آنکھیں گھما کے اس نے تھکن سے

خرخراتے ہوئے کہا:

''پانی لاؤ...''

مالک نے گھڑی پر نگاہ کی اور جھنجلایا:

''چار منٹ کی دیر کر دی، حرامی کہیں کا...''

''افسوس ہے کہ آپ شرط ہم نے نہیں قبول کی ورنہ آپ ہار ہی گئے تھے!'' تماشائیوں نے اس کو چھیڑا۔

''لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ ہے درندہ!''

''اس کو تو کسی سرکس میں ہونا چاہئے تھا...''

''افوہ، بعض انسانوں کو بھی خدا کیا ہی اول جلول بناتا ہے۔''

''چلو آؤ۔ چائے پیئیں، کیوں؟''

اور وہ شراب خانے کی طرف بڑھ گئے جیسے بہت سے بجرے رسی میں بندھے ایک دوسرے کے پیچھے تیرتے جا رہے ہوں۔

میں حیران تھا کہ آخر یہ بھاری بھرکم آہنی لوگ کیوں اس بدبخت کے چاروں طرف اکٹھے ہوئے تھے؟ اس طرح کے غیر فطری پیٹو پن کا مظاہرہ دیکھنے میں ان لوگوں کو کیا لطف آیا؟

یہ چھجہ بہت اندھیرا تھا اور اس میں جی گھبراتا تھا۔ یہاں سے وہاں تک اون کی گانٹھوں، بھیڑ کی کھال کے لبادوں، رسی، فلٹ کے جوتوں اور گھوڑے کے ساز وغیرہ کے ڈھیر رہتے اور ان کے اٹھانے دھرنے کا شور مچتا رہتا۔ چھجہ اینٹوں کے ستونوں پر کھڑا تھا۔ اینٹیں پرانی ہو کر گر رہی تھیں اور سڑک کی مٹی پڑ پڑ کر سیاہ ہو گئی تھیں۔ ان اینٹوں کو میں نے ہزاروں ہی بار گنا ہوگا اور ان کے درمیان پڑی ہوئی دراڑوں کو بھی، یہاں تک کہ ان کے بھدے نمونے کا نقشہ میرے ذہن میں خوب گہرا بیٹھ گیا تھا۔

فٹ پاتھ پر سے راہ گیر آہستہ آہستہ مزے مزے میں گذرتے رہتے اور ایسی ہی آہستہ آہستہ، دوکانوں کے سامان سے بھرے ٹھیلے اور گاڑیاں بھی گذرتیں۔ سڑک کے نکڑ پر ایک چوک تھا جس میں سرخ اینٹوں کی بنی دوکانیں تھیں۔ یہاں تمام زمین پر سامان کی پٹیاں، بھوسہ اور چیزیں لپیٹنے کے تڑے مڑے کاغذ بکھرے رہتے اور چلتے ہوئے قدموں کے دباؤ سے میلی برف میں دھنستے جاتے۔

اس تمام آمد و رفت کے باوجود ایسا محسوس ہوتا کہ تمام ماحول پر انسانوں اور گھوڑوں پر بھی ایک جمود کا عالم طاری ہے اور جیسے یہ ساری فضا بس ایک ہی جگہ پر کولہو کے بیل کی طرح ناچ رہی ہے جیسے کسی زنجیر سے بندھی بس چکر کاٹے جا رہی ہے۔ اور وہ زنجیر دکھائی نہیں دیتی۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے یہ سارا ماحول بے جان ہے، زندگی کی آواز سے محروم! ویسے گاڑیاں چوں چوں کرتی ہوئی برف پر سے گذرتیں، دوکانوں ں کے دروازے دھڑ ادھڑ کھلتے اور بند ہوتے، بیئر اور سموسے بیچنے والے آوازیں لگا لگا کے اپنا مال بیچتے۔ لیکن انسانی آوازیں اس قدر بے جان اور اکتائی ہوئی اور ایک ہی سی ہوتی تھیں کہ رفتہ رفتہ کان ان کے عادی ہو جاتے اور بھران کا احساس بھی نہ ہوتا۔

گرجوں کی گھنٹیاں اس طرح بجتیں جیسے جنازے پر بج رہی ہوں۔ ان کی رونی آواز میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایسا معلو ہوتا کہ صبح سے شام تک یہ آواز میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ صبح سے شام تک یہ آواز بازار پر منڈلاتی رہتی ہے۔ انسان کے خیالات اور احساسات کو چھیدتی ہوئی، اس کے ذہن کے تمام نقوش پر پیتل کے برادے جیسی گرد بٹھاتی ہوئی، پیلی اور بے جان۔

ہر چیز پر ایک عجیب اداسی سی پڑی ہوتی تھی، ہر شئے سے اکتاہٹ پھوٹتی تھی: زمین سے، جو میلے برف کا کمبل اوڑھے رہتی تھی، سرمئی برف سے جو مکانوں کی چھتوں پر ڈھیر رہتی تھی، عمارتوں سے جو کچے گوشت کی طرح سرخ تھیں، چمنیوں سے جو سیاہ دھواں نکلتا اور آہستہ آہستہ جھکے ہوئے سرمئی آسمان کی طرف رینگتا جاتا۔ اس میں بھی اکتاہٹ لپٹی ہوئی ہوتی تھی، گھوڑوں کے نتھنوں اور انسانوں کی سانسوں سے بھی یہی اکتاہٹ پھوٹتی تھی۔ اس کی اپنی ایک خاص بو ہوتی تھی جس میں پسینہ، چربی، دھویں، چربی میں پکے ہوئے سالن اور کڑوے تیل کی بو ملی جلی ہوتی تھی۔ بھاری اکتاہٹ بھری بو۔ یہ بو دماغ کو اس طرح گرفت میں لے لیتی تھی جیسے سر پر کوئی گرم اور تنگ ٹوپی خوب چست بٹھا دی گئی ہو، جسکی گرمی اور سختی سینے کے اندر تک تیر گئی ہو اور اس کے نشے سے انسان کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہوں اور دل چاہ رہا ہو کہ پوری قوت سے چیخے اور دوڑ کر جو بھی دیوار سامنے نظر آئے، اس سے اپنا سر پھوڑ لے۔

میں اکثر دوکانداروں کے چہروں کو غور سے دیکھا کرتا۔ کھائے پیئے چہرے، گاڑھا گہرا سرخ خون چھلکتا، پالے کی چبھن سے داغ داغ اور ایسے سوئے ہوئے جیسے نیند میں ہوں۔ اکثر جماہیاں لیتے رہتے اور ماہی بے آب کی طرح منہ کھولتے۔

جاڑوں میں دوکانداری یوں بھی کم چلتی تھی، اس لئے گرمیوں میں دوکانداروں میں جو ہوشیاری اور پھرتی اور بھاؤ تاؤ کی جھلک دکھائی دیتی تھی اور ان کو ذرا رونق بخشتی تھی، وہ سردی میں مفقود ہو جاتی تھی۔ بڑے بڑے لبادوں اور کوٹوں کی وجہ سے چلت پھرت میں دقت اور سستی آ جاتی اور وہ جیسے زمین میں گڑ جاتے۔ غصہ آتا تو آہستہ آہستہ سستی کے ساتھ بحثیں کرتے رہتے۔ مجھے تو ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا جیسے جان بوجھ کر یہ کر رہے ہیں، جیسے ایک دوسرے پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہین کہ ہم زندہ ہیں!

ان کی ظالمانہ اور احمقانہ تفریحوں کا میرے نزدیک یہی جواز اور وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ اس اکتاہٹ کو دور کرنے کی ایک جان توڑ کوشش کر رہے ہیں۔

کبھی کبھی میں پیوتر واسیلی وچ سے اس خیال کا اظہار کرتا۔ ویسے عام طور پر تو میری طرف اس کا رویہ طنزیہ اور چھیڑ کار ہا کرتا تھا لیکن مجھے کتابوں سے جو عشق تھا، وہ اسے پسند بھی تھا اور کبھی کبھی وہ مجھ سے کھل کر اور سنجیدگی کے ساتھ بات کرتا تھا جیسے مجھے ہدایت کر رہا ہو۔

''مجھے دوکانداروں کا زندگی بسر کرنے کا طریقہ پسند نہیں'' میں نے کہا۔

اس نے اپنی داڑھی کی نوک انگلی پر لپیٹی اور بولا:

''تمہیں کیا معلوم وہ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں؟ یا شاید تم ان کے گھروں کو بھی جاتے ہو؟ یہ تو بازار ہے، سڑک ہے میرے بیٹے! لوگ سڑکوں پر زندگی بسر نہیں کیا کرتے۔ سڑکوں پر تو تجارت ہوتی ہے یا لوگ اپنے گھروں کو جاتے ہوئے جلدی جلدی گزر جاتے ہیں! سڑک پر لوگ کپڑوں میں لپٹے ہوئے نظر آتے ہیں اور کیا پتہ چل سکتا ہے کہ اندر کیا ہے! وہ تو صرف انسان جب اپنے گھر میں ہوتا ہے، اپنی چہار دیواری کے اندر، تب وہ کھلتا ہے۔ لیکن ان کی زندگی کیسی ہے، تمہیں کیا معلوم!''

''لیکن ان کے خیالات تو ہی ہوتے ہیں۔ ان میں گھر اور باہر سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

بوڑھے نے مجھے سختی سے گھورا اور بھاری بھرکم آواز میں جواب دیا:

''ارے! کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا پڑوسی کیا سوچ رہا ہے؟ وہ جو بڑے بوڑھوں نے کہا ہے نا کہ خیالات جوؤں کی طرح ہوتے ہیں، ان کو کوئی گن نہیں سکتا۔ ممکن ہے کوئی شخص گھر پہنچے تو دوزانو ہو کر رونا اور دعا مانگنا شروع کرے: ''اے پروردگار، مجھے معاف کر کہ آج میں نے تیرے اس مقدس دن میں بھی گناہ کیا!'' ممکن ہے اس کا گھر ہی اس کی خانقاہ ہو جہاں وہ اپنے پروردگار کے ساتھ تخلیئے میں رہتا ہے۔

ہر مکڑی کا اپنا ایک الگ کونا ہوتا ہے۔ کونے میں بیٹھے اپنا وزن جانو اور جالا بنو۔ ورنہ...''

جب وہ سنجیدگی سے بات کرتا تھا تو اس کی آواز اور بھی بھاری ہو جاتی تھی جیسے کسی اہم راز کو ظاہر کر رہا ہو۔

''اب تم بیٹھ کر ہر بات میں منطق بگھارتے ہو حالانکہ یہ تمہاری عمر کے مطابق بات نہیں ہے۔ تمہارا یہ سن نہیں ہے کہ تم دماغ کے سہارے زندہ رہو، اس وقت تو تمہیں آنکھوں کا سہارا لینا چاہئے! یعنی دیکھو اور یاد رکھو۔ زبان نہ چلاؤ! دماغ کاروبار کے لئے ہوتا ہے، ایمان روح کے لئے! کتابیں پڑھنا اچھی بات ہے مگر ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ بعض لوگ اتنا زیادہ پڑھتے ہیں کہ وہ اپنا دماغ بھی کھو بیٹھتے ہیں اور خدا بھی ان سے چھوٹ جاتا ہے...''

مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ بڑھا امر ہے اور میں کبھی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ذرا بھی بدلے گا یا اور ضعیف ہو جائے گا۔ اسے کہانیاں کہنے کا بڑا شوق تھا۔ سوداگروں، ڈاکوؤں یا ان جعل سازوں کی کہانیاں جو مشہور ہوئے۔ میں نے ایسی بہت کہانیاں نانا ابا سے بھی سنی تھیں لیکن نانا ابا اس بوڑھے سے زیادہ اچھی طرح کہانی کہتے تھے۔ ویسے ان کہانیوں کے معنی ایک ہی ہوتے تھے کہ امیروں نے انسان اور خدا دونوں کے آگے گناہ کر کے دولت کمائی ہے۔ پیوتر واسیلی وچ کو انسانوں پر ترس نہیں آتا تھا لیکن خدا کا ذکر بڑی محبت سانسیں بھرا کرتا تھا۔

''دیکھو ذرا، لوگ کس طرح اپنے خالق کو بھی دھوکا دیتے ہیں۔ لیکن یسوع مسیح سب کچھ دیکھتا ہے اور ان کے لئے آنسو بہاتا ہے:

''آہ میری امت، میری بدبخت امت۔ جہنم تیرا منتظر ہے!''

ایک بار میں نے ہمت کر کے اس سے کہہ ہی دیا:

''مگر آپ بھی تو بیچارے دیہاتیوں کو دھوکہ دیتے ہیں...''

اس نے بالکل برا نہیں مانا، بولا:

''تو کیا برائی کرتا ہوں؟ ارے اپنے لئے چار پانچ روبل ہی تو نکال لیتا ہوں۔ یہی نا۔ اور تو کچھ نہیں...''

جب مجھے پڑھتے دیکھتا تو میرے ہاتھ سے کتاب لے لیتا اور پوچھتا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ پھر

ذرا تعجب سے مشکوک لہجے میں اسسٹنٹ سے مڑ کر کہتا:

''یہ دیکھو ذرا، یہ ان کتابوں کو سمجھ لیتا ہے، ننھا بندر!''

پھر وہ مجھے نصیحتیں کرنے لگتا۔ نہایت قطعی انداز سے وہ نصیحت کرتا تھا جسے کبھی بھلایا نہیں جا سکتا تھا:

''میری بات سنو، تمہارے کام آئے گی! دو آدمی تھے، دونوں کا نام کیریل تھا اور دونوں ہی پادری تھے۔ ایک اسکندریہ کا رہنے والا تھا، دوسرا یروشلیم کا۔ ان میں سے پہلے کی لڑائی اس کافی نیسٹر سے ہوئی تھی جو فحش بکتا تھا کہ پاک مریم بھی معمولی انسان تھیں اس لئے وہ خدا کی روح کو کیسے جنم دے سکتی تھیں اور یہ کہ انہوں نے خدا کی روح کے بجائے ایک انسان کو پیدا کیا تھا جس کا نام عیسی تھا اور کام خدائی۔ وہ ہے شفاعت کرنے والا۔ بس ثابت ہوا کہ ہم ان کو خدا کی ماں کہنے کے بجائے عیسی کی ماں کہیں! سمجھے؟ اس کو کفر کہتے ہیں۔ یروشلم والا کیریل جو تھا وہ کافر ایریا سے لڑا تھا...''

مجھے پر بڈھے کی اس بات کا بڑا گہرا اثر پڑتا تھا کہ وہ عیسائی مذہب کی تاریخ سے بہت اچھی واقفیت رکھتا تھا۔ اپنے صاف ستھرے ہاتھ سے وہ اپنی داڑھی کو ہلکے ہلکے تھپکتا جاتا اور بڑے فخر سے کہتا جاتا:

''جہاں ایسی باتوں کی جنگ ہو وہاں تو جنرل ہوں، جنرل! ابھی ایسٹر کے ساتویں ہفتے کے دن میں ماسکو گیا تھا اور وہاں میں نے بڑے بڑے قابل نیکونیوں کی زہریلی زبانوں سے خوب جنگ کی۔ ان کے بہت سے پادری اور معمولی ماننے والے بھی وہاں اکٹھے تھے۔ پروفیسروں تک سے میرا مباحثہ ہوا! اور میں نے ایسی ایسی دلیلوں کی چابکیں ان کے رسید کیں کہ ایک فقیہ کے تو نکسیر پھوٹ نکلی۔ سوچو تو ذرا...''

اس کے گال سرخ ہو جاتے، آنکھیں چمکنے لگتیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے مخالف کے نکسیر پھوٹ نکلنے کو اپنی سب سے بڑی فتح سمجھ رہا تھا۔ گویا اس کے عزوشاش کے تاج میں ایک سرخ دھکتا ہوا لعل ٹک گیا ہو۔ بڑی فتح مندی سے اس نے اس واقعے کا تفصیلی ذکر کیا:

''وہ بڑا خوبصورت آدمی تھا، لمبا چوڑا جیسے دیو! جیسے دیو! وہ منبر پر کھڑا ہوا تو اس کی ناک بہنے لگی۔ ٹپ ٹپا ٹپ... اور اسے اپنی اس شرمناک حالت کا علم ہی نہیں ہوا! وہ ایسا دہشت ناک تھا جیسے شیر، آواز ایسی جیسے بڑا سا گھنٹہ گھنا گھن ہو رہا ہو! اور میں تھا کہ کہ بڑی خاموشی سے اپنے الفاظ اس کی روح میں چبھوتا چلا جا رہا تھا جیسے پسلیوں کے درمیان خنجر بھونکے جائیں! اور اس کی کافر طبیعت کو ایسا جوش آیا، ایسا آیا کہ

تندور کے ڈھکن کی طرح لال انگارہ ہوگیا وہ ..آہ، وہ بھی کیا زمانے تھے!''

ہماری دوکان میں اور بھی ایسے لوگ آتے تھے جو پرانے مذہب میں ایسے ہی کٹر تھے۔ مثلاً پکومی تھا۔ کانا، بڑا سا پیٹ۔ وہ خر کر کے بات کرتا اور ہمیشہ ایک پرانا چکٹا کوٹ پہنے رہتا تھا۔ پھر بڈھا لوکیان تھا، چھوٹا سا قد اور چوہے کی طرح پھرتیلا، اس کے طور طریقوں میں نرمی تھی اور ساتھ ہی ساتھ چستی اور زندہ دلی بھی۔ اس کے ساتھ ہمیشہ ایک لمبا چوڑا سا آدمی ہوتا تھا جو منہ بنائے رہتا تھا۔ یہ آدمی دیکھنے میں کوچبان لگتا تھا۔ سیاہ داڑھی، جمی ہوئی آنکھیں، قبول صورت مگر ناگوار چہرے پر ایک سپاٹ پن۔

یہ لوگ ہمیشہ ہی پرانی کتابیں، صلیبی تصویریں اور بت، طرح طرح کی عوددان ہم لوگوں کے ہاتھ بیچنے آیا کرتے تھے۔ کبھی ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہوتا تھا۔ کوئی بوڑھی عورت یا کوئی بوڑھا مرد، جو والگا پار کے رہنے والے ہوتے تھے اور یہ لوگ بھی بیچنے کے لئے چیزیں لایا کرتے تھے۔ جب سودا ہو چکتا تو وہ لوگ کاونٹر پر بیٹھ جاتے جیسے منڈیر پر کوؤں کی قطار بیٹھی ہو، اور چائے پیتے، جس کے ساتھ بند ہوتے اور پھلوں کی خوشبو سے بسی ہوئی شکر ہوتی اور یہ ذکر چل نکلتا کہ نیکونیوں نے کیا کیا مظالم کئے ہیں: کہیں تلاشیاں ہو کر مقدس کتابیں ضبط ہو رہی ہیں، کہیں تلاشیاں ہو کر مقدس کتابیں ضبط ہو رہی ہیں، کہیں پولیس نے ان لوگوں یعنی پرانے مذہب والوں کے گرجوں کو بند کر دیا اور وہاں جانے اور شریک ہونے والوں کو عدالت میں لیجایا گیا کیونکہ انہوں نے دفعہ 103 کی خلاف ورزی کی تھی۔ یہ دفعہ 103 ان لوگوں کا محبوب موضوع گفتگو ہوا کرتا تھا لیکن وہ نہایت اطمینان سے، جذباتی ہوئے بغیر اس کا ذکر کرتے تھے گویا یہ دفعہ 103 کوئی ناگزیر شئے ہو جیسے جاڑے کی برف یا کہر یا پالا۔

وہ لوگ برابر ذکر کرتے رہتے کہ کس طرح وہ اپنے ایمان کے واسطے تکلیفیں اٹھا رہے تھے اور ان تکلیفوں کا ذکر کرتے وقت وہ خاص طور پر پولیس، تلاشی، قید، حوالات، عدالت، سائبیر یا وغیرہ کا ذکر کرتے تھے۔ یہ الفاظ گرم سیسے کی طرح میرے کانوں میں ٹپکتے، میرے دل میں ان بوڑھوں کے لئے ہمدردی کی لہر اٹھتی اور ان اچھے انسانوں کے لئے نیک خیالات ابھرتے۔ میں نے جو کتابیں پڑھی تھیں انہوں نے مجھے سکھایا تھا کہ اخلاقی ہمت کی قدر کروں اور ان لوگوں کی عزت کروں جو اپنی منزل پر پہنچنے اور اپنا مقصد حاصل کرنے میں لڑکھڑاتے نہیں تھے، ثابت قدم رہتے تھے۔

پرانے مذہب کے ماننے والے ان انسانوں کی انفرادی کمزوریوں کو میں بھول جاتا تھا اور مجھے

صرف اس بات کا شعور رہتا تھا کہ یہ بڑی مستقل مزاجی سے اپنی جگہ پر قائم ہیں اور اس مستقل مزاجی کی تہہ میں کم از کم مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ ان کا مضبوط عقیدہ تھا کہ جس مقصد پر قائم ہیں وہ سچا ہے اور اس کے لئے وہ تمام مصیبتوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنے کا اٹل ارادہ کئے ہوئے ہیں۔

بعد کو جب معمولی اور سیدھے سادے لوگوں کے علاوہ پڑے لکھوں میں بھی اس طرح کے لوگوں سے میری ملاقات ہوئی تو میری سمجھ میں آیا کہ یہ ان کا استقلال نہیں تھا بلکہ یہ وہ چیز تھی جو لوگوں میں ایک جمود کی طرح پیدا ہو جاتی ہے جب کہ وہ کسی ایسے مقام پر پہونچ جاتے ہیں جہاں سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتے نہ ان میں آگے بڑھنے کی خواہش اور سکت ہوتی ہے، بس الفاظ اور گھسے گھسائے تصورات کے جال میں پھنسے ہوتے ہیں۔ ان کی قوت ارادی بے جان پڑ جاتی ہے اور اس میں مستقبل کی طرف ڑھنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی اور اگر ایسے موقعوں پر وہ یکا یک اس جال سے آزاد بھی ہو جائیں تو اس طرح پستی کی طرف لڑھکتے چلے جائیں گے جیسے ڈھلوان پہاڑ پر سے پتھر۔ ان کے ذہن میں ایک مریضانہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنی تکلیفوں اور دکھوں میں بھی وہ لطف لینے لگتے ہیں اور رجعت پسندی کے مردہ بہاؤ کے ساتھ رل کر وہ فرسودہ خیالات کے قبرستان میں قید ہو جاتے ہیں۔ اور ایک بار ان کی تکلیفیں ان سے لے لی گئیں تو ان لوگوں کا وجود ہی ختم ہو جائے گا اور یہ اس طرح اڑنچھو ہو جائیں گے جیسے صاف اور ہوادار روز روشن نمودار ہونے سے بادل اڑنچھو ہو جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جس ایمان کے لئے وہ اس شوق سے اور اس فخر کے ساتھ اپنی جانیں دے دیتے تھے، اس ایمان کے مضبوط ہونے پر کوئی شک یا سوال کی گنجائش نہ تھی لیکن یہ ایمان گھسے اور گلے ہوئے لباس کی مانند تھا جس پر اس قدر گرد و غبار جم چکا تھا کہ اب وہ زمانے کی کھینچا تانی کو برداشت نہی کرسکتا تھا۔ ان لوگوں کے خیالات اور احساسات شدید تعصّبات اور تعینات کے صندوقوں مین مقفل ہو کر خود دفن ہو گئے تھے، ان کی صورتیں مسخ ہو گئی تھیں لیکن اس بات سے ان لوگوں کو ذرا بھی پریشانی نہ تھی۔

یہ ایمان بالعادت ہماری زندگی کا سب سے زیادہ گھٹیا اور افسوس ناک عنصر ہے۔ اس قسم کے ایمان کے چہار دیواری میں ہوئی اور جدید چیز نہایت سست رفتاری کے ساتھ پھپکتی ہے جیسے دیوار کے سائے تلے لگا ہوا پودا۔ اس ایمان کی تاریکی میں محبت کی بہت ہی کم کرنیں جگہ پا سکتی ہیں اور انتقام، بغض اور حسد کی بھر مار ہوتی ہے جن کا نفرت سے حقیقی رشتہ ہوتا ہے۔ اس ایمان کی آگ وہی آگ ہوتی ہے جو سڑی ہوی

ہڈیوں کا گندھک جلنے سے پیدا ہوتی ہے۔

مگر ان باتوں کا یقین مجھے بہت سال تک جفاکشی کی زندگی بسر کرنے کے بعد ہوا، بہت سے ذہنی بت توڑنے پڑے، بہت سے خیالات کو ذہن سے کھروچ کر نوچ کر پھینکنا پڑا۔ جب میں ان پرانے مذہب کے قربانیوں سے ایک ایسی زندگی کے دوران میں ملا تھا جب میرے چاروں طرف بھی ماحول اکتایا ہوا اور بے مقصد تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ ان میں بے پناہ اخلاقی قوت کارفرما ہے، کہ یہ زندگی کا نمک ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی وقت پر عدالت لے جایا گیا تھا یا جیل خانے میں ڈال گیا تھا، شہر بدر کیا گیا تھا یا اس بات پر مجبور کیا گیا تھا کہ چوروں اور ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ جلاوطنی کے راستے پر چلیں۔

ہر ایک پر ایک پریشانی اور تناؤ کا عالم طاری رہتا تھا اور وہ روپوش رہا کرتے تھے۔

پھر بھی مجھے یہ نظر آتا تھا کہ یہی بوڑھے لوگ جو نیکونیوں پر الزام لگاتے تھے کہ وہ روحانیت کا پیچھا پکڑتے ہوئے ہیں، جب موقعہ لگتا تھا تو بڑی خوشی سے ایک دوسرے کا پیچھا پکڑ لیتے تھے۔

کانا پخومی دو چار پیالے چڑھا لیتا تو اپنی غیر معمولی یادداشت کا مظاہرہ بڑے فخر سے کرتا۔ اسے کئی مقدس کتابیں نوک زبان تھیں جس طرح یہودی اپنی مذہبی کتاب کو حفظ کئے رہتے ہیں۔ وہ اپنی انگلی کتاب میں کسی جگہ، کسی لفظ پر بھی رکھتا اور پھر اس جگہ سے اپنی خنخناتی ہوئی مدھم آواز میں دوھرانا شروع کر دیتا۔ اس کی نگاہ ہمیشہ فرش پر جمی رہتی، سوجھنے والی آنکھ جلدی جلدی ادھر ادھر گھومتی جیسے کسی قیمتی چیز کو ڈھونڈ رہی ہے۔ عام طور پر وہ اپنی اس صلاحیت کے لئے شہزادہ میشیتسکی کی کتاب ''روس کے انگور'' استعمال کرتا اور سب سے زیادہ اچھی طرح اس کو وہ حصہ یاد تھا ''جانباز اور نڈر شہیدوں کی بہادرانہ صابرانہ جفاکشی''۔

پیوتر واسیلی وچ ہمیشہ اس کوشش میں رہتا تھا کہ کسی جگہ سے اس کی غلطی پکڑے۔

''غلط! یہ تو دنیس پاکیزہ پر گذری تھی، کپرین پاک پر نہیں گذری تھی۔''

''دنیس؟ دنیس کون تھا بھلا؟ اصل دیونیسئی ہے...''

''نام پر کیا جھک جھک کرتے ہو!''

''تو آپ مجھے نہ سبق سکھائیں!''

ایک منٹ بعد دونوں غصے میں لال ایک دوسرے کو ایسا گھورتے جیسے نگاہوں میں نگاہوں میں کھا

جائیں گے اور کہتے:

''ارے او پیٹو! بے حیائی کی تھوتھنی لٹکائے پھرتا ہے۔ ذرا اپنی توند تو دیکھی ہوتی...''

پخومی اس طرح بے نیازی سے جواب دیتا جیسے وہ لڑ نہیں رہا تھا، ریاضی کا کوئی سوال رہا تھا ''اور تو بڈھا بکرا، ملعون! مردود! عورتوں کا دم چھلا بنا رہتا ہے!''

دوکاندار آستینوں میں ہاتھ ڈال لیتا اور کھڑا ہو کر نہایت کینہ پروری کے ساتھ مسکرا مسکرا کر قدیم مذہب کے ان محافظوں کو شہ دیتا جاتا جیسے وہ اسکولی لڑے ہوں:

''ہاں ہاں۔ لینا یہ بات ہے!''

ایک دن ان دونوں بڈھوں میں سچ مچ ہی لڑائی ہو پڑی۔

پیوتر واسیلی وچ نے پخومی کے منہ پر چانٹے رسید کئے اور اس کو بھگا دیا۔ وہ پسینہ پونچھتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چیختا رہا:

''اچھا ٹھہر دیکھ تیری روح پر اس گناہ کا الزام آتا ہے۔ تو نے میرا ہاتھ گناہ کے لئے اٹھوایا۔ تھڑی ہے تجھ پر!''

اسے اس بات میں خاص لطف آتا تھا کہ اپنے ساتھیوں پر یہ الزام لگائے کہ ان کا ایمان اتنا پکا نہیں ہے اور یہ کہ وہ بے دینی کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

''یہ وہ جو الیکساندر ہے نا، یہ اس کی صحبت کا اثر ہے، وہی تم کو بھڑکاتا رہتا ہے، بانگ دیتا رہتا ہے مرغے کی طرح!''

ظاہر ہے کہ 'دینی' سے اس کو چڑ بھی تھی اور وہ اس سے گھبراتا بھی تھا لیکن جب پوچھا جاتا کہ آخر بے دینی کے معنی کیا ہیں، یہ کیا سکھاتی ہے، کس طرح بگاڑتی ہے تو اس کی تشریح ٹھیک سے نہ کر پاتا:

''بے دینی جو ہے نہ وہ سب سے زیادہ کڑوے قسم کا کفر ہے۔ یعنی کہ جس میں خدا کو بالکل الگ کر دیا جاتا ہے اور دماغ دماغ رہ جاتا ہے۔ اب کزاکوں کو دیکھو وہ خالی انجیل کو مانتے ہیں اور انجیل جو ہے وہ جرمنوں سے آتی ہے یعنی وہ جرمن جو سارا توف میں ہیں۔ اور یہ انجیل جرمنوں کو لوتھر نے دی ہے۔ وہی لوتھر جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ لوتھر کا نام لوتھر خوب رکھا گیا ہے کیونکہ لوتھر لفظ بنا ہے لوسینو سے اس اس سے فقرہ نکلتا ہے... لوتھر لیچڑ... یہ ساری کی ساری جرمن قوم جہنمی قرار دی گئی ہے، خدا کی برکت سے بالکل

محروم! اور یہ باتیں بھی سب ان مغرب والوں کی پھیلائی ہوئی ہیں جو کافر وہاں بستے ہیں۔ بے دین۔ ان کی پھیلائی ہوئی۔''

وہ اپنا لنگڑا پاؤں زور سے زمین پر پٹختا اور بھاری بھر کم سرد لہجے میں کہتا:

''یہ لوگ ہیں جن کو ملک بدر کرنا چاہئے۔ ان لوگوں کا پیچھا کرنا چاہئے اور ان کو ستونوں سے باندھ باندھ کر جلانا چاہئے نہ کہ ہم لوگوں کو! ہم تو ازل سے روسی ہیں اور ہمارا ایمان بھی سچا مشرقی ایمان ہے۔ جڑ تک روسی ایمان! یہ جو دوسرا مذہب نکلا ہے، آزاد خیالوں کا، یہ البتہ سب مغرب سے آیا ہے جرمنوں سے، فرانسیسیوں سے۔ بھلا اس سے کسی کا کیا بھلا ہونے والا ہے؟ ذرا سن اٹھارہ سو بارہ کو یاد کرو...''

اپنے جوش میں وہ یہ بھول جاتا کہ وہ یہ تمام باتیں ایک کم عمر لڑکے سے کر رہا ہے۔ وہ میرے کمر میں بندھی ہوئی پیٹی میں اپنا ہاتھ ڈالکر گھڑی میں مجھے اپنی طرف کھینچتا، کبھی پیچھے کو دھکیل دیتا اور خود شاعرانہ انداز میں جوش وخروش اور گرمی کے ساتھ گفتگو کرتا جاتا:

''انسان کی عقل اپنے ہی بنے ہوئے جال کے جنگل میں اندھا دھند چکر کاٹتی اور الجھتی پھرتی ہے۔ تند خو بھیڑیے کی طرح وہ ادھر سے ادھر ٹکریں مارتی ہے کیونکہ شیطان عقل کو یہی سکھاتا ہے اور یہی سکھا پڑھا کر وہ آدمی کی روح کا ستیاناس مار دیتا ہے۔ روح کا جو معبود نے انسان کو بہترین عطیہ دیا ہے! آخر ان شیطان کے چیلوں نے اپنے کو سمجھ کیا رکھا ہے؟ اب دیکھو یہ بے دینیوں کے پادری اس طرح کی باتیں کہتے ہیں: شیطان بھی معبود کا بیٹا ہے، یسوع مسیح کا بڑا بھائی لاحول ولاقوۃ! سوچو ذرا! اور وہ لوگوں کو سکھاتے ہیں کہ بزرگوں کا مقابلہ کرو، کام چھوڑ دو، بیوی بچے چھوڑ دو، آدمی پر کوئی زبردستی نہیں ہو سکتی۔ کسی رسم کی پابندی کی ضرورت نہیں ہے۔ انسان جیسے چاہے زندگی بسر کرے، جس طرح اس کا دل چاہے۔ یعنی جس طرح شیطان اسے سکھائے۔ توبہ! لو وہ الیکسانڈر پھر آ مرا، بدبخت کیڑا کہیں ...'' بعض اوقات اسسٹنٹ مجھے اکیلے ہی بیٹھے خلا کو اپنا وعظ سناتے رہتے:

''آہ، ایک طرف پاک روحیں جو بغیر پروں کے جنت کو پرواز کر سکتی ہیں اور دوسری طرف یہ اندھے پلے ہیں کتے کے! آہ کہاں جا کے پناہ ڈھونڈوں، کہاں چھپوں!''

پھر وہ سر کو ذرا پیچھے جھکا لیتا اور ہتھیلیوں کو گھٹنوں پر رکھ کے دیر تک جاڑوں کے تاریک ہوتے ہوئے سرمئی آسمان کو تکا کرتا۔

رفتہ رفتہ وہ مجھ پر زیادہ توجہ دینے لگا تھا، زیادہ مہربان ہوگیا تھا، جب مجھے کوئی کتاب پڑھتے دیکھتا تو کندھا تھپتھپاتا اور کہتا:

''شاباش بیٹا، پڑھے چل! سب کام آئے گا تیرے! تیرے کندھوں پر جو یہ سر ہے نا یہ کافی تیز معلوم ہوتا ہے۔ افسوس یہی ہے کہ تو بزرگوں کی بات نہیں سنتا، ہر ایک کے منہ آتا ہے، ہر ایک کا سامنا کر بیٹھتا ہے! تو کیا سمجھتا ہے کہ یہ شرارتیں کہاں تک تیرا ساتھ دیں گی؟ بہت تو بہت تجھے قید خانے تک پہنچا دیں گی۔ کتابیں ضرور پڑھ بیٹا مگر یہ نہ بھولنا کہ کتاب بس کتاب ہے۔ اپنا بھی دماغ استعمال کرنا سیکھ! ایک شخص تھا، سنکی قسم کا فلسفی، جس کا یہ دعویٰ تھا کہ کتابیں چاہے قدیم ہوں یا جدید کسی کام کی نہیں ہوتیں۔ وہ اپنی ساری کتابیں لے جا کر دریا میں ڈبو آیا! اب اتنا کرنے میں بھی کوئی عقل کی بات نہیں۔ اور اس بدطینت کو دیکھو، الیکساندر کو، خواہ مخواہ ادھر گھوم کر لوگوں کے دماغوں میں اور الجھاؤ پیدا کرتا ہے۔''

اس الیکساندر کا ذکر وہ دن بدن زیادہ کرتا جاتا تھا اور ایک دن جو وہ دوکان میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے، تیزی سے اسسٹنٹ سے کہنے لگا:

''الیکساندر واسیلییف اس شہر میں پہنچ گیا ہے۔ کل ہی آیا ہے! میں چاروں طرف اس کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں مگر کہیں نہیں مل رہا ہے۔ چھپا ہوا ہے! اچھا چلو یہیں بیٹھتے ہیں کچھ دیر۔ شاید یہیں آجائے...''

''میں کسی کو نہیں جانتا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم!'' اسسٹنٹ نے رکھائی سے جواب دیا۔

بوڑھے نے سر ہلایا:

''ہاں آپ تو بس بیچنے والوں کو پہچانتے ہیں یا خریدنے والوں کو۔ باقی دنیا تو آپ کے لئے جیسے ہے ہی نہیں۔ اچھا چلیئے ایک گلاس چائے پلاتے ہیں؟''

جب میں پیتل کی بڑی سی کیتلی میں پانی لے کر لوٹا تو میں نے دیکھا کہ دوکان میں کچھ اور مہمان بھی بیٹھے ہیں۔ ان میں ایک تو بوڑھا لوکیان جو کھیسیں نکالے ہنس رہا تھا اور دروازے کے پیچھے ایک تاریک کونے میں ایک اجنبی بیٹھا تھا جو لمبے لمبے فلٹ کے جوتے پہنے ہوئے تھا، گرم کوٹ جس میں سبز رنگ کا پٹکا بندھا ہوا تھا اور ٹوپی جسے وہ آنکھوں کے اوپر جھکائے ہوئے تھا۔ اس کی صورت میں کوئی خاص بات نہ تھی لیکن وہ خاموش طبیعت اور خاکسار فطرت لگتا تھا۔ وہ صورت سے دوکان کا اسسٹنٹ معلوم ہوتا تھا جسے ابھی ابھی کام سے جواب مل گیا اور اس کی وجہ سے اس کا دل ٹوٹ گیا ہو۔

پیوتر واسیلی وچ اجنبی کی طرف دیکھے بغیر کوئی بات سختی سے کہہ رہا تھا۔اجنبی اپنی ٹوپی کو دھنے ہاتھ سے بار بار کھسکائے جا رہا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ اس طرح اٹھاتا جیسے سینے پر کھسکائے جا رہا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ اس طرح اٹھاتا جیسے سینے پر صلیب کا نشان بنانے کا ارادہ کر رہا ہو،ٹوپی کو ذرا سا کھسکاتا پھر ذرا سا اور کھسکاتا، اور کھسکاتا یہاں کہ ٹوپی بالکل اس کے سر کے پچھلے حصے پر لٹکنے لگتی جیسے بس اب گری، اب گری، اور پھر وہ اسے کھینچ کر آنکھوں کو ڈھانپ لیتا۔اس کی ان تشنجی حرکات سے مجھے پاگل ایگوشا کی یاد آئی۔ ایگوشا جس کو لڑکے ''موت در جیب'' کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔

پیوتر واسیلی وچ نے کہنا شروع کیا:

آجکل ہمارے یہاں پانی تو ویسے ہی گدلا ہے اور اوپر سے بہت سی مچھلیاں اس میں تیرا کرتی ہیں جو اور بھی اس میں ہلچل پیدا کرتی رہتی ہیں۔''

''اچھا اگر ہے بھی تو پھر؟...''

اس آدمی نے پھر بڑے خلوص کے ساتھ مگر اسی اطمینان سے کہا:

''اپنے متعلق تو میں صرف اپنے خدا سے بات کرتا ہوں یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔''

''نہیں بھلے آدمی، یہ صرف آپ کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ میرا معاملہ بھی ہے'' اس اجنبی زوردار لہجے میں بڑی شان سے کہا۔''سچائی سے منہ نہ موڑو۔ نہ غرور کا پردہ اپنی آنکھوں پر ڈالو کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔خدا اور انسان دونوں کے آگے۔''

مجھے یہ بات پسند آئی کہ اس نے پیوتر واسیلی وچ کو ''بھلے آدمی'' کہا اور میں اس کی پوشکوہ اور پرسکون آواز سے بہت متاثر ہوا۔ وہ اس طرح بات کرتا تھا جیسے کوئی اچھا پادری اپنا وعظ شروع کرے ''اے مالک ہر دو جہاں، اے خالق جسم خاکی...'' ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے چہرے کے آگے ہاتھ ہلا ہلا کر اپنی کرسی پر آگے کو کھسکتا جاتا تھا...

''آپ میرے معلق کیوں فیصلہ دے رہے ہیں؟ میں آپ سے زیادہ گہنگار نہیں ہوں'' اجنبی نے کہا۔

پیوتر واسیلی وچ بیچ میں بات کاٹ کر حقارت سے بولا ''سماوار کیسا لٹافٹ بھاپ تھوک رہا ہے۔''

لیکن اجنبی نے اس کی اس بات پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنی گفتگو جاری رکھی:

''یہ تو صرف پروردگار ہی جان سکتا ہے کہ روح القدس کی اولاد پر کون زیادہ کیچڑ اچھالتا ہے۔ غالبًا یہ گناہ آپ ہی کرتے ہوں گے۔ آپ جو کتابی آدمی ہیں، پڑھے لکھے اور قابل آدمی ہیں۔ میں نے تو نہ کتابیں پڑھی ہیں، نہ ہی میں کوئی لائق فائق انسان ہوں۔ میں تو بس ایک معمولی سیدھے سادے انسان کی طرح زندگی گذارتا ہوں...''

''مجھے آپ کی اس سادگی کا سب حال معلوم ہے، بہت سنا ہے!''

''لوگوں کو دماغوں کو آپ لوگ گڑبڑاتے ہیں۔ آپ پڑھے لکھے فریبی! سیدھی سادی بات کو توڑ موڑ کے کہنے والے۔ اور جہاں تک میرا سوال ہے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میں لوگوں کو کیا سمجھاتا ہوں، کیا سکھاتا ہوں؟''

''کفر!'' پیوتر واسیلی وچ نے کہا۔ لیکن اجنبی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بس اپنی ہتھیلی سامنے رکھے اسے غور سے دیکھتا رہا جیسے اس پر کچھ لکھا ہے جسے پڑھ رہا ہے۔ اس نے اپنی بات جوشیلے پرسکون انداز میں جاری رکھی:

'تم سمجھتے ہو کہ لوگوں کو ایک اصطبل سے نکال کر دوسرے میں باندھ دو گے تو ان کی قسمت سدھر جائے گی؟ میں کہتا ہوں۔ نہیں! اسی لئے میں انسان سے کہتا ہوں۔ اپنے آپ کو آزاد کرو، اے انسان! یہ تیرے بیوی بچے اور تیرے مویشی خدا کے نزدیک کیا حقیقت رکھتے ہیں اور اے انسان، اپنے آپ کو ان تمام بندھنوں سے آزاد کر جس کا نتیجہ لڑائی اور قتل و غارتگری ہوتا ہے، سونے اور چاندی سے اور تمام مال دولت سے کیونکہ یہ سب مٹی ہے اور گل جائے گی! انسان کو سکون قلب اس عالم خاکی میں نہیں بلکہ جنت صرف جنت ہی کی وادیوں میں مل سکتا ہے! اپنی ہر چیز سے دست بردار ہو جا، سارے تعلقات کو ختم کر، ہر اس بندھن کو توڑ ڈال جو تجھے اس دنیا سے باندھے ہوئے ہے کیونکہ یہ تمام چیزیں شیطان کی کارستانی ہیں۔ میں تو اس پتلے مگر سیدھے راستے پر چلتا ہوں، میرے روح کبھی ڈھلمل نہیں ہوتی، میں نے ایسی ایک اندھیری دنیا کو خیرباد کہہ دی ہے...''

''تو کیا آپ نے کھانے اور پینے اور لباس پہننے کو بھی خیرباد کہہ دی ہے؟ یہ بھی تو آخر اس دنیا کی چیزیں ہیں!'' پیوتر نے حقارت سے کہا۔

الیکساندر پر ان الفاظ کا کوئی اثر نہیں ہوا، وہ اسی طرح مخلصانہ انداز میں اپنی بات کہتا رہا، اس کی

آواز مدھم تھی، لیکن اس میں ایسا زور اور جوش تھا جیسے پیتل کا بگل بج رہا ہو۔

''آخر تیری دولت کی ہستی کیا ہے، اے انسان؟ اصل دولت خوشنودی خداوندی ہے۔ اس کے سامنے داغ کھڑا ہو، اپنی روح کو اس دنیا کی زنجیروں سے، بیڑیوں سے الگ کر لے، جب کہ ایک طرف تو تنہا، دوسری طرف تیرا خدا تنہا ہو! اس طرح تو اپنی معبود تک پہنچ سکتا ہے۔ کیونکہ صرف ایک ہی راستہ اس تک پہنچتا ہے! کہا گیا ہے کہ نجات چاہتا ہے تو ماں باپ کو چھوڑ، ہر چیز کو چھوڑ، ان آنکھوں تک کو نوچ پھینک دے اور اپنی روح کو بچالے تاکہ تیری روح میں ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے نور کی تابنا کی قائم رہے...''

پیوتر واسیلی وچ اٹھ کھڑا ہوا ''تھو، تیرا کتے کا حشر ہو! میں تو سمجھا تھا کہ اس ایک سال میں تجھے کچھ عقل آ گئی ہو گی لیکن تیری حالت تو اور بھی بدتر ہو گئی!''

وہ لڑکھڑاتا ہوا چھجے میں نکل آیا۔ اس حرکت پر الیکساندر گھبرا کے اٹھ کھڑا اور حیران ہو کر جلدی سے پوچھنے لگا:

''کیا آپ جا رہے ہیں؟ مگر... یہ کیسے؟ کیوں؟''

لوکیان نے اپنے نرم انداز میں جیسے تسکین دیتے ہوئے کہا:

''ٹھیک ہے... ٹھیک ہے...''

لیکن الیکساندر اس پر برس پڑا:

''تو بھی اسی دنیا کا کتا ہے' ادھر ادھر اپنا نکما بیج بوتا پھرتا ہے، آخر اس کا فائدہ کیا ہے؟ دو دن لہو لعب کر لو، چار دن کر لو...''

لوکیان بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہوا چھجے میں چلا گیا۔ وہ اجنبی اسسٹنٹ کی طرف مڑا اور بڑے یقین کے ساتھ بولا:

''دیکھا میری روح کی طاقت ان لوگوں کے لئے برداشت سے باہر ہے، ایسا بھاگتے ہیں جیسے آگ سے دھواں!...''

''دیکھا میری روح کی طاقت ان لوگوں کے لئے برداشت سے باہر ہے، ایسا بھاگتے ہیں جیسے آگے سے دھواں!...''

اسسٹنٹ نے بھوئیں سکیڑ کر دیکھا اور رکھائی سے بولا:

''مجھے ان سب باتوں سے کوئی واسطہ نہیں۔''

اجنبی اس جملے پر حیران رہ گیا، اپنی ٹوپی نیچے جھکا کے بڑبڑایا:

''مگر تمہارا ان چیزوں سے واسطہ ہے کیسے نہیں؟ یہ چیزیں تو اس قابل ہیں کہ ان سے واسطہ رکھا جائے...''

پھر ایک دو منٹ وہ اس جگہ خاموش سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اتنے میں باہر سے دونوں بوڑھوں نے اس کو آواز دی اور تینوں خدا حافظ کہے بغیر روانہ ہو گئے۔

یہ اجنبی میرے سامنے یوں یکا یک ابھرا تھا جیسے رات میں الاؤ بھڑکتا ہے، جو خوب لہلہا کر جلتا ہے اور بجھ جاتا ہے۔ میرے اوپر اس نے یہ اثر بھی چھوڑا کہ دنیا سے انکار کی بات میں ہے کچھ سچ ضرور۔

چنانچہ شام کو موقع پا کر میں نے ایوان لاریونچ سے بڑے جوش کے ساتھ شخص کا ذکر کیا۔ ایوان لاریونچ ہماری دوکان کا سب سے بڑا کاریگر تھا۔ نیک، خاموش مزاج آدمی۔ جب وہ میری پوری بات سن چکا تو بولا:

''اریان فراریوں میں سے کوئی ہوگا۔ یہ ایک ایسا فرقہ ہے جو کسی بات کو نہیں مانتا۔''

''تو یہ لوگ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں؟''

''بس یوں ہی بھاگتے پھرتے ہیں، اسی لئے تو ان کو فراری کہتے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ دنیا کو اور اس کے سارے لوازمات کو چھوڑ دینا چاہئے۔ پولیس کا خیال ہے یہ لوگ خطرناک ہیں، ہمیشہ ان کے پیچھے لگی رہتی ہے۔''

ویسے میری زندگی میں کافی تلخیاں تھیں لیکن یہ میں تصور نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی دنیا کی ہر بات کو کیسے چھوڑ سکتا ہے؟ اس وقت بھی مجھے اپنی زندگی میں چاروں طرف بہت سی ایسی چیزیں نظر آتی تھیں جو مجھے دلچسپ بھی لگتی تھیں اور عزیز بھی تھیں۔ چنانچہ الیکساندر کی ہستی بہت جلد میرے ذہن سے غائب ہو گئی۔

لیکن کبھی کبھی جب پریشان لمحے زندگی میں آتے تو پھر اس کا خیال آنے لگتا۔ جیسے وہ خاک آلود راستوں سے گذرتا کھیتوں سے ہوتا ہوا جنگل کی طرف جا رہا ہے۔ اپنی ٹوپی کو وہ بار بار تشنجی کیفیت کے ساتھ اپنے سفید ہاتھوں سے اوپر ڈھکیلتا، ہاتھ جن پر مشقت کی خاک نہیں پڑی تھی، اور بڑبڑاتا:

''میں ایک سیدھے راستے پر چلتا ہوں، میں نے تمام چیزوں سے قطع تعلق کر لیا ہے! سب

بندھنوں کوتوڑدو!توڑدو...‘‘

اس کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے والد چلتے ہوئے نظر آتے جیسے وہ نانی کے خوابوں میں آیا کرتے تھے۔بید کا عصا ہاتھ میں لئے،ایک گل دار کتا ان کے قدموں کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہوا۔اس کی زبان باہر کو نکلی ہوئی،لٹکی ہوئی...

13

یہ مقدس شبیہوں کی دوکان ایک ایسی عمارت کے دو کمروں میں تھی جو نیم پختہ تھی۔ایک کمرے میں تین کھڑکیاں تھیں جو احاطے کی طرف کھلتی تھیں اور دو باغ کی طرف۔دوسرے کمرے کی ایک کھڑکی باغ کی طرف تھی،ایک گلی کی طرف۔یہ کھڑکیاں چھوٹی چھوٹی اور چوکھونٹی تھیں اور ان کے شیشے پرانے ہو کر رنگین سے ہو گئے تھے۔ان میں سے جاڑوں کے زمانے میں بہت ہی ہلکی اور دھندلی سی روشنی آتی تھی۔

ان دونوں کمروں میں بہت سی میزیں رکھی تھیں اور ہر میز پر ایک یا دو مصور سر جھکائے تصویریں وغیرہ بناتے یا رنگتے رہتے تھے۔چھت سے رسی کے ذریعہ،پانی سے بھری ہوئی شیشے کی گیندیں لٹکتی رہتی تھیں تا کہ لیمپ کی روشنی کی ٹھنڈی،سفید کرنوں کا عکس مقدس شبیہوں کے تختوں پر پڑ سکے۔

دوکان کے اندر سخت گرمی،اس اور گھٹن ہوتی تھی۔مختلف جگہوں،مثلاً پالیخ،کھولوئی،ماستیرا وغیرہ کے تقریباً بیس ’’مصوران خداوندی‘‘ یہاں جمع رہتے تھے۔یہ سب چھینٹ کی قمیص پہنے تھے،جن کے گریبان کھلے ہوئے تھے،موٹے خاکی کپڑے کی پتلون۔وہ کپڑا جس کے بستر بند بنتے ہیں۔پیر یا تو ننگے ہوتے تھے یا پاؤں میں بہت ہی پھٹیچر قسم کے جوتے۔ان کے جھکے ہوئے سروں پر ہر وقت تمباکو کا دھواں چکر کاٹتا اور پھیلتا رہتا تھا اور فضا تیل،اسپرٹ دار روغن اور سڑے ہوئے انڈوں کی مہک سے بوجھل رہتی تھی۔ایک دم ولادیمیر کا ایک لوک گیت ابھرنے لگتا،تارکول کی طرح سست،بالکل آہستہ آہستہ بہتا ہوا:

آہ تم بے حیاؤں کو کیا کیجئے

نو جوان ایک کنواری کا حسن لوٹا کیا

اور تم بے حیائی سے دیکھا کئے!

وہ لوگ اور بھی گیت گایا کرتے تھے جو اسی قدر بے جان ہوتے تھے،لیکن یہ گیت ان کو سب سے

زیادہ پسند تھا۔ یہ لمبی کھینچی ہوئی تان نہ تو خیالات کو منتشر کرتی تھی اور نہ ہی ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلہری کی دم کے برش کی رفتار میں کوئی رکاوٹ ڈالتی تھی۔ کسی ولی کے لباس کی لہریں رنگتی جاتیں یا خشک، سوکھے چہروں پر دکھ کے گہرے نقوش کے خطوط کھلتے جاتے۔ کھڑکی میں سے گوگولیف کی ہتھوڑی کی آواز آتی۔ وہ کھدائی کا کام کرتا تھا۔ یہ آدمی بوڑھا تھا، شراب خوب پیتا تھا، لمبی سی ناک جوا ودی رہتی تھی۔ جب اندر گیت گایا جاتا تو کھڑی میں سے گوگولیف کی ہتھوڑی کی آواز اس پر تال دیتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی کیڑا ہے جو مستقل کسی درخت میں کتر کتر لگائے ہوئے ہے۔

ان مقدس شبیہوں کو رنگنے میں واقعی دلچسپی کسی کو نہیں تھی۔ کسی نہایت ہی شیطانی عاقل نے اس کام کو چند جے جمائے حصوں میں تقسیم کر دیا تھا جن میں حسن وخوبصورتی کا نام ونشان نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس کام سے کسی کو کیا دلچسپی پر ور آدمی تھا مختلف سائز کے تختے لاتا جن کو وہ برابر کرتا اور جوڑتا، پھر داویدوف جو ایک تپ دق کا مارا ہوا لڑکا تھا، ان پر رنگ لگاتا اور اس کا دوست ساروکن اس تختے کو چھیلنے اور کاٹنے کے لئے تیار کرتا۔ پھر میلیاشن کسی اصل تصویر سے، صلیبی تصویر کی نقل پنسل سے بناتا۔ گوگولیف بڑے میاں سنہری رنگ سے اس تصویر کا خاکہ تختے پر اتارتے۔ پھر اس مقدس شبیہ کو دیوار سے لگا کر کھڑا کر دیا جاتا۔ اس وقت یہ تصویر بے سر اور بے ہاتھ کی ہوتی اور اس بات کا انتظار ہوتا کہ ''چہروں'' کے فنکار اب اپنا کمال دکھائیں۔

محرابوں میں لگانے والی بڑی بڑی مقدس شبیہیں یا منبر کے دروازوں پر لگانے والی تصویریں جب اس طرح بے سر اور بے ہاتھ پاؤں کے دیواروں سے ٹکی رہتی تھیں تو دیکھ کر بہت ہی کوفت ہوتی تھی۔ ولیوں کے صرف لبادے نظر آ رہے ہیں، کہیں خالی عبا دکھائی دے رہی ہے، فرشتوں کے صرف نیچے کے اڑتے لہراتے دامن دکھائی دے رہے ہیں۔ شوخ رنگوں سے رنگے ہوئے ان تختوں سے موت کی فضا پھیلتی محسوس ہوتی تھی۔ جو چیز جان پیدا کرتی ہے ان میں نہیں تھی۔ لگتا ہے کہ پہلے وہ چیز تھی لیکن پھر غائب ہوگئی اور اب صرف اپنے گہرے نشان چھوڑ گئی ہے اور بس۔

جب چہروں کے فنکار بھی اپنا کام پورا کر لیتے تو مقدس شبیہ ایک اور صنعت کار کے حوالے کی جاتی۔ وہ سنہرے حاشئے پر چمک دار پالش پھیرتا، پھر لکھائی بھی ایک مشاق ماہر کرتا تھا اور جب ساری تصویر مکمل ہو جاتی تو اس پر آخری چمک کی پالش ایوان لاریونچ کرتا تھا۔ وہی خاموش آدمی جو دوکان کا

سب سے بڑا منتظم تھا۔

اس کا چہرہ بھورا تھا، داڑھی بھی بھوری تھی، نرم اور ریشمی۔ بھوری آنکھیں جو گہری بیٹھی ہوئی اور اداس لگی تھیں۔ وہ بڑی نرمی سے مسکراتا تھا لیکن نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس مسکراہٹ کے جواب میں مسکرانا نہ چاہئے۔ اس کی شکل سیمیون ستولپنیک کی مقدس شبیہ سے ملتی جلتی تھی۔ ویسا ہی دبلا، سوکھا سہما اور جب اس کی آنکھیں دیواروں اور انسانوں سے بھی پار دور خلا میں دیکھتی ہوئی جم جاتی تھیں تو بالکل اس ولی کی آنکھوں کی طرح چمکتی تھیں۔

اس دوکان میں میرے نوکر ہونے کے کچھ ہی دن بعد ایک مصور جو کزاک تھا اور دریائے دون کے علاقے کا رہنے والا تھا، خوب شراب پی کر کام پر آیا۔ اس کا نام کاپیندیوخن تھا، خوبصورت اور طاقت ور بھی تھا۔ تو وہ دانت پیس پیس کر اور عورتوں کی سی خوبصورت آنکھیں سکیڑ سکیڑ کر خاموشی کے ساتھ ہر ایک کو اپنے لوہے جیسی مٹھیوں سے مکیانے لگا۔ اس کا چست جسم جو بہت لمبا تو نہ تھا لیکن پھرتیلا تھا، اس طرح دوکان میں زناٹے بھر رہا تھا، جیسے چوہوں سے بھرے ہوئے پنجرے میں بلی۔ لوگ پریشان ہو ہو کر کونوں میں دبکنے لگے اور وہاں ایک دوسرے کو پکارتے:

''لینا پکڑنا!''

آخر یوگینی سیتانوف نے جو چہروں کا مصور تھا اس کے سر پر ایک سٹول کھینچ کر مارا تب کہیں وہ چکرا کر فرش پر گرا۔ پلک جھپکنے میں سب اس پر پل پڑے، زمین پر چت کر کے اس کے ہاتھ پاؤں تولیوں سے باندھے گئے، وہ زور زور سے تولیوں کو اپنے چیتے کے سے دانتوں سے چیر پھاڑ رہا تھا۔ اس بات کو دیکھ کر یوگینی غصے سے بے قابو ہو گیا، کود کر میز پر چڑھا اور دونوں کہنیاں پہلو میں کھینچ کر بس چاہتا ہی تھا کہ جست بھر کر اس پر کود جائے کہ لاریونچ کوٹ پہنے، ٹوپی لگائے، آ پہنچا۔ اس نے انگلی اٹھا کر سیتانوف کو روکا اور دوسروں سے پرسکون آواز میں بولا:

''لے جاؤ اسے ڈیوڑھی میں۔ ذرا ہوش میں تو آ جائے.....

لوگ کزاک کو گھسیٹ کر دوکان سے باہر لے گئے۔ میزیں کرسیاں پھر ٹھکانے رکھیں اور کام میں لگ گئے۔ کاپیندیوخن کی طاقت کا ذکر ہوتا رہا اور یہ پیش گوئی ہوتی رہی کہ ابھی کیا ہے کہ یہ کسی سے لڑائی کرنے ہی میں مارا جائے گا۔

سیتانوف نے بڑے اطمینان سے کہا:

''ارے، اس کو ٹھکانے لگانا بڑا مشکل کام ہے۔'' وہ اس طرح بات کر رہا تھا جیسے کوئی ماہر جسے اپنے کام کا بخوبی علم ہو، اپنی رائے کا اظہار کرے۔

میں نے لاریونچ کی طرف غور سے دیکھا اور سمجھنے کی کوشش کی کہ یہ بڑے بڑے مضبوط اور سرکش لوگ کس طرح فوراً اس کی بات مان لیتے ہیں؟

وہ ہر کام کے گر بتایا کرتا۔ بڑے بڑے تجربہ کار ماہرین بھی اس کی رائے شوق سے سنتے تھے۔ کاپیندیوخن کو سکھانے میں زیادہ وقت اور الفاظ صرف کیا کرتا تھا۔

''مصور۔تم مصور کہلاتے ہو کاپیندیوخن۔مصور کو زندگی کی تصویر بنانی چاہئے جیسے کہ اطالوی تصویریں ہوتی ہیں، روغنی مصوری میں رنگوں کے درمیان ایک گرم جوشی کا میل اور اتحاد اور تڑپ ہونی چاہئے۔ اور ذرا دیکھو تو۔تم نے یہ اتنا بہت سا سفید رنگ یہاں جھونک دیا ہے تو۔جبھی تو پاک مریم کی آنکھوں میں اتنی سرد مہری آ گئی ہے، جاڑوں کی فضا کی طرح۔ بے شک رخساروں کی گولائی اور سرخی ٹھیک ہے لیکن آنکھیں اس کے ساتھ میل نہیں کھاتیں۔ اس کے علاوہ آنکھوں کو ٹھیک جگہ پر بھی نہیں بٹھایا گیا ہے، ایک تو ناک سے بالکل پاس آ گئی ہے دوسری خفا ہو کر کنپٹی کی طرف بھاگی جا رہی ہے۔ چنانچہ صورت پر تقدس اور پاکیزگی کے بجائے چالاکی اور دنیاداری کا تاثر پیدا ہو گیا ہے۔تم اپنے کام میں جی نہیں لگاتے ہو، کافی توجہ نہیں دیتے ہو، کاپیندیوخن۔''

کزاک نے اس کی بات سن کر اپنی آنکھیں سکیڑیں پھر اس کی عورتوں کی سی آنکھوں میں بے حیائی دینے لگی، شراب کے نشے سے بوجھل آواز میں بڑے مزے میں کہنے لگا:

''اخ، یہ بھی کیا میرے کرنے کا کام ہے ایوان لاریونچ! میں تو موسیقی کے واسطے پیدا ہوا تھا اور ذرا دیکھئے، یہاں خانقاہ میں آ پہونچا!''

''کوشش کرو، محنت کرو تو ہر کام میں مہارت حاصل کر سکتے ہو۔''

''لیکن میں یہ کام کرنے والا ہوتا کون ہوں؟ مجھے تو کوچوان ہونا چاہئے تھا۔ ایک گاڑی ہوتی، اس میں خوب دم دار گھوڑے جتے ہوتے...'' اور وہ پھر منہ پھاڑ کر زور سے تان لگانے لگا:

اخ۔خ۔خ...

میں اپنی تیز گاڑی کو جوتوں گا،
ایک مشکی دوخا کی کو جوتوں گا،
اخ۔خ۔خ۔اخ۔خ۔خ۔۔
گھماتے ہوئے راستوں پر چلاؤں گا!
اخ۔خ۔خ...

ایوان لاریونچ نے مسکرا کر ہتھیار ڈال دئے، اپنی پھیلی ہوئی نیلی ناک پر عینک ٹھیک سے ٹکائی اور چل دئے۔اورف یہاں ایک درجن آوازوں نے اس گیت کو اٹھالیا، تان کا ایک چشمہ سا بہنے لگا جس نے پوری دکان کو سر پر اٹھا کر ہلکے ہلکے جھکورے دینے شروع کئے۔

میرے گھوڑوں کو مغرب جانا ہے
میرے محبوب کی گلی....

پاشکا اودینتسوف جو ابھی کام سیکھ رہا تھا، انڈوں کی زردی سفیدی الگ الگ کر رہا تھا، اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک چھلکا تھا اور وہ اسی طرح چھلکوں کو ہاتھ میں لئے، تان اڑانے لگا۔

آوازوں کے نشے نے سب کو مسحور کر رکھا تھا۔ وہ سب کچھ جیسے بھول گئے ہوں، صرف ایک ہی آہنگ سے سانس لے رہے تھے، ایک ہی جذبے کے تحت چل رہے تھے، ان کی نظریں کزاک پر تھیں جو جس وقت گانے پر آتا تھا، دوکان کا ملک ہوتا تھا۔ ایسے موقعوں پر ہو شخص کا دل اس کی ہی طرف کھچا جاتا اور ہر شخص اس کے ہاتھوں کی حرکتوں کی نقل کرتا تھا کیونکہ گاتے وقت وہ اپنے ہاتھوں کو مستقل ہلاتا رہتا تھا جیسے اب اڑ جائے گا۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اگر وہ اپنے گیت کے بیچ رک کر یکا یک چیخنے لگتا "آؤ آؤ، سب چیزوں کو چکنا چور کر دیں!" تو وہ سب لوگ یہاں تک کہ وہ بڑے مقطع کاریگر اور ماہر استاد بھی دوکان کو پانچ منٹ میں کھنڈر بنا کر رکھ دیتے۔

وہ کبھی کبھار ہی گاتا تھا لیکن جب گاتا تھا تو اس کے وحشت انگیز گیوں میں ایک فتح مندی اور ایک ایسی بے پناہ قوت ہوتی تھی جس کے آگے کچھ ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ لوگ چاہے کتنے ہی مردہ کیوں نہ بیٹھے ہوں، وہ ہمیشہ ان کو ابھار دیتا تھا اور پھر وہ اپنے اعصاب کا سارا زور لگاتے اور آوازوں کو ایک تان مین اس قوت کے ساتھ سموتے کہ ایک طاقت ور ساز سا وجود میں آجاتا۔

ان گانوں کی وجہ سے مجھ کو گانے والے پر بڑا رشک آتا تھا کیونکہ اس کو لوگوں کو اکسا دینے پر اتنا قابو حاصل تھا۔ میرے دل میں ایسا رعب اور دبدبہ بیٹھ جاتا کہ دل کے تار تار ہلا دیتا اور یہاں تک دل کو ابھارتا کہ جوش کے مارے تکلیف سی ہونے لگتی اور میرا جی چاہتا کہ چیخ کر ان گانے والوں سے کہوں:

''آہ، مجھے تم سب سے محبت ہے! تم سب سے محبت ہے!''

بے چارہ تپ دق کا مارا رزدداویدوف بھی بالوں کے گچھے لٹکائے ہوئے، چھوٹا سا منہ کھول کر گانے میں شامل ہو جاتا تھا جیسے ابھی انڈے میں نکلا ہوا مینا کا بچہ منہ پھاڑ رہا ہو۔

لیکن ان جوشیلے رنگیلے گیتوں کو شروع کرنے کا سہرا ہمیشہ اس کزاک کے ہی سر رہتا تھا۔ عام طور پر مصور لوگ تو لمبے لمبے اور غمگین گانے گاتے تھے، مثلاً ''پتھر ہے دل لوگوں کا'' ''آہ جنگل سے آئے ہوئے ننھے جنگل سے ہوتے ہوئے'' یا الیکساندر اول کی موت کے متعلق گے'' کیسے آیا ہمارا الیکساندر اپنی فوجوں کا جائزہ لینے۔''

کبھی کبھار ژیخاریف (چہروں کا سب سے اچھا مصور) کی تجویز پر وہ لوگ مذہبی گیت گانے شروع کرتے لیکن یہ کوشش شاذ ہی کبھی کامیاب ہوتی کیونکہ ژیخاریف ہمیشہ ایسے گیتوں کی دھنیں پسند کرتا تھا جو صرف اس کے سمجھ میں آتیں اور دوسروں کے گانے میں ہمیشہ عیب نکالتا تھا۔

وہ دبلا پتلا آدمی تھا، کوئی پنتالیس سال کی عمر۔ سر پر کنارے کنارے خانہ بدوشوں جیسے سیاہ اور گھنگھریالے بال تھے اور چندیا صاف! سیاہ بھوئیں ایسی گھنی جیسے مونچھیں۔ اس کا چہرہ روسی نہیں لگتا تھا۔ طوطے کی سی ناک کے نیچے جو مونچھیں تھیں وہ بھوؤں کے آگے بڑی ناچیز معلوم ہوتی تھیں، البتہ اس کے تپتے ہوئے، خوبصورت چہرے کی سجاوٹ اس کی سیاہ، گھنی نوکدار داڑھی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں فرق تھا یعنی بائیں طرف کی آنکھ دھنی سے ذرا بڑی تھی۔

وہ اونچی آواز میں میرے ساتھی سے کہتا ''پاشکا! چلو شروع کرو'' رعریف ہو اس نام خدا کی!'' ''سنو بھئی سب لوگو...''

پاشکا ایرن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے شروع کرتا ''ت۔ع۔ع۔ر۔ی۔ی۔ف ہو اس...''

''نا۔آ۔آ۔آم خداک۔ی۔ی'' کئی اور آوازیں اس کی آواز میں شامل ہو جاتیں اور ژیخاریف بڑے جوش میں چیختا:

''نیچے کرو وہاں سے یوگینی!''

سیتانوف اپنی بھاری کھرجدار آواز میں گاتا جیسے کنڈال بجاتا جارہا ہو''تعریف ہو اس نام خدا کی...''

''تھو، ایسے نہیں! اس طرح گراؤ آواز کو کہ کائنات ہل جائے، یہ کھڑکیاں اور دروازے اپنے آپ سے بند ہو جائیں!''

یہ کہتے کہتے ژیخاریف پر ایک ایسی کپکپی طاری ہوتی جس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ عجیب وغریب قسم کی بھوئیں پھڑکتیں اور آواز پھٹنے لگتی، انگلیاں اس طرح چلتیں جیسے کسی ان دیکھے ساز کے تاروں پر دوڑ رہی ہیں۔

وہ بڑی شان سے پوچھتا''بات یہ ہے کہ گانا تو تب گایا جائے جبکہ انسان اس کے مغز تک اتر جائے، اس کی روح کو سمجھ لے، چھلکے تک رہنے سے بات نہیں بنتی۔ خدا کے بندو۔ تعریف ہو اس نام خدا کی! اب اس بات کو اگر دل سے محسوس کرو بھلے آدمیو تب ہے۔ کیوں؟''

سیتانوف نے ادب سے جواب دیا''اس جگہ پر آتے، کبھی ٹھیک سے گایا ہی نہیں جاتا۔''

''اچھی بات ہے۔ تو پھر چھوڑ دو!''

ژیخاریف کچھ خفا ہو کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ جہاں تک مصوری کا سوال ہے وہ ہمارا بہترین استاد تھا، اس سے بزنطینی طریقے پر یا فریاژی طریقے پر یا اطالوی روائت کے مطابق غرض جیسا چاہئے چہرہ بنوایا جا سکتا تھا۔ جب کبھی لاریونچ کسی ایسی تصویر کا آرڈر لیتا جو گرجے کی دیواروں یا محرابوں میں لگانے والی ہوتی تو وہ ژیخاریف کا مشورہ ضرور لے لیتا تھا کیونکہ وہ مقدس شاہکاروں کی خوب پہچان رکھتا تھا اور وہ تمام مقدس تصویروں کی نقلوں کی تفصیلی بھی خوب جانتا تھا۔ مثلاً ولی فیودروف، اسمولینسک، قازان کی کنواریاں، وغیرہ تو یہ سب اس کے ہاتھ میں سے گذرتی تھیں۔ لیکن جب بھی وہ اصل تصویروں کو دیکھتا تو بڑے زوروں میں شکایت کرتا:

''یہ آخر کیا ہے کہ ہم لوگوں کو ان اصلی تصویروں کی قید میں جکڑ رکھا ہے؟ ہاں اس کے یہی معنی ہیں کہ ان اصلی تصویروں سے ہم کو چھٹکارا مل ہی نہیں سکتا جیسے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ دئے ہیں!''

دوکان میں اس کی جگہ نہایت اہم تھی اور پوزیشن بہت بڑی تھی۔ اس کے باوجود وہ اوروں کی بہ

نسبت بہت خاکسار طبیعت تھا اور نئے کام سیکھنے والوں، پاویل اور مجھ سے بہت محبت سے پیش آتا تھا۔ وہی ایک فنکار تھا جو دراصل اس بات کا خواہش مند رہتا تھا کہ اپنا فن ہم کو سکھا دے۔

اس شخص کی ہستی کو سمجھنا بڑا مشکل تھا۔ مجموعی حیثیت سے وہ خوش مزاج اور خوش باش آدمی نہ تھا۔ کبھی کبھی ایک ایک ہفتہ مسلسل کام کرتا رہتا تھا لیکن کسی سے ایک لفظ بات نہ کرتا جیسے گونگا ہو۔ ان جانے پہچانے لوگوں کی طرف عجیب حیران نظر سے دیکھتا جیسے اس سے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کو گانے کا بیحد شوق تھا لیکن ایسے موقعوں پر وہ بالکل خاموش رہتا تھا بلکہ دوسروں کا گانا بھی سنا ان سنا کر جاتا تھا۔ ہر شخص اس کا منہ دیکھتا اور ایک دوسرے کو آنکھ مارتا۔ لیکن وہ بس مقدس شبیہہ کے ترچھے رکھے ہوئے تختے پر سر جھکائے رہتا۔ تختے کا ایک سرا اس کے گھٹنوں پر ہوتا اور اس کا نازک نقشہ ابھارتا، ایک ایسا چہرہ جو اس کے اپنے چہرے کی طرح ہوتا۔ اجنبی اور سانولا۔

کبھی کبھی وہ یکا یک خود بخود بولنے لگتا۔ اس وقت اس کی آواز صاف تو ہوتی مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بات پر ناراض ہے:

''ایک بات ہوئی۔ پرید تیچا۔ تیچا کے معنی قدیم سلاف میں ہوتے ہیں جانا، اور پرید کے معنی ہوتے ہیں آگے۔ تو گویا پرید تیچا کے معنی ہوئے۔ آگے جانے والا، یعنی پیش رو اور تو کچھ نہیں۔''

سب لوگ خاموشی سے مسکراتے اور اس کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے اور اس کے عجیب عجیب الفاظ اس خاموشی میں سنائی دیتے رہتے:

''اس کو یوں نہیں بنانا چاہئے تھا کہ لے کے بھیڑ کی کھال پہنا دی۔ اس کے تو پر بنانے چاہئے تھے...''

کوئی ہمت کر کے پوچھتا:

''اجی، کس سے بات ہو رہی ہے؟''

لیکن وہ جواب نہ دیتا، یا تو وہ سوال سنتا ہی نہیں یا جان بوجھ کر جواب نہ دیتا۔ اور پھر خاموشی میں اس کے الفاظ برسنے لگتے جیسے اس خاموشی کو ان ہی کا تو انتظار تھا۔

''ہم لوگوں کو ان کی زندگیوں کا حال معلوم ہونا چاہئے اور بھلا کون ان مقدس کتابوں کو ٹھیک سے پڑھتا ہے؟ اور ہم کیا جانتے ہیں؟ بے مقصد جیتے ہیں... اور روح کہاں ہے؟ روح؟ پوچھتا ہوں روح کہا

ہے۔ یہ اصلی تصویریں ہمارے پاس ہیں، یہ تو ٹھیک ہے لیکن ان کے دل کہاں ہیں، دل؟''

جب وہ زور زور سے ان خیالات کو آپ ہی آپ بڑبڑاتا جاتا تو سیتانوف کے علاوہ سب ہی مسکرانے لگتے، ہمیشہ کوئی نہ کوئی دبی زبان سے کہتا:

''سنیچر کو یہ لنڈھائینگے...''

لیکن سیتانوف۔ لمبا، مضبوط آدمی جس کی عمر ابھی صرف بائیس سال کی تھی اور جس کا گول چہرہ ابھی داڑھی بھووں سے بے نیاز تھا، سنجیدگی اور اداسی کے ساتھ ایک کونے میں نظریں گاڑ دیتا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار ژیخاریف نے فیودوروف والی پاک مریم کی نقل کونگور کی خانقاہ کے لئے بنائی اور جب ختم کر چکا تو اس کو میز پر رکھتے ہوئے بڑی جوشیلی اور تیز آواز میں بولا:

''لو کنواری ماں، مقدس ماں ختم ہوگئیں۔ اب تو بس یہ ایک اتھاہ خلا ہے جس میں لوگوں کے دلوں سے آنسو نچڑ نچڑ کر بھرا کریں گے۔''

پھر اس نے کسی اور کا کوٹ اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالا اور پھر باہر شراب خانے میں چلا گیا۔ نوجوانوں نے سیٹیاں بجائیں اور ہنسنے لگے، بوڑھوں نے رشک سے ٹھنڈی سانس بھری لیکن سیتانوف اٹھ کر پہلے تو مقدس شبیہہ کے پاس گیا، اسے غور سے دیکھا اور کہا:

''ہاں ہاں، بے شک وہ شراب پی کر نشے میں دھت ہو جانا چاہتا ہے۔ آہ اپنی اس حسین تخلیق سے جدا ہونے کے غم میں بے شک وہ پینا چاہتا ہے۔ مگر سبھی تو جدائی کا غم اس طرح نہیں اٹھا سکتے نا؟''

ژیخاریف کی پینے پلانے کی مہم ہمیشہ سنیچر کو شروع ہوتی تھی۔ پینے پلانے کی یہ عادت عام کاریگروں کی عام شراب نوشی جیسی نہیں تھی۔ وہ اس طرح پورا پروگرام بناتا تھا: صبح کے وقت وہ ایک چٹھی لکھ کر پاویل کے ہاتھ بھیج دیتا تھا، پھر دن کے کھانے سے پہلے وہ لاریونچ کو اطلاع دیتا:

''آج میں حمام جاؤں گا!''

''کیا زیادہ دیر لگے گی وہاں؟''

''خدا جانے!''

''اچھا تو منگل سے زیادہ دیر نہ لگائے گا!''

ژیخاریف اپنا گنجا سر ہلاتا، بھوئیں کپکپانے لگتیں۔

حمام سے واپس آ کر وہ چھبیلوں کے سے کپڑے پہنتا، سخت گریبان والی قمیص اور گلے میں رنگین مفلر اور سیاہ صدری میں چاندی کی لمبی زنجیر لگاتا، پھر روانہ ہو جاتا اور جاتے وقت مجھے اور پاویل کو ہدایت کرتا:

''دیکھو آج شام دوکان کی صفائی خاص طور پر ہونی چاہئے لمبی والی میز کو خوب رگڑ رگڑ کر دھو کر صاف کر لینا، اچھا!''

بس پھر تو سب پر تہوار کی فضا طاری ہو جاتی۔ مصور لوگ جلدی جلدی اپنی اپنی میزیں ٹھیک کرتے، حمام دوڑے جاتے اور کھانا بھی پھرتی سے کھا لیا جاتا۔ جب شام کا کھانا ختم ہو جاتا تو اس کے کچھ دیر بعد ژیخاریف نمودار ہوتے۔ ہاتھوں میں شراب اور بیئر اور کھانے پینے کی چیزیں لئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک عورت ہوتی۔ اتنی لمبی چوڑی کہ بس خدا کی قدرت لگتی، اس کا قد تقریباً چھ فٹ اور پانچ انچ تھا چنانچہ ہماری تمام میز کرسیاں اس کے سامنے کھلونے کی طرح لگتیں یہاں تک کہ لمبا سیتانوف بھی مقابلتاً بالکل بچہ سا نظر آتا۔ ویسے اس عورت کا جسم سڈول تھا لیکن چھاتیاں خوب اٹھی ہوئی، ٹھڈی سے بات کرتی دکھائی دیتیں۔ اس کے تمام حرکات وسکنات آہستہ آہستہ اور اکثر گھبرائے ہوئے ہوتے تھے۔ اگرچہ اس کی عمر چالیس سے بھی اوپر تھی لیکن اس کا گول چہرہ تاثرات سے بالکل خالی تھا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں، بالکل گھوڑے جیسی۔ لیکن اس کے چہرے پر ابھی نرمی اور شادابی باقی تھی۔ اس کا منا سا دھن ایسا لگتا تھا جیسے کسی سستی قسم کی گڑیا کا رنگا ہوا منہ ہو۔

وہ عورت مسکرا مسکرا کر اپنی چوڑی چکلی گرم ہتھیلی سب کی طرف بڑھاتی اور خواہ مخواہ کی باتیں کرتی جاتیں:

''کہئے کہئے کیسے مزاج ہیں۔ آج سردی بہت ہے۔ یہاں آپ کے کمرے میں بو بہت آ رہی ہے۔ ہاں وہ روغن کی بو ہوگی۔ کہئے کیسے مزاج ہیں۔''

ویسے اس عورت کو دیکھ کر خوشی ہوتی تھی کیونکہ وہ نہایت مضبوط اور نہایت سنجیدہ تھی جیسے کوئی چوڑے پاٹ کا دریا ہو۔ ہاں البتہ بات کرتی تھی تب ذرا بور کر دیتی تھی کیونکہ اس کو ہمیشہ ایسی بات سوجھتی تھیں جو سطحی اور اکتا دینے والی ہوں۔ کوئی لفظ شروع کرنے سے پہلے وہ اپنے سرخ رخسار پھلا لیتی چنانچہ وہ ابھی گول ہو جاتے۔

نوجوان کبھی کبھی ایک دوسرے سے پھس پھس کرتے:

''دیکھ بے یہ ہے مشین!''

''افوہ گھنٹہ گھر!''

وہ اپنی چھاتیوں کے نیچے دونوں ہاتھ باندھ لیتی اور ہونٹ بھینچے سماوار کے پیچھے والی میز کے پاس بیٹھتی، ہرایک کو باری باری اپنی اپنی محبت بھری گھوڑے کی سی آنکھوں سے دیکھا کرتی۔

ہر شخص اس کی عزت کرتا۔ نوجوان لوگ تو اس سے مرعوب رہتے تھے۔ کوئی نوجوان للچائی ہوئی نظروں سے اس کے بھاری جسم کی طرف دیکھتا لیکن اگر نگاہیں اس کی بھرپور نظروں سے مل جاتیں تو جھینپ کر سر جھکا لیتا۔ ژیخاریف بھی اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا تھا، تکلیف سے اس سے بات کرتا، ''بہن'' کہتا اور جب میز پر سے کوئی چیز اٹھاتا اور اس کے سامنے پیش کرتا تو جھک جاتا۔

وہ بڑے شیریں انداز میں آواز کو کھینچتی ہوئی کہتی:

''ارے آپ میرے لئے کیوں تکلیف کر رہے ہیں؟ ارے آپ کتنے بے خبر ہیں!''

خود تو وہ کبھی پھرتی کرتی ہوئی معلوم ہی نہیں ہوتی تھی اور چونکہ اس کی کہنیاں ہمیشہ اس کے پہلوؤں سے چپکی رہتی تھیں اس لئے اس کے ہاتھ صرف کہنیوں کے پاس سے ملتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اس کے بھاری بھرکم جسم سے تازی ڈبل روٹی کی خمار آگئیں خوشبو آیا کرتی تھی۔

بوڑھا گوگولیف ادھر ادھر مسلسل خوشی کے مارے مٹکتا ہوا اینڈتا پھرتا اور اس عورت کی خوب چوپلوسی اور تعریفیں کرتا۔ اس کی آواز گھٹنے لگتی اور وہ سر ایک طرف کو ڈھلکائے بڑے احترام سے اس کی باتیں سنتی رہتی گویا وہ پادری ہو جو وعظ کہہ رہا ہو۔ جب کبھی گوگولیف کے الفاظ الجھ جاتے تو وہ اپنی طرف سے الفاظ جوڑتی؛

''میں کمسنی میں زیادہ خوبصورت نہیں تھی لیکن ایک میٹرن صاحبہ تھیں ان کے تجربات سے یہ نتیجہ برآمد ہوا۔ اور تیس سال کی عمر تک پہونچتے پہونچتے میں اتنی خوبصورت ہوگئی کہ بڑے بڑے شرفا کی نظریں مجھ پر اٹھنے لگیں اور ایک بڑے آدمی نے تو مجھے ایک بگھی بھی دینے کو کہی اور گھوڑوں کا جوڑا بھی...''

کاپیندیوخن جو اس وقت تک شراب کے نشے میں ہوش وحواس کھو کر گڑبڑا رہا تھا، اس عورت کو غصے کی نگاہوں سے گھور کر بدتمیزی سے چیخا:

''اچھا۔ کسی چیز کے عیوض میں دینے کو کہا تھا؟''

مہمان بولی ''وہ تو ظاہر ہے۔ میری محبت کے عیوض میں۔''

''محبت؟'' کاپیندیوخن بوکھلا ہوئے بولا ''کیا مطلب آپ کا محبت سے!''

وہ عورت سادگی سے بولی ''ارے تمہارے ایسے بانکے نوجوان کو تو معلوم ہونا چاہئے کہ محبت کا کیا مطلب ہے۔''

ساری دوکان قہقہوں سے گونج اٹھی اور سیتانوف نے کاپیندیوخن کے کان میں کہا:

''یہ عورت گدھی ہے، اس سے بھی بدتر! زندگی میں اور کچھ نہ ہو تو پھر اس عورت سے عشق کرو۔ ہاں، یہ تو کھلی بات ہے...''

شراب کے اثر سے اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا، کنپٹیوں پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے، ذہین آنکھوں میں خطرے کے شعلے لپک رہے تھے۔ بڑے میاں گوگولیوف نے اپنی بھدی ناک سکیڑی اور نم ناک آنکھوں کو انگلیوں سے پونچھتے ہوئے بولے:

''آپ کے بچے کتنے ہوئے؟''

''صرف ایک۔''

ایک لیمپ میز کے بالکل اوپر جلا کرتا تھا اور دوسرا کونے میں تندور سے ذرا ہٹ کر۔ ان دونوں لیمپوں کی روشنی کم پڑتی تھی چنانچہ دوکان کے کونوں میں تاریک پرچھائیاں باقی رہ جاتی تھیں اور وہاں سے نامکمل شبیہیں جھانکتی دکھائی دیتیں، ہاتھوں اور چہرے کی جگہ خالی خالی۔ بھوری اور سرمئی پرچھائیاں نظر آتیں تو ذہن میں عجیب عجیب شکلیں ابھرنے لگتیں اور یہ محسوس ہوتا کہ ولیوں کے جسم کسی پراسرار طریقے سے اڑ گئے اور اپنا رنگا ہوا لباس اس اندھیرے کمرے میں چھوڑ گئے۔ شیشے کی گیندیں اٹھا کر چھت سے باندھ دی جاتی تھیں جہاں وہ دھوئیں کے بادلوں کے درمیان نیلی نیلی چمکتی رہتیں۔

ژیخاریف میز کے چاروں طرف مسلسل پریشان چکر کاٹتا اور ہر ایک کے ساتھ میزبانی کے فرائض ادا کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کی گنجی کھوپڑی کبھی کسی کے آگے جھکتی، کبھی دوسرے کے آگے۔ پتلی پتلی انگلیاں برابر متحرک رہتیں۔ ادھر وہ کچھ دبلا ہو گیا تھا، طوطے کی سی ناک ذرا اور بھی تیکھی نکل آئی تھی کہ روشنی کے رخ کھڑا ہوتا تو اس کے گال پر ناک کی سیاہ پرچھائیں پڑتی۔ وہ گونجتی ہوئی آواز میں کہتا:

''کھاؤ، پیو، موج کرو یارو!'' اور وہ عورت سریلی آواز میں تان لگاتی جیسے وہی تو سب کو کھانا کھلا رہی ہے:

''ارے میں مرگئی! بھئی آپ کیوں اس قدر تکلف کر رہے ہیں؟ ہر شخص کا اپنا ہاتھ ہے، اپنا پیٹ ہے۔ آخر جس کو جتنی خواہش ہوگی، جتنی بھوک ہوگی، اس سے زیادہ تو کھا نہیں لے گا۔''

''بھائیو، خوب مزے کرو!'' ژیخاریف جوش میں آ کر چیختا۔ ''ہم سب معبود کے بندے ہیں۔ دوستو، گاؤ ''تعریف ہو اس نام خدا کی!...''

گانا چلا مگر حسب دستور نا کامیاب رہا۔ اس وقت تک سب لوگ خوب کھانا کھا کر اور خوب وادکا پی کر بڑے مزے میں آ گئے۔ کاپیند یوخن نے اکارڈین اٹھایا۔ نوجوان وکٹر سلاوتین جو کوے کی طرح سانولا اور سنجیدہ تھا، تنبورہ بجا رہا تھا۔ تنبورے میں ایک گھنگھناتی ہوئی آواز نکلتی تھی اور ساتھ ہی اس کے گول کنارے کے چاروں طرف لگے ہوئے گھنگھروؤں کی پیاری جھنجھناہٹ۔

ژیخاریف نے حکم دیا ''چلو ہو جائیں دو چار روسی قدم۔ بہن اٹھئے ذرا مہربانی کر کے!''

''اف'' عورت ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہتی ''ارے آپ کتنی پریشانی اٹھاتے ہیں!''

بہن بیچوں بیچ فرش پر آ کر گھنٹہ گھر کی طرح کھڑی ہو گئی۔ خوب گھیر دار بھورے رنگ کا سایہ پہنے ہوئے تھی، زرد رنگ کی چست کمر کی صدری، سر پر سرخ رومال بندھا تھا۔ اکارڈین سے ایک جاندار تان نکلنے لگی، ننھی ننھی گھنٹیاں بجنے لگیں اور تنبورہ رہ رہ کر سانس بھرنے لگا جیسے اس کا دم گھٹا جا رہا ہو، جیسے کوئی مخبوط الحواس انسان پھوٹ پھوٹ کر رہ رہا ہو، دیواروں سے سر پھوڑ رہا ہو، سسکیاں اور آہیں بھر رہا ہو۔

ژیخاریف کو ناچنا واچنا تو آتا نہیں تھا، بس اپنے قدم ادھر سے ادھر کھسکاتا رہتا، چمکدار بوٹوں کی ایڑیاں رگڑتا رہتا یا بکری کی طرح اچھل کود کرتا جو ساز سے بالکل ہی الگ جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے قدم اس کے قابو میں نہیں ہیں۔ جسم کو موڑتا تو اس بھدے طریقے سے جیسے بھڑ مکڑی کے جال میں چکر کاٹ رہی ہو یا مچھلی جال میں۔ دیکھ کر رنج ہوتا تھا۔ لیکن تمام لوگ، یہاں تک وہ لوگ بھی جو شراب کے نشے میں دھت رہتے تھے، وہ بھی، اس کی ان تشنجی حرکتوں کو بڑے غور سے تکتے رہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں اس کے چہرے اور ہاتھوں پر چپکی رہتی تھیں۔ ژیخاریف کے چہرے کے تاثرات نہایت حیرت انگیز طریقے سے بدلتے تھے۔ ابھی نرمی اور شرمیلا پن طاری ہے تو ابھی تمکنت اور ناز ہے، تو ابھی ناک بھوں

چڑھ گئی ہے۔ پھر کسی بات پر وہ یکا یک حیران سا رہ جاتا، ایک لمحے آہ بھرتا اور آنکھیں بند کر لیتا۔ جب آنکھیں کھلتیں تو سخت اداسی طاری ہوتی۔ مٹھیاں بھینچ کر وہ اس عورت کی طرف رینگتا بڑھتا لیکن پھر ٹھپ سے پاؤں پٹخ کر وہ اس کے سامنے دوزانو ہو جاتا۔ بازو دونوں پھیل جاتے، بھوئیں تن جاتیں اور عورت کو بڑی جاندار مسکراہٹ سے دیکھتا۔ وہ نظریں جھکا کر جوابی مسکراہٹ بخشتی اور اپنے پرسکون سنجیدہ انداز میں اس کو خبردار کرتی:

''دیکھئے بھائی، آپ اپنے آپ کو تھکا ڈالیں گے، پریشان کر لیں گے اپنے آپ کو۔''

پھر وہ کوشش کرتی کہ ناز کے ساتھ آنکھیں بند کرے لیکن آنکھیں جو تین کوپک والے سکے کے برابر تھیں، بند ہونے سے انکار کر دیتیں اور اس کوشش میں جو جھریاں پیدا ہو جاتیں تو ان سے اس کے چہرے میں ایک ناخوشگوار کیفیت پیدا ہو جاتی۔

اس کو بھی ناچنا واچنا نہیں آتا تھا، صرف اپنے بھاری جسم کو آہستہ آہستہ حرکت دیتی اور بے آواز طور پر قدم بدلتی تھی۔ بائیں ہاتھ میں ایک رومال ہوتا تھا اور وہ بہت آہستہ آہستہ رومال ہلاتی جاتی تھی۔ دھنا ہاتھ کولہے پر رکھا ہوتا تھا جس سے وہ ایک بڑے سے بھاری جگ کی طرح لگتی۔

اور ژیخاریف جب اس مجسمہ جیسی عورت کے چاروں طرف چکر کاٹتا تو اس کے چہرے پر متضاد کیفیتیں نمایاں ہوتی رہتیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس جگہ صرف وہ اکیلا نہیں ناچ رہا ہے بلکہ دس آدمی ہیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف۔ ایک شرمیلا اور خاکسار ہے، دوسرا ترش رو اور بھیانک، تیسرا خود ہی سہما ہوا جو اس بھاری بھرکم ناخوشگوار عورت سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر یکا یک ایک اور شخصیت نمودار ہوتی، اس کے دانت نکلے ہوئے ہوتے، جسم زخمی کتے کی طرح بل کھا رہا تھا۔ اس مکروہ ناچ سے میرا دم گھٹنے لگتا اور گندی گندی یادیں میرے ذہن پر ابھرنے لگتیں: سپاہیوں اور باورچنوں اور دھوبنوں اور کتوں کے جوڑا کھانے کی یادیں۔

سید وروف کے پرسکون الفاظ یاد آتے:

''ان باتوں کے متعلق سب جھوٹ بولتے ہیں۔ ان لوگوں کو شرم یوں آتی ہے کہ دراصل محبت کوئی نہیں کرتا۔ یہ سب کچھ مزے کی خاطر ہے!...''

میں اس بات کو ماننے کے لئے تیار بالکل نہ تھا کہ ہر شخص ان باتوں کے متعلق جھوٹ بولتا ہے، اگر

ایسا تھا تو پھر ملکہ مارگٹ بھی؟ اور یقیناً ژیخاریف بھی جھوٹ آدمی تو نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ سیتانوف کو ایک رنڈی سے محبت تھی جس نے اسے ایک شرمناک بیماری میں مبتلا کر دیا تھا۔لیکن سیتانوف نے اسے پیٹا نہیں حالانکہ ساتھیوں نے سیتانوف کو یہی صلاح دی تھی، بلکہ اس کے لئے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا تھا اور اس کا ڈاکٹری علاج کروارہا تھا اور ہمیشہ خاص محبت اور عزت سے اس کا ذکر کیا کرتا تھا۔

وہ لحیم شحیم عورت ناچے جا رہی تھی، چہرے پر وہی جمی ہوئی مسکراہٹ چپکی ہوئی، رومال ہاتھ میں اسی کے چاروں طرف اچک پھاندرہا تھا اور میں عورت کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا: یہ ممکن ہے کہ حوا کی بھی شکل اس گھوڑے کی سی رہی ہو؟ حوا جس نے معبود کو بھی چکمہ دے دیا تھا!'' مجھے اس عورت سے نفرت ہونے لگی۔

تاریک دیواروں پر سے مقدس شبیہیں جھانک رہی تھیں جن کے چہرے ابھی نہیں بنے تھے۔ باہر سے رات کا اندھیرا کھڑکیوں کے شیشوں پر دباؤ ڈال رہا تھا اور اندر گھٹی دوکان میں لیمپ دھندلے دھندلے جل رہے تھے۔ ناچتے ہوئے قدموں کے دھپادھپ اور آوازوں کے گنگناہٹ کے باوجود مجھے تانبے کے آب گرے میں سے پانی کے بوند بوند کر کے اگالدان میں ٹپکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

یہ زندگی کتابوں میں بیان کی ہوئی زندگی سے کس قدر مختلف تھی! کس قدر بھیانک تضاد تھا دونوں میں! جلد ہی سب لوگ اکتانے لگے۔ کاپیندیوخن نیا کارڈین سلاوتین کے ہاتھ میں ٹھونس دیا اور چیخا:

''آؤ فرش ہلائیں! زمین میں آگ لگا دیں!''

وہ وانیا خانہ بدوش کی طرح ناچتا تھا جیسے ہوا میں پرواز کر رہا ہو۔ پھر پاویل اودینتسوف اور ساورکن نے کچھ تیز اور پھرتیلے قدم دکھائے، یہاں تک کہ تپ دق کا مارا داویدوف بھی ناچنے لگتا اور دھول دھوئیں، وادکا اور بھونے ہوئے گوشت کی تیز بو سے کھانسنے لگتا۔ گوشت کی تو بو یوں پھیلتی رہتی تھی جیسے چمڑا جل رہا ہو۔

وہ اس طرح برابر ناچتے، گاتے، چیختے چلاتے رہے جیسے کسی نہ کسی طرح خوش ہونے کی کوشش کر رہے ہوں، جیسے ایک دوسرے کی پھرتی اور قوت برداشت کی آزمائش کر رہے ہوں۔

سیتانوف جواب نشے کی ترنگ میں تھا، جا جا کر ہر ایک سے دبی آواز میں پوچھتا:

''ارے ژیخاریف آخر اس عورت سے کیسے عشق لڑاتا ہے؟''

لگتا ہے جیسے وہ فوراً رو پڑے گا۔

لاریونچ نے اپنے ہڈیاں نکلے ہوئے کندھے ہلائے اور جواب دیا:

''ارے عورت پھر عورت ہے۔ اور پھر آخر تمہیں اس سے کیا مطلب؟''

لیکن ابھی یہ لوگ ان دونوں کا ذکر کر ہی رہے تھے کہ وہ چپکے سے باہر چلے گئے۔

اب ژیخاریف دو تین دن بعد دوکان پر لوٹے گا۔ حمام میں جائے گا اور پھر دو تین ہفتے لگا تار اپنے کونے میں بیٹھ کر بڑی شان کے ساتھ سب سے الگ تھلگ اپنے کام میں بھوت کی طرح جٹا رہے گا۔

سیتانوف نے اپنی غم گین نیلی مائل بھوری آنکھیں گھما کر کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور اپنے آپ سے پوچھتا ''چلے گئے یہ لوگ؟''

سیتانوف کے چہرے پر بڑھاپا تھا، دلکشی بالکل نہیں تھی۔ آنکھیں البتہ شفاف اور شفیق تھیں۔

وہ مجھ پر مہربان تھا اور اس کے لئے مجھے اپنی اس بیاض کا شکر گذار ہونا چاہئے تھا جس میں بہت اشعار بھرے ہوئے تھے۔ وہ خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا تھا ویسے اس جگہ یہ یقین سے کہنا مشکل ہی تھا کہ لاریونچ کے سوا اور کون خدا سے محبت کرتا تھا۔ ہر شخص خدا کے متعلق ایک عجیب طنزیہ انداز میں بات کرتا تھا جیسے اپنی مالکن کا ذکر کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بات بھی تھی کہ جب دن کا یا رات کا کھانا کھانے بیٹھتے تو سینے پر صلیب کا نشان ضرور بناتے، سونے کے لئے لیٹتے تو دعا ضرور پڑھتے۔ ہر شخص اتوار کے دن گرجے ضرور جاتا۔

لیکن سیتانوف ان میں سے کسی بات کا پابند نہ تھا اور لوگ اس کو ملحد سمجھتے تھے۔

''خدا جیسی کوئی چیز نہیں'' وہ اپنی رائے جماتا۔

''تو پھر ہر چیز پیدا کہاں سے ہوتی ہے؟''

''یہ مجھ کو معلوم نہیں...''

ایک بار میں نے اس سے پوچھا ''مگر یہ ہو کیسے سکتا ہے کہ کوئی خالق ہی نہ ہو دنیا کا؟''

اس نے اپنے لمبے لمبے بازو سر سے بھی اونچے بلند کئے ''دیکھو۔ بات یہ ہے کہ خدا تو ہے بلندی'' وہ زمین کی طرف اشارہ کر کے بولا ''اور انسان ہے پستی۔ ہے نا؟ لیکن حدیث یہ ہے کہ پروردگار نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا۔ اب تم بتاؤ کہ یہ گوگولیف جو ہیں، یہ کس کی صورت پر بنائے گئے ہیں؟''

میں گھبرا گیا۔ اپنی عمر کے باوجود گوگولیف، گندہ اور شرابی گوگولیف، جلق لگایا کرتا تھا۔ پھر مجھے نانی اماں کی بہن اور اریموخین کی بھی یاد آتی، ویاتکا والے سپاہی کا بھی خیال آیا۔ آخر ان لوگوں میں خدا کے نور کے کیا آثار نظر آ سکتے تھے؟

سیتانوف نے کہا ''لوگ سور ہوتے ہیں، سور!'' لیکن پھر مجھے سمجھانے لگا ''ارے پریشانی کی کوئی بات نہیں، میکسیمچ! انسانوں میں اچھے لوگ بھی ہوتی ہیں۔ سچ مچ ہوتی ہیں!''

مجھے اس سے بات کرنے سے سکون سا محسوس ہوتا تھا۔ اگر اسے کوئی بات معلوم نہ ہوتی تو فوراً تسلیم کر لیتا کہ نہیں معلوم ہے۔ جھٹ کہتا ''مجھے معلوم نہیں بھئی یہ بات۔ اس کے متعلق سوچا ہی نہیں کبھی!''

یہ بھی ایک غیر معمولی بات تھی۔ میں اور جن لوگوں سے ملا تھا وہ سب کے سب یہ سمجھتے تھے کہ وہ علم کل اور عقل کل ہیں اور کسی بھی مضمون پر بحث کیے جاتے اور ہرگز باز نہ آتے۔

مجھے اس بات پر بھی تعجب ہوتا تھا کہ جہاں اس کی بیاض میں بہت سے بلند، حسین اور روح پرور اشعار بھی تھے جن کو پڑھ کر چہرہ شرم سے سرخ ہو جاتا تھا۔ جب میں نے اس سے پوشکن کا ذکر کیا تو اس نے نظم ''گاوریلیادا'' کا ذک رجب میں نے اس سے پوشکن کا ذکر کیا تو اس نے نظم ''گاوریلیفا کا ذکر کیا جو اس نے کاپی کر لی تھی...

''پوشکن؟ اس کو تو میں زیادہ سنجیدگی سے نہیں پڑھ سکتا تھا لیکن ہاں بینیدیکتوف۔ وہ ہے پڑھنے کے قابل، ہاں میکسیمچ!''

پھر وہ آنکھیں بند کر لیتا اور آہستہ آہستہ دوہراتا:

''آہ اس حسینہ کے
سحر طراز سینوں کو
دیکھ کر ہوئے حیران
چشم...

نہ جانے کیوں وہ ان تین مصرعوں کو اکثر بڑے فخر سے دوہرایا کرتا تھا:

چشم عقابی بھی کہاں،
نیزہ باز نظروں سے

ان نوکیلے پاسبانوں کے

پار جانہیں سکتی

اس کے دل کے پردوں سے

رازِعشق لانہیں سکتی!

''سمجھے؟''

میں نے شرما کر تسلیم کیا کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان مصرعوں میں کیا بات تھی جس پر وہ اتنا نہال ہوا جا رہا تھا۔

14

دوکان میں میرے فرائض کچھ پیچیدہ نہیں تھے۔ صبح کو کسی کے اٹھنے سے پہلے مجھے اٹھنا ہوتا تھا اور مصوروں کے لئے سماوار گرم کرنا پڑتا۔ جب تک وہ لوگ باورچی خانے میں چائے پیتے، میں پاویل کمروں کی جھاڑو بہار اور صفائی کر لیتے، رنگوں کے ملانے کے لئے انڈوں کی زردی سفیدی الگ الگ کر لیتے اور پھر میں گاہکوں کو پھانسنے اور دوکانداری کے جھمیلوں میں لگ جاتا۔ شام کو میرا کام یہ تھا کہ رنگوں کو ملانے، پھینٹنے وغیرہ میں مددگاروں اور استادوں کو کام کرتا ہوا غور سے دیکھوں تا کہ کچھ سیکھ سکوں۔ شروع شروع میں تو میں نہایت غور سے دیکھا کرتا تھا لیکن بہت جلد مجھے یہ نظر آنے لگا کہ ان لوگوں میں سے بہت سے لوگوں کو اپنا یہ ٹکڑے ٹکڑے کیا ہوا کام پسند نہیں تھا اور وہ زیادہ عاجز رہتے اور کافی کوفت محسوس کرتے تھے۔

شام کے وقت میرے پاس کام کم رہتا تھا۔ میں مصوروں کو اپنی اسٹیمر کی زندگی کے حالات سنا سنا کر اپنی یہ شامیں گزارتا، یا پھر کتابوں میں پڑھی ہوئی کہانیاں سناتا اور دیکھتے ہی دیکھتے مجھے اندازہ بھی نہ ہوا اور میں نے اس دوکان میں ایک خاص حیثیت حاصل کر لی۔ داستان گو اور قصہ خواں کی حیثیت۔

مجھے بہت جلد یہ نظر آنے لگا کہ ان لوگوں میں سے کسی کو نہ اتنے معلوم تھے جتنے مجھے تھے، نہ کسی نے اتنی دنیا دیکھی تھی جتنی میں نے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ شروع بچپن ہی سے اپنے اپنے پیشے کی کوٹھریوں میں بند تھے۔ دوکان بھر کے لوگ میں صرف ژیخاریف تھا جو ماسکو گیا تھا اور وہ ہمیشہ اس کا ذکر

بڑی شان کے ساتھ تیوری چڑھا کر کیا کرتا تھا۔

''ماسکو میں منہ بسورنے سے دال نہیں گلتی! وہاں تو اپنی آنکھیں چوپٹ کھلی رکھنی ہوتی ہیں!''

باقی لوگوں میں سے کوئی شویا یا ولادیمیر سے آگے نہیں گیا تھا۔ اگر قازان کا ذکر ہوتا تو وہ لوگ مجھ سے پوچھتے:

''کیا وہاں روسیوں کی تعداد کافی ہے؟ کیا گرجے بھی ہیں وہاں؟''

ان کے واسطے پیرم کے معنی سائبیریا کے تھے اور ان کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ سائبیریا تو اورال پہاڑوں سے بھی پرے ہے۔

''واہ، وہاں سے تو اورال کے مچھلیاں لائی جاتی ہیں، وہاں کلسپین کے سمندر سے! تو اس کے معنی یہی ہوئے کہ اورال اسی سمندر پر ہوگا!''

کبھی کبھی جب وہ کہتے کہ انگلستان سمندر کے اس پار ہے اور نپولین بونا پارٹ شہر کالوگا کے امیر خاندان سے تھا تو مجھے خیال گذرتا کہ شاید یہ لوگ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ جب میں انہیں اپنی آنکھوں دیکھی باتیں بتاتا تب تو شاذ ہی میرا یقین کرتے لیکن جب سنسنی خیز کہانیاں اور پیچیدہ قصے سناتا تو بڑے شوق سے سنتے۔ یہاں تک کہ جو لوگ ذرا بوڑھے تھے وہ بھی ہوائی باتوں کو حقیقت پر ترجیح دیتے تھے، قصوں اور افسانوں کو واقعات پر! مجھے صاف نظر آتا تھا کہ جتنی ہی دوراز کار داستان کو واقعات پر! مجھے صاف نظر آتا تھا کہ جتنی ہی دوراز کار داستان ہوتی، جتنے ہی ناممکن الوقوع حالات ہوتے اتنا ہی وہ اس پر زیادہ دھیان دیتے، زیادہ غور سے سنتے۔ غرض کہ ان کو حقیقت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور حال کی بدھیتی اور مفلسی کو ذہن سے محو کرنے کے لئے ہر ایک مستقبل کی طرف اداس نگاہوں سے تکے جا رہا تھا۔

اس بات سے مجھے اور بھی تعجب ہوتا کیونکہ مجھ کو تو ابھی سے حقیقت اور افسانے کے تضادات کا ایک گہرا شعور تھا۔ یہ لوگ میرے سامنے سچ مچ کے انسان تھے اور ان کے ایسا مجھے کتابوں میں کب کوئی نظر آسکتا تھا۔ کتابوں میں کب کوئی نظر آسکتا تھا۔ کتابوں میں سمورئی کہاں؟ خلاصی یا کوف کہاں؟ فراری الیکساندر کہاں؟ ژیخاریف، نتالیا ایسی دھوبن کہاں؟

داویدوف کے صندوق میں کئی پرانی کتابیں اکٹھی تھیں، مثلاً گالیتسینسکی کی کہانیوں کا مجموعہ، بلگارین کا ناول ''ایوان ویژیگین'' اور بیرن برامبیوس کی ایک کتاب۔ میں نے سب کتابیں پڑھ کر

مصوروں کو سنائیں اور ان کو بے حد لطف آیا۔ لاریونچ کہنے لگا:

''پڑھنا نہایت اچھی بات ہے! اس سے خواہ مخواہ شور وشر دب جاتا ہے، لڑائی جھگڑا بھی نہیں ہوتا!''

اب میں نے اور کتابیں تلاش کرنی شروع کیں جو کچھ بھی مل جاتا بس ان لوگوں وک سناتا۔ قریب قریب ہر شام پڑھتا۔ وہ شامیں بڑی اچھی شامیں تھیں! دوکان میں آدھی رات کا سا سناٹا چھا جتا، شیشے کی دمکتی ہوئی گیندیں ٹھنڈے دودھیا ستاروں کی طرح سروں پر لٹکتی رہتیں، ان کی کرنیں میزوں پر جھکے ہوئے چندیا، صاف گنجے یا الجھے بالوں والے سروں پر روشنی کی بارش کرتی رہتیں۔ مجھے اپنے چاروں طرف پر سکون اور غور کرتے ہوئے چہرے نظر آتے تھے۔ کبھی کسی کی زبان سے ہیرو یا مصنف کی تعریف میں بے ساختہ ایک آدھ لفظ نکل جاتا۔ جیسے یہ لوگ دن کو ہوتے تھے اس سے بالکل مختلف اس وقت لگتے۔ خاموش، نیک، بردبار۔ ان لمحوں میں مجھ کو ان پر پیار آتا اور وہ بھی مجھ سے قریب کھنچ آتے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میری اصل منزل یہی ہے۔

سیتانوف ایک دن کہنے لگا:

''یہ کتابیں تو ایسا سماں باندھتی ہیں جیسے بہار آگئی ہو۔ کھڑکی کھولو اور بہار کا پہلا جھونکا آکر دل و دماغ کو معطر کر جائے۔''

ہم لوگوں میں سے کسی کو یہ خیال تو آیا ہی نہیں کہ لائبریری کے ممبر ہو جائیں اس لئے کتابیں حاصل کرنے میں دقت ہی ہوتی تھی۔ میں ہی بھکاری کی طرح ایک ایک کے آگے ہاتھ پھیلا پھیلا کر کسی نہ کسی طرح کتابیں لے آیا کرتا تھا۔

ایک دن فائر بریگیڈ کے بڑے افسر نے مجھے کو لیرمونتوف کی نظموں کا ایک مجموعہ دیا۔ یہ کتاب پڑھ کر مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ شعر کی قوت کس کو کہتے ہیں اور کس طرح شاعری انسان کے ذہن پر چھا کے رہ جاتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں نے نظم ''دیو'' پڑھنی شروع کی تو سیتانوف نے پہلے تو جھانک کر کتاب کے اندر دیکھا، پھر میری صورت دیکھی، پھر اپنا برش رکھ دیا، اپنے لمبے لمبے ہاتھ اپنے گھٹنوں میں دبائے اور آگے پیچھے ہل ہل کر مسکرانے لگا۔ کرسی اس کے ہلنے کے ساتھ چوں چوں کرتی جاتی تھی۔

لاریونچ نے بھی اپنا کام ایک طرف کو سرکا دیا، اٹھ کر سیتانوف کی میز کے پاس میرے قریب آبیٹھا

اور آہستہ سے بولا ''ہش، سب خاموش!''

نظم پڑھتے پڑھتے مجھ پر وہ جوش طاری ہوا کہ سینے میں دم گھٹنے لگا، آواز بھرانے لگی اور آنکھوں میں آنسو یوں ابلے کہ سطروں کا پڑھنا دشوار ہو گیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ میں خاموش اور دبی ہوئی حرکات وسکنات کو محسوس کرتا تھا جو کمرے میں جاری رہتی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرے چاروں طرف ہر چیز سانس لیتی ہے اور پھیلتی چلی جا رہی ہے اور یہ تمام لوگ ایک زبردست مقناطیسی کشش کے تحت کھنچے ہوئے مجھ سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ جب میں نے قصہ اول پڑھ کر ختم کیا تو تمام مصور لوگ میز کے چاروں طرف گھیرا ڈالے نظر آئے۔ کوئی مسکراتا، کوئی اداس، کوئی تیوری پر بل ڈالے، کوئی حیران۔ سب کی باہیں ایک دوسرے کے گلے میں پڑی ہوئی تھیں۔

ژیخاریف نے میرا سر پکڑ کر کتاب پر جھکا دیا ''پڑھے جاؤ، پڑھے جاؤ۔''

جب میں پوری کتاب ختم کر چکا تو اس نے کتاب لے لی، سرورق پر ایک نظر ڈالی اور پھر کتاب کو بغل میں دبا کر بولا:

''اب کل اس کو پھر پڑھنا ہوگا، سمجھے۔ کل ہی! اور اتنے میں اس کتاب کی حفاظت کروں گا۔''

وہ میز کے پاس سے ہٹا، اپنی میز کی دراز کھول کر لیرمونتوف کا مجموعہ اس میں رکھ کے تالا بند کیا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ دوکان پر سناٹا چھا گیا۔ لوگ خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ سیتانوف کھڑکی کے پاس جا کر بے حس وحرکت کھڑا ہو گیا اور اپنے سر کو اس کے شیشے پر لگا دیا اور ژیخاریف نے ایک بار پھر اپنا برش الگ رکھتے ہوئے زور سے کہا:

''اسی کو میں زندگی کہتا ہوں، خدا کے بندو۔ یہی ہے زندگی!'' پھر کندھے ہلائے اور سر جھکا کے بولتا گیا ''میں تو اس دیو کی تصویر بنا سکتا ہوں، اس کو رنگ سکتا ہوں۔ سیاہ، جھولا ہوا، تھل تھل جسم، شعلوں کے رنگ کے پر جیسے دھکتا ہوا سیسہ اور ہاتھ پاؤں، چہرہ نیلے۔ ہلکے نیلے جیسے چاندنی رات میں برف کا رنگ۔''

رات کے کھانے کے وقت تک وہ برابر اپنے اسٹول پر ایک عجیب قسم کی پریشانی سے ادھر ادھر ہلتا رہا، کبھی میز پر انگلیوں سے طبلہ بجاتا، کبھی بھوت اور شیطان، حوا اور عورتیں، جنت اور ولیوں کے بھی گناہوں کے متعلق بڑبڑانے لگتا۔ بڑبڑاہٹ جو سمجھ میں تو نہ آتی لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا کہ کس موضوع

کے متعلق ہے۔ پھر ایک دم سے بڑے یقین سے بولا:

''اور کیا، ٹھیک تو ہے! آگے خدا کے ولی لوگ بدچلن عورتوں کے ساتھ بدچلنی کو بینگے تو دیو یقیناً ایک نیک چلن روح کو بہکانے میں تو فخر محسوس کر ہی سکتا ہے...''

کسی نے اس کی بات کو جواب نہیں دیا۔ غالباً میری طرح سب ہی کا یہ خیال تھا کہ اب کون جواب دے۔ لوگ گھڑی پر نظریں جمائے بے دلی سے کام کرتے رہے اور جیسے ہی نو بجے سب نے فوراً کام بند کر دیا۔

سیتانوف اور ژیخاریف باہر احاطے میں چلے گئے، میں بھی ان سے جاملا۔ سیتانوف نے آسمان پر دیکھتے ہوئے ستاروں کی طرف نظریں اٹھائیں بولا:

بھٹکتا ہے قافلہ

کائناتی رہگذاروں میں...

''سوچو تو ذرا کیا الفاظ لایا ہے ڈھونڈ کر۔ کیا تلاش ہے!''

ژیخاریف نے کھلے آسمان کے نیچے کھڑے کھڑے سردی سے کانپتے ہوئے کہا ''مجھے تو لفظ ایک بھی یاد نہیں اس کا! مجھے کچھ بھی یاد نہیں مگر مجھے دیو صاف نظر آرہا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک انسان اور ایسی بات کہے جس سے دیو پر واقعی ترس آنے لگے۔ دیو سے ہمدردی ہو جائے! کیوں دیو پر ترس آنے لگتا ہے نا، اس کو سن کر؟''

سیتانوف نے اتفاق کرتے ہوئے کہا ''بے شک آنے لگتا ہے۔''

''دیکھو ذرا، اسے کہتے ہیں انسان!'' ژیخاریف نے آہستہ سے کہا۔

اس کی یہ بات میرے دل میں کچھ اس طرح بیٹھی کہ ہمیشہ کو نقش ہو گئی۔

جب وہ ڈیوڑھی میں داخل ہونے لگا تو مجھ سے دھیمے سے کہا:

''دیکھ میکسیمچ، دوکان میں اس کتاب کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ یقیناً یہ کتاب ممنوع ہوگی!''

میں خوشی سے اچھل پڑا: اچھا تو یہ اس قسم کی کتاب تھی جس کے متعلق مجھے اقبال گناہ کے وقت پادری صاحب نے خبردار کیا تھا!

کھانا بڑی بے نیازی سے اور خاموشی سے کھایا گیا، روز کا سا شور وشر اور بات چیت نہیں تھی جیسے

کوئی نہایت ہی اہم واقعہ ہو گیا ہو اور لوگ اس متعلق غور کر رہے ہوں۔

کھانے کے بعد ژیخاریف نے وہ کتاب نکالی اور مجھ سے بولا: ''لے پھر سے سنا ذرا۔ آہستہ آہستہ کوئی جلدی نہیں ہے...''

کچھ لوگ آہستہ سے اپنے اپنے پلنگوں پر سے اٹھے اور میز کے نزدیک آ کر اس چاروں طرف آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔ جسم نیم برہنہ تھے۔

اور جب میں ختم کر چکا تو ایک بار پھر ژیخاریف نے میز پر انگلیوں سے طلبہ بجاتے ہوئے کہا:

''یہ ہے زندگی کا نمونہ تم لوگوں کے لئے آہ دیو، دیو! آہ میرے بھائی تجھ پر یہ کیا ستم ہوا...''

سیتانوف نے میرے کندھے پر جھک کر کچھ شعر پڑھے اور ہنستے ہوئے بولا:

''ان کو میں اپنی بیاض میں نقل کروں گا...''

ژیخاریف اٹھا اور کتاب لے کر اپنی میز کی طرف چلا، پھر یکا یک رک کر اور دکھ بھری، جھنجھلاتی ہوئی آواز میں بولا:

''ارے ہم لوگ اندھے پلوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں! آخر کیوں؟ کوئی نہیں جانتا۔ ہماری ضرورت نہ خدا کو ہے، نہ دیو کو! بھلا ہم کیسے بندے ہیں خدا کے! یعقوب بھی خدا کا بندہ تھا۔ موسیٰ کو تو خدا نے نام تک دیا۔ موسیٰ۔ میرا بیج! لیکن ہم کس کے ہیں؟''

اس نے کتاب کو مقفل کر دیا اور کپڑے پہنتے ہوئے سیتانوف کو آواز دی:

''چلتے ہو شراب خانے؟''

سیتانوف نے آہستہ سے جواب دیا:

''میں تو اپنی معشوقہ سے ملنے جا رہا ہوں۔''

جب وہ دونوں باہر نکل گئے تو میں دروازے کے نزدیک پاویل اودینتسوف کے پاس فرش پر لیٹ گیا۔ پہلے تو وہ بے چینی سے ادھر ادھر کروٹ بدلتا رہا، پھر چپکے چپکے رونے لگا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''مجھے ان لوگوں پر بڑا ترس آتا ہے۔ ان سب کو جانتا ہوں، چار سال یہیں ان کے ساتھ رہتے گذرے ہیں...''

مجھے بھی ان لوگوں پر ترس آیا کرتا تھا۔ ہم دونوں بڑی دیر تک باگتے رہیا رپھس پھس کرتے ان لوگوں کا ذکر کرتے رہے۔ ان میں سے ہر ایک میں جو بھلائیاں اور نیکیاں تھیں اور وہ خوبیاں معلوم کرتے رہے جن کی وجہ سے ہمارا معصوم جذبہ ہمدردی ان کے لئے گہرا ہوتا جاتا تھا۔

پاویل اودینتسوف سے میری خوب گہری دوستی ہوگئی۔ اور بعد میں وہ بڑا ماہر اور استاد مصور بن گیا تھا لیکن اپنے اس پیشے میں اس کا جی زیادہ دن نہ لگا۔ تیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ پکا شرابی بن گیا۔ کچھ دن بعد میں نے اسے خیتروف مارکیٹ میں ایک اٹھائی گیرے کی طرح آوارہ گھومتے دیکھا اور ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے کہ میں نے سنا کہ وہ ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ یہ سوچ کر وحشت ہوتی ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں کتنے بہت سے اچھے انسانوں کو بلاوجہ مرتے اور تباہ ہوتے ہوئے دیکھا! یہ تو بالکل فطری بات ہے کہ انسان ایک خاص عمر کے بعد یا خاص مدت کے بعد گھسنے لگے اور ختم ہو جائے۔ ہر جگہ لوگ ختم ہوتے ہیں۔ لیکن غالباً دنیا میں کہیں لوگ اتنی جلد اور اس قدر بے سبب نہ گھستے ہونگے نہ مرتے ہونگے جتنے کہ روس میں...

اس وقت پاویل بالکل لڑکا ہی تھا، کوئی دو سال مجھ سے بڑا رہا ہوگا۔ بالکل گول مول، معصوم، تیز، ذہین اور ایماندار ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں فنی صلاحیت بھی تھی۔ بلیوں، کتوں اور چڑیوں کی تصویریں خوب کھینچتا تھا اور ہمارے مصوروں کے تو بڑے ہی مضحکہ خیز کارٹوں بنایا کرتا جن میں یہ لوگ ہمیشہ کسی نہ کسی پرندے کے روپ میں دکھائے جاتے۔ مثلاً سیتانوف کو کھٹ بڑھئی کی صورت میں ابھارا جاتا۔ منہ لٹکائے ایک ٹانگ اٹھائے کھڑا ہے۔ ژیخاریف کی مرغے میں شکل بنتی، بے کلغی اور بے پر۔ داویدوف دائم المرض تھا اس لئے اس کی صورت ایک کمھلائی ہوئی پدی کی سی بنتی۔ لیکن سب سے زیادہ دلچسپ کارٹون گوگوالیف کا تھا۔ ان کو چمگاڈر بنایا گیا تھا۔ بڑے بڑے کان، بھوتوں کی سی ناک، ننھے ننھے پاؤں اور دونوں پاؤں میں چھ چھ جنگل۔ سیاہ، گول چہرے میں سے آنکھوں کے سفید سفید دائرے جھانک رہے تھے۔ پتلیاں جیسے سیم کے بیج آڑے کھڑے ہوں جس سے اس کے چہرے پر ہوشیاری کا تاثر طاری اور بدمعاش کی فضا پیدا ہوتی تھی۔

جب مصوروں کو یہ کارٹون دکھائے گئے تو کسی نے برا نہ مانا لیکن گوگولیف کا کارٹون سب کو ہی برا لگا اور انہوں نے پاویل سے بڑے اصرار سے کہا:

''بہتر ہے کہ تم اس کو پھاڑ پھینکو ورنہ اگر بڑے میاں کی نظر پڑ گئی تو تمہاری زندگی دشوار کر دیں گے!''

گوگولیف بے ہودہ اور گندہ رہتا تھا اور ہر وقت نشے میں دھت رہتا تھا لیکن نہایت ہی متقی اور پرہیز گار بھی بنتا تھا۔ کمینہ پن بھی اس کی طبیعت میں بہت تھا اور ہر وقت دوکان کے اسٹنٹ کی خوشامد اور چاپلوسی میں لگا رہتا تھا۔ دوکان کی جو اصلی مالکن تھی، اس کا ارادہ تھا کہ اس اسسٹنٹ سے اپنی بھتیجی کی شادی کر دے۔ لہذا وہ اسسٹنٹ صاحب ابھی سے اپنے آپکو دوکان اور دوکان کے تمام لوگوں کا مالک سمجھتے تھے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے گوگولیف ہر وقت اس کی جی حضوری کرتا اور باقی لوگ اس سے نفرت کرتے اور ڈرتے بھی۔

پاویل گوگولیف کو مسلسل عاجز کرتا رہتا تھا۔ گویا اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ گوگولیف کو ایک منٹ چین نہ لینے دے۔ میں اس کوشش میں اس کا نہایت ہی معتبر اور مناسب ساتھی ثابت ہوتا تھا۔ باقی تمام لوگ ہماری کوششوں سے جو کہ اکثر سخت اور بے تکی ہوتی تھیں، خوب لطف لیا کرتے لیکن سب ہی مصور کہا کرتے:

''ابے لونڈو، ہوشیار رہنا! یہ کوزما بچھو ہے نہ کسی دن مارے گا ڈنک بڑے زوروں میں!''

''کوزما بچھو' اسسٹنٹ کا نام تھا جو دوکان میں کام کرنے والوں نے اسے بطور لقب عنائت کیا تھا۔

لیکن ہم دونوں ان باتوں کا کوئی نوٹس نہ لیتے تھے۔ اکثر سوتے میں گوگولیف کے چہرے پر پینٹ مل دیا کرتے تھے اور ایک دن جب وہ نشے میں غین بیٹھا تھا تو اس کے اسفنجی ناک پر ہم لوگوں نے سنہری پالش خوب تھوپ دی۔ تین دن تک ناک کے مساموں میں سے سنہرا رنگ نہ چھوٹا۔ لیکن جب کبھی اس بڈھے کو غصہ آتا تو مجھے کو وہ اسٹیمر والا واقعہ یاد آتا۔ وہ ویاتکا کا منحنی سپاہی۔ اور میرا ضمیر مجھ کو چین نہ لینے دیتا۔ عمر کی بات دوسری ہے، ویسے گوگولیف بہت تگڑا تھا۔ وہ اکثر ہمیں بے خبری میں پکڑ لیتا اور خوب ٹھکائی کرتا۔ اور ہر ٹھکائی کے بعد اصلی مالکن سے شکایت بھی جڑ تا۔

وہ بھی عادتاً ہر وقت نشے میں دھت رہتی تھی اور اس لئے ہمیشہ ہنستی بولتی اور بڑے مزے میں رہتی۔ اپنے پھولے پھولے ہاتھ میز پر مار کر وہ ہم لوگوں کو ڈرانے کی کوشش کرتی اور چیختی:

''کیوں شیطانو، پھر شرارت پر اتر آئے؟ ارے وہ بزرگ آدمی ہے، اس کا ادب واجب ہے نا۔

کس نے اس کے شراب کے پیالے میں روشنائی ڈالی؟''

''ہم لوگوں نے...''

مالکن آنکھیں جھپکاتی:

''ارے! میں حیران ہوں یہ آسمان کیسے قائم ہے! ارے منہ پر قبول رہے ہیں یہ شیطان کے بچے! ارے تم لوگوں کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ بزرگوں سے کیسے پیش آنا چاہئے!...''

وہ ہم لوگوں کو جوتا دکھا کر بھگا دیتی اور شام کو اسسٹنٹ سے شکایت کرتی۔ وہ مجھ سے سختی سے پوچھتا:

''ارے تم کتابیں پڑھتے ہو۔ انجیل مقدس پڑھتے ہو اور پھر بھی یہ حال ہے تمہارا کہ شرارت میں اٹکے رہتے ہو۔ ہوشیار رہنا بھائی صاحب!''

ہماری اصلی مالکن بیچاری بالکل اکیلی اور بڑی ہی قابل رحم تھی۔ کبھی کبھی جب زیادہ شراب پی لیتی تو کھڑکی پر بیٹھ کر گاتی:

میرے دکھ کا غم ہے کس کو
میرے غم کا علم ہے کس کو
نہ ترس کوئی مجھ پر کھائے
نہ پریم کی آس دلائے
میرے دکھ کو کوئی نہ بٹائے
میرے دکھ کا غم ہے کس کو

اور پھر ناک سوں سوں کر کے بڑھاپے کی سی سوکھی، بے جان آواز میں رونا شروع کرتی ''ہووُووُ...''

ایک دن میں نے دیکھا کہ وہ ہاتھ میں دودھ کا ایک جگ لئے اوپر زینے سے اتر رہی ہے۔ یکایک اس کے گھٹنوں نے جواب دے دیا اور دھڑام سے گر کر سیڑھی پر اچھلتی لڑھکتی نیچے جانے لگی۔ پھیلے ہوئے ہاتھوں میں جگ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا، دودھ تمام کپڑوں پر گرتا جا رہا تھا اور وہ جگ کو مخاطب کر کے اس پر خفا ہو رہی تھی:

''ارے دیکھ تو کیسا گرا رہے تو سارا دودھ! شیطان، ارے توبہ!''

وہ موٹی نہیں تھی لیکن نرم اور گلگلی تھی، جیسے کوئی بوڑھی بلی ہو کہ جس کے چوہے پکڑنے کی داستان اب قصہ پارینہ بن چکی ہو اور جواب صرف اتنی بھر رہ گئی ہو کہ سیر ہو خرخر کیا کرے اور پرانی ضیافتوں اور فتوحات کو یاد کیا کرے۔

''ہنہ'' سیتانوف نے تیوری چڑھا کر کہا ''ایک زمانہ وہ بھی تھا جب یہ دوکان خوب چلتی تھی۔ بڑا کاروبار ہوتا تھا، ایک ماہر استاد یہاں سب سے اوپر مقرر رہتا تھا اور اب تو سب کتوں کے حوالے استاد یہاں سب سے اوپر مقرر رہتا تھا اور اب تو سب کتوں کے حوالے ہو گیا۔ اور جو کچھ بھی بچا کھچا ہے وہ سب اس کوزما بچھو کے ہتھے چڑھتا ہے! ہم لوگ کیا جی لگا کر کام کرتے تھے۔ اور آخر میں معلوم ہوا کہ سب اس نے ہڑپ کیا۔ اس خیال ہی سے آدمی کا جی ٹوٹ جاتا ہیا اور یہی دل ہوتا ہے کہ کام کاج چھوڑ اوپر چھت پر جا لیٹے اور بس آسمان کو تکا کرے...''

سیتانوف کے ان خیالات کا اثر پاویل اودینتسوف پر بھی ہو رہا تھا۔ بڑوں کی طرح سگریٹ منہ میں دبا کر سلگاتے ہوئے وہ فلسفیانہ انداز میں خدا اور عورت اور شراب خوری اور محنت کے لاحاصل ہونے پر رائیں دیا کرتا۔ اس کا کہنا ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ بعض لوگ اپنا سارا وقت ایسی چیزوں کے بنانے میں لگاتے رہتے ہیں جن کو دوسرے لوگ، ان کی قیمت اور وقعت کا اندازہ کئے بغیر، توڑتے رہتے ہیں۔

ایسے لمحات میں اس کا چھوٹا سا ذہین اور دلکش چہرہ بوڑھا اور جھریاں پڑا ہوا لگنے لگتا تھا۔ عام طور پر جب وہ فرش پر اپنے بستر پر بیٹھتا تو اسے یہ خیالات ستاتے۔ وہ اپنے ہاتھ گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیتا، کھڑکی کے نیلے نیلے شیشوں سے پار ہوتی ہوئی اس کی نظریں جاڑوں کے آسمانی پر دمکتے ہوئے ستاروں پر ٹھہری رہتی۔ یا پھر چھپر کی چھت سے جالگتیں جو برف کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی۔

مصور کاریگر خراٹے لیتے اور نیند میں بڑبڑاتے۔ کہیں کسی کو کوئی پریشان خواب دکھائی دیتا اور وہ نیند میں بڑبڑاتا رہتا۔ سب سے اوپر والے ٹنڈ پر داویدوف کھانس کھانس کر زندگی کی باقیات تھوکتا رہتا۔ کونے میں ''بندگان خدا'' کا پینیدیوخن، ساروکن اور پیرشین ایک دوسرے کے پاس اوندھے پڑے، نیند اور نشے میں اسیر رہتے۔ دیواروں پر سے بے چہروں کی، بے ہاتھوں اور بے پاوؤں کی مقدس شبیہیں جھانکتی رہتیں۔ روغن اور سڑے انڈوں اور فرش کی دراڑوں میں بجبجاتی ہوئی گندگی کی بدبو سے سانس دشوار ہوتا۔

پاویل آہستہ سے کہتا ''آہ مجھے ان لوگوں پر کتنا ترس آتا ہے، اے پروردگار!''

میرے احساسات پر یہ جذبہ رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا دونوں کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ لوگ تو اچھے تھے لیکن جو زندگی وہ بسر کرتے تھے وہ زندگی خراب تھی، ان کے شایان شان نہ تھی، بے خود اکتائی ہوئی اور بجھا ڈالنے زندگی۔ روزے کے زمانے میں جب گھنٹیاں بڑی سستی اور بے دلی سے بجتیں، برف کے طوفان اٹھتے اور ان کے زور سے مکانات، درخت اور زمین پر کھڑی ہوئی ہر چیز ہلنے، چیخنے چلانے لگتی، تو ہماری دوکان پر پژمردگی کا ایک بھاری پردہ پڑ جاتا۔ سیسے کی طرح سیاہ اور بھاری۔ اس پژمردگی کے تلے دب کر تمام مصوروں کی سانس گھٹنے لگتی، زندگی کے آثار غائب ہونے لگتے اور ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے یہ طاقت ان کو دھکیل کر شراب خانوں کی طرف لیجا رہی ہے یا آوارہ عورتوں کی آغوش میں، جو وادکا سا ہی اثر رکھتی تھیں، جو انہیں دنیا و مافیہا کو بھول جانے میں مدد دیتی تھیں۔

اس طرح کی شامیں جب آجاتیں تو صرف کتابیں پڑھ کر سنانے سے کام نہ چلتا۔ چنانچہ مجھے اور پاویل کو تفریح کے دوسرے ذرائع ڈھونڈنے پڑتے۔ ہم لوگ رنگ اور سیاھی سے اپنے منہ رنگتے، جھار جھنکاڑ اور پھونس سے مونچھ کے بال اور مونچھیں لگاتے، طرح طرح کے مذاقیہ ڈرامے خود ایجاد کر کر کے ایکٹ کرتے اور اس طرح بڑے بہادرانہ طریقے سے چاروں طرف پھیلی ہوئی اداسی سے مسلسل جنگ لڑتے اور لوگوں کے ہنسانے کی کوشش کرتے۔ مجھے وہ کہانی ''پیٹر اعظم کو ایک سپاہی نے کیسے بچایا'' یاد آئی، چنانچہ میں نے اسے مکالموں کی صورت میں لکھا۔ ہم داویدوف کے تختے پر چڑھ جاتے اور اداکاری کیا کرتے اور اترا اترا کر خیالی دشمنوں کے سر اڑانے لگے۔ دیکھنے والے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

ان لوگوں کو خاص طور سے اس چینی جن تسنگ یوتانگ کی داستان پسند آئی۔ پاشکا نے بدبخت جن کا پارٹ کیا۔ جن کے دماغ میں یہ سودا سما گیا تھا کہ لوگوں سے نیکی کرے۔ اور باقی تمام پارٹ میں نے اکیلے ادا کئے۔ عورت کا بھی، مرد کا بھی، نیکی کا فرشتہ بھی، اسٹیج کا بہت سا سامان بھی میں ہی بنا۔ یہاں تک کہ وہ پتھر بھی میں ہی بنا جس پر وہ بیچارہ بدبخت جن نیکی کرنے کی کوشش کے بعد ناکامیاب ہو کر حیران پریشان آبیٹھا تھا۔

دیکھنے والے خوب ہنستے اور مجھے یہ محسوس کر کے کچھ تعجب انگیز صدمہ ہوا کہ لوگوں کو خوش کر دینا کس

قدر آسان ہے!

''ارے توبہ، مسخرے کمبخت! ارے بھانڈ ہیں یہ لوگ، بھانڈ!'' وہ چیخ چیخ کر کہتے اور ہنستے جاتے۔

لیکن ہم لوگ جتنا ہی زیادہ اس قسم کی اداکاریاں کرتے جاتے، اتنا ہی زیادہ یہ ذہن میں جمتا جاتا کہ ان لوگوں تک مسرت کے بجائے غم باریابی جلدی ہو جاتی تھی۔

ہماری قوم زیادہ دیر تک خوش نہیں رہتی۔ نہ خوشی کو بجائے خود کوئی مقصد سمجھا جاتا ہے۔ مسرت برائے مسرت جیسا کوئی تصور ہمارے یہاں نہیں ہے۔ یہ مسرت زبردستی کہیں سے لائی جاتی ہے، تب جا کر روسی قوم کے لبوں پر ہنسی آتی ہے۔ روسی قوم جو ہمیشہ دردِ دل کی گھٹن میں لطف لیتی رہتی ہے۔ روسی قوم جو ہمیشہ دردِ دل کی گھٹن میں لطف لیتی رہتی ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ جو مسرت اپنی کوئی زندگی نہ رکھتی ہو، نہ اس میں زندہ رہنے کی خواہش اور قوت ارادی ہو، وہ صرف وقتی طور اس میں زندہ رہنے کی خواہش اور قوت ارادی ہو، وہ صرف وقتی طور پر، آنکھ بچا کر کسی ظالمانہ ڈرامے میں بدل جائے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی رقص کے درمیان جب کہ رقاص اپنے آپ کو قیود و پابندیوں سے بالکل آزاد کر چکا ہے، اس کے بطون وارواح میں بیٹھا ہوا درندہ یک لخت چھٹ پڑے اور کھسیائے ہوئے غصے میں ہر شخص اور ہر چیز پر جھپٹ پڑے، چیختا ہوا ڈکارتا ہوا، تباہی مچاتا ہوا۔

اس زبردستی سے لائی اور لادی ہوئی مسرت سے مجھے اس حد تک کوفت ہوتی تھی کہ میں مارے غصے کے آپے سے باہر ہو جاتا تھا اور سب کچھ بھول کر اپنے دل سے فی البدیہہ جوڑ کر بہت کچھ کہنے لگتا تھا۔ اف، مجھے کس قدر ارمان تھا کہ ان لوگوں میں بھی ایک بے ساختہ اور آزاد مسرت کی روح پھونک دوں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ میری کوششیں ہمیشہ کامیاب نہ ہوتی ہوں۔ کامیاب ہوتی تھیں، کاریگر خوب داد دیتے اور تعریف کرتے تھے۔ لیکن اداسی اور پژمردگی کا وہ پردہ جسے میں سمجھتا تھا کہ میں نے اس شدت مشقت سے چاک کر دیا ہے، رفتہ رفتہ پھر بیٹھنے لگتا تھا ویسا ہی دبیز، اسی قدر سانس گھونٹ دینے والا، اتنا ہی تاریک۔

لاریونچ پیار سے کہتے ''ارے خدا تجھے سلامت رکھے! شیطان کا بچہ ہے اچھا خاصہ۔''

ژیخاریف کہتے ''بھئی کیا تفریح ہوئی ہے! تم سرکس میں کیوں نہیں چلے جاتے یا تھیٹر میں؟ بہترین مسخرے بن سکتے ہو، میں کہتا ہوں!''

بزرگ بجھانے کا آفس بالکل دوقدم پر تھا اس لئے وہ لوگ آسانی سے اور لوگوں کو مدد کے لئے بلا کر سیتانوف کی اچھی طرح کندی کروا سکتے تھے لیکن اس کی خوش قسمتی سے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس نے ان بھاگتوں کے پیچھے آواز دی ''کتے کے پلے کہیں کے!''

اتوار کے دن نوجوان لوگ پیٹر اور پال کے قبرستان کے پیچھے جو لکڑی کے گودام تھے وہاں جاتے تھے، وہاں ان کا مقابلہ صفائی کے محکمے والوں سے مکے بازی میں ہوتا تھا۔ آس پاس کے دیہات سے کسان بھی آ کر اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ صفائی کے محکمے والوں نے ایک بڑے دیو کو لا کر مقابلے میں کھڑا کیا نوکدار کھوپڑی چندھی چندھی، پانی بہتی ہوئی آنکھیں، وہ اپنے حوالے حوالیوں کے آگے ٹانگیں پھیلائے کھڑا، اپنی گندی آستین سے آنکھیں پونچھتا جاتا تھا اور شہر والوں کو پکار رہا تھا:

''اب آتا ہے تو نہیں تو مجھے سردی لگ جائے گی، کب تک کھڑا رہوں!''

جب بھی وہ میدان میں آتا، ہماری طرف سے ہمیشہ کا پینیدیوخن مقابلے پر جاتا لیکن وہ ہمیشہ کا پینیدوخن کو مار رکھتا۔

کا پینیدیوخن غصے میں بھرا، ہانپتا، لہولہان چہرے کے ساتھ چیخ چیخ کر کہتا جاتا:

''اگر اس آدمی کو میں نے چاٹ نہ دی تو پھر میرے وجود کا فائدہ ہی کیا ہے؟''

آخر کار یہ مقصد اس کی زندگی کا واحد مقصد بن گیا۔ اس نے سخت ریاض کرنا شروع کیا، شراب چھوڑ دی، زیادہ تر صرف گوشت کھانے لگا، رات کو سونے سے پہلے روز جسم پر برف سے مالش کی رگڑائی ہوتی اور دس دس سیر کے مگدر ہلا ہلا کر صلیب کا نشان بناتے۔ لیکن ان تمام باتوں سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر کار اس نے اپنے دستانوں کے اندر سیسے کے ٹکڑے سی لئے اور اترا کر سیتانوف سے بولا:

''لو، اب اس مردوین کا خاتمہ سمجھو!''

سیتانوف سختی سے بولا:

''نکلوا ان ٹکڑوں کو، ورنہ مکہ بازی شروع ہونے سے پہلے تمہارے پول کھول دوں گا!''

کا پینیدیوخن کو یقین نہ آیا کہ وہ ایسا کرے گا لیکن جیسے ہی مکہ بازی شروع ہونے کو ہوئی سیتانوف نے اچانک اس مردوین سے کہا:

''ٹھیر جائے واسیلی ایوانووچ، پہلے میں کا پینیدیوخن سے لڑوں گا!''

کزاک غصے سے لال ہو گیا، چیخا:

''میں تم سے نہیں لڑوں گا۔ ہٹ جاؤ یہاں سے!''

''لڑنا ہوگا'' سیتانوف نے کہا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی طرف بڑھا۔ کاپیندیوخن ایک منٹ جھجکا، پھر دستانے نوچ کر اپنی اندر والی جیب میں رکھ لئے اور تیزی سے وہاں سے کھسک لیا۔

دونوں طرف کے لوگوں کو تعجب اور کوفت ہوئی۔ ایک شریف صورت بگڑ کر سیتانوف سے بولے:

''جناب، یہ قاعدے کے خلاف بات ہے کہ آپ یہاں پبلک میں آکر اپنا ذاتی بغض نکالتے ہیں!''

چاروں طرف سے لوگ سیتانوف پر چلانے لگے۔ کچھ دیر تو وہ خاموش رہا، پھر ان میں شریف صورت سے بولا:

''اور اگر آپ کو یہ معلوم ہو کہ میں نے ایک قاتل کو روک دیا تو؟''

وہ شریف صورت فوراً بھانپ گئے۔ ٹوپی اتار کر جھکے:

''اگر ایسا ہے تو ہماری طرف سے شکریہ قبول کیجئے جناب!''

''مگر اس بات کے متعلق کہیں ذکر نہ ہونے پائے!''

''میں کیوں ذکر کرنے لگا؟ کاپیندیوخن نہایت ہی نایاب مکہ باز ہے۔ اور انسان جب ہمیشہ چاٹ کھاتا رہے تو عاجز ہو کر اس کی عقل ٹھکانے نہیں رہتی۔ یہ ہم سمجھ سکتے ہیں! لیکن اب آئندہ سے لڑنے سے پہلے اس کے دستانوں کو دیکھ لیا کریں گے۔''

''یہ آپ جانیں اور آپ کا کام جانے!''

جب وہ شریف صورت چلے گئے تو ہماری طرف والوں نے سیتانوف کو آڑے ہاتھوں لینا شروع کیا۔

''ارے یہ کیوں کیا احمق؟ وہ کزاک اس کو ایسا چاٹ دیتا کہ یاد ہی کرتا اور اب ہماری طرف کو چاٹ بھگتنی پڑے گی...''

بڑی دیر تک لوگ خوب لطف لے لے کر اس کو عاجز کرتے رہے لیکن سیتانوف نے صرف ٹھنڈی سانس بھری اور کہا:

''اُنہہ توبہ، بدمعاشو!''

اور پھر ہر شخص یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس نے خود اس مردوین کو چیلنج کر دیا۔ اس دیوزاد نے اپنی جگہ سنبھالی اور مکے دکھاتا ہوا مذاق میں بولا:

''آؤ، ہو جائے ذرا ایک ننھی منی سی پکڑ! ذرا گرمی ہی آجائے گی ہاتھ پاؤں میں...''

چاروں طرف لوگوں نے گھیرا ڈال دیا، آگے والوں نے پیچھے والوں کو دھکا دے کر ان کے ہاتھ پکڑ لئے۔

دونوں مکہ باز گول گول گھومنے لگے، آنکھیں ایک دوسرے کے چہروں پر چپکی ہوئی، دھنے ہاتھوں کے مکے آگے بڑھے ہوئے اور بائیں ہاتھ کے سینے پر رکھے ہوئے۔ تجربہ کار ناظرین فوراً بھانپ گئے کہ سیتانوف کے ہاتھ اس مردوین سے زیادہ لمبے تھے۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ صرف لڑنے والوں کے پیروں تلے کچلتی برف کی کچر کچر سنائی دے رہی تھی۔ بھیڑ میں کسی سے یہ تناؤ برداشت نہ ہو سکا، وہ بے صبری سے چیخا:

''ارے اب کر بھی چکیں یہ لوگ حملہ۔ گتھ جائیں ذرا...''

سیتانوف نے اپنا دھنا بازو گھمایا، مردوین نے بچاؤ کے لئے بایاں ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ سیتانوف نے بائیں سے اس کے پیٹ میں ایک زور کا ڈگ دیا۔ وہ غرا کر پیچھے ہٹا اور داد دیتا ہوا بولا:

''ہو تو لونڈے مگر بدھو نہیں ہو دوست!

پھر تو ٹھن گئی۔ ایک دوسرے کے سینوں پر دھڑا دھڑ مکے پڑنے لگے۔ اور چند منٹوں بعد دونوں طرف کے لوگ زور زور سے چیخ رہے تھے:

''ہاں لینا، معبود کے مصور! ذرا اس کی کھوپڑی رنگنا۔ ہاں لینا!''

مردوین میں قوت تو سیتانوف سے زیادہ تھی لیکن پھرتی میں سیتانوف بڑھا ہوا تھا۔ وہ اس تیزی سے مڑ نہیں پاتا تھا اور اگر ایک مارتا تو دو تین کھاتا۔ لیکن مکوں کی بارش کا اس پر کوئی اثر نہیں نظر آتا تھا کیونکہ وہ برابر چیخ چیخ کر اپنے مخالف کا مذاق اڑاتا جاتا تھا۔ اور پھر یکا یک اس نے ایک ہاتھ اوپر کی طرف جو مارا تو سیتانوف کا بازو کندھے سے اکھڑ گیا۔

کئی آوازیں ایک ساتھ چیخنے لگیں ''الگ کر دو، الگ کر دو! برابر، برابر!...'' تماشائی دوڑ پڑے اور

دونوں کو الگ کیا

مردوین بڑے مزے میں کہنے لگا:

''اس معبود کے مصور میں دم تو تو زیادہ نہیں مگر تیزی غضب کی ہے! اور میں کہتا ہوں، لوگوں کے سامنے کہتا ہوں۔ اس کی اب بھی تربیت دی جائے تو بڑا شاندار مکہ باز ہوگا۔''

پھر عام مکہ بازیاں شروع ہوگئیں۔ اور میں سیتانوف کو لے کر ایک ہڈی بٹھانے والے کے پاس گیا۔ سیتانوف طبیعتاً نہایت ایماندار اور منصف مزاج تھا اور اسے اپنا فرض تصور کرتا تھا۔ لیکن کاپیندیوخن نے اس کا مذاق اڑایا:

''ابے ہمیشہ شیخی بگھارتا پھرتا ہے! سمجھتا ہے کہ اپنی روح کو مانجھ دھو کر چمکا دیا ہے جیسے سماوار۔ اور چمک پر اتراتا ہے کہ دیکھو کسی جھلمل جھلمل کرتی ہے میری روح! تھو، یہ نہیں جانتا کہ تمہاری روح پیتل کی ہے اور تم سے بڑی اکتاہٹ ہوتی ہے...''

سیتانوف خاموشی اور اطمینان سے اپنے کام میں لگا رہتا، یا پھر لیومونتوف کی نظمیں اپنی بیاض میں نقل کرتا رہتا۔ فرصت کا سارا وقت وہ اسی طرح اشعار نقل کرنے میں صرف کرتا۔ ایک بار میں نے اس سے کہا:

''مگر تمہارے پاس تو پیسے موجود ہیں، ایک جلد اس کتاب کی خرید کیوں نہیں لیتے؟''

''نہیں۔ جب انسان اپنے ہاتھ سے نقل کرتا ہے تو زیادہ ٹھیک رہتا ہے!'' اس نے جواب دیا۔

وہ خوب خوش خط لکھتا تھا اور ایک صفحے کو نہایت بنا بنا کر لکھنے کے بعد روشنائی سوکھنے تک مدھم پڑھتا جاتا:

تم کو احساس نہیں،
تم کو پشیمانی نہیں،
عالم خاکی سے منہ پھیر لیا ہے تم نے،
جہاں نہ روحانی مسرت اور نہ حسن جاوداں

اور اس کو پڑھ کر وہ اپنی آنکھیں سکوڑ کر کہتا:

''یہ ہے سچائی۔ شاعر بھی کس قدر عمدگی سے حقیقت کی تہہ کو پہنچتا ہے!

کاپیند یوخن کے ساتھ سیتانوف کا جو برتاؤ تھا، اس کو دیکھ کر میں حیران رہ جاتا تھا۔ جب کاپیند یوخن شراب کے نشے میں واپس آتا تو سیتانوف سے جھگڑا شروع کرتا اور سیتانوف نہایت صبر واستقلال سے اس اس جھگڑے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا:

''انہہ پرے ہٹ! مت مجھے ہاتھ لگا...''

آخر نتیجہ یہ ہوتا کہ سیتانوف عاجز آ کر اس شرابی پر پل پڑتا اور اسے اس بے دردی سے پیٹتا کہ دوسرے مصور لوگ جو لڑائی دیکھنے کا ضرورت سے زیادہ ہی اشتیاق رکھتے تھے، بیچ میں پڑتے، دونوں دوستوں کو کھینچ کر الگ کرتے اور کہتے:

''اگر ہم لوگ کیا بات کر رہے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی خاص بات تو نہیں۔ یوں ہی نیند آ رہی تھی تو وقت کاٹ رہے تھے'' کز اک نے جواب دیا۔

لیکن بعد میں ان کی باتیں سن کر مجھے یہ پتہ چلا کہ لوگ دن میں جس طرح کی باتیں کرتے ہیں اسی طرح کی باتیں کر کے یہ لوگ اپنی راتیں بھی گذارا کرتے تھے۔ خدا کی ذات، انصاف، مسرت، عورتوں کی حماقت اور چالاکی، امیروں کی طمع اور لالچ اور یہ حقیقت کہ فی الجملہ زندگی ایک ایسا الجھاؤ ہے جو سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

میں ہمیشہ سے ان لوگوں کی باتیں سننے کا اشتیاق رکھتا تھا۔ ان کی باتیں سن کر میرے دل میں ہلچل مچ جاتی تھی۔ مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ قریب قریب سبھی یہ تسلیم کرتے تھے کہ زندگی فی الحال خراب وخستہ ہے اور اس کو بہتر بنایا جائے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میں نے یہ بھی دیکھا کہ صرف زندگی کو بہتر بنانے کی خواہش کو دل میں پالنے سے کسی پر کوئی ذمہ داری یا فرض عائد نہیں ہوتا، نہ اس سے دوکان کی زندگی بدلتی ہے، نہ وہاں کام کرنے والوں کے آپس کے تعلقات بدلتے ہیں۔ اس قسم کی تمام گفتگو مجھے زندگی کا عرفان ضرور بخشتی تھی لیکن یہ بھی دکھاتی تھی کہ زندگی ایک بے رنگ خلا ہے جس میں تمام انسان اس طرح ادھر سے ادھر رل رہے ہیں جیسے کسی تالاب کی سطح پر ہوا سے اڑتے ہوئے خزاں کے سوکھے پتے۔ وہ خود اپنے وجود کی اس بے مقصدی سے نفرت کرتے ہیں، اس سے انکار کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے سامنے نہ کوئی منزل ہے نہ کوئی مقصد۔

یہ مصور لوگ ہمیشہ ڈینگیں مارا کرتے یا ندامت کا اظہار کیا کرتے یا کسی پر کوئی نہ کوئی تہمت لگایا

کرتے ہیں، ذرا ذرا سی بات پر سخت جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا، ایک دوسرے کی شدید دل آزادی کی جاتی۔ ان کو اس بات کی بھی بہت فکر رہتی تھی کہ عاقبت میں ان کا کیا حشر ہوگا، نجات ہوگی کہ نہیں۔ حالانکہ دروازے کے نزدیک والی اگالدان کے پاس ایک تختہ سڑ کر ٹوٹ گیا تھا اور اس میں سے سرد بدبودار ہوا ہر وقت ہمارے پیروں کو لگتی تھی۔ پاویل نے اور میں نے مل کر اس دراڑ کو چیتھڑوں اور پھوس سے بھر دیا تھا۔ باتیں روز ہوتیں کہ گلے ہوئے پٹرے کے بجائے نیا پٹرا لگا دیا جائے لیکن وہ پوری کبھی نہ ہوتیں اور دراڑ بڑھتی ہی چلی جاتی۔ جب برف کے طافان آتے تو ہوا اس دراڑ سے اس طرح دراتی جیسے بگل بجاتی گھسی آ رہی ہو۔ لوگوں کو خوب زکام ہوتے، خوب کھانسیاں آتیں اس طرح روشن دان والی کھڑکی کا گول لوہے کا قبضہ چوں چوں بولتا تھا۔ اور جب وہ چوں چوں بولتا تو سب ہی لوگ اس کو خوب گندی گندی گالیاں دیتے۔ میں نے اس میں تیل ڈال دیا، تو ژیخاریف نے کان لگا کر سنا اور جب آواز نہ آئی تو آہستہ سے کہا:

''ارے وہ چوں چوں مٹ گئی تو اور بھی اکتاہٹ بڑھ گئی!''

یہ لوگ حمام سے واپس آتے تو اپنے گندے اور گرد آلود ہی بستروں پر پڑ رہتے، گندگی اور بدبو کا تو احساس ہی مٹ گیا تھا۔ بے شمار چھوٹی چھوٹی باتیں ایسی تھیں جن سے زندگی مصیبت بنی ہوئی تھی، جو آسانی سے دور کی جا سکتی تھیں لیکن کسی کو یہ خیال نہ آتا تھا کہ اس کی کوشش بھی کرے۔

اس خیال کا اکثر اظہار ہوتا:

''عوام پر کون ترس کھاتا ہے؟ نہ خدا اور نہ لوگ...''

لیکن جب میں نے اور پاویل نے داویدوف کو نہلایا جو بالکل قریب المرگ تھا، اور اس کے جوئیں پڑ گئی تھیں اور کپڑوں اور جسم پر بے حد گندگی تھی، تو باقی سب لوگوں نے ہمارا خوب ٹھٹھا کیا۔ ہمیں غسال کہا، اور کہا کہ ہماری بھی قمیصوں سے چیلر نکال دو۔ غرض کہ فی الجملہ ان کا رویہ یہ تھا کہ گویا ہم کوئی ایسی حرکت کر رہے ہیں جو بڑی ہی عجیب اور انتہائی شرمناک ہے۔

کرسمس کے زمانے سے لے کر ایسٹر تک داویدوف اپنے ٹنڈ پر پڑا مسلسل کھانستا رہتا تھا۔ کھانسی کے ساتھ بلغم اور خون کے بڑے بڑے لوتھڑے گرتے جو اکثر اگالدان کا نشانہ چوک کر زمین پر گرتے۔ رات کو وہ اکثر سرسامی کیفیت میں چیخیں مارتا اور ہم سب لوگ جاگ پڑتے۔

تقریباً روز ہی اس رائے کا اظہار ہوتا کہ داویدوف کو ہسپتال لے جایا جائے۔

لیکن پہلے تو یہ پیچیدگی نکلی کہ داویدوف کا پاسپورٹ پھر سے ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔اس لئے ہسپتال میں اس کا داخلہ نہیں ہو سکے گا۔ پھر ایسا لگنے لگا جیسے اس کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔اور آخر میں سب کہنے لگے:

''کیا فرق پڑے گا لیجانے سے؟ اب تو اسے بہت جلد ختم ہی ہو جانا ہے!''

''ہاں اور کیا۔اب تو خاتمہ نزدیک ہے!'' بیمار نے اپنے ساتھیوں سے وعدہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ بھی خاموش طبیعت لیکن شگفتہ مزاج انسان تھا۔جب تک اس سے ممکن ہو سکا، اسنے بھی دوکان کے ماحول کی اداسی اور پژمردگی کو دور کرنے کی کوشش کی۔اپنے ٹنڈ پر سے اپنا مرجھایا ہوا چہرہ جس پر موت کی زردی چھائی ہوتی تھی، نیچے لٹکا کر اکھڑی ہوئی آواز میں کہتا۔

''ارے لوگ، اے ایمان دارو، بھلے آدمیو! اس شخص کی بات کان دھر کر سنو جسے خدا نے تم سے اوپر والے درجے میں بیٹھا دیا ہے...''

اور پھر وہ اداس بکواس ترنم کے ساتھ چالو کر دیتا:

میں لٹکا ہوا ہوں یہاں ٹنڈ پر،
راستے میں کسی کے اٹکتا نہیں ہوں ٹنڈ پر
تیل چٹے کھاتے میرا گوشت پوست،
چاہے سوتا رہوں، چاہے بیدار رہوں...

سننے والے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ''کس قدر باہمت شخص ہے!''

کبھی کبھی میں اور پاویل اوپر چڑھ جاتے تو بڑی ہمت اور مشکل سے اپنے اوپر خوشی طاری کرتا اور بن بن کر کہتا:

''آؤ، دوستو آؤ! آپ کی خاطر کی جائے۔آپ کے لئے ایک اچھی سی تازی سی مکڑی منگوائی جائے؟''

اس کی موت بہت سست رفتاری سے آ رہی تھی اور اس سے اس کے اعصاب پر بڑا برا اثر پڑ رہا تھا۔ پریشان ہو کر اور اپنی پریشانی کو ظاہر کر کے کہتا:

''معلوم نہیں کیوں نہیں مر چکتا میں، زندگی مصیبت ہوتی جاتی ہے!

موت کے مقابلے میں اس کی اس دلیری سے پاویل کو گھبراہٹ ہوتی تھی۔ رات کو اکثر مجھے جگا کر پھسر پھسر کہتا:

''میکسیمچ! دیکھوتو... شاید مر گیا... ہائے وہ اسی طرح کسی رات مر جائے گا اور ہم لوگ یہاں نیچے لیٹے رہیں گے۔ اف معبود! مجھے مردوں سے بڑی وحشت ہوتی ہے...''

یا کہتا:

''ہائے جیا میں، کیوں جیا میں؟ بیس برس کی عمر نہیں اور موت آ گئی...''

ایک رات جب خوب چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، اس نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔ خوب کے مارے اس کی آنکھیں باہر کو ابل آئی تھیں۔ وہ بولا:

''سنو!...''

اوپر ٹنڈ پر سے داویدوف کی گہری سانس چلنے کی آواز آ رہی تھی اور وہ جلدی جلدی اور صاف صاف بڑبڑا رہا تھا:

''یہاں... یہاں... آؤ دو مجھے۔ ادھر...''

پھر اس کو ہیجانی کیفیت آنے لگیں۔

پاویل پر ہیجانی کیفیت طاری تھی:

''وہ مر رہا ہے۔ یا خدا اس کا دم نکل رہا ہے... تم دیکھنا!''

اس روز دن بھر میں نے اپنے احاطے سے برف کھود کھود کر ٹھیلے میں لاد لاد کر باہر میدان میں لے جا کر پھینکی تھی اور میں تھکان کے مارے اتنا مرا ہوا تھا کہ مجھے سو جانے کے سوا اور کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ پاویل میری خوشامد کرنے لگا:

''مت سوؤ، تمہیں یسوع مسیح کا واسطہ! مت سوؤ!''

پھر ایکدم سے وہ اچھل کر دوزانو ہو گیا اور بے اختیار چلایا:

''اٹھو، اٹھو، داویدوف چل بسا!''

باقی لوگوں میں سے بھی کچھ لوگ جاگ پڑے، بعض بستر چھوڑ کر اٹھ بیٹھے اور جھنجھلا کر پوچھنے لگے کہ کیا ہوا۔

کا پیند یوخن اوپر ٹنڈ پر چڑھا اور حیران ہو کر بولا ''ہاں، یقیناً آثار تو سب یہی ہیں کہ مر چکا... لیکن ابھی گرمی اس میں ذرا ذرا باقی ہے...''

سب لوگ خاموش ہو گئے۔ ژیخاریف نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور اپنا کمبل ذرا اور اچھی طرح لپیٹ کر بولا:

''خیر، خدا اس کی روح کو چین نصیب کرے!''

کسی نے تجویز کی:

''بہتر ہو کہ اسے اٹھا کر ڈیوڑھی میں لٹا دیں...''

کا پیند یوخن اوپر سے اتر کر کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوا بولا:

''نہیں، صبح تک وہیں رہنے دو جہاں ہے۔ بیچارہ جب زندہ تھا تب بھی اس نے کبھی کسی کا راستہ نہیں روکا...''

پاویل نے اپنا سر تکیئے میں دے کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

سیتانوف کی آنکھ نہیں کھلی۔

15

زمین پر برف پگھلنے لگی۔ آسمان پر جاڑوں کے بادل بھی پگھلنے لگے اور زمین پر نم برف اور بارش بن بن کر برسنے لگے۔ سورج اب اپنا دن بھر کا چکر لگانے میں زیادہ وقت صرف کرنے لگا۔ ہوا میں گرمی آ گئی۔ ایسا لگتا تھا بہار تو آ گئی ہے لیکن شرارت سے میدانوں کی آڑ میں کہیں چھپی بیٹھی ہے اور بس ایک دم سے شہر میں گھس آئے گی۔ سڑکوں پر سرخ اور مٹیالی کیچڑ بکھری پڑی تھی۔ ننھے ننھے چشمے غرغرغر کرتے ہوئے فٹ پاتھ کے دونوں طرف بہہ رہے تھے اور ارستانسکایا چوک میں پگھلی ہوئی برف سے زمین جھانک رہی تھی۔ اس پر چڑیاں خوشی سے پھدکتی پھرتی تھیں۔ لوگوں پر بھی چڑیوں کی طرح کیف کا عالم طاری تھا۔ چشموں کی اس قل قل کے پس منظر میں ایسٹر کے زمانے کی گھنٹیاں بجتی سنائی دیا کرتی تھیں۔ صبح سے شام تک مسلسل ان کی آواز آتی رہتی اور دل ان کے ساتھ ساتھ جھکورے لیا کرتا۔ ان کی گھنگھناہٹ میں کچھ ایسا دکھ کا احساس سمویا ہوا ہوتا تھا جیسے بوڑھوں کی گفتگو میں ہوتا ہے، جیسے نہایت ہی سرد اداسی کے

ساتھ وہ کہتی رہتی ہوں:

''مدتیں... مدت ت ت یں گذ ریں یں... زمانہ۔ نہ۔ نہ۔ نہ۔ ہوگیا۔ آ۔ آ۔ آ...''

میرے بپتسمہ والے دن دوکان کی طرف سے لوگوں نے مجھے ایک چھوٹی سی مقدس شبیہہ تحفہ دی۔ یہ شبیہہ الیکسئی بندہ خدا کی تھی اور نہایت خوبصورت رنگی ہوئی تھی۔ اور اس موقعہ پر ژیخاریف نے ایک لمبی سی تقریر بھی کی جسے میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔

اس نے اپنی بھوئیں تانیں اور میز پر انگلیوں سے تال دیتے ہوئے کہا:

''تمہاری ہستی ہی کیا ہے؟ صرف ایک ننھا سا لڑکا، ایک ننھا سا تیرہ سالہ یتیم لڑکا۔ لیکن میں جو عمر میں تم سے چار گنا بڑا ہوں، تمہاری تعریف کرتا ہوں اور تمہیں مبارکباد دیتا ہوں کہ تم زندگی سے بھاگے نہیں بلکہ تم نے ڈٹ کر اس کا مقابلہ ایمانداری سے کیا۔ زندگی بسر کرنے کا یہ طریقہ اصلی اور سچا طریقہ ہے۔ ہمیشہ ڈٹ کر ایمانداری سے حالات کا مقابلہ کرو!''

پھر اس نے اس خدا کے بندوں اور خدا کے خادموں کا ذکر کیا لیکن میری سمجھ میں یہ فرق ہی کیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ فرق خود ژیخاریف کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اس کی تقریر زیادہ تر بے جان اور پھیکی تھی اور لوگ اس کا مذاق اڑاتے جاتے تھے۔ میں ہاتھ میں وہ مقدس شبیہہ لئے کھڑا تھا، نہایت متاثر لیکن گھبرایا ہوا، بوکھلایا ہوا کہ کدھر دیکھوں اور کیا کروں۔

کاپیند یوخن نے عاجز آ کر زور سے چلا کر مقرر کو مخاطب کیا۔

''توبہ ہے! یہ تو معلوم ہوتا ہے جنازے کی نماز ہوگئی کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی! سنتے سنتے اس بیچارے کے کان بھی نیلے پڑ گئے!'' پھر اس نے خود میرے کندھے پر ایک دھپ دیا اور میری تعریف کرنے لگا:

''تم میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سب سے اپنایت رکھتے ہو! مشکل یہ ہے کہ جب پٹنے والی حرکت بھی کرتے ہو تو تم کو پیٹنا تو خیر ڈانٹا بھی نہیں جا سکتا!''

سب لوگ ہنس ہنس کر میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے اور میری بوکھلاہٹ کی ہنسی اڑاتے۔ اگر وہ رسم اور زیادہ دیر تک چلتی رہتی تو مجھے یقین ہے کہ میں اس خوشی سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا کہ میری ہستی بھی ان چند انسانوں کے لئے کوئی اہمیت رکھتی تھی۔ تھی۔ حالانکہ اسی دن صبح کو دوکان کے

اسسٹنٹ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پیوتر واسیلی وچ سے کہا تھا ''بڑا فضول آدمی ہے، کسی کام کا نہیں!''

میں اس دن صبح بھی حسب دستور دوکان گیا تھا لیکن اسسٹنٹ نے دوپہر کو مجھ سے کہا ''ہمارے گھر جاؤ اور اناج کی کوٹھی پر جو برف جم گئی ہے، اسے پھاوڑے سے کھود کر اس تہہ خانے میں بھر دو جس میں کولڈ اسٹور ہے۔''

اس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ آج میرے بپتسمہ کا دن ہے۔ میرا خیال تھا کہ کسی کو بھی نہیں معلوم ہوگا۔

بہر حال جب مبارک بادی کی رسم دوکان میں ختم ہو گئی تو میں نے کپڑے بدلے اور دوڑتا ہوا احاطے میں پہنچا۔ اناج کی کوٹھی کی چھت پر چڑھا تا کہ جاڑوں کی بہت سی جمی ہوئی برف کھود کر نیچے پھینک دوں۔ اس گڑبڑ اور گھبراہٹ میں میں تہہ خانے کا دروازہ کھولنا بھول گیا اور میں نے اوپر سے برف جو کھود کھود کر پھینکی تو دروازہ اس کے نیچے بند ہو گیا۔ جب میں نے اپنی غلطی دیکھی تو جلدی جلدی نیچے زمین پر کود کر دروازے کو گھورنے لگا لیکن برف گیلی اور سخت جمی ہوئی تھی۔ لوہے کا پھاوڑا تھا نہیں، اس لئے میں لکڑی کے پھاوڑے سے کام لے رہا تھا۔ وہ برف کے بوجھ کو برداشت نہ کر سکا، ٹوٹ گیا اور عین اسی وقت جب اسسٹنٹ پھاٹک پر آپہونچا۔ گویا اس نے وہ روسی مثل سچ کر کے دکھائی کہ ''خوشی کے پیچھے پیچھے غم چلتا ہے۔''

میرے پاس پہنچ کر وہ طنزیہ انداز میں بولا ''ہوں، خوب کاریگر ہو تم شیطان کی مار تم پر! دماغ خراب ہو گیا ہے؟ اس الٹی کھوپڑی میں دراڑ ڈال دوں گا تب پتہ چلے گا...'' اس نے پھاوڑے کا ٹوٹا ہوا دستہ اٹھایا اور میرے سر کی سیدھ باندھی۔ لیکن میں جھکائی دے گیا اور بگڑ کر بولا:

''میں آپ کا احاطہ صاف کرنے والا تو نہیں ہوں۔''

اس نے دستہ میرے پاؤں کے پاس پھینک دیا۔ میں نے ایک برف کا ڈھونکا اور اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ سڑ پڑ کرتا بھاگ کھڑا ہوا اور میں کام دھام چھوڑ کر دوکان میں واپس ہوا۔ چند منٹ بعد اس کی منگیتر نیچے اتری جس کے چہرے پر مہاسے بھرے ہوئے تھے۔ وہ بولی:

''میکسیچ، تم کو اوپر بلایا ہے!''

''میں نہیں جاؤں گا'' میں نے جواب دیا۔

لاریونچ نے خاموش حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا:

''یہ کیا بات ہے؟ کیوں نہیں جاؤ گے؟''

میں نے اس کا کل ماجرا سنایا۔ اس نے فکرمندی سے تیوری چڑھائی، آہستہ سے بولا:

''یہ تم نے ذرا زیادہ گستاخی کی۔'' اور پھر خود اوپر گیا۔

دوکان میں اسسٹنٹ کے خلاف بھن بھن بھن بھن شروع ہوگئی۔

کاپیندیوخن کہنے لگا:

''اب تم کو ضرور جواب مل جائے گا!''

مجھے اس سے کوئی ڈر نہیں محسوس ہوا۔ بات یہ ہے کہ اسسٹنٹ کے اور میرے تعلقات بہت دن سے اس انتہا پر آ گئے تھے کہ اب ٹوٹے اور تب ٹوٹے۔ وہ مجھ سے بڑی ڈھٹائی سے نفرت کرتا تھا اور وہ نفرت دن بدن بڑھتی جاتی تھی۔ میں بھی اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن میں یہ سمجھنا چاہتا تھا کہ آخر اس کا رویہ میری طرف اتنا برا، اتنا بیزار کن کیوں ہے۔

مثلاً جان بوجھ کر دوکان کے فرش پر ادھر ادھر پیسے ڈال دیتا تا کہ وہ جھاڑتے وقت مجھ کو مل جائیں۔ لیکن میں ان پیسوں کو ہمیشہ اٹھا کر اس پیالے میں ڈال دیتا جو کاؤنٹر پر رہتا تھا اور جس میں فقیروں کو دینے کیلئے پیسے ڈال دیئے جاتے تھے۔

جب آخر کار مجھے معلوم ہوا کہ وہ یہ حرکت کیوں کرتا ہے تو میں نے کہا:

''اس طرح میرے سامنے پیسے پھینکنے سے کچھ نہیں بنے گا!''

وہ بوکھلا کر سرخ ہو گیا اور مجھ پر چیخنے لگا:

''ابے تیری اتنی ہمت کہ مجھ کو سبق سکھاتا ہے!'' پھر ذرا رک کر بولا ''مگر تجھے کیسے خیال ہوا کہ میں جان بوجھ کر پیسے گراتا ہوں؟ وہ تو خود ہی فرش پر بکھرے رہتے ہیں...''

دوکان میں میرا کتاب پڑھنا بھی اس نے یہ کہہ کر منع کر دیا:

''یہ تمہارے ایسوں کا کام نہیں ہے۔ یا تم کوئی پادری بننا چاہتے ہو کیوں؟ نکمے!''

اس نے مجھے سکوں کی چوری میں پھنسانے کی کوشش برابر جاری رکھی اور مجھے یہ خیال ہوا کہ جس دن کوئی چونی یا اٹھنی کسی دراز میں چلی گئی اور میں جھاڑو دیتا ہوا تو بس وہ مجھ پر الزام لگائے گا کہ میں نے

ہی چرایا ہے۔ چنانچہ پھر میں نے اس کے سامنے تجویز پیش کی کہ وہ یہ کھلواڑ مجھ سے نہ کرے۔ لیکن اسی دن جب میں شراب خانے سے گرم پانی کی کیتلی لے کر لوٹ رہا تھا تو میں نے اسے پڑوس کی دوکان کے اسسٹنٹ سے یہ کہتے سنا:

''اس سے ایک مناجات کی کتاب چروالو۔ بہت جلدی تو نئی کتابیں آنے والی ہیں، تین بکس بھر کے...''

میں سمجھ گیا کہ بات چیت میرے ہی متعلق ہو رہی ہے کیوں کہ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو دونوں گھبرا گئے۔ ویسے بھی میں بھانپ سکتا تھا کہ وہ میرے خلاف احمقانہ جوڑتوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔

پڑوس کی دوکان کا یہ اسسٹنٹ ایک دبلا سوکھا سہا آدمی تھا، تیز چالاک آنکھیں۔ وہ بار بار اس دوکان داری کا کام اچھا کرتا تھا لیکن شرابی تھا۔ جب بھی وہ لنڈھانے چل دیتا تو اس کا مالک اسے برخاست کر دیتا اور پھر رکھ لیتا۔ اوپر اوپر سے تو وہ بڑا مسکین لگتا، مالک کے ذرا ذرا سے حکم پر دوڑتا لیکن اس کی داڑھی سے ایک زہریلی مسکراہٹ چھنتی رہتی اور جلے کٹے فقرے کہا کرتا۔ اگر چہ اس کے دانت مضبوط اور سفید تھے لیکن اس کے منہ سے ایسی بو آیا کرتی تھی جیسے سڑے ہوئے دانتوں والوں کے منہ سے آتی ہے۔

اس سے پہلے بھی مجھے ایک تجربہ ہو چکا تھا جس کی وجہ سے اس شک کو اور بھی زیادہ تقویت ہوتی تھی کہ وہ ہمارے اسسٹنٹ سے مل کر میرے خلاف کوئی سازش کر رہا ہے۔

ایک دن وہ بری محبت سے مسکراتا ہوا میرے قریب آیا، پھر ایک دم سے میری ٹوپی نوچ کر پھینک دی اور میرے بال پکڑ لئے۔ ہم دونوں گتھ گئے۔ وہ مجھے پیچھے سے دھکیلتا ہوا دوکان کے اندر لے گیا اور وہاں اس نے یہ کوشش کی کہ مجھے فرش پر رکھی ہوئی بڑی بڑی مقدس شبیہوں پر دھکیل دے۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو میری ٹکر لگنے سے یقیناً شیشے ٹوٹتے، باریک نقش ونگار ٹوٹتے اور قیمتی شبیہوں کا سخت نقصان ہوتا۔ چونکہ اس شخص ونگار ٹوٹتے اور قیمتی شبیہوں کا سخت نقصان ہوتا۔ چونکہ اس شخص میں طاقت کم تھی۔ میں نے آسانی سے اس پر قابو پالیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ داڑھی والا آدمی فرش پر بیٹھ کر، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اپنی دکھی زخمی ناک سہلانے لگا۔

اگلی ہی صبح کو جب دونوں دوکانوں کے مالک کہیں چلے گئے اور ہم دونوں تنہا تھے وہ اپنی ناک کے

بانسے پر اور ایک آنکھ کے نیچے کی سوجن سہلاتا ہوا دوستانہ انداز میں بولا:

''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں نے اپنی مرضی سے تم پر حملہ کیا؟ میں کوئی احمق نہیں ہوں، جانتا ہوں کہ تم مجھ سے جیت جاؤ گے کہ میں کمزور اور شرابی ہوں۔ وہ تو میرے مالک نے مجھے حکم دیا تھا کہ ایسا کروں۔ اس نے کہا۔ اس کو خوب پیٹو اور کوشش کرو کہ اس کے ہاتھ سے ان لوگوں کی دوکان کا جتنا بھی نقصان ہو سکے وہ ہو جائے۔ خوب ان لوگوں کو نقصان پہنچے! اور جہاں تک میرا اپنا سوال ہے میرا بس چلتا تو کبھی ایسا نہ کرتا۔ ذرا دیکھو تو تم نے کیسا گومڑا ڈالا ہے...''

مجھے اس کی بات کا یقین آ گیا اور اس سے ہمدردی ہونے لگی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کو پیٹ بھر کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا ہے اور وہ ایک ایسی عورت کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے جو اس کو پیٹتی ہے۔ پھر بھی میں نے اس سے سوال کیا:

''اچھا اگر یہ لوگ تم سے کہیں کہ کسی کو زہر دے دو دلوا دے گا۔ یہ تو کچھ بھی کر سکتا ہے...''

ایک اور موقعہ پر وہ مجھ سے کہنے لگا:

''میرے پاس نام کو ایک کوڑی نہیں ہے، گھر میں کچھ کھانے کو نہیں ہے اور وہ میری بڑھیا میرے دم پر بنی ہے۔ اگر تم اپنے گودام سے ایک مقدس شبیہہ چرا کر دے دو تو میں اسے بیچ لوں۔ کیوں اتنا مجھ پر کرم کرو گے یا مناجات کی ہی ایک جلد دے دو؟''

مجھے وہ جوتوں کی دوکان اور وہ گرجے والا بوڑھا چوکی دار یاد آیا۔ میں نے سوچا یہ آدمی ضرور میری چغلی کھائے گا! لیکن میں اس سے انکار نہ کر سکا، چنانچہ میں نے اسے ایک مقدس شبیہہ دے دی۔ نہ جانے کیوں مناجات چرانا ذرا زیادہ بڑا جرم محسوس ہوا کیونکہ اس کی قیمت کئی روبل تھی۔ ہاں، یہ کہنے میں تو عجیب سی بات لگتی ہے لیکن ہمارے اخلاقیات پر ہمیشہ سوداگری ناپ تول کا معیار حاوی رہتا ہے۔ ہماری فرد جرم اور تعزیرات جرم اپنی تمام معصومیت اور بھولے پن کے باوجود اس چھوٹے سے راز کو ہر قدم پر افشا کرتی ہے جس کے پردے میں ذاتی ملکیت اور احساس ملکیت کی عظیم الشان شر پسندی چھپی رہتی ہے۔

اور جب میں نے اپنے اسسٹنٹ کو دیکھا کہ وہ اسی بدبخت آدمی کا پیچھا پکڑے ہے کہ وہ مجھ سے مناجات کی ایک جلد چروالے، تو مجھے وہ مقدس شبیہہ والی چوری یاد آئی جو میں نے اسی کے لئے کی تھی اور مجھے خوف محسوس ہوا۔ یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسسٹنٹ کو اس فیاضی کا علم تھا جو میں نے اس کے کندھے

پر بندوق رکھ کے کی تھی۔اور اس شخص نے میری چغلی کھادی تھی۔

دوسروں کے کندھوں پر بندوق رکھ کر چھوڑنے کا گھٹیاپن اور ان دونوں کے پلان کے کمینے پن سے مجھ میں نفرت کا ایسا شدید احساس ابل پڑا کہ مجھے اپنے چاروں طرف کے ماحول سے بلکہ اپنے آپ سے بھی نفرت ہوگئی۔کئی دن جب تک نئی کتابیں نہ آگئیں میں سخت اذیت اٹھاتا رہا۔آخر کار وہ آئیں۔ جس وقت میں گودام میں بیٹھا کتابوں کا پارسل کھول رہا تھا تو پڑوس کی دوکان سے وہی شخص آپہنچا اور مجھ سے ایک مناجات مانگنے لگا۔

''کیا تم نے میرے مالک کو وہ مقدس شبیہہ والی بات بتادی؟''

''ہاں'' اسنے کھسیا کر قبول کرلیا''میرے پیٹ میں بات ٹکتی نہیں بھائی...''

میں ششدر رہ گیا،فرش پر بیٹھا اور اس کا منہ تکنے لگا۔اور وہ دھیرے دھیرے بڑبڑانے لگا۔اس وقت اس کی حالت بے حد پریشان اور قابل رحم لگ رہی تھی۔

''وہ...وہ...تمہارے مالک خود سمجھ گئے...نہیں نہیں...میرے مالک سمجھ گئے۔انہوں نے تمہارے مالک سے کہہ دیا...''

میں نے سوچا کہ میرا تو خاتمہ ہوا اب۔ان لوگوں نے اچھی طرح پھنسالیا ہے اور اب مجھے کسی ایسے مقام پر بھیج دیا جائے گا جو کم سن مجرموں کی اصلاح کے لئے ہوگا! اچھا تو اگر یہی بات ہے تو پھر کیا پرواہ! اگر مجھے ڈوبنا ہی ہے تو چلو، تہہ تک ڈوبوں! میں نے ایک جلد مناجات اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھمادی۔ اس نے اسے اپنے کوٹ کے اندر چھپالیا اور کھسک لیا۔

لیکن پھر فوراً ہی الٹے پاؤں لوٹا اور مناجات میرے قدموں کے پاس گر پڑی۔''نہیں، میں اس کو نہیں لے جاسکتا! تم مجھے تباہ کردو گے!...'' یہ کہہ کر وہ روانہ ہوگیا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، میں اس کو کیوں تباہ کرنے لگا۔لیکن مجھے اس بات سے بے حد خوشی ہوئی کہ اس نے کتاب نہیں لی۔اس واقعے کے بعد سے ہمارا اسسٹنٹ مجھ کو اور بھی شبہہ کی نظر سے دیکھنے لگا اور میرا سخت دشمن ہوگیا۔

جب لارینچ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو یہ تمام باتیں مجھ یاد آئیں۔

وہ جلد ہی واپس آیا، پہلے سے بھی زیادہ خاموش اور اداس اور کھانے سے پہلے جب میں اور وہ تنہا

تھے تو مجھ سے بولا:

''میں نے کوشش کی کہ یہ لوگ تم سے نوکر کا کام لے لیں اور کام سیکھنے پر تم کو لگا کر رکھیں۔ لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔ کوزما تو بالکل سنتا ہی نہیں ہے! تمہارے بہت ہی سخت خلاف ہے...''

اس گھر میں میرا ایک اور بھی دشمن تھا۔ اسسٹنٹ کی منگیتر، جو بڑی ہی چلبلی عورت تھی۔ دوکان میں کام کرنے والے سب ہی نوجوان اس سے کھیلا کرتے تھے، دروازے میں کھڑے ہو جاتے اور جب وہ گذرتی تو اس کو ہاتھ لگاتے۔ وہ برا نہیں مانتی تھی، صرف کتے کے پلے کی طرح کوں کوں کرتی رہتی۔ صبح سے شام تک وہ بسکٹ اور مٹھائیاں کھایا کرتی جو اس کی جیبوں میں اٹم اٹ بھری رہتی تھی۔ اس کا پھیکا چہرہ اور بیقرار بھوری آنکھیں بری بری لگتی تھیں۔ مجھ سے اور پاویل سے وہ ہمیشہ پہیلیاں بجھواتی رہتی تھی جن کے جواب میں خاص گندے اشارے پوشیدہ ہوتے یا دو سخنے یا زبان پھیریاں کہلواتی جن میں آخر جا کر فحش الفاظ نکلتے۔ ایک مرتبہ ایک ادھیڑ مصور نے اس سے کہا:

''تم بڑی حیا لڑکی ہو!''

تو اس نے چہک کر جواب دیا اور ایک بھونڈی سی مثل سنا دی:

''اگر کوئی لڑکی حد سے زیادہ شرم کرے

تو لڑکی جنم جنم لڑکی رہے عورت نہ بنے...''

میں نے ایسی لڑکی پہلے کبھی دیکھی ہی نہ تھی۔ مجھے اس سے نفرت محسوس ہوتی اور وہ جس بھونڈے طریقے سے مجھ پر پلی پڑتی تھی اس سے مجھ کو خوف سا محسوس ہوتا۔ میں اس سے دور بھاگتا اور وہ اور مجھ پر ڈھتی پڑتی۔

ایک دن جب تہہ خانے میں پاویل اور میں اس کو کھیروں کے لئے کچھ جڑیاں ابالنے میں مدد رہے تھے، ہم لوگوں سے کہنے لگی:

''کیوں لڑکو، تم لوگوں کو بوسہ لینا سکھاؤں؟''

پاویل ہنس کر بولا:

''وہ ہم تم سے اچھا جانتے ہیں۔'' اور میں نے ذرا سختی سے اس کو یہ رائے دی کہ جا کے اپنے یار کو سکھائے۔ بس وہ بگڑ گئی۔

''ناشکرے! ارے ایک لڑکی تو تم پر مہربانی کر رہی ہے اور تم اس کو اس کا یہ بدلہ دیتے ہو کہ ناک اونچی کر کے بات کرتے ہو!'' اور پھر انگلی اٹھا کر بولی:

''ٹھہرو، میں بھولونگی نہیں!''

پاویل میری طرف داری میں بولا:

''اگر اس تمہارے یار کو تمہاری حرکتوں کا حال معلوم ہو گیا تو تمہیں ایسی دے گا کہ یاد کرو گی۔''

اس نے اپنا مہاسوں سے بھرا ہوا چہرہ سکوڑا:

''میں کیا اس سے ڈرتی ہوں؟ ارے جتنا جہیز میرا ہے اتنے جہیز کے ساتھ تو مجھے درجنوں شوہر ملجائیں گے، اس سے بھی اچھے! ارے شادی ہی تک تو لڑکی کو مزے اڑانے کا موقع ہے۔ پھر کہاں؟''

اس دن سے وہ پاویل سے باقاعدہ معاشقہ کرنے اور میری چغلیاں کھانے اور مجھ پر تہمتیں تراشنے لگی۔

اب دوکان میں کام کرنا دن بدن زیادہ مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے تمام مذہبی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں اور کٹر مذھبی لوگوں کی بحثوں اور لن ترانیوں سے عاجز آ چکا تھا۔ وہ ایک ہی بات کو بار بار بار کہے جاتے تھے۔ جو کچھ دل بہلنے کا سامان تھا وہ پیوتر واسیلی وچ کی ذات تھی کیونکہ اسے انسانی زندگی کے تاریک بہاؤ کا خوب علم تھا اور اپنے خیالات کو نہایت دلچسپ اور جوشیلے انداز میں بیان کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ پیغمبر الیاس بھی اسی طرح دنیا کی خاک چھانتے ہوں گے۔ تن تنہا اور جھلائے ہوئے۔

جب کبھی میں اس کو اپنے خیالات اور مشاہدات سے آگاہ کرتا جو انسانوں کے متعلق ہوتے، تو وہ فوراً میری باتیں سننے پر تیار ہو جاتا لیکن پھر ساری باتیں اسسٹنٹ سے کہتا جو یا تو میرا مذاق اڑاتا یا مجھے ڈانٹتا۔

ایک دن میں نے ان بڑے میاں سے کہہ دیا کہ میں اکثر اس کاپی میں، جس میں قلمبند اشعار یا حوالے نقل کرتا تھا، اس میں ان کی کہی ہوئی باتیں نقل کر لیتا تھا۔ اس سے وہ گھبرا گیا اور مجھ پر جھک کر بوکھلا کے پوچھنے لگا:

''مگر تم نے ایسا کیوں کیا؟ یہ بات ٹھیک نہیں ہے میاں لڑکے! کیا یاد رکھنے کے لئے کیا؟ ارے نہیں۔ ایسا نہ کرو! تم تو بڑے چھٹے ہوئے معلوم ہوتے ہو! مگر مجھے وہ نوٹ بک دے دینا۔ دے دو گے،

کیوں؟''

وہ بڑی دیر تک اور بہت اصرار سے مجھ سے کہتا رہا کہ نوٹ بک اسے دے دوں یا کم از کم جلا دوں۔ پھر وہ بڑے جوش کے ساتھ اسسٹنٹ سے کچھ کھسر پھسر کرنے لگا۔

گھر جاتے ہوئے اسسٹنٹ نے مجھ سے سختی سے کہا:

''معلوم ہوا کہ تم کسی قسم کے حوالے وغیرہ نوٹ کر کے لکھتے ہو۔ دیکھ خبردار یہ تماشا بند کرو۔ سنتے ہو، صرف جاسوس اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔''

بے خبری میں میرے منہ سے نکل گیا:

''اور سیتانوف؟ وہ بھی تو نوٹ لکھ کے رکھتا ہے۔''

''کیا وہ بھی رکھتا ہے؟ لمبا اونٹ بے وقوف!'' کچھ دیر بعد وہ نہایت غیر متوقع نرمی کے ساتھ بولا ''اچھا، مجھے اپنی اور سیتانوف کی نوٹ بک دکھا دو۔ میں تمہیں آدھا روبل دوں گا! مگر چپکے سے کرنا۔ سیتانوف کو پتہ نہ چلنے پائے...''

ظاہر ہے کہ اس کو اس بات پر پورا اعتماد تھا کہ میں اس کا کہا کروں گا کیونکہ پھر وہ ایک لفظ نہ بولا اور کھٹ پٹ کرتا، اپنے ٹھگنے پیر گھسیٹتا چل دیا۔

گھر پہنچ کر میں نے سیتانوف کو اسسٹنٹ کی تجویز بتائی اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

''تم نے اس کو کیوں بتایا؟ اب وہ کسی سے میری اور تمہاری دونوں کی بیاض چروالے گا۔ لاؤ تم اپنی بیاض بھی مجھے دے دو کہیں چھپا دوں... اور دیکھ لینا، اب وہ جلد ہی تمہیں برخاست بھی کر دے گا!''

مجھے اس میں کوئی شک نہ تھا اور میں نے ارادہ کر لیا کہ جیسے ہی نانی اماں شہر واپس آ جائیں گی، میں یہ جگہ چھوڑ دوں گا۔ نانی اماں جاڑوں بھر بالاخنا میں رہی تھیں جہاں وہ کسی کی لڑکیوں کو لیس بنانا سکھا رہی تھیں۔ نانا ابا پھر کوناوینو میں رہ رہے تھے۔ اگر وہ کبھی کبھار شہر آتے بھی تو مجھ سے کبھی نہ ملتے، نہ ہی میں کبھی ان سے ملنے جاتا۔ ایک دن اتفاقیہ سڑک پر ان سے ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ اپنا بھاری والا ریچھ کی کھال کا کوٹ پہنے چلے جا رہے تھے اور ایسے بھاری بھرکم انداز سے چل رہے تھے جیسے کوئی پادری ہوں۔ جب میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے ایک ہاتھ سے اپنی آنکھوں پر چھجا سا بنا لیا اور کھوئے ہوئے بولے:

''اچھا،تم ہو... ہاں۔ ہاں۔تو تم تو اب معبود کے مصور بن گئے ہو...اچھا۔چلو۔چلو۔''

انہوں نے مجھے ایک طرف کو دھکا دیا اور اسی شان سے اکڑتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

نانی اماں سے شاذ ہی کبھی ملاقات ہوتی تھی۔وہ آج کل ان تھک کام کرتی تھیں۔وہ نانا ابا کی دیکھ بھال کرتیں جن کی دماغی حالت صحیح نہیں تھی،اور پھر نانی اماں میرے ماموؤں کے بچوں کو بھی رکھتی تھیں اور ان کی مدد کرتی تھیں۔میخائل ماموں کا ساشا ان کے لئے خاص طور پر پریشانی کا باعث تھا۔وہ رنگریزی کی دوکان میں کام تو کرتا تھا پر جم کر کبھی نہیں رہتا تھا۔جگہیں بدلتا رہتا اور بیچ بیچ میں بالکل نانی اماں پر آپڑتا اور بڑے اطمینان سے رستہ دیکھتا رہتا تھا کہ وہ کب اس کے لئے نیا اور دوسرا ٹھکانا تلاش کر کے دیں۔پھر ساشا کی بہن بھی ان کی گردن میں پڑی ہوئی تھی۔اس نے ایک شرابی کے ساتھ قسمت پھوڑی تھی جو اسے مار پیٹ کر گھر سے نکالا کرتا تھا۔

جب کبھی میری ملاقات نانی اماں سے ہوتی تو مجھے ان کی روح کے حسن کا تو اور زیادہ احساس ہوتا تھا لیکن مجھے ہمیشہ یہ خیال آتا کہ یہ شاندار روح افسانوں کی دنیاؤں میں رہتی ہے اور اسی چیز نے اسے ماحول کی تلخ حقیقتوں سے بالکل بے نیاز کر دیا ہے۔وہ اسے نظر ہی نہیں آتیں۔مجھ پر جس قسم کے خوف یا گھبراہٹیں طاری ہوا کرتی تھیں،نانی اماں ان سے بالکل الگ تھیں۔

یہی کہتیں:''الیوشا بیٹا،صبر کرو۔''

جب میں زندگی کے پھیکے پن کا ذکر کرتا،لوگوں کے دکھ اور مصائب کا قصہ چھیڑتا۔ان تمام چیزوں کا ذکر کرتا جن کے خلاف میرے ذہن میں سخت احتجاج تھا۔تو وہ یہی کہتیں:''الیوشا بیٹا،صبر کرو۔''

میں صبر کرنے کے لئے بنا ہی تھا۔یہ چیز میری خلقت ہی میں نہیں تھی۔اور اگر کبھی کبھار میں اس صفت کا اظہار بھی کرتا جو صرف مویشیوں،پتھروں اور لکڑیوں کی صفت ہے،تو وہ صرف اس لئے کہ اپنی طاقت کو آزماؤں اور اندازہ کر سکوں کہ میرے قدم زمین میں کتنی مضبوطی سے اور کس قدر گہرے جمے ہوئے ہیں۔بعض وقت کم عمر لوگ بھی کمسنی کی حماقت میں آ کر یا بڑوں کی ریس میں اپنی طاقت سے زیادہ وزن اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں جن سے ان کے عضلات اور ہڈیاں مجروح ہو جاتی ہیں۔کبھی کبھی وہ اس میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔اکثر میں آ کر دس سیری مگدر ہلانے کی بھی کوشش کرتے ہیں جو صرف پیشہ ور پہلوان کا کام ہے۔

میں نے بھی ایسا کیا۔ لغوی اور معنوی حیثیت سے ایسا کیا۔ روحانی اور جسمانی حیثیت سے ایسا کیا۔ اور یہ صرف میری خوش بختی تھی کہ میں مرتے مرتے بچ گیا یا زندگی بھر کو مفلوج ہو کر نہیں بیٹھ گیا۔ کیونکہ انسان کو کون چیز اتنا زیادہ مفلوج اور ناکارا بنا سکتی ہے جتنا کہ صبر کرنا؟ جتنا کہ حالات کے سامنے اور ناکارا بن کر ہتھیار ڈال دینا؟

اور پھر بھی اگر میں دھرتی ماتا کے سامنے مفلوج کی حیثیت سے آتا ہوں تو کم از مجھے فخر کے ساتھ یہ کہنے کی تو گنجائش رہے گی کہ تیری دنیا کے شریفوں نے میری روح کو زخمی کرنے اور دو ٹکڑے کر کے جھکائے کی کوشش میں کسر نہیں اٹھا رکھی۔ لیکن میں چالیس برس تک مسلسل ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرتا رہا اور میں نے کبھی نہ صبر کیا، نہ ہتھیار ڈالے۔

یہ خواہش مجھ پر دن بدن زیادہ حاوی ہوتی جاتی تھی کہ شرارتیں کروں، لوگوں کو خوش کروں، ان کو ہنساؤں اور میں اسی میں کامیاب بھی ہوتا تھا۔ نچلے بازار کے سوداگروں کی نقلیں کرنے اور ان کا تمسخر آمیز ذکر کرنے کا مجھے خاص ملکہ تھا۔ میں بڑے مزے میں ایکٹ کر کے دکھاتا تھا کہ دیہاتی لوگ اور ان کی عورتیں کس طرح مقدس شبیہیں بیچتی یا خریدتی تھیں، کس چالاکی سے دوکاندار ان کو بے وقوف بناتے تھے اور مذہبی لوگ کسی طرح اپنا مسلسل پروپیگنڈا اڑالے جاتے تھے۔

دوکان کے لوگ ہنس ہنس کے لوٹ جاتے اور اکثر برش رکھ کر میرا تماشا دیکھنے لگتے۔ لیکن جب تماشا ختم ہو جاتا تو لاریونچ کہتے ''دیکھ بھائی، یہ اپنے تماشے رات کے کھانے کے بعد کیا کر، تاکہ کام میں حرج نہ ہو...''

اس قسم کے ''تماشوں'' کے بعد میری طبیعت ہلکی ہو جاتی تھی جیسے سر سے کوئی بڑا بوجھ اتر گیا۔ کوئی ایک گھنٹے تک میرا سر نہایت ہلکا اور خالی خالی لگتا اور یہ احساس بڑا پر لطف ہوتا۔ اور پھر جیسے ننھی ننھی کیلیں سی سر میں ٹھک جاتیں جو بہت چبھتیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ چاروں طرف ایک گندگی کا دلیہ پک رہا ہے اور میں بھی اس میں بڑا ہوا رفتہ رفتہ گلتا جا رہا ہوں! میں سوچتا:

''کیا ساری زندگی اسی طرح کی ہے؟ کیا میں ان ہی لوگوں کی طرح زندگی بسر کروں گا، ان حالات سے بہتر حالات نہ کبھی جانوں گا نہ دیکھوں گا؟''

ژیخاریف مجھے غور سے دیکھ کر کہتا:

''میکسیچ، منہ کیوں بھولا رہتا ہے؟ کیوں جھلائے رہتے ہو؟''

سیتانوف اکثر پوچھتا:

''کیا بات ہے، کیا گڑبڑ ہے؟''

اور میری سمجھ میں کچھ نہ آتا کہ ان لوگوں کو کیا جواب دوں۔

زندگی بڑے ظالمانہ طریقے سے میری روح پر بنے ہوئے تمام حسین نقوش کھوچتی جا رہی تھی۔ حسین نقوش جو اس نے خود ہی بنائے تھے۔ اور ان کی جگہ حقارت کے ساتھ، انتقاماً کچھ ایسے کھرچے لگا رہی تھی جن کے نشانات بالکل بے کار اور بے رنگ تھے۔ میں غصے میں بھرا زندگی کے اس ظلم، اس زیادتی کے خلاف مسلسل لڑ رہا تھا۔ بے شک میں بھی اس دھارے میں بہہ رہا تھا جس میں باقی تمام لوگ بہہ رہے تھے، لیکن میرے لئے پانی زیادہ سرد تھا۔ دوسرے پانی پر آسانی سے تیرتے تھے لیکن مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب ایسی تہہ میں ڈوب رہا ہوں جہاں سے کبھی نہ ابھروں گا۔

پھر بھی لوگوں کا رویہ میری طرف بہتر ہوتا چلا گیا۔ جس طرح پاویل پر ڈانٹ پھٹکار، چیخ پکار پڑتی تھی، اس طرح مجھ پر نہیں پڑتی تھی۔ مجھے ادھر ادھر دوڑایا بھی نہ جاتا اور میرا اپنا نام لینے کے بجائے لوگ مجھ کو میرے خاندانی نام سے بلاتے، جس کے معنی یہ تھے کہ وہ نسبتاً میرا احترام زیادہ کرتے تھے۔ یہ سب تو ٹھیک تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر کوفت ہوتی تھی کہ کتنے لوگ تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر کوفت ہوتی تھی کہ کتنے لوگ تھے جو واد کا پیتے تھے اور پی کر قابل نفرت حرکتیں کرتے تھے۔ عورتوں سے ان کے تعلقات کس قدر مکروہ تھے، حالانکہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ زندگی میں ان کی یہی دو تفریحیں تھیں۔ شراب اور عورت۔

مجھے یہ یاد کر کر کے رنج ہوتا تھا کہ وہ دھوبن نتالیا کوزلوفسکایا جو خود ایک سمجھ دار اور باہمت عورت تھی، اس کا بھی یہی خیال تھا کہ عورت تفریح کا ذریعہ ہے۔

اور پھر نانی اماں؟ اور ملکہ مارگٹ؟

ملکہ ماگٹ جب مجھے یاد آتی تھی، تو مجھ پر رعب سا چھا جاتا تھا۔ میں نے اب تک جتنے انسانوں کو دیکھا تھا وہ ان سب سے اس قدر مختلف تھی کہ گویا میں نے اس خواب میں دیکھا تھا۔

اسی زمانے میں میں عورت کے متعلق کافی سوچا کرتا تھا اور اس امکان پر بھی غور کیا کرتا تھا کہ کل جب باقی لوگ لطف اٹھانے جائیں گے، تو میں بھی چھٹی لے کر تفریح کروں گا۔ یہ خیال جسمانی

خواہشات کی بنا پر پیدا نہیں ہوا تھا۔ میں تندرست اور نفاست پسند تھا۔لیکن کبھی کبھی میرے دل میں شدت سے ہوک اٹھتی کہ کسی کو گلے لگاؤں۔ کسی ایسی ہستی کو جو سمجھدار اور دردمند ہو۔ جس سے میں اپنے دل کا دکھ اسی طرح دیر تک کہتا رہوں جیسے اپنی ماں سے۔

پاویل پر مجھے بہت رشک آیا کرتا تھا۔ راتوں کو ہم دونوں پاس پاس بستر بچھائے تھے کہ وہ مجھے بتانے لگا کہ سڑک کے اس پار جو نوکرانی رہتی ہے، اس سے اس کا معاشقہ چل رہا ہے۔

''ذرا سوچ تو بھیا، ایک مہینہ بھی نہیں گذرا کہ میں اسے برف کی گیندیں بنا بنا کر مارا کرتا تھا، پہلے وہ مجھے بھاتی نہ تھی۔ اور اس کی ذرا برابر بھی پرواہ نہیں کرتا تھا اور اب جب کہ میں اسے بنچ پر اپنے پاس بیٹھا محسوس کرتا ہوں تو افوہ، اس کے ایسا تو کوئی ہے ہی نہیں!''

''تم اس سے کیا باتیں کرتے ہو؟''

''سب باتیں! وہ مجھے اپنے بارے میں بتاتی ہے اور میں اسے اپنے بارے میں بتاتا ہوں۔ اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے کا بوسہ لیتے ہیں..مگر وہ...وہ شریف ہے..تم تو سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ کتنی نیک ہے! کیوں، تم تو بڑھے سپاہی کی طرح سگریٹ پینے لگے یار!..''

''تم اس سے کیا باتیں کرتے ہو؟''

''سب باتیں! وہ مجھے اپنے بارے میں بتاتی ہے اور میں اسے اپنے بارے میں بتاتا ہوں۔ اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے کا بوسہ لیتے ہیں..مگر وہ...وہ شریف ہے..تم تو سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ کتنی نیک ہے! کیوں، تم تو بڑھے سپاہی کی طرح سگریٹ پینے لگے یار!..''

میں بہت تمباکو پیتا تھا۔ تمباکو کا اثر جب دماغ پر ہوتا تو دل دماغ کی الجھن کسی قدر دب جاتی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے وادکا کی بو اور مزے دونوں سے نفرت تھی لیکن پاویل خوب پیتا تھا۔ جب نشے میں ہوتا تو منہ بسور بسور کر بڑے دردناک انداز سے روتا:

''میں گھر جاؤں۔ مجھے گھر جانے دو...''

مجھے یاد ہے وہ یتیم تھا۔ ماں باپ بہت دن ہوئے مر چکے تھے، بھائی بہن کوئی تھا نہیں۔ آٹھ سال کی عمر سے وہ غیروں اور اجنبیوں میں پلا تھا۔

بہار کا موسم آیا تو میرے دماغ کی جھنجھلاہٹ اور پریشانی اور بھی بڑھ گئی، اور اسی کیفیت میں میں

نے فیصلہ کیا کہ پھر کسی اسٹیمر پر کام تلاش کرنا چاہئے تاکہ میں استراخان پہنچ سکوں اور وہاں سے بھاگ کر ایران جاسکوں۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ بھاگ جانے کے لئے میں نے ایران کا ہی انتخاب کیوں کیا۔شاید اس لئے کہ نیژنی کے میلے میں جو ایرانی سوداگر آیا کرتے تھے وہ مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ڈھوپ میں بیٹھے بیٹھے حقہ پیا کرتے سکون کے ساتھ، جیسے پتھر کے بت ہوں، رنگی ہوئی داڑھیاں اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جو ایسا لگتا تھا سب کچھ جانتی ہیں۔

غالبًا میں بھاگ ہی جاتا لیکن بات یہ ہوگئی کہ ایسٹر کے ہفتہ میں جب کئی مصور لوگ اپنے اپنے گاؤں کو گئے ہوئے تھے اور باقی سب پی پی کر خوب مست ہو رہے تھے، تو میری ملاقات اپنے سابق مالک سے ہوگئی۔ وہی نانی کے بھانجے۔ وہ دریائے اوکا کے کنارے دھوپ میں ایک کھیت میں سیر کر رہے تھے۔

ان کے جسم پر ایک لمبا سا، ہلکا، بھورے رنگ کا کوٹ تھا۔ ہاتھ پتلون کی جیب میں تھے، منہ میں سگریٹ دبا ہوا تھا، ٹوپی بانکے انداز میں پیچھے کو کھسکی ہوئی تھی۔ میں جیسے ہی بڑھا انہوں نے ایک دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ان کے چہرے سے آزاد، رنگین مزاج انسان کی کیفیت جھلک رہی تھی۔اس وقت کھیت میں وہ اور میں ہو گیا۔''

''آہ، پیشکوف مسیحا کا ظہور ہو گیا۔''

مجھے ایسٹر کا پیار کر کے انہوں نے پوچھا کہ میرا کیا حال چال ہے۔جس کے جواب میں میں نے بڑی صاف گوئی سے کہہ دیا کہ میں اس دوکان میں عاجز آ گیا ہوں، شہر سے اور باقی تمام حالات سے بھی اکتا گیا ہوں اور میں نے ایران جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

وہ سنجیدگی سے بولے:

''چھوڑو بھی اس خیال کو! ایران پر لعنت ہے! مجھے یہ معلوم ہے بھائی، تمہاری عمر میں میں بھی بھاگ جانا چاہتا تھا اور یہ شیطان ہی کو معلوم ہے کہ کہاں بھاگ جانا چاہتا تھا!...''

جس مزے سے وہ شیطان کو ادھر سے ادھر اچھالا کرتے تھے وہ ادا مجھے پسند تھی۔ ان میں ایک خاص قسم کی اچھائی اور تازگی تھی۔ان کی ہر بات رنگین اور بانکی لگتی تھی۔

پھر انہوں نے چاندی کی ایک ڈبیہ کھولی جس میں موٹے موٹے سگریٹ بھرے ہوئے بھرے

ہوئے تھے اور میری طرف بڑھائی: ''لو پیو؟''

اس بات پر تو میں بالکل ریشہ خطمی ہو گیا۔

''سن پیشکوف، پھر میرے ساتھ کام کرا۔ میں نے اس سال میلے میں کوئی چالیس ہزار کے ٹھیکے لئے ہیں، سمجھے۔ تمہاری ڈیوٹی میلے میں لگا دوں گا۔ مطلب ہے اور سیر کی قسم کا کام ہو گا۔ عمارتوں کا مال سارا اتروانا اور یہ دیکھنا کہ وقت پر ٹھیک جگہ مال لا کر ڈال دیا جائے اور مزدور لوگ کچھ پار نہ کریں، کیوں؟ تمہارے لئے ٹھیک ہے؟ تنخواہ پانچ روبل مہینہ اور روز کھانے کے لئے پانچ کوپک الگ سے! میری عورتوں سے تمہارا کوئی واسطہ نہ رہے گا، صبح جانا شام آ جانا۔ عورتوں سے مطلب ہی کیا! صرف یہ ہے کہ ان لوگوں کو یہ نہ بتانا کہ معری تمہاری ملاقات ہوئی۔ بس سینٹ ٹامس والے اتوار کو آ جانا۔ اور بس۔ یہ رہے تم! سمجھے؟''

دوستوں کی طرح ہم دونوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ انہوں نے روانہ ہوتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا بلکہ دور سے بھی برابر ٹوپی ہلاتے چلے گئے۔

جب میں نے ساتھی مصوروں سے اعلان کیا کہ میں جا رہا ہوں تو ان میں سے زیادہ لوگوں نے اس طرح اظہارِ افسوس کیا کہ میری انا کو بہت تسکین پہنچی۔ پاویل خاص طور پر پریشان ہوا۔ برا ماننے کے انداز میں بولا:

''سوچو تو ذرا کہ تم ہم لوگوں کو چھوڑ کر ان اجڈوں مین زندگی بسر کرنے جا رہے ہو۔ بڑھئی اور رنگائی کرنے والے... تھو! اس کو تو کہتے ہیں چاند سے گرے کھجور میں اٹکے...''

زیخاریف بڑبڑایا:

''ارے جوانی میں تو انسان پریشانیوں کو اس طرح ڈھونڈتا ہے کہ آ بیل مجھے مار۔''

ان مصوروں نے مجھے رخصت کرنے کے لئے جو تقریب کی، وہ نہایت بے جان اور بور قسم کی تھی۔

ژیخاریف خوب شراب پیئے تھا، زرد ہو رہا تھا شراب کے نشے کے مارے، کہنے لگا ''ہاں یہ تو ضرور ہے کہ آدمی کو یہ بھی آزمانا چاہئے اور وہ بھی۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ وہ شروع سے ایک ہی چیز کو پکڑے اور اسی کو لپٹا رہے...''

لاریونچ دھیمے سے بولے ''ہاں۔ پوری زندگی لپٹا رہے۔''

لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ لوگ یہ سب باتیں محض فرض کی ادائیگی کے لئے کہہ رہے ہیں۔ ورنہ میں ان سے جس رشتے سے بندھا تھا وہ گل چکا تھا پھٹ سے ٹوٹ گیا تھا۔

گوگولیف شراب کے نشے میں دھت اوپر والے ٹنڈ پر پڑا بڑبڑا رہا تھا:

''اگر میں چاہوں تو ابھی تمہیں جیل خانے کرادوں! مجھے یک راز معلوم ہے! تم خدا کو نہیں مانتے۔ آہاہاہاہا...''

بے منہ کی ادھوری مقدس شبیہیں دیواروں سے لگی کھڑی تھیں، چھت میں شیشے کی گیندیں اسی طرح چپکی ہوئی تھیں۔ ادھر کچھ دنوں سے دوکان میں مصنوعی روشنی کے بغیر کام ہو رہا تھا۔ اس لئے ہم لوگوں کو ان پر کالکھ اور گرد وغبار کی تہہ جم گئی تھی۔ اس وقت ہر چیز نے میرے ذہن پر ایسا گہرا نقش کیا تھا کہ آج بھی بس اگر میں اپنی آنکھیں بند کرلوں تو مجھے سب کچھ ویسے کا ویسا ہی نظر آنے لگتا ہے۔ وہ تاریک تہہ خانہ، اس میں پڑی ہوئی میزیں، کھڑکیوں کے طاقوں پر رکھے ہوئے رنگوں کے ڈبے، رنگنے کے برشوں کے گٹھے، مقدس شبیہیں، تانبے کی سلفچی کے نیچے رکھا ہوا اگالدان۔ سلفچی آگ بجھانے والوں کے کود کی طرح لگتی تھی اور ٹنڈ کے کنارے سے لٹکی ہوئی گوگولیف کی ٹانگ، نیلی جیسے مردہ کی ٹانگ ہو۔

میں تو فوراً ہی نکل بھاگنا چاہتا تھا۔ لیکن روسی قوم کو اس بات کا خاص شوق ہے کہ غم کے لمحات کو زیادہ سے زیادہ طول دیا جائے۔ الوداع کی رسم تجہیز وتکفین سے کم نہیں ہوتی!

ژیخاریف نے تیوری چڑھا کر مجھ سے کہا:

''میں وہ کتاب ''دیو'' تمہیں واپس نہیں کروں گا، جی چاہے تو بیس کوپک اس کے لے لو۔''

لیرونتوف کے کلام سے جدا ہونا میرے لئے بھی بڑی مشکل تھی، خاص طور پر اس لئے بھی کہ وہ اس فایر بریگیڈ کے بڑے افسر کا دیا ہوا تحفہ تھا۔ لیکن جب میں نے کسی قدر برامان کے روپیہ لینے سے انکار کر دیا تو ژیخاریف نے بڑے اطمینان سے پیسے اپنے بٹوے میں واپس رکھ لئے اور بڑے مزے میں بولا:

''جیسی تمہاری مرضی! لیکن کتاب تو میں نہیں دوں گا! تمہارے لئے ایسی کتاب رکھنا ٹھیک بھی نہیں ہے۔ یہ کتاب پاس ہوگی تو پل بھر میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہو!...''

''لیکن یہ تو اسٹور میں بکتی ہے۔ میں نے خود دیکھی!''

لیکن اس نے یقین دلاتے ہوئے کہا:

''تو پھر کیا ہوا۔ اسٹور میں تو پستول بھی بکتے ہیں۔''

چنانچہ اس نے وہ کتاب نہیں واپس کی۔

جب میں اوپر گیا کہ مالکن کو خدا حافظ کہہ دوں تو ڈیوڑھی میں اس کی بھانجی سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگی:

''سنا ہے تم ہم لوگوں کو چھوڑ کر جا رہے ہو؟''

''ہاں۔ جا تو رہا ہوں۔''

''اچھا ہی ہوا۔ ورنہ تمہیں برخاست تو کر ہی دیا جاتا۔'' اس نے یہ بات کافی خلوص سے مگر زیادہ اخلاق سے نہیں کہی۔

اور وہ شرابی مالکن جو تھی اس نے کہا:

''خدا حافظ، خدا تمہارا نگہبان ہو! ویسے تم ہو تو بہت برے لڑکے، گستاخ بہت ہو! اگرچہ میں نے تو تمہاری برائی کا کوئی پہلو دیکھا نہیں لیکن لوگ سب یہی کہتے ہیں!''

پھر یکایک وہ رونے لگی اور آنسو بہاتی ہوئی بولی:

''کاش میرا شوہر غریب زندہ ہوتا، خدا اسے غریق رحمت کرے! وہ تمہارے کان مروڑتا، تمہارے سر پر چپتیں لگاتا لیکن رکھتا تم کو یہیں، نکالتا نہیں! آج کل تو ہر بات کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ذرا سی خطا ہوئی اور نکال دئے گئے! ہائے میں مر جاؤں! اب تیرا کیا ہوگا بیٹے!''

16

میں اور میرے مالک کشتی میں بیٹھے میلے کی سڑکوں پر تیر رہے تھے۔ یہ راستے پتھریلی عمارتوں کے درمیان سے گزرتے تھے۔ بہار کے موسم میں دریا میں باڑھ آئی تھی اور یہ مکان اوپری منزل تک پانی میں ڈوب گئے تھے۔ میں کشتی کھے رہا تھا۔ میرے مالک کشتی کے دنبالے میں بیٹھے تھے اور اوٹ پٹانگ طریقے سے پتوار کو پانی کے اندر بہت گہرائی میں ڈال کر کشتی کا رخ ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

کشتی ہچکولے کھاتی ہوئی خاموش اور میلے پانی میں بہتی رہتی ہے، ایک سڑک سے دوسری سڑک میں۔

''کم بخت، کتنا پانی بھر آیا ہے، خدا سمجھے اس سے! کام کا پڑا ہوا جاتا ہے!'' مالک سگار کے کش اڑاتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ سگار کی بو جلے ہوئے کپڑے کی طرح محسوس ہوتی ہے۔

''آہستہ!'' وہ خوب سے چیختا ہے ''ارے کھمبے سے ٹکراؤ گے کیا!'' انہوں نے کشتی دی ہے بدمعاشوں نے!''

مالک نے مجھے وہ جگہ دکھائی جہاں پانی ہٹنے کے بعد دوکانوں کی مرمت کا کام شروع ہوگا۔ اتنے چکنے شیو، ترشی ہوئی مونچھوں اور منہ میں سگار کی وجہ سے وہ بالکل ٹھیکیدار دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ چمڑے کی جیکٹ پہنے ہوئے تھا، گھٹنوں تک کے جوتے، شانوں پر شکاری تھیلہ اور قدموں پر دونالی بندوق پڑی ہوئی تھی۔ وہ مستقل چمڑے کی ٹوپی کی کبھی نیچے آنکھوں پر جھکا لیتا، کبھی ایک طرف ترچھا کر لیتا، ہونٹ چباتا اور چاروں طرف بپھری بپھری نظریں دوڑاتا۔ جب وہ ٹوپی پیچھے کی طرف جھٹکتا تو وہ زیادہ جوان دکھنے لگتا، اس کی مونچھوں سے مسکراہٹ چھننے لگتی گویا کسی خوشگوار چیز کے بارے میں سوچ رہا ہو۔ یقین نہیں آتا کہ اسے بہت سا کام کرنا ہے اور وہ اس وجہ سے پریشان ہے کہ پانی بہت آہستہ آہسہت گھٹ رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کے ذہن میں غیر کاروباری خیال کی کوئی موج سی تیر رہی ہے۔

اور میں حیرانی کے جذبانی میں بہہ رہا تھا: مردوشہر، بندکھڑکیوں والی عمارتوں کی سیدھی قطاریں کتنی عجیب معلوم ہو رہی تھیں۔ پوراشہر پانی میں ڈوبا ہوا بالکل ہماری کشتی کے پاس سے تیرتا چلا جا رہا تھا۔

آسمان کا رنگ سرمئی تھا۔ سورج بادلوں میں کہیں کھو گیا تھا۔ کبھی کبھی وہ گھرے بادلوں میں چاندی کی تھالی کی طرح نظر آجاتا۔

ٹھنڈے پانی کا رنگ بھی سرمئی تھا۔ اس کے بہاؤ کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پانی جم گیا ہو، مکانوں اور زرد دوکانوں کے ساتھ ساتھ سو گیا ہو، جب بادلوں سے اجلا سورج دکھائی دیتا تو چاروں طرف ہر چیز کچھ روشن ہو جاتی۔ پانی میں آسمان کا سرمئی سایہ کپڑے کی تھان کی طرح جھلک اٹھتا۔ ہماری کشتی دو آسمانوں کے درمیان ہوا میں لٹکی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ پتھروں کی عمارتیں بھی ذرا سا اٹھتیں اور دریائے والگا اور اوکا کی طرف بہتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ کشتی کے چاروں طرف ٹوٹے پھوٹے پیپے اور بکسے، ٹوکریاں اور کباڑ ناچ رہے تھے۔ کبھی کبھی ڈنڈے اور شہتیر مردے سانپوں کی طرح بہتے ہوئے نظر آجاتے۔

کہیں کہیں کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ چھتوں پر کپڑے سوکھ رہے تھے۔ گھٹنوں تک کے جوتے جھانکتے نظر آ رہے تھے۔ کھڑکی سے ایک عورت جھانک رہی تھی۔ ایک کشتی جنگلے سے بندھی ہوئی تھی۔ کشتی کے سرخ پہلوؤں کا عکس پانی میں گوشت کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

میرے مالک نے زندگی کے ان نشانوں کی طرف سر جھٹک کر مجھے سمجھنا شروع کیا:

''یہاں میلے کا چوکیدار رہتا ہے۔ کھڑکی سے نکلتا ہے اور چھت سے کشتی میں سوار ہو جاتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ کہیں چور تو ادھر ادھر گھات میں نہیں۔ بھلا چور کہاں۔ خود ہی چوری کرتا ہے...''

وہ بہت ہی آہستہ آہستہ بڑے اطمینان سے بات کر رہا تھا اور کسی اور چیز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ چاروں طرف خاموشی تھی، ویرانی، عجیب وغریب سناٹا جیسے خواب کی دنیا ہو۔ والگا اور اوکا نے ایک بڑی سی جھیل بنا دی۔ دور، اونچے اونچے پہاڑ پر پچرنگا شہر نظر آ رہا تھا، بالکل باغوں میں چھپا ہوا، جن کا رنگ اب تک سیاہ تھا لیکن کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ باغوں نے مکانوں اور گرجا گھر کو سبزی مائل گرم سمور سے ڈھک دیا تھا۔ پانی پر ایسٹر کے گھنٹے کی گہری گونج تیر رہی تھی، شہر کی سانس سنائی دے رہی تھی۔ لیکن یہاں۔ جیسے قبرستان!

ہماری کشتی درختوں کی دو قطاروں کے درمیان تیر رہی تھی۔ ہم پرانی خانقاہ کی طرف جا رہے تھے۔ سگار سے مالک کو بڑی الجھن ہو رہی تھی۔ ان کی آنکھیں سگار کے تلخ دھویں سے جل رہی تھیں۔ کشتی مستقل درختوں کے تنوں سے الجھ الجھ جاتی تھی۔ مالک چونک چونک پڑتا:

''اف کتنی چوپٹ چونک پڑتا:

''ہاں آپ نہ چلایئے!''

''میں کیا کروں؟''

''میں کیا کروں؟'' وہ بڑبڑائے ''جب کشتی میں دو آدمی بیٹھتے ہیں تو ایک کھیتا ہے اور دوسرا پتوار سنبھالتا ہے۔ دیکھو وہ چینی قطار...''

میں میلے کے میدانوں کو اندر باہر سے پوری طرح جانتا تھا۔ اور اس مضحکہ خیز قطار کو خوب اچھی طرح پہچانتا تھا جس کی چھت بڑی ہی عجیب تھی۔ ان کے کونوں پر چینیوں کے پلاسٹر کے مجسمے لگے ہوئے تھے۔ ایک زمانہ تھا لڑکپن میں میں نے اور میرے ساتھی لڑکوں نے ان پر پتھر پھینکے اور میں خود ان چینی

مجسموں میں سے کئی ایک کو سروں اور ہاتھوں سے محروم کیا تھا۔ لیکن اب مجھے اس بات کو سروں اور ہاتھوں سے محروم کیا تھا۔ لیکن اب مجھے اس بات پر کوئی فخر محسوس نہ ہوتا تھا۔

''بکواس!'' میرے مالک نے ان عمارتوں کی طرف اشارہ کر کے کہا ''اگر یہ لوگ مجھے اتنا موقع دیتے کہ ان عمارتوں کو بناتا...'' انہوں نے سیٹی بجائی اور اپنی ٹوپی پیچھے کی طرف کھسکائی۔ لیکن مجھے نہ جانے کیوں خیال آیا کہ اگر وہ بھی بناتے تو اسی بے نیازی سے بناتے اور اسی جگہ بناتے جو نیچی تھی اور جہاں ہر موسم بہار میں دونوں دریاؤں کا پانی بھر جایا کرتا تھا اور وہ بھی کوئی ایسی ہی مکروہ اور بے کار چیز سوچتے جیسے چینی قطار.....

انہوں نے اپنا سگار کشتی سے پھینک دیا اور نفرت سے تھوکتے ہوئے بولے:

''اف زندگی کس قدر بور ہے پیشکوف! کس قدر بور! کوئی پڑھا لکھا نہیں ملتا، آدمی بات کس سے کرے؟ کبھی کبھی انسان کا اونچی اونچی ہانکنے کو جی ہوتا ہے سو کس کے ساتھ بیٹھ کر ہانکے؟ کوئی ہے ہی نہیں۔ جدھر دیکھو بڑھئی اور مستری اور دیہاتی اور چور...''

وہ دھنی طرف کو دیکھنے لگے جہاں دریا کے پانی سے گھرے ہوئے ایک ٹیلے پر ایک سفید مسجد بڑے حسن سے ابھری ہوئی نظر آ رہی تھی اور باتیں کرتے رہے جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد کر رہے ہیں:

''میں نے بیئر پینا شروع کر دیا ہے اور سگار پھونکتا ہوں۔ جرمنوں کی طرح! جرمن لوگ اچھے کاروباری ہوتے ہیں، لڑاکو مرغیاں! ویسے بیئر پینا تو اچھا خاصا شغل معلوم ہوتا ہے لیکن سگار مجھے موافق نہیں آتا! جہاں پیا کہ بیوی شکایت کرنے لگی: ''یہ تم سے چمار کی سی بو کیوں آ رہی ہے؟'' زندگی کو تھوڑا سا پرلطف بنانے کے لئے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں...لو اب تم چلاؤ...''

انہوں نے اپنا چپوار کشتی کے کنارے سے ٹکا کر رکھ دیا۔ بندوق اٹھائی اور ایک چھت پر بنے ہوئے چینی مجسمے پر نشانہ لگایا۔ چینی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ چھرے چھت اور دیوار پر بکھر گئے۔ غبار کے بادل اٹھے اور دب گئے۔

''چوک گیا'' وہ بندوق پھر سے بھرتے ہوئے بے نیازی سے بولے۔

''لڑکیوں کے سلسلے میں تمہارا کیا عالم ہے؟ روزہ کھولا کہ نہیں ابھی؟ نہیں؟ میں نے تو تیرہ سال کی عمر سے عشق کا کاروبار شروع کر دیا تھا...''

وہ مجھے اپنی پہلی معشوقہ کے متعلق بتانے لگے جیسے کوئی بھولا ہوا خواب یاد کر رہا ہو۔ وہ معمار کے یہاں کام سیکھتے تھے اس کے یہاں ایک نوکرانی تھی۔ ان کے قصے کے بیان کے ساتھ عمارتوں کے کونے پر ٹکراتے ہوئے پانی کی چھپا چھپ سنائی دے رہی تھی۔ کتھیڈرل سے پرے پانی کی ایک بڑی سی چادر بچھی ہوئی تھی جس میں سے سیاہ سیاہ جھار جھنکاڑ یہاں وہاں نظر آ رہے تھے۔

مقدس شبیہوں والی دوکان میں مصور کاریگر اکثر طالبعلموں کا ایک گیت گایا کرتے تھے:

نیلا سمندر، نیلا نیلا سمندر

کتنا طوفانی، جوشیلا سمندر...

وہ نیلا سمندر کس قدر عاجز کر دیتا ہوگا...

میرے مالک کہتے جا رہے تھے:

''تو مجھے راتوں کو نیند نہ آتی۔ میں بستر سے اٹھتا اور اس کے دروازے پر کھڑا رہتا، کتے کے پلے کی طرح کپکپاتا ہوا۔ کیوں کہ اس گھر میں ہر طرف ہوا بھرتی تھی! اس کا مالک بھی اکثر رات کو اس کے پاس آیا کرتا تھا اور مجھے آسانی سے پکڑ سکتا تھا۔ لیکن میں بالکل نہ ڈرتا۔ ذرہ برابر بھی نہیں...''

وہ اس طرح سوچ سوچ کر بیان کر رہے تھے جیسے پرانے کپڑے کو غور سے الٹ پلٹ کر دیکھ رہے ہوں کہ یہ اب بھی استعمال ہو سکتے ہیں کہ نہیں۔

''وہ مجھے دیکھ لیتی اور مجھ پر ترس کھاتی۔ دروازہ کھول کر کہتی: ''آ دیوانے لڑکے...''

میں نے اس طرح کے اتنے قصے سنے تھے کہ اس طرح کے قصوں سے متلی سی ہوتی تھی۔ البتہ ایک بات ضرور خوشگوار تھی: یہ لوگ اپنے پہلے معاشقہ کے متعلق گفتگو کرتے تھے تو اس میں کسی قسم کی شیخی بازی نہیں ہوتی، فحاشی نہیں ہوتی تھی اور عام طور پر ایسی محبت بھری پشیمانی ہوتی تھی کہ مجھے محسوس ہوتا۔ یہ انکی زندگی کے بہترین لمحے تھے۔ بہتوں کے لئے تو یقیناً ایسا معلوم ہوتا یہی ایک اچھی چیز تھی، جو انہیں زندگی میں نصیب ہوئی تھی۔

میرے مالک نے ہنس کے سر ہلاتے ہوئے کہا:

''لیکن میں اپنی بیوی سے یہ ماجرا کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ ارے نہیں! کبھی نہیں! ایسا نہیں ہے کہ اس میں کوئی خرابی ہے مگر بس اس سے کہنے کی ہمت نہیں ہوتی، خیر تو...''

دراصل وہ یہ کہانی مجھ سے بھی نہیں بلکہ اپنے آپ سے کہہ رہے تھے۔ اگر وہ خاموش رہتے تو میں کچھ کہتا کیونکہ اس ویرانے اور خاموشی میں اگر بات نہ کی جاتی، گایا نہ تایا کوئی ساز بجایا نہ جاتا تو اس بات کا خطرہ تھا کہ اس شہرِ خموشاں میں انسان پر گہری نیند طاری ہو جاتی، اس شہرِ خموشاں میں انسان پر گہری نیند طاری ہو جاتی، اس شہرِ خموشاں میں غرقاب تھا۔

میرے مالک مجھ کو سمجھانے لگے:

''سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کم عمری میں کبھی شادی نہ کرو! شادی نہایت ہی اہم چیز ہے میرے بھائی! جہاں کہیں اور جس طرح بھی تم رہو۔ تمہاری مرضی! چاہے کس مسلمان کی طرح ایران میں یا پولیس کے سپاہی کی طرح ماسکو میں۔ چاہے کپڑا بنو اور چاہے چوری کرو۔ اگر حالات پسند نہ ہوں تو ان کو ٹھیک کر لو! بیوی تو موسم کی طرح ہوتی ہے بھیا... بیوی ٹھیک نہیں کی جا سکتی جیسی بھی ہو بھگتو! وہ کوئی جوتا نہیں ہے کہ جب جی اتارا اور پھینک دیا...''

اس کا چہرہ بدل گیا۔ وہ سرمئی پانی پر نظر جمائے، تیوری پر بل ڈالے، ایک انگلی سے اپنی طوطا ناک کھجاتے رہے اور بڑبڑاتے رہے:

''ہاں بھائی... بڑا ہوشیار رہنا پڑتا ہے! ممکن ہے کہ تم ہواؤں کی تیزی سے جھوم جائیں لیکن پھر بھی جڑیں مضبوطی سے مٹی میں گڑی رہیں... اور پھر بھی ہر انسان کے واسطے ایک جال تیار ہی رہتا ہے...''

ہم لوگ مشچیرسکی جھیل کی جھاڑیوں میں گھس گئے تھے، جو اس وقت والگا سے مل گئی تھی۔ میرے مالک نے جھاڑیوں کی طرف بندوق کا نشانہ لگایا اور مجھ سے بولے ''آہستہ سے کھیو۔''

چند دبلی پتلی جنگلی مرغابیاں مارنے کے بعد کہنے لگے:

''کناوینو کی طرف چلو! میں وہاں شام تک ٹھہروں گا اور تم گھر پر کہہ دینا مجھے کاروباری کام آ پڑا۔''

میں نے انہیں بستی کی ایک ایسی گلی میں چھوڑا جہاں پانی بھر گیا تھا اور میلے کے میدانوں سے ہوتا ہوا گھاٹ پہنچ گیا۔ یہاں میں نے کشتی باندھ دی اور اس میں بیٹھ کر نظارہ کرنے لگا۔ دونوں دریاؤں کا سنگم، شہر، آتے جاتے اسٹیمر اور آسمان۔ آسمان کو سفید بادلوں کے پر لگ گئے تھے جیسے کوئی بہت بڑی چڑیا ہو اور اس کے شہ پر پھیلے ہوئے ہوں۔ بادلوں کے درمیان نیلی نیلی دراڑوں میں سے سنہری سورج بار بار جھانک کر دیکھتا تھا۔ اس کی ایک کرن ہی دنیا کو بدل کر رکھ دینے کیلئے کافی تھی۔ میرے چاروں طرف ہر

چیز تیزی سے متحرک تھی۔ نیچے کو بہتر ہوئے دھارے کے بہاؤ پر کتنی ہی پٹروں کی کشتیاں تیرتی چلی جارہی تھیں۔ ان پٹروں پر تنومند کسان کھڑے ہوئے تھے اور لمبے لمبے پتواروں سے ان کو چلاتے ہوئے ایک دوسرے کو اور اسٹیمروں کو زور زور سے آوازیں دے رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا اسٹیمر ایک خالی بجرے کو بہاؤ کے مخالف سمت کھینچ رہا تھا اور دریا اسٹیمر کو ادھر ادھر اچھال رہا تھا، اس کی نوک مچھلی کی طرح ادھر سے ادھر ہل رہی تھی۔ اسٹیمر ہانپ رہا تھا اور اس کے پہئیے بڑی ڈھٹائی سے، بے رحمی کے ساتھ پانی کو دباتے، کچلتے اٖگے بڑھتے چلے جارہے تھے۔ بجرے کے کنارے پر چار کسان ایک دوسرے سے لگے بیٹھے تھے، ان میں ایک سرخ رنگ کی قمیص پہنے تھا۔ اور سب کے سب گارہے تھے۔ الفاظ تو سنائی نہیں دے رہے تھے لیکن گیت جانا پہچانا لگتا تھا۔

مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہاں اس دریا پر میں ہر چیز سے واقف تھا، ہر چیز سے میں مانوس تھا، ہر چیز کو میں سمجھ سکتا تھا۔ اور پانی میں ڈوبا ہوا شہر ایک خواب پریشان کی طرح لگتا تھا۔ ایک ایسا خواب جو میرے مالک کی ایجاد تھی اور جو میری سمجھ سے اسی قدر باہر تھا جتنا کہ میرے مالک کی ہستی۔

جب میں جی بھر کر دریا کے اس منظر سے لطف اٹھا چکا تو گھر واپس ہوا۔ اور اس وقت مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اب میں ایک پختہ عمر کا آدمی ہوں، جو اپنے کندھوں پر کسی طرح کا بوجھ بھی اٹھا سکتا ہے۔ واپس جاتے وقت میں والگا پر ایک آخری نظر ڈالنے کے لئے کریملن پہاڑ پر رکا۔ اس بلندی سے زمین لامتناہی اور بے کنار لگتی تھی۔ اور دلوں کی مراد پوری کرنے کو بیقرار!

گھر پر کتابیں موجود تھیں۔ جس فلیٹ میں ملکہ مارگٹ تھی۔ اس میں اب ایک بڑا خاندان رہتا تھا۔ پانچ لڑکیاں تھیں جو ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت تھیں اور دو طالب علم تھیں جو ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت تھیں اور دو طالب علم تھے جو باقاعدہ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان نو جوانوں نے مجھے بہت سی کتابیں دیں۔ میں ترگنیف کو جلدی جلدی اور ہوکے کے ساتھ نگل گیا۔ اس کی طرز تحریر کتنی سادہ تھی! رواں، صاف شفاف جیسے خزاں کے دن۔ اس کے کردار کس قدر پاکیزہ تھے۔ اس کی ہر بات جسے وہ نہایت خاکساری کے ساتھ پیش کرتا تھا کس قدر حسین ہوتی تھی۔

پامیلو کی لکھی ہوئی ’’سمینار‘‘ بھی میں نے پڑھی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ کس قدر حیرت انگیز طریقے پر اس زندگی سے ملتی جلتی تھی جو میں نے مقدس شبیہوں والی دوکان میں دیکھی تھی۔ زندگی کی اس

اکتاہٹ کو جو اکثر ظالمانہ رخ اختیار کر جاتی ہے، مجھ سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔

روسی کتابوں کے پڑھنے میں بڑا لطف آیا۔ ان میں ہمیشہ مجھے ایک حسرتنا کی نظر آتی تھی جو میری جانی پہچانی تھی، جیسے ان کتابوں کے صفحوں میں ایسٹر کی گھنٹیوں کی دردناک گھنگھناہٹ کو قید کر دیا گیا ہو۔ صفحوں کو کھولا نہیں کہ ان کی ہلکی ہلکی، دبی دبی، غنائیت آزاد ہو کر ابھرنے لگی۔

میں نے ''مردہ روحیں'' بہت ہچکچاتے ہوئے پڑھی۔ ''مردہ گھر کی یادداشت'' کا بھی یہی حال تھا۔ ''مردہ روحیں'' ''مردہ گھر'' ''موت'' ''تین موتیں'' ''زندہ ممی''۔ انسان کو ان کتابوں کے ناموں کی یکسانیت فوراً نظر آجاتی تھی اور اس طرح کی کتابوں سے نفرت سی محسوس ہوتی۔ مجھے ''وقت کی نشانی'' ''قدم بقدم'' ''کیا کیا جائے'' ''اسمورین کے گاؤں کی داستان'' اور اسی طرح کی اور کتابیں بھی پسند نہ آئی تھیں۔

لیکن مجھے سر والٹر اسکاٹ اور ڈکنس کی کتابیں پڑھنے کا بہت اشتیاق رہتا تھا۔ ان لوگوں کی کتابیں میں انتہائی لطف لے کر پڑھتا۔ ایک ایک کتاب دو دو تین تین مرتبہ پڑھ کر بھی میرے شوق میں کمی نہ آتی تھی اور بڑی خوشی سے پڑھتا جاتا۔ سر والٹر اسکاٹ کی کتابیں پڑھ کر تو یہ محسوس ہوتا کہ کسی بہت بڑے سجے ہوئے شاندار گرجے میں تہوار کے دن کی عبادت جاری ہے۔ کسی قدر طویل اور تھکا دینے والی مگر ہمیشہ فرحت بخش۔ اور ڈکنس تو آج تک میرے ذہن میں ایک ایسے مصنف کی حیثیت رکھتا ہے جس کا میں بے حد مداح اور معترف ہوں۔ ایک ایسا فنکار جس نے دنیا کے سب سے مشکل فن میں مکمل مہارت حاصل کی ہے: انسانوں سے محبت کرنے کا فن۔

شام کو ہم لوگوں کا ایک کافی بڑا گروہ برساتی میں اکٹھا ہوتا۔ وہ سب بھائی بہن جو ملکہ مارگٹ کے فلیٹ میں رہتے تھے، ایک طالبعلم جس کی ناک اٹھی ہوئی تھی اور جس کا نام ویاچیسلاف سیماشکو تھا، اور ایک بڑے افسر کی لڑکی بھی کبھی کبھی آکر شامل ہوتی تھی۔ اس کا نام پتیتسینا تھا۔ ہم لوگ کتابوں اور شاعری کی باتیں کرتے تھے۔ یہ باتیں میں خوب سمجھتا تھا اور ان میں بے حد دلچسپی رکھتا تھا۔ میرا مطالعہ ان نوجوانوں سے زیادہ تھا۔ لیکن میرے ساتھی اکثر اسکول کے متعلق بات کیا کرتے اور استادوں کا شکوہ کرتے۔ میں یہ باتیں سن سن کر محسوس کرتا کہ مجھے ان سے زیادہ آزادی نصیب تھی اور ان کی قوت برداشت اور صبر پر تعجب کرتا تھا۔ پھر بھی مجھے ان پر رشک ضرور آتا تھا۔ وہ باقاعدہ تعلیم حاصل کر رہے تھے!

میرے ان دوستوں کی عمر مجھ سے زیادہ تھی لیکن معلوم ہوتا تھا کہ میرا ذہن ان سے زیادہ پختہ تھا، تجربہ بھی زیادہ وسیع اور گہرا تھا۔ اس بات سے مجھے گھبراہٹ سی ہوتی تھی کیونکہ جی یہ چاہتا کہ ان سے نزدیک ہوں۔ میں رات کو گھر لوٹتا تھا تو گرد و غبار میں اٹا ہوا اور مجھ میں ان کی زندگی سے ایک بالکل مختلف زندگی کے تاثرات بھرے ہوتے تھے۔ ان سب کے تاثرات بنیادی طور پر ایک ہی جیسے تھے۔ وہ لڑکیوں کے متعلق بہت زیادہ باتیں کرتے، پہلے ایک سے عشق کرتے، پھر دوسری سے۔ اشعار کہنے کی کوشش کرتے۔ اکثر اس معاملے میں میری مدد طلب کی جاتی۔ میں بڑی خوشی سے اشعار کہنے کے معاملے میں دو دو ہاتھ دکھانے کی کوشش کرتا۔ ''قافئے'' مجھے آسانی سے مل جاتے لیکن نہ جانے کیوں میرے اشعار ہمیشہ ایک مزاحیہ رنگ لئے ہوتے اکثر میں پنٹیسینا کو کسی نہ کسی سبزی سے، عام طور پر پیاز سے تشبیہ دیتا، زیادہ تر اسی کے نام شعر و شاعری کا سلسلہ رہتا۔ سیما شکو کہتا:

''ان سطروں کو تم شعر کہتے ہو؟ یہ تو جوتے کی کیلیں ہیں۔''

دوستوں کے برابر رہنے کی خواہش کے ہی سلسلے میں میں پنٹیسین والی لڑکی پر عاشق ہوا۔ اب اس وقت مجھے یہ تو یاد نہیں کہ میں نے اپنے احساسات کا اظہار اس سے کیونکر کیا تھا، لیکن اس معاملے کا انجام نہایت ہی افسوسناک ہوا تھا۔ بات یہ ہوئی کہ زویزدین تالاب کے سڑے پانی میں ایک تختہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک دن لڑکی کو اس تختے پر تیرنے کی دعوت دی۔ اس نے میری دعوت قبول کر لی۔ میں تختے پر تیرنے کی دعوت دی۔ اس نے میری دعوت قبول کر لی۔ میں تختے کو کنارے تک لایا۔ وہ اتنی مضبوط تو تھا کہ میرا بوجھ سنبھال لیتا لیکن جب وہ لڑکی۔ خوب رین اور جھالروں اور لیسوں سے سجی ہوئی۔ بڑے ناز و انداز سے دوسری طرف پاؤں رکھنے لگی تو وہ کمبخت تختہ اس کے قدموں تلے جواب دے گیا اور دیکھتے دیکھتے وہ پانی میں! نہایت دلیرانہ انداز میں میں بھی اس کے پیچھے ہی دیکھتے پانی میں کود پڑا اور اسے جلدی سے کنارے پر لے آیا۔ لیکن خوف اور کائی دونوں نے مل کر میری ملکہ کے حسن پر کالک پوت دی تھی۔

مجھ کو بھیگا ہوا گھونسہ دکھاتی ہوئی وہ چلائی:

''تم نے مجھے جان بوجھ کر ڈبویا!''

میں نے بہتری معافی مانگی مگر اس نے میری معافی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس دن سے میری جانی دشمن ہوگئی۔

عام طور پر شہر کی زندگی کچھ دلچسپ نہ تھی۔ بڑھیا مالکن کو اب بھی مجھ سے نفرت تھی۔ بہو مجھے شک کی نظروں سے دیکھتی تھی۔ وکٹر، جس کے چہرے پر اب اور بھی چھائیاں پڑ گئی تھیں، ہر ایک پر غرایا کرتا تھا جیسے اسے سب سے شکایت ہو! میرے مالک کے پاس نقشہ بنانے کا کام اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ اور اس کا بھائی مل کر پورا نہیں کر سکتے تھے اس لئے انہوں نے میرے سوتیلے باپ کو مدد کے لئے بلایا۔

ایک دن میں میلے والے میدانوں سے ذرا جلدی کوئی پانچ بجے لوٹ کر آ گیا اور کھانے کے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے انہیں بیٹھا دیکھا۔ وہ شخص جسے میں مدتوں سے بھلا چکا تھا، چائے کی میز پر مالک کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا: ''کیا حال چال ہیں؟ کیسے مزاج ہیں؟'' اس ملاقات کے اچانک پن سے میں ششدر رہ گیا۔ ایک دم سے ماضی ایک شعلہ بنکر سینے میں بھڑکا اور دل کو جھلسانے لگا۔

میرا مالک بولے ''آپ نے تو اسے ڈرا دیا۔''

میرے سوتیلے باپ کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے دیکھا۔ ان کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور بھی زیادہ پھیل گئی تھیں اور وہ بالکل کچلے ہوئے تھکے ہوئے ماندے لگ رہے تھے۔

میں باہر چلا گیا۔ ایسی کمزوری سی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے کسی نے مجھے خوب زدوکوب کیا ہے۔

ہمارے درمیان تکلف اور احتیاط کا پردہ پڑا رہا۔ وہ مجھے میرا اپنا نام اور خاندانی نام ملا کر پکارا کرتے تھے اور مجھ سے برابری کا برتاؤ کرتے تھے۔

''دیکھئے آپ ادھر اسٹور کی طرف جائے گا تو اتنی مہربانی کیجئے گا کہ آدھ پاؤ لافرم تمبا کو اور سو سگریٹ کے وکٹرسن کا غذ لیتے آئے گا، اور پاؤ بھر ابلا ہوا کباب...''

جو پیسے وہ مجھے دیتے تھے وہ ہمیشہ گرم ہوتے تھے اور مجھے برے لگتے تھے۔ بالکل ظاہر تھا کہ ان کو ٹی بی تھا اور وہ زیادہ دن چلتے نظر نہیں آتے تھے۔ ان کو خود بھی اس بات کا علم تھا اور اکثر بری پرسکون، گہری آواز میں، اپنی سیاہ داڑھی کو مڑوڑتے ہوئے کہتے:

''میری بیماری کا دراصل کوئی علاج ہے بھی نہیں۔ حالانکہ اگر انسان کافی مقدار میں گوشت کھائے تو شاید اچھا ہو سکے۔ کون جانے شاید میں بھی اچھا ہو ہی جاؤں...''

وہ کھانے کی کافی مقدار کھاتے تھے اور بہت سگریٹ پیتے تھے۔ سگریٹ ان کے منہ سے صرف اسی

وقت نکلتا تھا، جب اس میں کھانا ڈالنا ہوتا تھا۔تقریباً روز ہی میں ان کے لئے کباب، جب اس میں کھانا ڈالنا ہوتا تھا۔تقریباً روز ہی میں ان کے لئے کباب، بھنا گوشت اور سارڈین مچھلی لایا کرتا تھا۔لیکن نانی اماں کی بہن نہایت اطمینان سے ارشاد فرمایا کرتیں گویا یہ آخری فیصلہ ہوتا تھا: ''ارے موت ان چھوٹے نوالوں کو کیا گرداتنی ہے بھلا! موت کو کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا! ہرگز نہیں! یقیناً نہیں!''

عورتیں میرے سوتیلے باپ کی طرف اتنی توجہ دیتیں کہ کوفت ہونے لگتی۔ ہر وقت ان سے کوئی نئی دوا کھانے کا مشورہ دیتی رہتیں لیکن پیٹھ پیچھے ان کا مذاق اڑاتیں۔

بہو کہتی ''بڑے آدمی ہیں! بڑے آدمی سے کم تھوڑا ہی ہیں! کہتے ہیں کہ میز سے ریزے وغیرہ اچھی طرح جھاڑنا چاہئے۔ریزے سے مکھیاں آتی ہیں، کہتے ہیں۔''

بڑھیا اس کا ساتھ دیتی: ''اوھو، بہت بڑے آدمی ہی ہیں نا! کوٹ تو دیکھو تو جھیر جھیر ہو گیا ہے، تار تار الگ الگ چمک رہا ہے مگر اسی پر برش کئے جاتے ہیں۔ بڑے مزاج دار ہیں کہ گرد کا ایک ذرہ نہ رہنے پائے۔''

میرے مالک سمجھاتے ہوئے کہتے ''ارے ذرا صبر کرو، لڑاکو مرغیاں، چند دنوں میں اس کا خاتمہ دراصل ان ٹٹ پونجیوں کی نفرت اور حقارت تھی جو انہیں اشرافیہ سے ہوتی ہے۔اس چیز نے مجھے سوتیلے بات کا طرف دار بنا دیا۔مکھی مار کر مرتے تو ضرور زہریلے ہیں مگر دیکھنے میں تو حسین لگتے ہیں ہیں!

ان لوگوں کے ماحول کی دم گھونٹ دینے والی فضا میں میرے سوتیلے باپ کا وجود ایسا تھا جیسے مرغیوں کے ڈربے میں کوئی مچھلی پھنس گئی ہو۔دونوں ایک دوسرے سے بالکل ہی الگ اور متضاد تھے جیسے ہماری زندگی کا ہر ایک حصہ ایک دوسرے سے الگ اور متضاد تھا۔

مجھ پر رفتہ رفتہ یہ بات کھلنے لگی اور میرے سوتیلے باپ میں بہت سی ایسی صفتیں تھیں جو ''بہت خوب'' میں تھیں۔ وہ ہستی جس قدر احساس حسن ہوتا تھا۔اس کے مجھے دو ہی نمائندے نظر آتے تھے۔ ''بہت خوب'' اور ملکہ مارگٹ۔ میں اپنے بہترین جذبات و احساسات ان دونوں ہستیوں پر نچھاور کیا کرتا تھا۔سارے وہ حسین تصورات جو مجھے کتابوں سے نصیب ہوتے تھے۔

میرے سوتیلے باپ بھی لوگوں سے اسی طرح الگ تھلگ رہتے تھے جس طرح ''بہت خوب'' اور اسی طرح باپ بھی لوگوں سے اسی لوگوں کی محبت سے محروم تھے۔وہ ہمارے گھر میں ہر شخص سے ایک سا

برتاؤ کرتے تھے، کبھی خود چھیڑ کر کوئی بات نہ کرتے، جو باتیں پوچھی جاتیں ان میں سے ہر ایک کا جواب مختصر اور شائستگی کے ساتھ دیتے تھے۔ خاص طور پر مجھے ان کی اس وقت کی باتیں سننا بہت اچھا لگتا تھا جب وہ میرے مالک کو کچھ بتاتے اور سمجھاتے ہوتے۔ میز کے نزدیک وہ جھک کر تقریباً دوھرے ہوتے ہوئے اور اپنی لمبی لمبی پتلی پتلی انگلیوں سے موٹے کاغذ پر کھٹ کھٹ کرتے ہوئے بڑے بڑے اطمینان سے سمجھاتے:

''اس جگہ شہتیر میں ایک گلی دینی چاہئے تاکہ بوجھ برابر بٹ جائے ورنہ شہتیر دیوار کو توڑ کر نکل جائیں گے۔''

میرے مالک بڑبڑاتے ''ہاں ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ لعنت ہے اس سب پر!'' اور جب میرے سوتیلے باپ وہاں سے ہٹ جاتے تو بہو کہتی:

''یہ تم کیسے اس سے سبق لیتے رہتے ہو۔ کیسے برداشت کر لیتے ہو کہ وہ تمہیں بات بات پر ٹوکتا ہے!''

وہ نہ جانے کیوں اس بات پر خاص سے چڑتی تھی کہ رات کے کھانے کے بعد میرے سوتیلے باپ اپنے دانت اور منہ کی صفائی کے لئے بہت سی کلیاں کرتے تھے اور غرارہ کرتے وقت اپنے سر کو اس طرح پیچھے جھکاتے تھے کہ گلے کی ہڈی باہر کو نکل آتی تھی۔ چنانچہ ایک بار وہ بڑے تلخ انداز میں بولی:

''ایوگینی واسیلی وچ، میرا خیال ہے کہ آپ اس طرح پیچھے کو جو جھکتے ہیں تو یہ آپ کے لئے نقصان دہ ہے!''

وہ صرف مسکرا دئے اور بڑی شائستگی سے بولے:

''مگر کیوں؟''

''بس...ویسے ہی...''

میرے سوتیلے باپ نے ایک ہڈی کی نہرنی نکالی اور اس سے اپنے نیلے نیلے ناخن صاف کرنے لگے۔

جب وہ چلے گئے تو بہو بولی ''ذرا یہ دیکھو، ناخن تک صاف کرنے کی ان کو پڑی رہتی ہے۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور...''

''اخ'' میرے مالک نے ٹھنڈی سانس بھری ''تم لوگ کس قدر احمق ہو، لڑاکو مرغیاں!''

''کیا بکتے ہو!'' بیوی بگڑ کر بولیں۔

رات کے وقت بڑھیا بڑی تلخی کے ساتھ خدا کے آگے رونا روتی:

''اے پروردگار، یہ گلتا سڑتا آدمی نہ جانے کہاں سے میرے سر پر آلدا۔اور وکٹر کو پھر پیچھے ڈھکیل دیا گیا...''

وکٹر نے بھی میرے سوتیلے باپ کے طور پر طریقوں کی ریس کرنی شروع کر دی۔ان کی طرح آہستہ آہستہ چلنا، ان کے شریف اور صاف ستھرے ہاتھوں کی خود اعتماد حرکات، ان کی طرح ٹائی کی گرہ لگانا اور ان کی طرح بغیر ہونٹ چپڑ چپڑ کئے کھانا کھانا۔وہ بار بار بے ڈھنگے پن سے پوچھے چلا جا رہا تھا:

''میکسیموف، گھٹنے کو فرانسیسی میں کیا کہتے ہیں؟''

''میرا نام ایوگینی واسیلی وچ ہے'' میرے سوتیلے باپ نے صحیح کرتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

''اوہ ٹھیک ہے۔ٹھیک ہے۔اور چھاتیوں کو؟''

کھانے کی میز پر وکٹر اپنی ماں کو فرانسیسی میں احکامات دیتا:

''اماں پیاری، ذرا مجھے وہ ڈیش بڑھانا بھنے ہوئے بڑے گوشت کی!''

بڑھیا کو بڑی ہنسی آتی ''توبہ ہے، فرانسیسی کا استاد!''

اور میرے سوتیلے باپ بیٹھے اپنے حصے کا گوشت آہستہ آہستہ چباتے رہتے۔ان پر کوئی اثر نہ ہوتا، کسی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے تک نہیں، جیسے گونگے اور بہرے ہوں۔

ایک دن بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی سے کہا:

''وکٹر، اب جب کہ تم نے فرانسیسی بولنا بھی سیکھ لیا تو اپنے لئے ایک معشوقہ تلاش کرو...''

وہی ایک ایسا موقعہ تھا جب میں نے دیکھا کہ میرے سوتیلے باپ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔

لیکن بہو نے بگڑ کر اپنا چمچہ زور سے پھینکا اور اپنے میاں پر چیخنے لگی:

''میری موجودگی میں تم نے اتنی بے حیائی کی بات کیسے کہی؟ کیسے تمہاری ہمت ہوئی؟''

میں مکان کی پچھلی ڈیوڑھی میں زینہ کے نیچے سوتا تھا اور یہیں زینہ پر کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر میں مطالعہ بھی کیا کرتا تھا۔کبھی کبھی میرے سوتیلے باپ بھی یہاں آپہونچتے۔وہ مجھ سے پوچھتے:

''پڑھ رہے ہو؟'' اور پھر اس قدر زور سے دھواں پھینکتے کہ سینے کے اندر کوئی چیز سلگتی لکڑیوں کی طرح چٹختی کی ہوئی معلوم ہوتی۔ ''کون سی کتاب ہے؟''

میں انہیں کتاب دکھاتا۔

وہ سرورق دیکھ کر کہتے ''اچھا، ایسا لگتا ہے میں نے پڑھی ہے یہ کتاب! لو سگریٹ پیو!''

باہر گندے احاطے کی طرف دیکھتے ہوئے ہم دونوں سگریٹ پیتے رہتے۔ وہ کہتے رہتے:

''یہ بہت ہی برا ہے کہ تم تعلیم حاصل نہیں کر سکتے! تم میں کافی صلاحیت معلوم ہوتی ہے...''

''مگر میں پڑھ رہا ہوں۔ کافی مطالعہ کرتا ہوں...''

''اتنا کافی نہیں ہے! تمہاری با قاعدہ اسکول کی تعلیم ہونی چاہئے۔''

میرا دل چاہتا ان سے کہوں ''جناب من! آپ نے باقاعدہ اسکول کی تعلیم حاصل کی ہے۔ پھر اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوا؟''

وہ جیسے میرے خیالات پڑھ لیتے کہتے:

''اگر انسان میں قوت ارادی ہو تو اسکول کی باقاعدہ تربیت کر دیتا ہے۔ صرف پڑھے لکھے لوگ ہی زندگی سے لڑ سکتے ہیں...''

مجھ سے انہوں نے متعدد بار کہا:

''تمہارے لئے یہی بہتر ہو کہ تم یہ کام چھوڑ دو۔ مجھے تو نظر نہیں آتا کہ تمہارے یہاں رہنے میں کیا فائدہ ہے۔ یہ کوئی سمجھداری کی بات نہیں معلوم ہوتی...''

''لیکن مجھے یہ مزدور اچھے لگتے ہیں۔''

''اچھے؟ ان میں تمہیں کیا اچھا لگتا ہے؟''

''دلچسپ لوگ ہیں۔''

''شاید...''

اور ایک بار انہوں نے کہا:

''اگر غور سے دیکھو تو ہم جن لوگوں کے نوکر ہیں وہ کیا ہی جانگلوش ہیں۔ کس قدر جانور...''

مجھے ایک دم سے یاد آ گیا کہ میری ماں نے بھی یہ لفظ 'جانور' استعمال کیا تھا اور کس وقت اور کس

موقع پر استعمال کیا تھا۔ میں بے اختیار ہنس گیا۔

''کیوں، تم اتفاق نہیں کرتے؟'' انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کرتا ہوں۔''

''ہاں... یہ تو مجھے نظر آ رہا ہے۔''

''ہاں وہ تو ذرا اچھی طبیعت کا انسان لگتا ہے... پر بڑا مضحکہ خیز ہے۔''

میں نے چاہا کہ ان سے کتابوں کے متعلق گفتگو کروں لیکن یہ ظاہر ہوا کہ ان کو کتابوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اکثر وہ کہتے:

''اپنا زیادہ وقت ان میں ضائع نہ کیا کرو۔ کتابوں میں تمام باتیں بڑھا چڑھا کر بیان کی جاتی ہیں۔ ادھر یا ادھر کو ان کا جھکاؤ زیادہ رہتا ہے۔ زیادہ تر مصنفین ان ہمارے مالکوں کی طرح ہوتے ہیں، گھٹیا لوگ!''

مجھے یہ رائیں نہایت ہی صاف گوئی اور دلیری کی معلوم ہوتیں اور اس لئے میں دل میں ان کا معترف ہوتا۔

ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا:

''تم نے گونچاروف کی کتابیں پڑھی ہیں؟''

''فریگیٹ پلاڈا،'' میں نے کہا۔

''نہیں ''پلاڈا'' تو بالکل پھیکی ہے۔ لیکن فی الجملہ گونچاروف روس کا سب سے زیادہ ذہین مصنف ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اس کی ''اوبلوموف'' پڑھو! وہ اس کی سب سے زیادہ حقیقت پسند کتاب ہے جس میں جرأت رندانہ سے کام لیا گیا ہے۔ اور فی الجملہ روسی ادب کی بہترین کتاب ہے...''

ڈکنس کے متعلق انہوں نے کہا:

''کوڑا! میری بات مانو، بالکل کوڑا! لیکن فی الحال ''نیا زمانہ'' کے ضمیموں میں ایک نہایت دلچسپ چیز چھپ رہی ہے۔ ''سینٹ اینٹنی کی عیاشی''۔ تمہیں چاہئے کہ اس کو پڑھو، ایسا معلوم ہوتا ہے تمہیں چاہئے کہ اس کو پڑھو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تمہیں گرجے سے متعلق مذہبی چیز پڑھنے کو شوق ہے۔ تمہیں اس ''عیاشی'' کے پڑھنے سے فائدہ ہوگا...''

وہ خود ہی میرے لئے ان ضمیموں کی ایک گڈی گڈلے آئے اور میں نے فلا بیر کی اس عالمانہ تصنیف کو پڑھا۔اس کو پڑھ کر مجھے ولیوں کی وہ بے شمار زندگیاں یاد آئیں جو میں نے پڑھی تھیں اور بہت سی وہ کہانیاں جو کٹر مذہبی لوگ کہتے ہیں۔لیکن اس نے میرے ذہن پر کوئی گہرا اثر نہیں کیا، بلکہ ''جانوروں کو سدھانے والے اوپیلوفائی مالی کی یادداشت'' پڑھ کر زیادہ لطف آیا جو ضمیمے میں چھپی تھی۔

جب میں نے یہ بات اپنے سوتیلے باپ کے سامنے قبولی تو انہوں نے بڑے سکون کے ساتھ جواب دیا:

''اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی تم اس طرح کی چیزیں پڑھنے کیل ئے کم عمر ہو! مگر اس کتاب کو بھولنا مت...''

کبھی کبھی وہ میرے پاس بڑی دیر دیر بیٹھے رہتے۔منہ سے ایک لفظ نہ کہتے،بس کھانستے جاتے اور سگریٹ کے دھوئیں کے بادل نکالتے جاتے۔ان کی حسین آنکھوں میں ایک خوفناک قسم کی چمک تھی۔ میں خاموش بیٹھا انہیں دیکھتا رہتا تو یہ بھول جاتا کہ یہ انسان، جو کسی سے گلہ وشکوہ کئے بغیر مر رہا تھا،کبھی میری ماں سے قریب رہا تھا اور انہوں نے میری ماں پر ظلم بھی توڑے تھے۔مجھے یہ معلوم تھا کہ اب وہ کسی درزن کے ساتھ رہتا تھا اور مجھے اس درزن کا خیال کر کے تعجب ہوتا اور رحم آتا: کس طرح وہ ان لمبی لمبی ہڈیوں سے گلے ملتی ہوگی کس طرح ان ہونٹوں کا بوسہ لیتی ہوگی جو جراثیم سے بھرے ہوئے تھے۔

''بہت خوب'' کی طرح میرے سوتیلے باپ بھی اکثر ایسی باتیں بے ساختہ کر بیٹھتے جو بالکل ان کی اپنی ہوتی تھیں۔''شکاری کتے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں، بڑے احمق ہوتے ہیں مگر مجھے بہر حال اچھے لگتے ہیں۔بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔خوبصورت عورتیں بھی اکثر احمق ہوتی ہیں...''

میں اپنے دل میں ذرا فخر سے کہتا ''جائیے بھی! آپ ملکہ مارگٹ کو دیکھتے تو کہتے!''

ایک دن وہ کہنے لگے:''جب لوگ ایک ہی مکان میں مدت تک ساتھ رہتے ہیں تو ان کی صورتیں بھی ایک سی دکھائی دیتی ہیں۔''میں نے اس بات کو اپنی بیاض میں نوٹ کیا۔

میں ان کی ایسی باتوں کا اس طرح منتظر رہتا تھا جیسے کوئی مسرت کا انتظار کرے۔اس گھر میں بے ساختہ اور تخلیقی حسن والے جملے سننا ایک بڑی مسرت تھی کیونکہ یہیں ہر شخص روکھی پھیکی زبان بولتا تھا، جو اکثر گھسے پٹے اور ایک ہی سے جملوں میں ادا ہوتی تھی۔

میرے سوتیلے باپ مجھ سے میری ماں کا ذکر کبھی نہیں کرتے تھے۔ میرا خیال ہے انہوں نے میرے سامنے کبھی امی کا نام بھی لیا۔ ان کی یہ بات مجھے پسند آئی اور اس کی وجہ سے میرے دل میں ان کی عزت بھی بڑھی۔

ایک دن میں نے ان سے خدا کے وجود کے متعلق سوال کیا۔ یہ یاد نہیں ہے کہ یہ سوال کن الفاظ میں تھا۔ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا اور بڑے اطمینان سے بولے:

''مجھے نہیں معلوم۔ میں خدا کو نہیں مانتا۔''

مجھے سیتانوف یاد آ گیا اور میں نے اس کا ذکر کیا۔ جب بات ختم کر چکا تو میرے سوتیلے باپ اسی اطمینان سے بولے:

''وہ چیزوں کے متعلق دلیلیں دیتا ہے اور جو لوگ دلیلیں دیتے ہیں وہ کسی نہ کسی چیز کو مانتے ضرور ہیں... میں کسی چیز کو نہیں مانتا۔''

''مگر یہ تو ناممکن ہے کہ کسی چیز کو نہ مانا جائے''، میں نے کہا۔

''کیوں؟ تم خود ہی دیکھ سکتے ہو، میں کسی چیز کو نہیں مانتا۔''

میں دراصل تو صرف ایک ہی حقیقت دیکھ سکتا تھا کہ وہ مر رہے ہیں۔ یہ تو مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے کہ مجھے ان پر ترس آتا تھا لیکن ہاں یہ پہلا موقعہ تھا جب کہ میں ایک انسان کی موت کے خیال سے اور خود موت کے راز سے اتنی دلچسپی لے رہا تھا۔

ابھی یہاں ایک انسان بیٹھا ہے، اس کا گھٹنا میرے گھٹنے سے چھو رہا ہے۔ حساس انسان، ذہین انسان۔ لوگوں کو جس نظر سے دیکھتا ہے اس کا اعلان کرتا ہے۔ ہر چیز کے متعلق اس طرح بات کر رہا ہے جیسے یہ باتیں کہنے کا حق ہو۔ اس کی ہستی میں کچھ ایسے بھی عناصر ہیں جو میرے لئے ضروری ہیں، یا ان عناصر کو صحیح رستے پر لگاتے ہیں جو میرے لئے غیر ضروری ہیں۔ ایک ایسا انسان جس کا ذہن پیچیدہ ہے، بالکل خیالات کا ایک ابلتا ہوا آتش فشان۔ ان کے لئے میرے احساسات جو کچھ بھی ہوں، وہ گویا میرے ہی وجود کے ایک حصے کی نمائندگی کرتے تھے کیونکہ اکثر ان کا خیال میرے ذہن پر چھایا رہتا، ان کی روح کی پرچھائیں میری روح پر اپنا عکس ڈالتی رہتی۔ اور کل؟ کل یہ شخص بالکل غائب ہو جائے گا۔ اپنے دل اور دماغ کی تمام پکتی ہوئی فکروں کو لئے، ان تمام احساسات اور جذبات کو لئے جن کا مطالعہ میں اس کی

خوبصورت آنکھوں می کر سکتا تھا۔اور جب وہ غائب ہو جائے گا تو دنیا سے مجھ کو باندھنے والی ایک اور ڈور مجھ سے چھٹ جائے گی۔صرف ایک یاد رہ جائے گی۔اور یہ صرف مجھ ہی تک رہ جائے گی، یون ہی زندہ، جیسی ہے ویسی، اس میں کبھی تغیر نہ آئے گا۔ جب کہ یہ زندہ انسان، یہ ہر گھڑی تغیر پانے والا انسان مر جائے گا...

لیکن یہ سب تو محض خیالات ہیں اور ان خیالات کے پیچھے بہت دور کوئی ایسی چیز چھپی ہے جو خیالات کو ڈھالتی اور پروان چڑھاتی ہے۔لیکن جس کی تعریف نہیں کی جا سکتی کہ وہ ہے کیا۔کوئی ایسی چیز جو ہمیں اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ زندگی کے گورکھ دھندے پر غور و فکر کریں اور اس سوال کے جواب کا مطالبہ کریں۔کیوں؟ آخر کیوں یہ سب؟

ایک دن جب کہ پانی برس رہا تھا، میرے سوتیلے باپ بولے ''مجھے خیال ہے کہ اب میں جلد ہی پلنگ پکڑ لوں گا۔ایسی بیہودہ قسم کی کمزوری محسوس ہوتی ہے! کسی چیز کو جی نہیں چاہتا...''

دوسرے دن سہ پہر کو چائے کے وقت انہوں نے میز پر اور اپنے کپڑوں پر گرے ہوئے ریزے اور بھی زیادہ نفاست کے ساتھ جھاڑے اور اس طرح ہاتھ ہٹایا جیسے کوئی ان دیکھی چیز اڑا رہے ہوں۔ بڑھیا ان کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے بہو سے سرگوشی میں بولی:

''دیکھا؟ پر جھاڑ رہا ہے۔تیاری کر رہا ہے بس...''

دو دن بعد وہ کام پر نہیں آئے اور پھر بڑھیا نے مجھے ایک بڑا سا سفید لفافہ دیا اور بولی:

''لو۔یہ ایک لڑکی کل دوپہر ہی لائی تھی مگر میں تم کو دینا بھول گئی۔ بڑی اچھی سی۔وہ کون ہوتی ہے تمہاری، کون جونے!''

لفافے کے اندر، اسپتال کے ہی کاغذ پر حسب ذیل جلی خط میں لکھا ہوا تھا:

''اگر تمہیں ایک گھنٹے کی فرصت ہو تو مجھ سے ملنے آنا۔ میں مرتی نوفسکایا ہسپتال میں ہوں۔ای۔ م۔''

دوسرے دن صبح میں ہسپتال کے ایک وارڈ میں اپنے سوتیلے باپ کے پلنگ کے پائینتی ہوا تھا۔وہ پلنگ سے زیادہ لمبے تھے اور ان کے پاؤں لٹکتے ہوئے بھورے موزوں میں لپٹے ہوئے لوہے کے پلنگ کے کٹہرے سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ان کی حسین آنکھیں کبھی زرد زرد دیواروں پر بھٹکتیں، کبھی میرے

چہرے پر ٹھہرتیں اور کبھی اس لڑکی کے ننھے ننھے ہاتھوں پر جو پلنگ کے سرہانے اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھی۔

اس نے اپنے ہاتھوں کو ان کے تکئے پر رکھا اور میرے سوتیلے باپ ان پر اپنے گالوں کو رگڑتے اور منہ کھل جاتا۔ لڑکی گدبرے جسم کی تھی اور کسی گہرے رنگ کا سادہ لباس پہنے تھی۔ اس کے بیضوی چہرے پر آنسو آہستہ آہستہ بہہ رہے تھے، نیلی بھیگی آنکھیں میرے سوتیلے باپ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ چہرہ جس کی گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، ناک کی ہڈی تیکھی ہو گئی تھی، ہونٹ سفید اور بے جان پڑ گئے تھے۔

لڑکی آہستہ آہستہ کہتی جا رہی تھی:

''کاش یہ اس بات پر راضی ہو جاتے کہ کسی پادری کو بلوا لیا جاتا تو ان کی مشکل آسان ہو جاتی۔ پر مانتے ہی نہیں... سمجھتے ہی نہیں...''

اس نے اپنے ہاتھ تکئے پر سے اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لئے جیسے دعا مانگ رہی ہو۔

ایک منٹ کے لئے میرے سوتیلے باپ کو ہوش آ گیا۔ پہلے تو وہ بھوئیں چڑھا کر چھت کی طرف غور سے دیکھتے رہے جیسے کچھ یاد کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے ایک سوکھا ہاتھ میری طرف بڑھایا:

''تم؟ شکریہ! دیکھو نا وہ... مجھے ایسا لگتا ہے... میں بڑا احمق ہوں...''

اتنی بات کر کے وہ تھک گئے، آنکھیں بند کر لیں۔ میں ان کی لمبی لمبی سرد انگلیوں کو سہلانے لگا، جن کے ناخن نیلے پڑ گئے تھے، اور لڑکی پھر خوشامد کرنے لگی ''ایوگینی واسیلی وچ، دے دو اجازت...''

میرے سوتیل باپ نے آنکھ سے لڑکی کی طرف اشارہ کیا ''میں چاہتا ہوں کہ اس لڑکی سے تمہارا تعارف ہو جائے... اچھی لڑکی ہے...''

پھر وہ جب ہو گئے، منہ اور بھی زیادہ کھل گیا۔ اور یکا یک انہوں نے ایک چیخ ٹٹولنے لگے۔ کمبل پھینک دیا اور اس کو ننگے ہاتھوں سے پکڑ پکڑ کر کھینچنے لگے۔ لڑکی بھی چیخیں مارنے لگی اور ملے دلے تکئے میں سر چھپا لیا۔

میرے سوتیلے باپ کا دم نکلتے کچھ دیر نہیں لگی اور مرنے کے فوراً ہی بعد ان کا ناک نقشہ بہت ہی خوبصورت لگنے لگا۔

میں ہسپتال سے نکلا تو وہ لڑکی میرے بازو کا سہارا لئے تھی۔ وہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو

اور لڑکھڑا رہی تھی جیسے وہ خود بھی بیمار ہو۔ اس کے ہاتھ میں ایک رومال دبا ہوا تھا جسے وہ گیند کی طرح مروڑ کر کبھی ایک آنکھ پر لگاتی کبھی دوسری پر۔ وہ اسے اور بھی کس کے لپٹتی جا رہی تھی اور طرح اسے دیکھ رہی تھی جیسے اس کی آخری اور سب سے پیاری ملکیت ہو۔

یکا یک وہ رک گئی اور مجھ سے ذرا قریب ہو کر شکایت بھرے لہجے میں بولی:

''اور وہ جاڑوں تک بھی زندہ نہیں رہے... آہ معبود، یہ کیوں ہوا... کیوں ہوا یہ!''

پھر اس نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہاتھ بڑھایا:

''خدا حافظ۔ وہ ہمیشہ آپ کی تعریف کرتے رہتے تھے۔ کل۔ کل جنازہ اٹھے گا۔''

''میں تم کو گھر پہنچا دوں؟''

اس نے مڑ کر دیکھا۔

''نہیں۔ کیوں؟ دن کا وقت ہے رات نہیں، چلی جاؤں گی۔''

میں گلی کے نکڑ پر پہنچ کر اس کو جاتے دیکھتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی جیسے کوئی ایسا شخص جاتا ہو جسے کہیں پہنچنے کی جلدی نہ ہو۔

یہ اگست کا مہینہ تھا، پت جھڑ شروع ہو گئی تھی۔

مجھے اپنے سوتیلے باپ کے جنازے میں شریک ہونے کی فرصت نہیں ملی اور اس لڑکی سے پھر کبھی میری ملاقات نہ ہوئی...

روز صبح کو چھ بجے میں اپنے کام پر، میلے کے میدانوں کی طرف روانہ ہو جاتا تھا۔ وہاں پر میری ملاقات بڑے دلچسپ لوگوں سے ہوتی تھی: بڑھئی اوسپ، جس کا سارا سفید تھا، زبان خوب چلتی تھی اور جو بڑا ماہر کاریگر تھا۔ اس کی صورت نکولائی پیر سے بہت ملتی جلتی تھی۔ پھر کبڑا ایفی موشکا تھا، جو چھتیں پاٹنے کا کام کرتا تھا۔ پتھر کا مستری پیوتر تھا، عابد، زاہد، پرہیزگار۔ ہمیشہ کسی فکر میں ڈوبا، کسی مسئلے پر غور کرتا ہوا۔ اس کی شکل بھی کسی ولی کی سی لگتی تھی۔ پھر گریگوری شِشلین تھا، جو پلاسٹر کا کام کرتا تھا۔ دلکش صورت، سنہری داڑھی، نیلی آنکھیں۔ اس کے وجود سے ہر وقت خوش باشی اور محبت شعاری کی شعاعیں پھوٹتی رہتی تھیں۔

دوسری مرتبہ جب میں نے اپنے مالک کے یہاں کام کیا تھا تو اس وقت بھی میری ان لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہر اتوار کو وہ آ موجود ہوتے تھے اور باورچی خانے میں آ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔

مضبوط، باوقار، ایسے خوشگوار انداز اور دلکش الفاظ میں بات کرتے جو مجھے بہت بھاتے۔ یہ بھاری بھرکم لوگ مجھے نہایت اچھے انسان نظر آتے۔ ہر ایک اپنے طور پر دلچسپ تھا اور ان میں سے ہر ایک کا مقابلہ اگر کناوینو کے شرابی، کمینے چور دوکانداروں اور سوداگروں سے کیا جاتا تو یقیناً یہ دیہاتی ان سے ہزار گنا بہتر ثابت ہوتے۔

مجھے پلاسٹر مستری شِشلین سب سے زیادہ اچھے لگے۔ میں نے اس سے یہاں تک کہا تھا کہ مجھے کام سکھائے اور اپنا شاگرد بنالے مگر اس نے نرمی کے ساتھ انکار کر دیا اور اپنی سفید انگلیوں سے سنہری بھوؤں کو کھجاتے ہوئے بولا:

''ابھی تم بچے ہو۔ ہمارا کام کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایک دو سال اور ٹھیرو۔'' پھر اپنا خوبصورت سر پیچھے کو جھکا کر بولا:

''معلوم ہوتا ہے تمہیں زندگی تکلیف دہ اور سخت لگتی ہے۔ مگر کوئی بات نہیں۔ برداشت کرنے کی کوشش کرو۔ ذرا اپنے وجود کو مضبوطی سے سنبھال، بناہ لے جاؤ گے!''

یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس مشورے سے مجھے کوئی فائدہ ہوا یا نہیں لیکن اس کی یاد میرے دل میں شکرگذار کے احساس کے ساتھ قائم رہی۔

یہ لوگ اب بھی اتوار کے دن میرے مالک کے یہاں آتے تھے۔ باورچی خانے میں میز کے چاروں طرف بنچ پر بیٹھ جاتے اور مالک کا انتظار کرتے ہوئے آپس میں بڑی دلچسپ گفتگو کیا کرتے۔ میرے مالک آتے تو بڑے زور وشور اور ہنسی ٹھٹھے کے ساتھ ان لوگوں کا استقبال کرتے، ان کے مضبوط ہاتھوں سے اپنے ہاتھ ملاتے اور مقدس شبیہہ والے کونے میں بیٹھ جاتے۔ پھر روپے اور رسیدیں نکلتیں۔ یہ آدمی اپنے بل نکالتے، گھسی پٹی حسابوں کی بیاضیں میز پر رکھی جاتیں اور ہفتے بھر کا حساب وکتاب ہوتا۔

میرے مالک مذاق اور خوشدلی کر کر کے ان کو بیوقوف بنانے کی کوشش کرتے اور وہ لوگ مالک کو۔ کبھی کبھار جھگڑا بھی ہو جاتا۔ لیکن عام طور پر دونوں ساتھ مل کر ہنستے۔

یہ لوگ مالک سے کہتے ''افوہ دوست، تم تو پیدائشی بے ایمان ہو!''

وہ کھسیائی ہنسی ہنس کر جواب دیتے:

''ارے تم بھی چوری کرنے میں کچھ ایسے برے نہیں ہو! کم نہیں ہو کسی سے، لڑاکو مرغیاں!''

''ظاہر ہے''،یفی موشکا قبولتا اور سنجیدہ مزاج پیوتر ٹکڑا لگا تا:

''آخر انسان جو کچھ چوری سے پیدا کرتا ہے وہی تو اس کا ہوتا ہے، اسی پر تو وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ ایمانداری کی کمائی تو ساری کی ساری پروردگار اور زار کی نذر ہو جاتی ہے...''

''اسی لئے تو میں تم لوگوں کی قدرے حجامت بنا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا!'' مالک ہنستے ہوئے کہتا۔

وہ لوگ اس کے مذاق سے لطف لیتے:

''یعنی ہماری چمڑی ادھیڑنے میں؟!''

''یعنی ہمارا دیوالہ نکالنے میں؟''

گریگوری شٹشلین اپنی سینے پر پھیلی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا اور گنگناتی ہوئی آواز میں کہتا:

''اگر ہم لوگ دھوکہ بازی کئے بغیر کاروبار کریں تو کیا حرج ہے آخر؟ کیوں بھائیو؟ اگر صرف ایمانداری برتیں سب تو ہر بات کتنی آسان اور کتنی بہتر ہو جائے۔ کیوں؟ کیا کہتے ہو بھلے آدمیو؟''

اس کی نیلی آنکھوں میں تاریکی اور غمناک چھا جاتی، اس وقت وہ غضب کا حسین لگتا۔ اس کی اس تجویز سے ہر شخص پر تھوڑی سی گھبراہٹ چھا جاتی اور لوگ بوکھلا بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔

ولی صورت اوسپ سانس لے کر بڑبڑاتا:

''ارے دیہاتی لوگ کسی کو دھوکہ بھی کیا دے سکتے ہیں اور اس سے حاصل بھی کیا کر سکتے ہیں''۔ جیسے اسے دیہاتیوں پر ترس آ رہا ہو۔ پتھر کا مستری۔ جھکے ہوئے کندھے، تپا ہوا رنگ۔ میز پر جھک جاتا اور موٹی آواز میں کہتا:

''گناہ دلدل کی طرح ہوتا ہے۔ جتنے ہی آگے جاؤ اتنے ہی گہرے دھنستے جاؤ!''

میرے مالک جواب دینے میں ان ہی لوگوں کو لہجہ اختیار کرتے ''جیسی پکار ہوگی ویسی ہی اس کی گونج۔''

کچھ دیر تک وہ اس طرح فلسفہ بگھارتے رہتے اور ایک دوسرے سے بازی لیجانے کی کوشش کرتے رہتے۔ جب حساب کتاب مکمل ہو جاتا تو وہ آٹھتے، تھکے ہارے، اس بات چیت کی تھکن سے پسینہ میں تر، شراب خانے کی طرف چائے پینے کے لئے روانہ ہو جاتے۔ وہاں ساتھ چلنے کے لئے وہ ہمیشہ میرے

مالک کو بھی دعوت دیتے۔

میلے کے میدانوں میں میری ڈیوٹی یہ تھی کہ اس بات کی نگہبانی کروں کہ یہ لوگ کیلیں، اینٹیں، بانس، لکڑی وغیرہ نہ چرائیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک میرے مالک کے لئے کام کرنے کے علاوہ خود اپنا ٹھیکہ بھی لیتا تھا اور اس لئے اپنے استعمال کے واسطے یہ لوگ سامان کھسکا دیا کرتے تھے۔

جب مجھے یہ ڈیوٹی ملی تو ان لوگوں نے دوستانہ طریقے پر میرا استقبال کیا لیکن ششلین بولا:

''دیکھو، تمہیں یاد ہے تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں اپنی شاگردی میں لے لوں؟ سو دیکھو اب تمہاری کتنی ترقی ہوگئی ہے کہ میرے بھی اوپر اور سیر ہو گئے ہو۔''

اوسپ مذاق کرتا ہوا بولا:

''ارے سب ٹھیک ہے۔ خوب جی بھر کر جاسوسی کرو۔ خوب سونگھتے پھرو!''

پیوتر نے کسی قدر مخالفت کے لہجے میں کہا ''لیکن یہ ہمارے جیسے بوڑھے چوھوں پر اس ننھی سی بلی کا لگانا کیا معنی...''

میری یہ ڈیوٹی مجھ پر ایک بھاری بوجھ تھی۔ ان لوگوں کے سامنے مجھے شرم آتی تھی کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی ایسے علم سے واقف تھا جہاں تک کسی دوسرے کی پہنچ نہ تھی۔ اور میں تھا کہ ان کی اسطرح چوکی داری کرتا تھا جیسے وہ اٹھائی گیرے اور چوٹٹے ہوں۔

شروع کے چند دن بڑی مصیبت سے کٹے۔ پھر اوسپ نے اس بات کو بھانپ لیا اور اور مجھ سے اکیلے میں بولا:

''سنو میاں لڑکے! تم خواہ مخواہ منہ پھلاتے ہو۔ اس کا کوئی تک نہیں! سمجھے؟''

ظاہر ہے کہ میں کچھ نہیں سمجھا۔ ہاں اتنا ضرور سمجھ میں آتا کہ اس بوڑھے انسان کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں کیوں منہ پھلاتا ہوں۔ اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے بڑی صفائی سے باتیں کرنے لگے۔

وہ مجھے کہیں کونے میں لیجا کر ہدایات دیتا:

''اصل میں جو تم سچ پوچھو تو ہمارے درمیان خاص چور جو ہے تو وہ یہ پتھر کا مستری پیوتر ہے۔ اس کا خاندان بھی بڑا ہے اور یہ ہے بھی لالچی۔ اس پر ذرا کڑی نظر رکھنا۔ یہ کچھ بھی چرالے گا۔ آدھ سیر کیلیں ہی سہی، ایک درجن اینٹیں ہی سہی، ایک تھیلا سیمنٹ ہی سہی! ویسے آدمی اچھا ہے، خیالات کا متقی اور سختی سے

پرہیزگار، لکھ پڑھ بھی سکتا ہے، پر چوری اس کی کمزوری ہے! یفی موشکا تو عورتوں کے فراق میں زندگی بسر کرتا ہے، بے ضرر آدمی ہے، تمہارا کیا بگاڑے گا، اس کے کندھوں پر جو سر ہے نا وہ کافی تیز ہے۔ سب کبڑے ذہین ہوتے ہیں! اور گریگوری شُشلین کی چول کچھ ڈھیلی ہے۔ مزاج شاہانہ۔ وہ اپنا جو کچھ حق ہے وہی وصول کرنے کی پرواہ نہیں کرتا، کسی دوسرے کا کچھ کیا لے گا؟ وہ تو اپنے کام سے خود بھی فایدہ نہیں اٹھاتا۔ اس کو جو چاہے الو بنالے وہ کسی کو الو نہیں بنا سکتا۔ عقل سے بالکل کام نہیں لیتا۔''

''لیکن آدمی تو نیک ہے نا؟''

اوسپ نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں دور کہیں کھڑا ہوں اور پھر بڑے یادگار کے الفاظ کہے:

''ہاں۔ نیک آدمی ہے! آخر کاہل الوجود آدمی نیک نہ ہوگا تو اور ہوگا بھی کیا؟ نیکی کے لئے کسی قسم کی ذہانت کی ضرورت تو ہے نہیں... سمجھے نہ میاں لڑکے؟''

میں نے الٹ کر اوسپ سے سوال کیا:

''اور آپ خود؟''

وہ ذرا سا ہنسا۔ ''میں تو ایسا ہوں جیسے کوئی لڑکی۔ جب میں نانی اماں بن جاؤں گا تب تم کو سنایا کروں گا کہ میں کیا تھا۔ انتظار کرو! ورنہ پھر لڑاؤ اپنا دماغ اور معلوم کرو کہ میں کیسا ہوں۔ چلو! کروکوشش!''

میں نے اس کے اور اس کے دوستوں کے متعلق جو رائیں قائم کی تھیں وہ سب اس نے گڑ بڑا دیں۔ مجھے اس کی بات کی سچائی پر ذرہ برابر بھی شبہ نہ تھا۔ یہ بھی نظر آتا تھا کہ یفی موشکا، پیوتر اور گریگوری تینوں اس دلکش بوڑھے کو اپنے آپ سے زیادہ سمجھدار اور ہر معاملے میں عملی طور پر سے زیادہ ہوشیار سمجھتے تھے۔ وہ ہر بات میں اس سے رائے لیتے، غور سے اس کی گفتگو کو سنتے، ہر طرح اس کی عزت اور احترام کرتے۔

اس سے جا جا کر کہتے ''مہربانی کرکے ذرا یہ بتا دیجئے۔'' لیکن ایسے ہی ایک موقعہ پر جب اوسپ چلا گیا تو میں نے سنا کہ پتھر کا مستری پیوتر گریگوری سے آہستہ سے بولا:

''کافر، بے دین۔''

گریگوری نے بھی کھنکار کر جواب دیا:

''مسخرہ کہیں کا۔''

اور پلاسٹر کرنے والے نے مجھے دوستانہ طور پر آگاہ کیا:

''میکسیمچ، ذرا ان بڑے میاں سے ہوشیار رہنا۔ ان سے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے! پلک جھپکتے میں چٹکیوں میں اڑا دے گا تمہیں! ایسے بڑھے سب سے خطرناک ہوتے ہیں۔ خدا ہی جانے کہ کس قدر آدمی کا خرابہ کر سکتے ہیں!''

ان باتوں کا سر پاؤں کچھ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

ظاہر میں تو مجھ کو ایسا نظر آتا کہ ان میں سب سے زیادہ ایمان دار اور پرہیزگار پتھر کا مستری پیوتر تھا۔ اس کے خیالات کا رجحان پروردگار کی ذات، موت اور جہنم کی طرف رہتا تھا۔

''آہ بھائیو! آدمی جتنی کوشش چاہے کر لے، جتنی امید چاہے باندھ لے، انجام آخر سب کا ایک ہی ہے۔ وہی کفن اور وہی قبر کا کونہ!''

اسے معدہ کی کوئی بیماری تھی۔ ایسے بھی دن آتے جب وہ بالکل کچھ نہ کھا سکتا اور روٹی کا چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا بھی اگر پیٹ میں چلا جاتا تو اس کو درد کے دورے اٹھنے لگتے اور متلی آنے لگتی۔

کبڑا ایفی موشکا بھی دیکھنے میں نیک اور ایماندار لگتا تھا اگرچہ وہ کس قدر مضحکہ خیز تھا اور بعض وقت ایسے عجیب انداز اختیار کرتا اور شیخی بگھارتا کہ نیم دیوانہ لگتا۔ جب دیکھو تب وہ عشق میں مبتلا ہوا کرتا اور اپنی ہر معشوقہ کا بیان ایک ہی سے الفاظ میں کرتا:

''بھئی، میں تو تم سے صاف کہتا ہوں۔ وہ کوئی عورت نہیں ہے، وہ تو ملائی کی پیالی میں پڑی ہوئی گالب کی کلی ہے۔ کلی ہے کلی! سمجھے؟''

جب کنا وینو کی شوخ مہترانیاں دوکانوں کے فرش دھونے اٹیں تو یفی موشکا چھت پر سے نیچے اتر کر کسی کونے میں دبک بیٹھتا اور وہاں بیٹھا بیٹھا خوشی سے خرخرایا کرتا۔ چمکتی ہوئی بھوری آنکھیں سکڑ جاتیں، کھیسیں نکل کر ہونٹ اس قدر پھیلتے کہ ادھر ادھر کانوں سے جا ملتے۔

''آہ پروردگار نے آج میرے رستے میں کیا رس کے گھڑے انڈیلے ہیں! آہ کس قدر لطف خود دوڑتا ہوا میرے ہاتھوں تک پہونچ گیا ہے۔ ہائے ذرا دیکھو تو وہ ملائی میں پڑی ہوئی کلی ہے۔ اپنی تقریر پر کتنا ناز کروں! اس بیش بہا تحفے کو کیا کروں! آہ مگر یہ حسن تو مجھ غریب عاشق کو جلا دے گا۔ پھونک کر خاک کر دے گا، ہائے!''

شروع میں مہترانیاں اس پر ہنستیں اور ایک دوسرے کو پکار پکار کہتیں:

''اری ذرا دیکھ تو یہ کبڑا کیسا ریشہ خطمی ہوا جا رہا ہے۔ پگھلا جا رہا ہے بے چارہ! ارے توبہ، اے معبود!'' لیکن یفی موشکا پر ان کے ٹھٹھے کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ رفتہ رفتہ اس کے ابھری ہڈیوں والے چہرے پر ایک خواب ناک کیفیت طاری ہو جاتی، پیار بھرے الفاظ اس طرح اس کے منہ سے نکلتے اور عورتوں کے دل کو سرور و مدھوشی سے بھر دیتے۔

آخر کار مہترانیوں میں سے کوئی، جو ذرا پکی عمر کی ہوتی حیرانی سے کہتی ''ارے یہ مرد تو اس طرح باتیں کر رہا ہے جیسے کہیں کا نوجوان ہو۔''

''گا رہا ہے مینا کی طرح...''

ضدی حسینہ ڈانٹتی ''نہیں، جیسے گرجا گھر کے دروازے پر فقیر۔''

لیکن یفی موشکا اور فقیر میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس میں فقیر ایسی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ اس کے قدم اس طرح زمین میں گڑے رہتے تھے جیسے کوئی مضبوط ٹھونٹھ جما ہوا ہو۔ اس کی آواز اور دلگداز ہوتی جاتی، الفاظ اور بھی زیادہ سحر کار ہوتے جاتے، یہاں تک کہ عورتیں خاموشی سے اس کی بات سننے پر مجبور ہو جاتیں گویا وہ اپنی شہد گھلی ہوئی باتوں سے رفتہ رفتہ ایک جادو سا ان پر ڈالتا ہو۔

انجام کار یہ ہوتا کہ وہ رات کے کھانے پر یا کام کے بعد اپنا بڑا سا چوکھونٹا سر ہلاتا جھومتا آتا اور حیران نظروں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھ دیکھ کر کہتا:

''ہائے، کیا شیریں عورت ہے! کیا ہی پیاری ہے۔ زندگی میں پہلی بات مجھے ایسی نصیب ہوئی!''

یفی موشکا جب اپنی ان فتح مندیوں کا ذکر کرتا تو اوروں کی طرح نہ تو شیخی بگھارتا اور نہ اپنی حاصل کی ہوئی عورتوں کا مذاق اڑاتا۔ صرف آنکھیں پھاڑ کر مسکراتا اور اس کے چہرے پر ایک شکر گذاری کا اور مسرت کا عکس ہوتا۔

اوسپ سر ہلا کر کہتا:

''توبہ، کمبخت! کبھی جو سدھر جائے یہ آدمی؟ تمہاری کیا عمر ہوگی بھلا؟''

''چار اوپر چالیس۔ لیکن اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ آج تو میرا سن پانچ سال کم ہو گیا ہے۔ میں نے آب حیات میں غوطہ لگایا ہے۔ اور جو کچھ کمی تھی وہ پوری ہو گئی ہے۔ دل نہایت مطمئن ہو گیا! دنیا میں بھی

کیا کیا عورتیں پڑی ہیں!''

گریگوری ششلین ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا:

''یفی موشکا تم بڑے بے حیا آدمی ہو۔''

لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ یہ خوبصورت جوان ششلین دراصل کبڑے کی فتح مندیوں پر رشک کرتا تھا۔

اوسپ ان سب کو اپنی سفید بھوؤں کے نیچے سے کنکھیوں سے دیکھتا اور بڑے مزے میں اس کی آواز گونجتی:

''یہ تمہاری ساری معشوقائیں کچھ نہ کچھ دیکھ کر گرتی ہیں، کوئی مٹھائی پر تو کوئی زیورات پر، لیکن یہ ساری کی ساری ایک نہ ایک دن نانی اماں بن جائیں گی۔''

ششلین شادی شدہ تھا لیکن اس کی بیوی گاؤں میں رہتی تھی۔ وہ بھی ان مہترانیوں پر للچائی ہوئی نظریں ڈالا کرتا تھا۔ عورتوں میں سے بھی تقریباً ہر ایک کو حاصل کیا جا سکتا تھا کیونکہ اوپر کی آمدنی کی خواہش سب ہی کو تھی اور اس غربت کے مارے شہر میں آمدنی کا یہ ذریعہ کسی بھی دوسرے ذریعہ کے برابر ہی ٹھیک سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ خوبصورت مرد، ششلین، عورتوں کو ہاتھ نہ لگاتا۔ صرف دور سے ان کو ایسی نظروں سے دیکھا کرتا جیسے یا تو ان عورتوں پر ترس کھا رہا ہے یا اپنے اوپر ترس کھا رہا ہے۔ جب وہ عورتیں خود چھیڑ چھیڑ کر اس سے پینگ بڑھانے کی کوشش کرتیں تو کھسیا کے، گھبرا کے ہنستا ہوا کھسک لیتا:

''چلو بھی۔ چلو چلو۔''

یفی موشکا حیران ہو کر کہتا:

''ارے! تم کیا سڑی ہو گیا؟ ایسا موقع اور ہاتھ سے نکل جانے دیا!''

گریگوری جیسے اسے یاد دلاتا: ''میں شادی شدہ ہوں۔''

''تو تمہاری بیوی کو کیا پتہ چل سکتا ہے؟''

''اگر شوہر بے وفائی کی زندگی بسر کرتا ہے تو بیوی کو ضرور پتہ چل جاتا ہے۔ بیوی کو بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا بھائی!''

''پر اسے کیسے پتہ چلے گا؟''

''یہ مجھے کونہیں معلوم۔لیکن اگر وہ خود عصمت دار ہے تو لامحالہ اس کو معلوم ہو جائے گا۔اگر میں پاکباز ہوں اور وہ بے وفات و مجھے پتہ چل جائے گا...''

''یہ مجھ کونہیں معلوم۔لیکن اگر وہ خود عصمت دار ہے تو لامحالہ اس کو معلوم ہو جائے گا۔اگر میں پاکباز ہوں اور وہ بے وفا تو مجھے پتہ چل جائے گا...''

یفی موشکا عاجز آکر زور سے چیخا''پر کیسے؟''

''یہ میں نہیں کہہ سکتا۔''

یفی موشکا نے عاجز آکر ہاتھ ہلایا۔

''ذرا یہ دیکھو۔'وفاداری'،'معلوم نہیں'،...یہ سب کیا آخر تمہارے سر میں بھرا ہے؟ یہ تمہاری عقل کو ہوا کیا ہے؟''

شلین کی ٹیم میں ساتھ مزدور کام کرتے تھے۔سب ہی کا رویہ اس کی طرف سیدھا سادہ تھا جیسے وہ ان کا مالک نہ ہو۔لیکن پیٹھ پیچھے وہ اس کو بچھیرا کہتے تھے۔اگر وہ کام پر آتا اور دیکھتا کہ وہ اینڈ رہے ہیں تو خود پھاوڑا یا پرات اٹھالیتا اور انتقاماً کام کرنا شروع کر دیتا اور ان کو محبت سے آواز دیتا جاتا:

''آؤ بھائیو! چلو دوستو!''

ایکدن مالک نے طیش میں آکر کچھ کہا تو میں نے سنا دیا:

''یہ تمہارے مزدور بالکل نکمے ہیں۔کسی کام کے نہیں...''

''سچ مچ؟''اس نے اس طرح کہا جیسے اسے خود کبھی اس بات کا خیال ہی نہ آیا ہو۔

''یہ کام کل دوپہر کو ختم ہو جانا چاہئے تھا اور دیکھ لینا یہ آج بھی ختم نہیں ہوگا۔''

''ہاں، یہ تو سچ ہے۔ان لوگوں سے تو آج نہیں ختم ہو سکتا''اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔پھر ذرا رک کر احتیاط سے بولا:

''جو کچھ ہوتا رہتا ہے۔وہ مجھے نظر تو ضرور آتا ہے مگر ان لوگوں کو سختی سے ہنکانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔یہ سب اپنے ہی ہیں۔میرے گاؤں کے ہیں یہ لوگ معبود نے کہا تھا کہ انسان اپنے ماتھے کا پسینہ بہا کر اپنا رزق پیدا کرے گا اور یہ اصول سب کے لئے تھا۔میرے اور تمہارے لئے بھی!لیکن میں اور تم ان لوگوں سے تو کم ہی کام کرتے ہیں۔اس لئے مجھے ان لوگوں کو ہنکاتے شرم آتی ہے...''

وہ اکثر سوچ میں ڈوبا رہتا۔ کبھی کبھی میلے کے میدانوں کی کسی خالی سڑک پر چلتا ہوا نہر کے پل پر جا پہنچتا۔ منڈیر سے لگا وہ گھنٹوں کھڑا رہتا اور پانی، آسمان اور دریائے اوکا کے پھیلے ہوئے کناروں کو دیکھتا رہتا۔

میں آ پہنچتا اور کہتا ''کیا ہو رہا ہے بھئی؟'' تو وہ گھبرا کے چونک پڑتا ''کچھ نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں... ذرا یوں ہی ستانے اور ادھر ادھر نظر دوڑانے کھڑا ہو گیا تھا۔''

وہ اکثر کہتا ''پروردگار نے ہر چیز ویسی ہی بنائی ہے جیسا اس کو ہونا چاہئے تھا۔ آسمان اور زمین اور اس پر بہتے ہوئے دریا اور کشتیاں۔ کشتی لے کر آپ جہاں جی چاہے چلے جایئے۔ ریازان، ری بنسک، پیرم یا استراخان! میں ایک بار ریازان گیا تھا۔ بڑا شہر نہیں ہے اور رکھا پھیکا ہے۔ نیژنی سے زیادہ روکھا پھیکا ہے۔ ہمارا نیژنی تو ذرا چہل دار شہر ہے! استراخان بھی ایسا ہی ہے بے نمک۔ خاص بات تو یہ ہے کہ وہاں کالمک لوگ بھرے رہتے ہیں اور مجھے وہ پسند نہیں۔ مجھ کو یہ تمہارے مردوین اور کالمک اور ایرانی اور جرمن بالکل پسند نہیں۔ پردیسی ہیں نا!...''

وہ آہستہ آہستہ بات کرتا تھا جیسے اس کے الفاظ کسی ایسے کا راستہ دیکھ رہے ہوں جو ان سے اتفاق کرے۔ اور ہمیشہ ایسا آدمی انہیں پتھر کے مستری پیوتر کی ذات میں مل جاتا۔

پیوتر اکثر کہتا ''وہ لوگ پردیسی نہیں ہیں لیکن ہمارے مذہب کے باہر ہیں، برادری کے باہر ہیں، یسوع مسیح سے بھی باہر ہیں۔ وہ لوگ اوران کی برکت کے بغیر ہی زندگی بسر کرتے ہیں۔''

گریگوری شَشلین کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔

''بھائی تم کچھ بھی کہو لیکن میں تو اصل روسی کا قائل ہوں۔ ایماندار روسی کا! مجھے یہودی پسند نہیں آتے اور میرے تو بھئی زندگی بھر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر پروردگار نے ان پردیسیوں کو بنایا ہی کیوں؟ اس میں ضرور کوئی گہری مصلحت ہوگی...''

پیوتر منہ بگاڑ کے کہتا:

''ہوگی مصلحت گہری! لیکن دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کے بغیر بھی ہمارا کام چل ہی سکتا تھا!...''

اس گفتگو کو سن کر اوسپ ٹکڑا لگاتا طنز اور تمسخر کے ساتھ:

''ہاں ہاں، بہت سی چیزوں کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا مثلاً تم لوگوں کی اس گفتگو کے بغیر! جب دیکھوتب بھڑے رہتے ہوایک دوسرے سے۔کوڑے پڑیں تو ٹھیک ہو۔''

اوسپ ہمیشہ الگ تھلگ رہتا تھا اور کبھی ظاہر نہ کرتا کہ کسی سے اتفاق کر رہا ہے اور کسی سے اختلاف۔کبھی کبھی تو ایسا لگتا کہ وہ ہر شخص سے اور ہر آدمی سے عاجز ہے اور تمام انسانوں کو احمق سمجھتا ہے۔ گریگوری اور پیوتر اور یفی موشکا سے وہ اکثر کہتا:

''اخ،سور کے بچے...''

وہ لوگ ذرا سا ہنس کے خاموش ہو جاتے۔اس ہنسی میں نہ جوش ہوتا نہ مسرت۔بے جان سی ہنسی ہوتی مگر بہر حال وہ ہنستے ضرور تھے۔

میرے مالک مجھے کھانے کے لئے پانچ کوپک روز دیتے تھے۔یہ کافی نہیں ہوتا تھا،اس لئے مجھے اکثر بھوکا رہنا پڑتا۔یہ دیکھ کر مزدور لوگ مجھے اکثر دن یا رات کے کھانے پر اپنے ساتھ شریک کر لیا کرتے۔کبھی کبھی ٹھیکیدار لوگ مجھے شراب خانے میں ساتھ لیجا کر چائے وغیرہ پلاتے۔میں بڑی خوشی سے ان لوگوں کی یہ دعوتیں قبول کرتا۔ان کی صحبت میں بیٹھنے اور ان کی آہستہ آہستہ بیان ہونے والی عجیب وغریب داستانیں سننے میں مجھے مزا آتا تھا۔وہ اپنی جگہ پر میری مذہبی معلومات سے مرعوب تھے اور اس کو پسند کرتے تھے۔

اوسپ نے مجھے پر اپنی گہری نیلی آنکھیں جما کے کہا''تم نے خوب پیٹ بھر کتابیں ہضم کر رکھی ہیں۔اتنا بھرا ہے تیرے کدو میں کہ بس پھٹا ہی چاہتا ہے۔''میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اوسپ کی آنکھوں میں اس وقت کیا تاثر تھا۔پتلیاں معلوم ہوتا تھا کہ سفیدی میں گھلی ملی جا رہی ہیں۔

''اپنی معلومات کی قدر کرو اور حفاظت سے رکھو۔کسی دن بڑے موقعہ سے کام آئیں گی۔بڑے ہو کر تم پادری بھی بن سکتے ہو کہ انسانوں کو اپنے شہد گھلے الفاظ سے تسکین دے سکو یا پھر کروڑ پتی بن سکتے ہو...''

''راہب''پیوتر نے صحیح کیا۔نہ جانے کیوں اس کی آواز سے ایسا لگتا تھا جیسے اسے کوئی دکھ پہنچا ہے۔

''اخ؟''اوسپ نے پوچھا۔

''میں نے کہا وہ لوگ راہب کہلاتے ہیں۔ آپ اونچا تو نہیں سنتے ہیں؟...''

''اچھا اچھا۔ راہب ہی سہی۔ کافروں بے دینوں سے بحث کرنے کے لئے۔ یا ہو سکتا ہے تم کافروں کی ہی صف میں داخل ہو جاؤ۔ اس کا بھی معاوضہ کچھ ایسا برا نہیں ملتا! اگر تم اپنا دماغ استعمال کرو تو بے دینی کے ذریعہ بھی اچھی خاصی طرح سے اپنے لئے روزی مہیا کر سکتے ہو...''

گریگوری کھسیائی ہنسی ہنسنے لگا۔ اور پیوتر داڑھی میں سے بولا:

''یوں تو چڑیلیں بھی اچھی خاصی طرح سے زندگی گذار لیتی ہیں۔ ہر طرح کے کافر بے دین بھی رہ ہی لیتے ہیں...''

اوسپ نے ایک دم اعتراض جڑ دیا:

''چڑیلیں کب پڑھی لکھی ہوتی ہیں، ان کو اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔''

پھر وہ میری طرف مڑ کر بولا:

''اچھا سنو۔ یہ ایک قصہ سن لو۔ ایک مرتبہ ہمارے ضلع میں ایک آدمی رہتا تھا۔ اکیلا، تنہا۔ توشکا اس کا نام تھا۔ یوں ہی سا تھا بے چارہ نکما سا آدمی! پر کی طرح ادھر سے ادھر اڑتا مارا پھرتا، وہ محنت مزدوری بھی نہ کرتا اور نہ چوری چماری! بس جدھر کی ہوا چلتی ادھر ہی کو چل پڑتا۔ پھر ایک دن وہ یاترا کے واسطے نکل کھڑا ہوا۔ اور کوئی کام اس کے پاس کرنے کو تھا ہی نہیں۔ دو سال تک باہر رہا اور پھر یکا یک جو واپس آیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ لباس وغیرہ بالکل بدلا ہوا۔ گیسو کندھوں پر پڑے ہوئے، سر پر چھوٹی ٹوپی، جسم پر موٹے کھردرے کپڑے کی عبا۔ وہ لوگوں کو مچھلی جیسی آنکھوں سے گھور گھور کر دیکھتا اور مجذوب کی طرح صدائیں لگاتا:

''گنہگارو توبہ کرو۔ توبہ کرو۔ توبہ کرو'' اب بھلا لوگوں کو توبہ کرنے سے کون باز رکھ سکتا تھا اور خاص کر عورتوں کو۔ اس کا کاروبار خوب چل نکلا۔ توشکا کو کھانا پینا ملتا تھا۔ جتنی عورتوں پر چاہتا قبضہ کر لیتا...''

پیوتر بگڑ کر بولا:

''زندگی کیا ہے۔ بس کھانا پینا اور موج اڑانا؟''

''تو پھر کیا چیز ہے زندگی؟''

''الفاظ! اصل قیمت اور اہمیت الفاظ کی ہے!''

''خیر، میں نے اس کے الفاظ پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ میرے پاس خود ہی اتنے الفاظ موجود ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں ان کا۔''

پیوتر نے برا مانتے ہوئے کہا ''ہم لوگ خود ہی اس توشکا کو جانتے ہیں۔ اس کا اصل نام دمیتری ہے اور واسیلی وچ خاندانی نام ہے۔''

گریگوری نے خاموشی سے نظریں جھکا لیں اور اپنے گلاس کو تکنے لگا۔

اوسپ نے صلح کرنے کے انداز میں کہا ''تو بھئی میں کسی سے بحث تو نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو ذرا میکسیمچ کو روزی کمانے کے مختلف طریقے بتا رہا تھا...''

''ان میں سے کچھ طریقے سیدھے جیلخانے بھی پہنچا دیتے ہیں...''

''ہاں ہاں، بہت سے!'' اوسپ نے اتفاق کیا۔ ''پادری بننے کی طرف تو بہت کم راستے لیجاتے ہیں۔ بس انسان کو اتنا معلوم ہونا چاہئے کہ کس جگہ سے پینترا بدل دیا جائے۔''

اوسپ جب کبھی گریگوری یا پیوتر جیسے پارسا لوگوں سے بات کرتا تو ہمیشہ ایک ہلکا سا طنز اختیار کئے رہتا۔ شاید وہ ان لوگوں کو پسند نہ کرتا ہو لیکن احتیاطاً اپنے احساسات کو چھپائے رکھتا ہو۔ عام طور پر یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا تھا کہ لوگوں کی طرف اس کا رویہ کیا ہے۔

یفی موشکا سے وہ زیادہ محبت سے پیش آتا کیونکہ یفی موشکا کبھی خدا یا انصاف یا ذات پات یا انسانی زندگی کے مصائب کی بحث میں نہیں پڑتا تھا۔ وہ موضوعات جو اس کے ساتھیوں کو بہت محبوب تھے۔ وہ اپنی کرسی ہمیشہ ٹیڑھی رکھتا تھا تاکہ کرسی کی پشت کھمبے میں نہ لگے اور بیٹھا بڑے سکون کے ساتھ ایک کے بعد ایک چائے کے گلاس پیتا رہتا۔ پھر ایک دم سے چوکنا ہوتا، دھوئیں بھرے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑاتا، آوازوں کی گڑبڑ میں کان لگائے سنتا اور آخر کار یکا یک اچھل کر غائب ہو جاتا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اس کے چند درجن قرض داروں میں سے کوئی شراب خانے میں داخل ہو گیا ہے اور چونکہ ان میں سے کئی کا رجحان یہ تھا کہ اگر قرض ادا نہ کرے تو تو پیٹو، اس لئے یفی موشکا کو اکثر اچھل اچھل کر غائب ہونا پڑتا۔

اکثر وہ حیران ہو کر کہتا ''آخر یہ لوگ کیوں کھونٹے پر اچھلتے رہتے ہیں؟ اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں آخر کیوں نہ دے دیتا۔ ضرور دے دیتا ہے۔ شوق سے دے دیتا۔''

''تھو! خدا حافظ!'' اوسپ اس کے جانے کے بعد کہتا۔

کبھی کبھی یفی موشکا دیر تک سوچ میں کھویا بیٹھا رہتا۔ نہ کچھ دیکھتا نہ سنتا۔ اس کا ہڈیلا چہرہ نرم پڑ جاتا، شفقت بھری آنکھوں میں جیسے اور نرمی اور شفقت گھل جاتی۔

لوگ پوچھتے'' کہو دوست، کیا سوچ رہے ہو؟''

''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر میرے پاس پیسے ہوتے تو میں ایک سچ مچ کی شریف زادی سے بیاہ رچاتا۔ سچ کہتا ہوں اپنی جان قسم۔ مثلاً کسی کرنل کی لڑکی۔ اور پھر دیکھئے آپ لوگ کہ میں جم کر وفاداری سے اور استقلال سے اس کے ساتھ محبت کرتا ہوں کہ نہیں۔ آہ معبود! میں اس کے پہلو میں کس قدر تیزی سے شعلہ بن کر اپنے آپ کو پھونک سکتا ہوں... بات یہ ہوئی بھائیو کہ ایک بار میں دیہات میں ایک عمارت پر چھت کی مرمت کر رہا تھا۔ عمارت ایک کرنل کی تھی...''

''اور اس کی ایک بیوہ بیٹی تھی۔ یہ سب ہم بہت سن چکے ہیں'' پیوتر جھلا کے بات کاٹتا۔ لیکن یفی موشکا ذرا نہ گھبراتا۔ گھٹنوں کو ہتھیلیوں سے سہلاتا جاتا، آگے پیچھے ہل ہل کر ہوا میں اپنی کھبہ ہلاتا جاتا اور کہتا جاتا:

''بس وہ باغ میں نکل آئی، سفید جھاگ کے سے پھولے پھولے کپڑے پہنے اور میں چھت پر سے جھانک جھانک کر دیکھتا اور دل ہی دل میں سوچتا: اس ہستی کے بغیر سورج کے کیا معنی؟ ساری دنیا کا کیا مطلب؟ آہ! کاش ایسا ہوسکتا کہ میں فاختہ کی طرح اڑ کر اس کے قدموں میں جا بیٹھتا۔ وہ بس ایک کلی تھی۔ ایک پیاری سی نیلے رنگ کی کلی، ملائی کے کٹورے میں پڑی ہوئی کلی۔ آہ جوانو! کاش ایسی عورت مل جائے۔ پھر چاہے ہمیشہ کو رات ہو جائے!''

''اور کھلاؤ گے کیا اس کو؟'' پیوتر ذرا سختی سے پوچھتا۔ لیکن اس بات سے بھی یفی موشکا ذرا نہ گھبراتا۔

''اے معبود! ہم دونوں کو کھانے کی حاجت ہی کب ہوگی۔ اتنی پرواہ ہی کہاں ہوگی کھانے کی۔ اور پھر وہ امیر ہوگی...''

اوسپ زور سے ہنسا:

''ارے کمبخت یفی موشکا! گھلا جا رہا ہے اسی فراق میں۔ اگر یہی دھندے رہے تو ایک دن صاف ہو جائے گا۔''

یفی موشکا عورت کے سوا اور کسی موضوع پر گفتگو نہیں کرتا تھا۔ وہ مستقل مزاج مزدور بھی نہیں تھا۔ کبھی کبھی تو خوب اچھا کام بھی کرتا اور تیزی اور پھرتی بھی دکھاتا۔ لیکن کبھی کبھی اس سے کوئی کام نہ بنتا۔ لکڑی کی پائنتی کو بے دلی اور بے پرواہی سے پیٹتا اور جوڑوں کے بیچ میں دراڑیں چھوٹ جاتیں۔ ویسے تو اس میں ہمیشہ وھیل مچھلی کے تیل کی بو آیا کرتی تھی لیکن اس کی اپنی بھی ایک علیحدہ اور ذاتی خوشبو تھی۔ بہت خوشگوار اور صحت مند قسم کی خوشبو، جو تازے چرے ہوئے لکڑوں میں سے آتی ہے۔

بڑھئی سے ہر طرح کے موضوعات پر گفتگو کرنے میں دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔ دلچسپی لیکن زیادہ لطف نہیں۔ اس کے الفاظ ہمیشہ گڑبڑاتے رہتے تھے اور یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کس وقت مذاق کر رہا ہے اور کب سنجیدہ ہے۔

گریگوری کا محبوب موضوع پروردگار کی ذات تھی جس سے وہ بے حد محبت کرتا تھا اور بے حد عقیدت رکھتا تھا۔

میں نے ایک بار اس سے کہا ''گریگوری، تمہیں معلوم ہے کہ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو خدا کو نہیں مانتے؟''

''وہ ذرا سا ہنسا ''یہ کیا بات ہوئی بھلا؟''

''مطلب یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ خدا نہیں ہے۔''

''اچھا، یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ خدا نہیں ہے۔''

پھر خواہ مخواہ مکھی اڑاتے ہوئے (حالانکہ مکھی تھی ہی نہیں) کہتا:

''یاد کرو کہ کس طرح حضرت داؤد نے کہا تھا 'بے وقوف اپنے دل میں سمجھتا ہے کہ خدا نہیں'۔ سوچو ذرا کہ اب سے کتنا عرصہ پہلے اس طرح کی بے عقلی اور لاعلمی اور جہالت پر یہ فیصلے دئے گئے تھے۔ خدا کے بغیر کب گذارہ ہو سکتا ہے بھیا؟''

اور اوسپ اس طرح کہتا جیسے اس بات سے اتفاق کر رہا ہو:

''ہاں ہاں۔ ذرا پیوتر کا خدا پر ایمان چھڑوا کر دیکھو، تو پھر وہ تمہیں بتائے گا۔''

ششلین کا خوبصورت چہرہ سنجیدہ ہو جاتا۔ وہ اپنی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرتا جن کے ناخنوں پر پلاسٹر سوکھ گیا تھا، اور پراسرار انداز میں کہتا:

''پروردگار کا نور سب گوشت پوست میں حلول کئے رہتا ہے۔ آدمی کا ضمیر اور اس کا بطون اور اس کی ارواح سب خدا کا عطیہ ہیں۔''

''اور گناہ؟''

''گناہ جسم خاکی سے پیدا ہوتا ہے۔ گناہ شیطان کا دیا ہوا ہے۔ اس لئے وہ صرف انسان کی خارجی ہستی سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسے ماتا کے داغ صرف جلد تک ہی ہوتے ہیں۔ اس سے آگے گناہ کی پہنچ نہیں۔ جو لوگ زیادہ بھی ہوتا ہے۔ اگر انسان اس کا خیال ذہن سے نکال پھینکے تو پھر گناہ کرے بھی نہیں! اور اس کا خیال شیطان دل میں ڈالتا ہے جس کی حکومت جسم خاکی تک محدود ہے...''

پیوتر ذرا مشکوک لہجے میں بولا ''بھئی نہ جانے کیوں میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ... کہ بالکل ایسا تو نہیں ہے۔ یعنی کہ بالکل ایسے کی ایسی ہی بات تو نہیں ہے۔ شاید...''

''بالکل ایسا ہی ہے! پروردگار کا گناہ سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور انسان پروردگار کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ گناہ تو ظاہری سانچہ کرتا ہے اور اندر کی روح گناہ نہیں کر سکتی۔'' وہ فتح مندی کے ساتھ مسکراتا۔

لیکن پیوتر وہی کہے جاتا ''مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ بالکل ایسی بات تو نہیں ہے...''

اوسپ بولا ''تو پھر تمہارے کہنے کے مطابق اگر کوئی پاپ نہیں ہے تو پرائشچت بھی نہیں، گناہ نہیں تو انفعال بھی نہیں اور اگر پرائشچت نہیں تو مکتی بھی نہیں۔ انفعال نہیں تو نجات بھی نہیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ شیطان نظروں سے اوجھل ہوا کہ خدا ہاتھ سے گیا جیسے کہ پرانے لوگ مثل کہا کرتے تھے...''

شِشلین چونکہ پینے کا عادی نہیں تھا، اس لئے دو ہی گلاس شراب سے اس پر نشہ چڑھ جاتا تھا، چہرہ گلابی ہو جاتا، آنکھیں بچوں کی طرح چمکنے لگتیں اور آواز گونجنے لگتی۔

''آہ بھائیو، اف کتنی اچھی ہے زندگی! تھوڑا سا کام کرتے اور بھوکوں بھی نہیں مرتے۔ تعریف ہو خدا کی! کیا شاندار زندگی ہے!''

اور وہ رونے لگتا۔ آنسو گالوں پر سے بہہ بہہ کر داڑھی پر گرتے اور موتیوں کی طرح چمکتے۔

مجھے ان شیشوں کے سے آنسوؤں سے نفرت لگتی تھی۔ اس وجہ سے اور بھی کہ وہ ہر وقت زندگی کی تعریفیں کیا کرتا تھا۔ نانی اماں کی تعریفیں واقعی تعریفیں ہوتی تھیں کہ ان پر یقین آجاتا تھا۔ زیادہ سادگی

ہوتی تھی ان میں، زیادہ خلوص۔

اس قسم کی گفتگو سے میرے ذہن پر ایک مستقل تناؤ کا عالم رہتا تھا اور عجیب عجیب مبہم خیالات اور خوف ذہن میں پیدا ہوتے رہتے تھے۔ میں نے دیہاتیوں کے متعلق بہت سی کہانیاں پڑھی تھیں اور مجھے صاف نظر آتا تھا کہ کتابوں میں پیش کئے ہوئے دیہاتیوں اور سچ مچ کے دیہاتیوں میں بڑا فرق تھا۔ کتابوں کے سارے ہی دیہاتی بدنصیب لوگ ہوتے تھے، اور اچھے برے ہر طرح کے دیہاتیوں میں پایا جاتا تھا۔ کتابوں کا دیہاتی خدا، مختلف فرقوں اور گرجے کے متعلق کم بات کرتا تھا اور زیادہ تر افسروں، زمین، زندگی کی سچائی اور مصائب کی بات کرتا تھا۔ وہ عورت کے متعلق بھی کم ہی بات کرتا تھا اور اس کا رویہ عورتوں کی طرف کم کھردرا اور زیادہ بہتر ہوتا تھا۔ لیکن سچ مچ کے دیہاتی کے لئے عورت صرف خیال بٹانے اور جی بہلانے کا ذریعہ تھی۔ لیکن ایک خطرناک تفریح۔ وہ اس کے ساتھ چالاکی سے پیش آتا تھا کہ کہیں عورت اس حاوی ہو کر زندگی کو برباد نہ کر دے۔ کتاب کا دیہاتی یا تو نیک ہوتا تھا یا بد۔ لیکن اسکی پوری ہستی، اس کا کل وجود کتاب میں نظر آجاتا تھا۔ لیکن اصل اور زندگی دیہاتی نہ تو نیک ہوتا اور نہ بد اور اس کی ہستی نہایت پر اسرار اور دلچسپ ہوتی تھی۔ سچ مچ کا دیہاتی چاہے جتنا بھی بھڑ بھڑیا ہوتا لیکن ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا رہتا کہ وہ اپنے وجود کے متعلق کچھ باتیں زبان پر نہیں لایا ہے اور اپنے وجود کا ایک خاص حصہ اس نے صرف اپنے ہی تک محدود رکھا ہے۔ اور غالباً یہی حصہ اس کی ہستی کا نچوڑ ہے جس کے متعلق وہ کبھی زبان نہیں کھولتا۔

دیہاتی کرداروں میں سے مجھے کتاب ''بڑھئی کی دوکان'' کا کردار پیوتر سب سے زیادہ اچھا لگا۔ میرا دل چاہا کہ یہ کہانی پڑھ کر اپنے دوستوں کو سناؤں چنانچہ میں وہ کتاب لے کر میلے میدانوں میں جانے لگا۔ اکثر میری رات کسی نہ کسی دوکان میں بسر ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو اس وجہ سے کہ بارش شروع ہو جاتی تھی، ایسے میں شہر جانے کو دل نہ چاہتا تھا۔ لیکن زیادہ تر اس وجہ سے کہ دن بھر کی محنت تھکا کر نڈھال کر دیتی تھی۔

جب میں نے ان لوگوں کو بتایا کہ میں بڑھئیوں کی زندگی کے متعلق ایک کتاب لایا ہوں، تو ان کو بڑی دلچسپی ہوئی خاص کر اوسپ کو۔ اس نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی، اس کے ورق الٹے اور اپنا ولیوں کا سا سر طنز کے ساتھ ہلاتے ہوئے بولا:

''تو گویا یہ کتاب سچ مچ ہم لوگوں کے متعلق لکھی گئی ہے! اب ذرا سوچو! آخر یہ لکھی ہوگی؟ ہونہہ، میرا یہی خیال تھا، یہ شریف لوگ اور یہ کلرک لوگ کچھ اٹھا رکھتے ہیں بھلا۔ جو کچھ خدا سے چھوٹ جائے وہ یہ پورا کر دیتے ہیں۔ اس دنیا میں یہی تو ان کا کام ہے...''

پیوتر بولا ''اوسپ، تم خدا کے متعلق زیادہ احترام سے نہیں بات کرتے ہونا۔''

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میرے الفاظ کی پروردگار کے نزدیک اتنی ہی اہمیت اور حقیقت ہے جتنی میری صاف چندیا پر پانی کی بوند کی۔ تم فکر نہ کرو بھائی، ہم تم کبھی اتنے بلند نہیں ہو سکتے کہ خدا تک پہنچیں۔''

پھر یکا یک اس کو جوش آ گیا اور تیز تیز الفاظ یوں اس کے لبوں سے اچھل اچھل کر نکلنے لگے جیسے چقماق سے چنگاریاں۔ جتنی باتوں سے اس کو چڑھتی سب کے خلاف اس نے زہر اگلنا شروع کر دیا۔ دن میں کئی بار اس نے پوچھا:

''تو آپ ہم کو کچھ پڑھ کر سنائیں گے، کیوں میکسیمچ؟ خوب۔ بہت خوب۔ یہ تو خوب سوجھی!''

جب کام ختم ہو گیا تو ہم لوگ شام کے کھانے کے لئے اس دوکان میں جمع ہوئے۔ اور کھانے کے بعد پیوتر اپنے مزدور آردلیون اور شِشلین اور ایک نوجوان فرما کے ساتھ وہاں آ پہنچے۔ جس دوکان میں سب مزدور اکٹھے سویا کرتے تھے وہاں چراغ روشن کیا گیا اور میں نے پڑھنا شروع کیا۔

وہ لوگ بے حس و حرکت سنتے رہے اور ایک لفظ نہیں کہا، یہاں تک کہ آردلیون جھنجھلا کر بولا:

''بھئی، اب بس کرو۔ میرے لئے کافی ہو چکا۔''

وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ سب سے پہلے گریگوری کو نیند آئی۔ سوتے میں اس کا منہ اس طرح کھل گیا تھا جیسے وہ حیران رہ گیا ہو۔ پھر سب بڑھئی ایک ایک کر کے سو گئے لیکن پیوتر، اوسپ اور فوما مجھ سے سٹ کر بیٹھ گئے اور غور سے سنتے رہے۔

جب میں ختم کر چکا تو اوسپ نے فوراً چراغ بجھا دیا۔ ستاروں سے پتہ چلتا تھا کہ آدھی رات جا چکی ہے۔

پیوتر نے اندھیرے میں سے پوچھا:

''مگر اس کتاب کا مقصد کیا ہے؟ یہ کس کے خلاف لکھی گئی ہے؟''

اوسپ جوتے اتارتا ہوا بولا ''سونے کا وقت آ گیا ہے بھئی!''

فوما خاموشی سے ایک طرف کو کھسک لیا۔

پیوتر اصرار کرنے لگا:

''میں پوچھتا ہوں یہ کتاب آخر کس کے خلاف لکھی گئی ہے۔''

اوسپ اپنے لئے تختے پر بستر لگاتے ہوئے بولا ''یہی لوگ جانیں!''

پیوتر اپنی بات کہتا رہا ''اگر یہ سوتیلی ماؤں کے خلاف ہے تو اس کا کوئی تک نہیں۔ سوتیلی مائیں اس طرح کتابوں سے ٹھیک نہیں ہوا کرتیں اور جو اگر پیوتر کے خلاف ہے تو بھی اس کا کوئی تک نہیں۔ گناہ اس کا ہے تو پھر سزا بھی بھگتے۔ قتل کیا تھا تو سائبیریا کو جلاوطن ہونا ہی چاہئے تھا اس کو! انصاف تو یہی کہتا ہے۔ اور ان معاملات میں کتاب بھلا کسی کے کیا کام آ سکتی ہے۔ ہرگز نہیں آ سکتی، بالکل نہیں آ سکتی!''

اوسپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس لئے پیوتر نے اپنی بات جاری رکھی:

''یہ لکھنے والے جو ہوتے ہیں تو ان کو مصروف رہنے کے لئے دنیا کا اور کوئی کام تو ہوتا نہیں۔ اس لئے دوسروں کے معاملات میں اپنی ٹانگ اڑاتے پھرتے ہیں جیسے دو چار عورتیں کہیں اکٹھی ہو جائیں تو پھر دیکھو! اچھا خیر! سونے کا وقت ہے۔ شب بخیر!''

ایک منٹ تک وہ کھلے دروازے میں کھڑا رہا جہاں نیلگوں چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔

''کیوں اوسپ، تم کیا کہتے ہیں؟''

اوسپ نے نیند بھرے لہجے میں کہا ''اخ؟''

''اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے، سو رہے...''

ششلین جہاں بیٹھا تھا اسی جگہ فرش پر لمبا لمبا پسر گیا۔ فوما میرے پاس پیال پر لیٹا۔ تمام بستی سو رہی تھی۔ دور سے ریل کے انجنوں کی سیٹیاں اور ریل کے ڈبوں کو جوڑنے والی کڑیوں کی جھناجھن سنائی دے رہی تھیں۔ دوکان میں مختلف قسم کے خراٹوں کا ساز سنائی دے رہا تھا۔

مجھے مایوسی کا احساس تھا۔ میرا خیال تھا کہ کچھ بحث ہوگی سو وہ بالکل نہیں ہوئی۔

یکایک اوسپ نے آہستگی سے مگر صاف لہجے میں کہا:

''ساتھیو! ان باتوں کو دل پر بوجھ نہ بنانا۔ تم ابھی بچے ہو۔ تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہوئی

ہے۔ تم اپنے اپنے خیالات اکٹھے کر ر۔ اپنا ایک خیال دوسرے کے دو پر بھاری ہوتا ہے۔ فوما، کیا سو گئے؟''

''نہیں تو'' فوما نے بے دلی سے جواب دیا۔

''اچھا۔ تم دونوں ہی پڑھنا جانتے ہو۔ اس لئے پڑھو ضرور لیکن ان باتوں کو دماغ میں زیادہ جگہ نہ دو۔ یہ لوگ جو چاہتے ہیں وہ چھاپتے ہیں۔ یہ کام ان کے ہاتھ میں ہے!''

پھر اس نے تختے پر سے پاؤں لٹکائے اور تختے کے کناروں کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر ہم لوگوں کی طرف جھکا اور اپنی بات جاری رکھی:

''کتاب، کتاب آخر ہے کیا؟ لوگوں کو زندگی کی جھلک دکھانے کا ذریعہ! یہی ہے نہ کتاب کیا اہمیت کہ جیسے وہ کہتی ہو'دیکھو معمولی انسانی کس طرح کا ہوتا ہے، بڑھئی یا کوئی اور۔ اور دیکھو یہ رہے بڑے لوگ، شرفا۔ گویا شرفا باقی انسانوں سے، باقی لوگوں سے کوئی الگ چیز ہیں!'' کوئی بھی کتاب ہو وہ بغیر کسی مقصد کے نہیں لکھی جاتی۔ وہ ضرور کسی نہ کسی بات کا بچاؤ کرنے کے لئے لکھی جاتی ہے۔ کسی نہ کسی چیز کی طرف داری میں ہوتی ہے وہ...''

فوما بھاری آواز میں بولا:

''اس پیوتر نے ٹھیک کیا جو اس ٹھیکیدار کو مار ڈالا!''

''خیر یہ غلط ہے۔ کسی انسان کو مار ڈالنا کسی حالت میں کبھی بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم گریگوری کو پسند نہیں کرتے لیکن یہ خیال دل سے نکال ڈالو۔ ہم میں سے کوئی امیر نہیں ہے۔ آج ہم مالک ہیں تو کل پھر وہی بھولے بھالے مزدو ہیں...''

''میں آپ کے متعلق بات نہیں کر رہا ہوں، چچا اوسپ...''

''وہ ایک ہی بات ہے چاہے جس کے متعلق کرو...''

''آپ تو ایک بھلے مانس ہیں...''

''ٹھہرو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ کتاب کس بات سے متعلق ہے'' اوسپ نے فوما کے جھنجھلائے ہوئے الفاظ کو بیچ میں کاٹ دیا۔ ''دیا بڑی چالاکی سے لکھی ہوئی کتاب ہے! کسی جگہ شریف آدمی کا ذکر ہے تو دیہاتی کا نہیں ہے اور دیہاتی کا ہے تو شریف آدمی کا نہیں ہے۔ اس لئے تم خود دیکھ سکتے ہو کہ نہ تو

شریف آدمی کا ہی بھلا ہوتا ہے اور نہ دیہاتی کا۔ شریف آدمی کمزور اور بے کار ہو جاتا ہے اور ہر چیز سے اکتا جاتا ہے اور دیہاتی اپنے دل کی خلش کی بدولت شرابی اور اٹھائی گیرا ہو جاتا ہے۔ یہ بتاتی ہے اس کتاب کی کہانی! یہ سمجھاتی ہے کہ زمینداروں کا آسامی رہنا اس سے کہیں بہتر تھا۔ شریف آدمی کی پردہ پوشی دیہاتی کرتا تھا اور دیہاتی شریف آدمی کی آڑ لیتا تھا اور دونوں اطمینان سے پیٹ بھرتے اور ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتے تھے... یہ میں نہیں کہتا کہ زمینداروں کے تحت زندگی زیادہ پرسکون نہ تھی۔ دیہاتی غریب ہوں تو اس سے زمینداروں کو کیا فائدہ؟ بس وہ تو یہ چاہتے تھے کہ ان کا پیٹ بھر جائے لیکن دماغ خالی رہے! بھئی میں جو جانتا ہوں وہ کہتا ہوں کیونکہ میں نے کیا زمینداروں کی غلامی میں چالیس سال نہیں بتائے ہیں؟ کوڑوں نے مجھے بہت کچھ سبق پڑھایا ہے!''

مجھے یاد آیا کہ وہ ٹھیلے والا پیوتر جس نے اپنا گلا کاٹا تھا وہ بھی شریفوں اور زمینداروں کے متعلق اسی طرح بات کرتا تھا۔ اور مجھے اس خیال سے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی کہ اوسپ کے سوچنے کا طریقہ اس کمینے آدمی سے اس قدر ملتا جلتا تھا۔

اوسپ نے میرٹاٹونگ چھوٹی اور بات جاری رکھی:

''انسان کو چاہئے کہ کتابوں اور دوسری لکھی ہوئی چیزوں کے اصل مطلب کو بھانپ لے کیونکہ دنیا میں کوئی شخص چاہے کتنا ہی چھپانا چاہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بغیر مطلب کے کوئی کام نہیں کرتا۔ اور کتابیں لکھنے کا بھی ہوشیاری ہر کام میں استعمال ہوتی ہے میرے بھائی! کتابیں لکھنے سے لے کر لکڑیاں کاٹنے اور جوتے سینے تک میں...''

وہ بڑی دیر تک اس طرح باتیں کرتا رہا۔ وہ اپنے بستر پر چت لیٹ جاتا، کبھی کبھی اٹھ بیٹھتا اور اپنی ستھری گفتگو کے موتی پھینکتے ہوئے اندھیرے اور خاموشی میں بکھرنے لگتا۔

''کہا جاتا ہے کہ زمینداروں اور کسانوں میں بڑا فرق ہے۔ مگر یہ سچ بات نہیں ہے۔ ہم دونوں ایک ہی ہیں۔ صرف زمیندار ذرا اوپر ہے اور ہم ذرا نیچے۔ یہ صحیح ہے کہ شریف لوگ کتابوں سے عقل سیکھتے ہیں اور ہم اپنے زخموں سے! لیکن اگر ان لوگوں کی پیٹھ کوڑوں سے لال نہیں ہوتی تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کو عقل بھی زیادہ ہوتی ہے۔ نہیں نوجوانو، زندگی کا نیا راستہ ڈھونڈنا چاہئے۔ یہ کتابیں الگ کر دینی چاہئیں، پھینک دینی چاہئیں۔ ہر شخص اپنے دل سے پوچھے۔ میں کون ہوں، کیا ہوں؟ انسان۔ اور وہ کون

اور کیا ہے؟ پھر وہی انسان۔ پھر کیا ہو؟ کیا خدا کسی انسان سے کوئی خاص دولت مانگتا ہے؟ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے آگے ہم سب برابر ہیں ...ُ

آخر پو پھٹنے سے پہلے، جب کہ ستارے بجھ گئے تو اوسپ نے مجھ سے کہا ''دیکھا میں کیسی کیسی باتیں کر سکتا ہوں؟ دیکھو کیسی کیسی باتیں کہہ گیا جو کبھی سوچی بھی نہیں تھیں۔ لڑکو، میری باتوں پر کان نہ دھرنا۔ یہ تو میں نیند کی کمی سے بڑبڑا رہا ہوں۔ اس میں سنجیدگی نہیں ہے۔ لیٹے ہوئے ہو اور آنکھیں بند نہ ہوں تو طرح طرح کا خیال تو آئے گا ہی۔ بہت دنوں کی بات ہے: ایک تھا کوا۔ کھیت سے اڑا تو پہنچا پہاڑ کی چوٹی پر، اور بہت دنوں جیا، خدا نے پھر اس کو سزا دی۔ مرگیا کوا، سوکھ گیا کوا! اس کا مطلب کیا ہے؟۔ کیا مطلب نہیں۔ اچھا اچھا، اب سو جائیں۔ جلد ہی اٹھنا پڑے گا!...''

18

اس خلاصی یا کوف کی طرف اوسپ بھی میری نظروں میں اتنا بلند ہوا کہ باقی تمام لوگ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اوسپ کی بہت سی باتیں یا کوف سے ملتی جلتی تھیں لیکن ساتھ ہی اس میں میرے نانا ابا، اس کٹر مذہبی پیوتر واسیلی وچ اور باروچی سموری کی بھی جھنک آتی تھی۔ اور اگر چہ وہ مجھے ان سب کی یاد دلاتا تھا جن کے نقوش اس گہرائی سے میرے ذہن میں بیٹھے ہوئے تھے، پھر بھی اس کا اپنا نقش اس طرح میرے ذہن پر کھد گیا تھا جیسے پیتل کو تیزاب کھا لیتا ہے۔

یہ ظاہر تھا کہ اس کے سوچنے کے دو طریقے تھے: دن کو کام کرتے وقت لوگوں کے سامنے اس کی فکر کا سیدھا سادا طریقہ ایک عملی شکل اختیار کر لیتا تھا اور سمجھ میں زیادہ آسکتا تھا۔ لیکن رات کو، آرام کے وقت جب وہ سو نہ سکتا یا شام کو جب میں اور وہ ٹہلتے ہوئے شہر کی طرف، اس کی معشوقہ کے یہاں جایا کرتے (اس کی معشوقہ پوریاں بیچا کرتی تھی) اوسپ کے ہشت پہلو خیالات چمک اٹھتے تھے جیسے مشعل۔ لیکن یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کون سا پہلو سیدھا ہے یا ان میں سے کس حصے کو وہ خود پسند کرتا ہے۔

مجھے ایسا لگتا تھا کہ آج تک جتنے لوگوں سے میری ملاقات ہوئی تھی، وہ ان میں سب سے زیادہ ہوشیار اور سمجھدار تھا اور میں یوں اس کے چاروں طرف منڈلایا کرتا تھا۔ مجھے اس شخص کو جاننے اور سمجھنے کی بڑی خواہش تھی لیکن وہ ہر بار مجھے چرکا دے کر پھسل جاتا تھا۔ آخر اس کی جڑ، اس کی حقیقت کہاں تھی؟ اس

کی شخصیت کا کون سا حصہ تھا جسے میں حقیقی اور اصلی سمجھتا؟

مجھے اس کی کہی ہوئی بات بار بار یاد آتی:

''مجھے سمجھنے کے لئے اپنی کھوپڑی استعمال کرو۔ چلو، کرو کوشش!''

میری خودی کو ٹھیس لگی لیکن اس سے بھی زیادہ اہم ایک بات کھڑی ہوگئی کہ اب کسی نہ کسی طرح اس شخص کو سمجھنا ضرور تھا۔

اپنے تمام لا ابالی پن کے باوجود اس کی طبیعت میں بڑا ٹھیراؤ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر یہ شخص سو برس بھی اور زندہ رہ جائے تب بھی ایسا ہی رہے گا اور ان بدلتے ہوئے انسانوں کے درمیان وہی ایک انسان ہے جو کبھی نہ بدلے گا۔ کٹر مذہبی پیوتر واسیلی وچ کے متعلق بھی میرا یہی خیال تھا لیکن اس شخص کے بارے میں یہ سوچ کر کوفت سی ہوتی تھی۔ دراصل اوسپ کی مستقل مزاجی ایک اور قسم کی تھی، زیادہ خوشگوار۔

ذہن انسانی کا ڈھلمل پن مجھے برابر اپنی موجودگی کا احساس کراتا رہتا تھا۔ اور لوگ جو ایک انتہا سے دوسری انتہا پر فوراً قلانچ لگا جاتے تھے اس سے مجھے گھبراہٹ ہوتی تھی کیونکہ ان قلانچوں کا کوئی سبب، کوئی دلیل نہیں ملتی تھی اور میں ان کے متعلق سوچ سوچ کر حیران رہ جاتا تھا اور اب میں اس سوچ سے تھک گیا تھا۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے جو دلچسپی میں انسانوں سے رکھتا تھا اس پر اوس سی پڑ جاتی تھی، جو محبت میں انسانوں کے لئے اپنے دل میں رکھتا تھا وہ جھٹلا جاتی تھی، بے رنگ ہوکر پھیکی پڑ جاتی تھی۔

جولائی کا شروع زمانہ تھا کہ ایک دن ایک کھڑکھڑاتی ہوئی گھوڑا گاڑی لپکتی ہوی اس جگہ آپہونچی جہاں ہم لوگ کام کر رہے تھے۔ کوچبان کی سیٹ پر ایک داڑھی والا سائیس بیٹھا تھا، شراب کے نشے میں دھت، سر پر ٹوپی نہیں، ہونٹ سے خون رستا ہوا، ہچکیاں لیتا ہوا۔ پیچھے کی سیٹ پر گریگوری شِشلین شراب کے نشے میں مست، ایک موٹی سی سرخ گالوں والی لڑکی کے بازوؤں میں دبا جھوم رہا تھا۔ لڑکی کے سر پر تنکوں کی ہیٹ تھی جس میں سرخ سرخ ربن بندھے ہوئے تھے اور شیشے کے گوندنیوں کے گچھے سجے ہوئے تھے۔ ننگے پیروں پر ربر کے غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ وہ گاڑی کے ہچکولوں کے ساتھ جھوم رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک چھتری تھی جسے گھما گھما کر وہ ہنستی اور چیختی جارہی تھی:

''ایں بدمعاشو! ایں کمبختو! میلہ تو ابھی شروع ہوا نہیں۔ نہیں اور یہ لوگ مجھے میلے کے بہانے گھسیٹ

لائے!''

گریگوری صاحب کچلے ملے دلے، گاڑی میں سے باہر رینگے، زمین پر بیٹھ گئے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر ہم لوگوں کے سامنے اعلان کرنے لگے:

''لو، میں تم لوگوں کے سامنے دوزانو ہوا جاتا ہوں۔ میں بڑا گناہ کیا ہے! سوچ سمجھ کے گناہ کیا ہے! جان بوجھ کے کیا ہے! تو پھر میں بھگتوں گا ہی۔ لواب، یفی موشکا کہتا ہے۔ کہ گریگوری، اے گریگوری... وہ جو کچھ بھی کہے بجا ہے۔ پر تم مجھے معاف کر دو! تم سب کی دعوت کروں گا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے سچ کہتا ہے۔ زندگی ایک بار سے زیادہ کو نہیں ملتی نا...''

لڑکی زور زور سے قہقہہ لگا کے ہنستی جا رہی تھی اور اس طرح پاؤں پٹک رہی تھی کہ ربر کے غلاف پیروں میں سے اتر گئے۔ کوچوان چیخنے لگا؛

چلو... چلو!... میں گھوڑے کو کب تک پکڑے رہوں؟''

گھوڑا بڈھا، مریل پھوس بڑھیا کی طرح تھا، منہ سے جھاگ نکلتے ہوئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ زمین میں گڑ گیا ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ سارے کا سارا منظر بیحد مضحکہ خیز تھا۔ گریگوری کے نیچے کام کرنے والے مزدور اپنے مالک کی یہ ہیئت کذائی دیکھ کر اور اس کی اس شاندار معشوقہ کی زیارت کر کے اور اس بوکھلائے ہوئے دیوانے کوچوان کا جلوہ دیکھ کر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

صرف فوما ہی ایک ایسا آدمی تھا جو نہیں ہنسا۔ وہ میرے پاس دوکان کے دروازے پر کھڑا رہا اور بڑبڑاتا رہا:

''تو آخر کار اس سور نے لگا میں تڑا ہی لیں... گھر پر بیوی موجود ہے اور وہ بھی ایسی حسین!''

کوچوان برابر ان لوگوں سے کہے جا رہا تھا کہ گاڑی میں بیٹھ جائیں چنانچہ لڑکی نیچے اتری، گریگوری کو پھر گاڑی میں کھینچا۔ جہاں وہ اس کے قدموں میں لیٹ گیا اور اوندھا ہو پڑا۔ پھر لڑکی نے اپنی چھتری گھمائی اور چیخی ''لو، ہم لوگ چلے!''

مزدوروں نے اپنے مالک کے متعلق چند فقرے بڑے مزے میں کہے لیکن یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس پر رشک کر رہے ہیں۔ فوفا نے ایک آواز دی اور سارے مزدور پھر اپنے کام پر لگ گئے۔ غالباً فوما کو اس بات سے کوفت ہو رہی تھی کہ گریگوری اس طرح سب کے سامنے اپنے آپ کو الو بنا رہا ہے۔

فوما بڑبڑا کر بولا ''اس کو مالک کہتے ہیں۔ ایک مہینے میں ہم لوگ اپنا کام ختم کر کے گاؤں چلے ہی جاتے... اتنے دن نہیں رہا گیا اس سے...''

مجھ کو بھی گوگوری پر غصہ آ رہا تھا۔ شیشے کی گوندنیاں لگائے وہ لڑکی اس کے پہلو میں کھڑی نہایت ہی بے ہودہ لگ رہی تھی۔

اکثر مجھے اس بات پر تعجب ہوتا تھا کہ گریگوری شتشلین کیسے مالک ہو گیا اور فوما تچکوف کیسے اس کا ماتحت ہو گیا؟

فوما خوب تنومند آدمی تھا۔ گورا رنگ، گھنگھریالے بال، طوطے کی سی ناک، گول چہرے پر ذہین بھوری آنکھیں۔ وہ کسان یا دیہاتی بالکل نہیں معلوم ہوتی تھا۔ اگر اچھے کپڑے اس کو پہنا دئے جاتے تو شہر کے کسی اونچے خاندان کے سوداگر کا بیٹا لگتا۔ اس کی طبیعت فطرتاً اداس تھی۔ وہ بولتا کم تھا، بالکل کاروباری انداز میں۔ چونکہ اس کو پڑھنا لکھنا آتا تھا اس لئے وہ ٹھیکیدار کا حساب کتاب رکھتا اور خرچ کا تخمینہ اور بجٹ وغیرہ تیار کرتا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے کام لینے کی صلاحیت اس میں خوب تھی۔ لیکن خود اسے محنت کرنے سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

بڑے اطمینان سے کہتا ''اب ایک زندگی ملی ہے۔ اس میں ہر کام کوئی کہاں تک کرلے۔'' کتابوں کو حقارت سے دیکھتا ''ہر چیز چھپ جاتی ہے۔ کہو تو میں ہی کوئی کہانی بنا کر تمہیں سناؤں۔ اس میں ایسی کیا مشکل بات ہے۔''

البتہ جو کچھ بات چیت ہوتی رہتی اا س کو بڑے غور سے سنتا اور اگر کسی چیز سے اس کو دلچسپی محسوس ہوتی تو پھر اس کی ساری تفصیلیں دریافت کرتا، اپنے نتائج خود اخذ کرتا، اپنے پیمانے سے تمام باتوں کو ناپتا۔

ایک مرتبہ میں نے فوما سے کہا کہ اس کو ٹھیکیدار بننا چاہئے تو سستی سے بولا:

''ارے اب ہزاروں روبل کا کاروبار ہوتا تو کوئی ایسی بری بات بھی نہیں۔ لیکن ذرا سے منافع کے لئے جھوا بھر مزدوروں سے نپٹتے پھرو۔ یہ کونسی عقل کی بات ہے؟ نہیں بھائی، ہم تو دل بہلا رہے ہیں۔ پھر اور انکا چلے جائیں گے۔ خانقاہ میں۔ خوب لمبے چوڑے اور وجیہہ تو ہیں ہی، ہوسکتا ہے کہ کوئی امیری بیوہ ہم پر عاشق ہو جائے! ایسے واقعات ہوتے ہیں۔ سرگاچی کا ایک شخص تھا۔ دو سال کے عرصے میں اسے

ایک اچھا رشتہ مل گیا۔ اور وہ بھی شہر کے ایک اونچے شریف گھرانے کی ایک لڑکی کے ساتھ۔ وہ گھر گھر اورانسکا یا کنواری کی شبیہہ لیجایا کرتا تھا۔ بس وہیں اس لڑکی کی نظر پڑ گئی...''

اس کا یہ پلان تھا۔ بہت سی کہانیاں وہ سنے بیٹھا تھا کہ لوگوں نے خانقاہ کی امیدواری کر کے کسی طرح اپنے لئے آسانی سے روزی مہیا کرنے کی صورت نکال لی تھی۔ مجھے ایسی کہانیوں سے نفرت تھی اور اس بات سے کوفت ہوتی تھی کہ فوما اس طرح سوچتا تھا۔ لیکن یقین تھا کہ وہ خانقاہ میں ضرور داخل ہوگا۔

مگر جب میلہ شروع ہوگیا تو سب کو ہی اس بات پر حیرانی ہوئی کہ فوما ایک شراب خانے میں ویٹر ہو گیا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے ساتھیوں کو حیرانی ہوئی۔ مگر وہ اس کا مذاق اڑانے لگے۔ جب اتوار کو یا کسی اور چھٹی کو چائے پینے نکلتے تو ہنس کر ایک دوسرے سے کہتے:

''چلو یار، ذرا فوما کا کاروبار چالو کر دیا جائے!''

شراب خانے میں پہنچ کر شاہانہ انداز سے کہتے:

''اے ویٹر! ارے تم، گھنگھریالے بالوں والا ادھر آؤ!''

فوما ٹھڈی اونچی کئے آتا اور پوچھتا ''کیا چاہئے؟''

''پرانے دوستوں کو پہچانتے بھی نہیں ہو؟''

''میں بہت مصروف ہوں...''

اس نے تو یہ سمجھ ہی لیا تھا کہ اس کے ساتھی اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کو چھیڑنا چاہتے ہیں۔ اسکا چہرہ بالکل بے جان ہو جاتا تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ چہرہ بول رہا ہے: ''اچھا بس ہوا۔ مذاق اڑا رہے ہو؟ اچھا اڑاؤ۔''

''غالباً تم کو ٹپ بھی چاہئے ہوگی؟'' وہ کہتے اور بڑی شان سے بٹوے میں ہاتھ ڈال کر دیر تک ڈھونڈتے اور پھر اسے ایک کوپک دئے بغیر نکل جاتے۔

میں نے فوما سے پوچھا کہ جب اس نے راہب بننے کا پلان بنایا تھا تو ویٹر کیوں بن گیا؟

اس نے جواب دیا ''میرا کبھی راہب بننے کا پلان تھا ہی نہیں اور ویٹر بھی میں زیادہ عرصے تک نہیں رہوں گا...''

لیکن چار سال بعد تسارتیسین میں اس سے میری ملاقات ہوئی تو اس وقت بھی ایک شراب خانے

میں ویٹر ہی تھا۔ آخر کار میں نے اخباروں میں پڑھا کہ فوما تچکوف کو نقب لگانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔

مجھ پر خاص طور پر آردلیون کی داستان کا بڑا اثر پڑا جو پتھر کا مستری تھا۔ پیوتر کی ٹیم میں وہ سب سے پرانا اور بہترین کاریگر تھا۔ اس چالیس سالہ، ساہ داڑھی والے دیہاتی کو بھی دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا تھا کہ پیوتر کی بجائے وہ ٹیم کا مالک کیوں نہیں ہے؟ وہ کبھی کبھار ہی پیتا تھا اور شاذونادر ہی کبھی اسے نشہ چڑھتا تھا۔ اپنے فن میں بڑی مہارت رکھتا تھا اور شوق وذوق سے کام کرتا تھا۔ اینٹیں اس کے ہاتھوں سے یوں اڑتیں جیسے سرخ سرخ کبوتر پرواز کر رہے ہوں۔ اس کے سامنے بیمار اور مریل اور بے جان پیوتر کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ پیوتر اکثر کہا کرتا تھا:

''میں دوسروں کے لئے پختہ مکان بناتا ہوں تاکہ میرے لئے لکڑی کا ایک تابوت بن سکے...''

اور آردلیون اینٹیں جماتا ہوا بڑے شوق اور مزے سے پکارتا:

''آؤ، آؤ ساتھیو! لگاؤ ہاتھ، تعریف ہو خدا کی!''

اور پھر وہ ان کو بتاتا کہ موسم بہار میں وہ تومسک جانے والا ہے جہاں اس کے بہنوئی نے ایک گرجا بنانے کا ٹھیکہ لیا ہے اور اس کو فورمین کی جگہ پیش کرتا ہے۔

''سب طے ہو گیا ہے۔ گرجے بنانے کا کام مجھے بہت پسند ہے!'' پھر وہ میری طرف مڑ کر کہتا ''تو بھی چل میرے ساتھ! اگر انسان پڑھنا لکھنا جانے تو سائبیریا میں زندگی کافی آسان ہے۔ وہاں پڑھے لکھوں کا بھاؤ کافی اونچا ہے!''

میں اس کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا۔ آردلیون فتح مندی کے ساتھ چیخا:

''شاباش! مگر دیکھ سچ مچ چلنا۔ مذاق کی سہی نہیں!''

گریگوری اور پیوتر کی طرف اس کا رویہ شفقت اور طنز کا ہوتا تھا جیسے بزرگوں کو بچوں کے ساتھ، اور اوسپ سے کہتا:

''کمبخت کہیں کے! جو کچھ یہ سوچتے ہیں اپنی اپنی کھوپڑیوں میں وہ دوسروں کو دکھا دیتے ہیں، تاش کے پتوں کی طرح۔ ایک کہتا ہے ''دیکھو کتنا اچھا ہاتھ آیا ہے میرے پاس!'' تو دوسرا کہتا ہے ''ہاں وہ تو خیر ٹھیک ہے مگر ذرا میرے ترپ کے پتے تو دیکھو!''

''کیوں نہ کریں!'' اوسپ فلسفیانہ انداز میں جواب دیتا ''اترانا اور شیخی بگھارنا تو انسانی فطرت ہے۔ سب ہی عورتیں چھاتیاں تان کر چلتی ہیں...''

آردلیون قائل نہ ہوتا '' کہتے تو رہتے ہیں کہ خدا یہ اور خدا وہ لیکن جوڑتے رہتے ہیں پیسے!''

''مجھ سے تو یہ نہ کہو کہ گریگوری کچھ جوڑ رہا ہے۔''

''میں دوسرے کی بات کرتا ہوں۔ ایسا خدا کا بھگت ہے تو جنگل میں جا کر، بیابانوں میں جا کر کیوں نہیں خدا کو یاد کرتا۔ کیوں نہیں مراقبے میں بیٹھتا؟ بھائی ہم تو یہاں کی ہر بات سے عاجز آ گئے ہیں۔ بہار کا موسم آ جائے تو ہم تو سائبیریا چلے جائیں گے۔''

دوسرے مزدور اور مستری آردلیون پر رشک کرتے ہوئے کہتے:

''اگر ہمارا بھی کوئی ایسا لٹکنے کا سہارا ہوتا کوئی داماد ہوتا تو ہم کو بھی سائبیریا جاتے کوئی ڈر نہیں لگتا...''

پھر یکا یک ایک دن آردلیون غائب ہو گیا۔ ایک اتوار کو ٹیم سے نکلا اور پھر تین دن تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے اور اس پر کیا گذری۔

اپنے اپنے عقلی گدے سب لگا رہے تھے:

''شاید کسی نے اس کو ختم کر دیا ہو؟''

''شاید تیرنے گیا ہو اور ڈوب گیا ہو؟''

آخر یفی موشکا نے آ کر اعلان کیا ''اردلیون تو موج آرا رہا ہے۔''

''یہ جھوٹ ہے!'' پیوتر نے بے یقینی کے ساتھ کہا۔

''ارے نہیں سچ۔ موج اڑا رہا ہے پڑے ہوئے۔ اس طرح سلگ اٹھا جیسے کسی نے گھاس کے گٹھے کے بیچوں بیچ چنگاری پھینک دی ہو، جیسے اس کی پیاری بیوی مر ہی گئی ہو!''

''ارے وہ تو کب سے ہی رنڈوا ہے! پر ہے کہاں وہ؟''

پیوتر غصے میں بھرا آردلیون کو نجات دلانے چل کھڑا ہوا۔ لیکن آردلیون نے اس کے عوض میں پیوتر کی ہی ٹھکائی کر دی۔

تب اوسپ نے اپنے دانت بھینچے، جیبوں میں کس کر ہاتھ ڈالے اور اعلان کیا:

''میں خود جا کر دیکھتا ہوں یہ بات کیا ہے؟ وہ تو بھلا آدمی ہوا کرتا تھا...''

میں بھی اوسپ کے ساتھ ہولیا۔

چلتے چلتے اوسپ کہنے لگا ''اب یہ دیکھو ذرا۔ ایک آدمی اچھا خاصہ شرافت سے زندگی بسر کر رہا ہے اور پھر ایک دم سے اس کی دم اٹھ جاتی ہے اور جا پڑتا ہے گھور پر! میکسیچ، اپنی آنکھیں کھلی رکھو اور سبق سیکھو، عبرت حاصل کرو...''

ہم کناوینو کی رنگیلی بستی کے ایک سستے قحبہ خانے میں پہنچے۔ وہاں ہماری ملاقات ایک بڑھیا سے ہوئی جو صورت اول نمبر کی چوٹی معلوم ہوتی تھی۔ اوسپ نے اس کے کان میں کچھ کہا اور وہ ہم لوگوں کو ایک چھوٹے کمرے میں لے گئی جو اصطبل کی طرح گندہ اور اندھیرا تھا اور بالکل خالی تھا۔ صرف ایک پلنگ پر ایک موٹی سی عورت نیند میں کورٹیں بدل رہی تھی۔

بڑھیا نے اس کے پہلو میں ٹہوکا لگایا: ''نکل یہاں سے! سنتی ہے؟ نکل یہاں سے، مینڈکی!''

عورت ڈر کر اٹھ بیٹھی اور اپنا چہرہ سہلاتی ہوئی پوچھنے لگی:

''ارے میرے معبود! کیا ہے؟ کون ہے یہ؟''

''سی آئی ڈی آپہونچی ہے'' اوسپ نے سنجیدگی سے کہا۔ عورت نے ایک دم سے آہ بھری اور غائب ہوگئی۔ اوسپ نے زور سے تھوکا اور مجھے سمجھایا ''یہ لوگ شیطان سے بھی اتنا نہیں ڈرتیں جتنا سی آئی ڈی سے...''

بڑھیا نے ایک چھوٹا سا آئینہ اتارا جو دیوار پر لگا ہوا تھا اور دیواری کاغذ کو ذرا سا سرکایا اور اٹھاتے ہوئے بولی ''لو آؤ دیکھو، یہی ہے وہ؟''

اوسپ اس موکھے سے جھانکا۔

''ہاں ہاں۔ یہی ہے! اس عورت کو تو بھگاؤ۔''

میں نے بھی جھانک کر دیکھا: جس کمرے میں ہم داخل ہوئے تھے اسی طرح کا اجڑا سا کمرہ یہ بھی تھا۔ کھڑکی پر ایک لیمپ جل رہا تھا اور کھڑکی کے پٹ دونوں جکڑ بند تھے۔ کھڑکی کے پاس ایک بھینگی تاتاری لڑکی کھڑی تھی جو بالکل ننگی تھی۔ وہ اپنی قمیص سی رہی تھی۔ اس لڑکی کے پیچھے سے آردلیون کا پھولا ہوا چہرہ جھانک رہا تا۔ جو دو تکیوں پر سہارا لئے، بستر پر نظر آرہا تھا۔ کالی سخت داڑھی ہر طرف کو بکھری ہوئی تھی۔ تاتاری لڑکی چونک پڑی، قمیص پہن لی اور پلنگ کے پاس سے ہوتے ہوئے یکایک ہمارے کمرے

میں نمودار ہوگئی۔

اوسپ نے اس کی طرف دیکھ کر پھر تھوکا:

''تھو، بے حیا چھنال!''

''تم خود ہی احمق کھوسٹ''اس نے قہقہہ لگا کے جواب دیا۔

اوسپ بھی اس کو انگلی دکھا کر ہنسنے لگا۔

ہم لوگ اس تا تاری لڑکی کی کوٹھری میں گئے اور اوسپ آردلیون کے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔ بڑی دیر تک وہ اسے جگانے کی بیکار کوشش کرتا رہا۔ پر آردلیون بڑبڑاتا رہا:

''اچھا اچھا..ٹھیک ہے...چلیں گے، چلیں گے...ایک منٹ تو ٹھیرو...''

آخر کار وہ جگ پڑا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھ کو اور اوسپ کو گھورنے لگا۔ پھر اپنی سوجی ہوئی آنکھیں بند کر کے بولا:

''اچھا تو پھر؟''

اوسپ نے بڑے سکون اور اطمینان سے پوچھا''کیا بات ہوئی؟''اس کا لہجہ سپاٹ تھا مگر اس میں فہمائش نہ تھی۔

''کچھ نہیں۔ دماغ خراب ہوگیا''آردلیون نے ایک بھرائی ہوئی کھانسی کے ساتھ کہا۔

''لیکن یہ اچھا نہیں۔''

''ہاں مجھے معلوم ہے کہ برا ہوا۔''

آردلیون نے میز پر سے وادکا کی ایک کھلی ہوئی بوتل اٹھائی اور اسے حلق میں انڈیلنے لگا۔ پھر اوسپ کو پیش کی:

''لو، چاہئے تھوڑی سی؟ یہاں آخر کچھ خاطر تو ہونی چاہئے نہ تمہاری۔''

اوسپ نے ایک گھونٹ لیا، پھر منہ بنایا اور ایک روٹی کا ٹکڑا لے کر آہستہ آہستہ چبانے لگا۔ آردلیون کھینچ کھینچ کر اپنی بات کہتا رہا:

''دیکھو نا میرا اس تا تاری لڑکی سے تعلق ہوگیا ہے۔ یہ سب لیفی موشکا کی حرکت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تا تاری بنایا گیا تھا۔''

دیوار کے ادھر سے ٹوٹی پھوٹی زبان میں ترنگ بھرے الفاظ سنائی دے رہے تھے:

''تاتاری لڑکی خوب ہے! چوزہ ہے چوزہ! تو بھگا دو اس بڈھے کو... وہ تمہارا باپ تو نہیں۔''

آردلیون نے دیوار پر اکتائی ہوئی نظریں ڈالیں اور بڑبڑایا ''اسی لڑکی کا ذکر ہو رہا ہے۔''

''میں نے اس کو دیکھا ہے'' اوسپ نے جواب دیا۔

آردلیوں مجھ سے مخاطب ہوا:

''دیکھ بھائی، یہ کیا حرکت مجھ سے ہوئی...''

میں امید کر رہا تھا کہ اوسپ آردلیون کو ڈانٹے گا یا لیکچر دے گا اور وہ گنہگار پشیمان ہو کر منفعل ہو گا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ دونوں کے دونوں کندھے جوڑے بیٹھے رہے اور چھوٹے چھوٹے جملے ایک دوسرے سے کہتے رہے۔ اس گندی اندھیری کوٹھری میں ان دونوں کو دیکھ کر بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ تاراری لڑکی موکھے میں سے برابر ٹوٹی پھوٹی روسی زبان میں کچھ کچھ بولتی جا رہی تھی لیکن وہ دونوں اس کا نوٹس ہی نہیں لے رہے تھے۔ اوسپ نے میز پر سے ایک بھنی ہوئی خشک مچھلی اٹھائی اور اسے اپنے جوتے پر پٹخ کر اس کا چھلکا اتارنے لگا اور بولا:

''تمہارا روپیہ سب ختم ہو گیا نا؟''

''نہیں ابھی پیوتر پر کچھ باقی ہے....''

''پر تم تو جلد ہی تومسک جانے والے تھے۔ اب کس طرح اس انتظام کرو گے؟''

''ارے تومسک میں کیا رکھا ہے؟''

''کیوں، کیا ارادہ بدل دیا؟''

''اگر میرے رشتہ داروں کے بلانے کی بات نہ ہوتی تو....''

''کیا؟''

''وہ میری بہن اور بہنوئی....''

''ہاں تو پھر؟''

''ارے رشتہ داروں کے لئے کام کرنے میں کچھ لطف نہیں....''

''مگر اس میں کیا ہے؟ مالک تو مالک۔ چاہے اپنی رشتہ دار ہو چاہے نہ ہو۔''

''پھر بھی.....''

وہ دونوں اتنی سنجیدگی اور رفاقت سے بات کر رہے تھے کہ تاتاری لڑکی نے ان کو چھیڑنا بند کر دیا۔ وہ کمرے میں گئی اور خاموشی کے ساتھ کیل پر سے اپنا لباس اتار لیا اور دوسری کوٹھری میں گھس کے غائب ہو گئی۔

''ہے تو نوجوان اور کمسن ہی۔'' اوسپ بولا۔

آردلیون نے اسے غور سے دیکھا اور مزے میں جواب دیا ''یہ سب لیفی موشکا کی حرکت ہے۔ اس کو تو بس عورتوں کا ہی دھیان رہتا ہے... ویسے یہ تاتاری لڑکی بھی اچھی خوش مزاج ہے۔ ہر وقت حماقت کی باتیں کرتی رہتی ہے...''

''ذرا ہوشیار رہنا ورنہ ہمیشہ کو پھنسو گے'' اوسپ نے اسے خبردار کیا۔ پھر مچھلی کا آخری نوالہ چباتا ہوا وہ رخصت ہونے لگا۔

واپسی پر میں نے راستے میں اس سے کہا:

''آپ آخر آئے ہی کیوں تھے؟''

بس یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ میرا دوست ہے نا۔ میں ایسے بہت سے کیس جانتا ہوں۔ ایک انسان اچھی خاصر طرح سے زندگی بسر کرتا ہوتا ہے اور پھر اس طرح لگا میں تڑاتا ہے جیسے جیل خانے سے نکلا ہو۔ پھر اس نے دہرایا ''وادکا سے ہمیشہ دور رہنا!''

لیکن ایک منٹ بعد پھر بولا ''مگر اس کے بغیر ذرا کچھ بے کیفی سی رہتی ہے!''

''کیا وادکا کے بغیر؟''

''ہاں۔ اگر ایک گھونٹ پی لو تو عالم ہی اور نظر آتا ہے جیسے ایک اور ہی دنیا میں ہیں...''

آردلیون ہمیشہ کو پھنس گیا۔ اس وقت تو وہ چند دنوں بعد کام پر واپس آ گیا لیکن پھر جلد ہی غائب ہو گیا اور جب بہار کے موسم میں میری اس کی ملاقات ہوئی تو وہ کچھ اور اٹھائی گیروں کے ساتھ دریائی بجروں کو آس پاس سے برف کھودنے کا کام کر رہا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے س مل کر بہت خوش ہوئے اور ایک شراب خانے میں چائے پینے گئے۔

وہ چائے پیتے پیتے اترا کر کہنے لگا:

''یاد ہے میں کیسا زبردست کاریگر ہوا کرتا تھا؟ اس سے انکار نہیں ہوسکتا۔ اپنے کام میں جادوگر تھا جادوگر! اگر چاہتا تو سینکڑوں روبل کما سکتا...''

''مگر آپ نے کمائے تو نہیں۔''

وہ بڑے فخر سے بولا ''ہاں ہاں، بے شک نہیں کمائے۔ ایسی کی تیسی نوکری کی۔''

وہ کچھ اس طرح تن تن کر شیخی بگھار رہا تھا کہ شراب خانے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی توجہ اس کی طرف ہو جائے۔

''یاد ہے وہ پیوتر جو تھا۔ چپ چور۔ تو وہ کیا کہا کرتا تھا کام اور مزدوری کے بارے میں؟ کہ ہم دوسروں کے لئے اینٹوں کے گھر بناتے ہیں اور اپنے لئے لکڑی کا تابوت۔ تو یہ بات ہے۔ یہ ہے آپ کی نوکری!''

میں نے جواب دیا:

''پیوتر کی اور بات ہے۔ وہ جنم کا روگی ہے، اسے تو ہر وقت موت کا خیال آ کر ستایا کرتا ہے۔''

''میں بھی مریض ہوں!'' آردلیون چیخا ''کون جانے، میری روح بیمار ہو!''

اتوار کے دن میں اکثر شہر کے مرکز سے نکل کر ''لکھ پتیوں کی گلی'' میں پہنچ جایا کرتا تھا۔

اس گلی میں شہدے اور اٹھائی گیرے رہتے تھے۔ مجھے صاف دکھائی دیا کہ آردلیون بڑی تیزی سے ان لوگوں کی صف میں شامل ہوتا جا رہا ہے۔ ابھی ایک ہی سال پیشتر وہ سنجیدہ مزاج، خوش باش کاریگر تھا۔ اب اس کے طور طریقے بڑے ہی بازارو ہو گئے تھے۔ جھوم جھوم کر اکڑ کر چلتا تھا، آنکھوں میں ایسی سرکشی کی چمک آ گئی تھی جیسے ہر ایک کو لڑائی جھگڑے کے لئے خواہ مخواہ ہی چیلنج کر رہا ہے۔ اترا کے کہتا:

''دیکھو یہاں لوگ کیسا میری بات مانتے ہیں۔ میں اس محلے میں سردار کی طرح ہوں۔''

جو کچھ پیسے وہ کماتا وہ دل کھول کے خرچ کرتا۔ خوب سب اچکوں کی دعوت کرتا اور جو ہارتے انکی طرفداری میں لڑائیاں مول لیتا۔ اکثر چیختا سنائی دیتا:

''بھائیو، یہ بے انصافی ہے! ساتھیو، تم لوگوں کو انصاف سے کام لینا چاہئے!''

چنانچہ ان لوگوں نے اس کا نام ہی منصف صاحب رکھ دیا تھا۔

وہ پرانی اور گندی گلی ایک پتھر کے بورے کی طرح لگتی تھی جس میں یہ سب بھر دئے گئے تھے۔ مجھے

بڑی خواہش تھی کہ ان لوگوں کو سمجھ سکوں۔ ان میں سب ہی لوگ ایسے تھے جو زندگی کے اصل دھارے سے بچھڑ گئے تھے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے اپنی ایک الگ دنیا بنالی تھی۔ رنگین اور بانکی دنیا اور تمام مالکوں سے وہ بالکل الگ تھے۔ یہ لوگ آزاد منش تھے اور بے باک تھے اور ان کو دیکھ کر مجھے نانا ابا کی ان کہانیوں کا خیال آجاتا تھا جو والگا کے کشتی کھینچنے والوں کے متعلق ہوتی تھیں، جو بڑی آسانی سے ڈاکو یا درویش بن جاتے تھے۔ جب یہ لوگ بے روزگار ہوتے تو بجروں یا اسٹیمروں پر سے چھوٹی چھوٹی چوریاں کرنے سے نہ چوکتے۔ لیکن مجھے ان باتوں سے کوئی دھکا نہ لگتا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ قسم قسم کی چوریاں زندگی میں جگہ جگہ اس طرح پیوند ہوگئی ہیں جیسے کسی نے پرانے کوٹ میں جابجا سرمئی دھاگے سے رفو کر دیا ہو۔ خاص خاص موقعوں پر مجھے یہ بھی نظر آتا تھا کہ مثلاً آگ بجھانا ہے یا دریا سے برف بہتی ہے یا کہیں جلدی سامان کی لدائی کرنی ہے۔ تو یہ لوگ غضب کا جوش وخروش اور قربانیاں دکھاتے تھے اور اپنی قوت بھر کچھ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اوروں کے مقابلے میں ان کی زندگی میں جان اور تڑپ بھی زیادہ تھی۔

جب اوسپ نے میری اور آردلیون کی دوستی دیکھی تو مجھ سے پدارانہ شفقت کے ساتھ بولا:

''سن بیٹے! یہ تو ''لکھ پتیوں والی گلی'' کے لوگوں کے ساتھ ذرا زیادہ خلا ملا کرتا جارہا ہے۔ ذرا ہشیار رہنا، کہیں تجھے نقصان نہ پہونچادیں یہ لوگ۔''

مجھ سے جتنا بھی ہوسکتا، میں نے کوشش کی کہ ان لوگوں میں جو بات مجھے سب سے زیادہ پسند آتی تھی وہ اوسپ کو سمجھادوں۔ کہ ان سب کا آزاد رہنا اور مزدوری اور کام کے جھمیلے میں نہ پڑنا مجھے اچھا لگتا تھا۔

''ہوں، تو گویا جانوروں کی طرح آزاد۔ پرندوں کی طرح چھٹے ہوئے!'' اس نے ہنس کر میری بات کاٹی۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ یہ سب کے سب کاہل الوجود ہیں اور محنت کرنے کو سزا سمجھتے ہیں!''

''لیکن محنت میں لطف لیتا بھی کون ہے؟'' میں نے کہا ''مثل مشہور ہے کہ محنت سے اور ایمانداری سے تو آج تک کسی نے اپنے لئے محل بنایا نہیں۔''

میں نے مثل دوہرادی کیونکہ مجھے یہ مثل اچھی اور سچی معلوم ہوتی تھی۔ اکثر اس کو سنا بھی تھا۔ لیکن اوسپ کو غصہ آگیا، چیخ کر بولا:

''کون ایسی بات کہتا ہے؟ یا تو احمق کہتے ہیں یا کوڑھی کہتے ہیں۔ اور تو نے اگر ان باتوں کو سنا، ان

پر کان دھرا، کتے کے پلے، تو پھر دیکھنا! جن سے کچھ کرتے دھرتے بن نہیں پڑتا ہے اس طرح کی گدھے پن کی بات کر سکتے ہیں۔ اگر اڑنا چاہتا ہے تو پھر پر تو نکل آنے دے۔ اور اس دوستی کا جہاں تک تعلق ہے میں تیرے مالک سے تیری رپورٹ کرتا ہوں۔ پھر تو ہی جاننا۔ برا نہ ماننا۔''

چنانچہ اس نے میرے مالک سے کہہ ہی دیا۔ اور میرے مالک اس کی موجودگی میں بولے:

''پیشکوف، اس ''لکھ پتیوں کی گلی'' کو چھوڑ دو! اس گلی میں صرف چوراچکوں اور رنڈیوں کا ٹھکانہ اور گذر ہے۔ اور اس گلی سے سیدھا رستہ یا تو جیلخانے کی طرف جاتا ہے یا ہسپتال کو۔ چھوڑ دو ان کا ساتھ۔''

اب میں نے یہ کیا کہ ان لوگوں سے اپنا اس گلی میں آنا جانا چھپانا شروع کیا۔ لیکن جلدی ہی ایسا ہوا کہ آخر مجھے اس گلی سے قطع تعلق کرنا ہی پڑا۔

ہوا یوں کہ ایک دن آردلیون، میں اور اس کا ایک ساتھ رابیونک ایک مسافرخانے کے احاطے میں سائبان کی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ رابیونک ہم لوگوں کو ایک دلچسپ بیان سنا رہا تھا کہ کس طرح وہ دریائے دون والے راستوف سے ہو کر پیدل ماسکو گیا تھا۔ وہ پرانا سپاہی تھا جس نے انجنیرنگ دستے میں خدمات انجام دی تھیں اور سینٹ جارج کا تمغہ حاصل کیا تھا۔ ترکی جنگل میں اس کے گھٹنے پر ضرب لگی تھی جس سے وہ عمر بھر کے لئے لنگڑا ہو گیا تھا۔ وہ چھوٹا سا اور گھٹیلا تھا اور اس کے ہاتھوں میں غضب کی طاقت تھی۔ ایسی طاقت جسے اپنے آپ کو ظاہر کرنے کا کوئی موقع ہی نہ ملتا تھا کیونکہ لنگڑے ہونے کی وجہ سے وہ کوئی محنت کرنے سے معذور تھا۔ کسی جلدی بیماری کی وجہ سے اس کے بال اور داڑھی جھڑ گئی تھی اور اس کا سر نوزائیدہ بچوں کی طرح منڈا ہوا لگتا تھا۔

اپنی عنبریں آنکھیں چمکا چمکا کے وہ کہتا جا رہا تھا:

''تو چنانچہ میں شہر سرپرخوف پہنچا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ایک پادری اپنے پائیں باغ میں بیٹھا ہے۔ تو مین اس کے پاس گیا اور کہا ''جناب عالی آپ ترکی جنگ کے ہیرو کے لئے ایک ٹکڑا دے سکتے ہیں؟''

آردلیون نے سر ہلایا:

''افوہ، کس قدر جھوٹا! کس قدر جھوٹا!''

رابیونک برا نہیں مانا ''کیوں جناب، جھوٹ کیوں آخر؟''

لیکن آردلیون برابر اسے فہمائشی لہجے میں سمجھاتا رہا:

''ارے کبھی تو قاعدے کی بات کیا کر! اگر چوکیدار کی جگہ ملے کرلے۔ لنگڑے یہی تو کیا کرتے ہیں۔ مگر نہیں۔ ادھر سے ادھر مارا پھرے گا اور بس جھوٹ کے پل کھڑے کیا کرے گا''...

''ارے یہ تو میں یوں ہی کہتا ہوں، ذرا لطف لینے کے لئے کہ تم لوگوں کو ذرا ہنسی آجائے، اس لئے''...

''تم کو تو اپنے آپ پر ہنسنا چاہئے۔''

پھر یکا یک اس احاطے میں جو چمکدار موسم کے باوجود اندھیرا اور میلا لگتا تھا، ایک عورت داخل ہوئی اور اپنے سر پر سے کوئی کپڑا گھماتی ہوئی چیخی:

''اے لڑکیو! کوئی لہنگا خریدتا ہے؟ سایہ مول لیتا ہے کوئی؟''

تہہ خانوں کی دراڑوں، موکھوں اور کھنڈروں سے عورتیں جھانکنے لگیں اور رینگتی ہوئی نکل آئیں اور بیچنے والی کو گھیر کر کھڑی ہوگئیں۔ میں نے ایک دم سے اس عورت کو پہچان لیا۔ وہ نتالیا تھی۔ نتالیا دھوبن!

جب تک کہ میں چھت سے کودوں اس نے پہلی ہی قیمت لگانے والی کے ہاتھ وہ اسکرٹ بیچ دیا اور احاطے سے باہر نکل رہی تھی کہ میں پہنچا۔ پھاٹک کے پاس میں نے اس کو جالیا اور بڑی خوشی سے چلایا:

''ھلو!''

اس نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا ''کیا بس اتنا ہی کہنے کو ہے تمہیں؟'' پھر اچانک رک گئی، غور سے مجھے دیکھا اور بگڑ کر بولی:

''اے میرے معبود! یہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

میں اس کی اس خوفزدہ چیخ سے گھبرا گیا اور دل پر چوٹ سی لگی۔ نتالیا کے ذہین چہرے پر خوف اور تعجب صاف لکھے ہوئے نظر آرہے تھے اور میں بھی سمجھ گیا کہ وہ میرے متعلق پریشان ہے کہ میں اس گلی میں کہاں۔ میں نے جلدی جلدی اس کو سمجھایا کہ میں یہاں رہتا نہیں ہوں، صرف کبھی کبھار یوں ہی سیر کو آجاتا ہوں۔

اس نے میرا منہ چڑایا ''سیر کو! کہاں کرتے ہو سیر؟ لوگوں کی جیبوں میں اور عورتوں کی چولیوں میں؟ کیوں، ہے نا؟''

اس کا چہرہ ستا ہوا لگ رہا تھا۔ ہونٹ بے جان سے تھے اور آنکھوں کے نیچے سیاہ سیاہ حلقے تھے۔

شراب خانے کے دروازے پر وہ رکی:

''آؤ ایک گلاس چائے پی لیں۔ ویسے تمہارے کپڑے سفید پوشوں کے سے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی طرح نہیں۔ لیکن مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں آتا...''

ہم لوگ اندر جا کر بیٹھے تو اس کو مجھ پر کسی قدر اعتماد ہونے لگا۔ چائے انڈیلتے ہوئے وہ مجھے اکتاہٹ کے ساتھ بتانے لگی کہ وہ ابھی ایک گھنٹے پہلے ہی سو کر اٹھی ہے اور ابھی تک اس نے کچھ کھایا نہیں ہے۔

''کل رات میں سوئی تو نشے میں ایسی دھت تھی کہ جیسے کوئی کوچوان ہو۔ لیکن مجھے یہ یاد نہیں کہ میں نے کہاں پی اور کس کے ساتھ پی۔''

مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ اس کی موجودگی سے گھبراہٹ بھی محسوس ہوئی اور بہت دل چاہا کہ اس کی لڑکی کے متعلق پوچھوں۔

جب وہ تھوڑی سی چائے اور وادکا پی چکی تو اپنے مانوس تیز تیز لہجے میں اسی گنوارپن سے بات کرنے لگی جو اس گلی کی رہنے والی عورتوں کی خصوصیت تھی۔ لیکن جب میں نے اس کی لڑکی کے متعلق پوچھا تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور چیخنے لگی:

''ارے کیوں پوچھتے ہو؟ نہیں میرے بچے تم زندگی بھر تک میری بیٹی کے آس پاس نہیں پھٹک سکتے۔ عمر بھر اس کے قریب نہیں پہونچ سکتے!''

ایک گھونٹ وادکا پی کر اس نے اپنی بات جاری رکھی:

''میری بیٹی کو اب مجھ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میری ہستی ہی کیا؟ ایک دھوبن ہی تو۔ بھلا میں اس جیسوں کے لئے کس طرح ماں بن سکتی ہوں؟ وہ پڑھی لکھی ہے، تعلیم یافتہ ہے۔ یہ بات ہے بھائی! اس نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور اپنی ایک مالدار سہیلی کے ساتھ چلی گئی ہے، ایک امیر لڑکی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ غالباً گورنس بننے کے واسطے۔ لگتا ایسا ہی ہے...''

پھر ذرا رک کر آہستہ سے پوچھا ''دھوبن کو کون پوچھے؟ رنڈی کی تو پھر بھی پوچھ ہے۔''

یہ مجھے فوراً ہی نظر آ گیا تھا کہ وہ خود بھی سڑک پر ٹہلنے والی رنڈی بن چکی ہے۔ اس گلی کی تقریباً سب

ہی عورتیں یہی پیشہ کرتی تھیں۔ لیکن... لیکن خود اس کے منہ سے اپنے آپ کو رنڈی کہتے سن کر مجھے ایسا دھکا لگا کہ شرم اور دکھ سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس حقیقت سے کہ نتالیا اس بات کو خود تسلیم کر رہی تھی، خاص طور پر دل پر جیسے اچانک گھونسہ لگا۔ نتالیا، جو ابھی حال ہی میں ایسی بہادر، سمجھدار اور آزاد طبیعت عورت نظر آتی تھی!

اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر میری طرف دیکھا:

''احمق کے بچے، اس گلی سے نکل جا! اور میں تجھ سے کہتی ہوں، تیرے ہاتھ جوڑتی ہوں، پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا ورنہ تباہ ہو جائے گا۔ تباہ!''

پھر وہ میز پر جھکی اور چائے کی کشتی میں انگلیوں سے کچھ نشانات کھینچنے لگی، ساتھ ہی آہستہ آہستہ اور بکھرے الفاظ میں بولتی جاتی تھی جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو:

''لیکن تم کو میری صلاح کی کیوں پرواہ ہو گی؟ اگر میری اپنی بیٹی میری بات نہیں سنتی تو پھر کیا؟ میں اس سے کہتی ہوں کہ بیٹی، تو اپنی ماں کا ساتھ نہ چھوڑ۔ کیسے چھوڑ دے گی؟ لیکن وہ کہتی ہے ''اچھا تو پھر میں خودکشی کر لوں گی۔'' چنانچہ وہ قازان چلی گئی۔ دائی کا کام سیکھنا چاہتی تھی۔ ٹھیک ہے... خوش رہے... لیکن میرا کیا ہو؟ اب دیکھو یہ حال ہے میرا... کس کی طرف دیکھوں؟ یہ گلی میں جو مرد ہیں ان کی طرف؟''

وہ خیالات میں کھوئی ہوئی چپ بیٹھی، اپنے لب ہلاتی رہی جیسے میں تو وہاں موجود ہی نہ تھا۔ اس کے لبوں کے کونے ڈھل گئے جس سے اس کا دھانہ ہلال کی طرح دکھائی دینے لگا۔ اور اس کے لبوں کی کپکپاہٹ اور جھریوں کی تھرتھراہٹ دیکھ کر سخت کوفت ہوتی تھی جیسے وہ کوئی خاموش پیغام سنا رہے ہوں۔ اس کے چہرے پر بچپن تھا اور اس بچپن کے بھولے پن میں دکھ کے آثار کھلے ہوئے تھے۔ بالوں کی ایک لٹ سر پر بندھی ہوئی شال میں سے نکل کر گال پر لٹک آئی تھی اور ننھے سے کان سے لپٹی جا رہی تھی۔ آنسو کا ایک قطرہ چائے کے گلاس میں گرا جو رکھے رکھے ٹھنڈا ہوا چکا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے چائے کا گلاس ہٹا دیا اور اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں۔ دو آنسو اور نکل آئے، پھر شال سے منہ پونچھا۔

اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا کہ اس کے پاس بیٹھوں۔ چپ چاپ اٹھ کھڑا ہوا۔

''خدا حافظ!''

''ہیں؟ دفان ہو! جاؤ شیطان کے حوالے!'' اس نے میری طرف دیکھے بغیر ہاتھ ہلا کر کہا۔ غالباً

اس کے ذہن سے اتر چکا تھا کہ میں کون ہوں۔

میں آردلیون کو تلاش کرتا ہوا احاطے میں واپس ہوا کیونکہ میں اور وہ مچھلی کا شکار کھیلنے جانے والے تھے۔ میرا یہ بھی دل چاہ رہا تھا۔ کہ اس کو نتالیا کے بارے میں بتا دوں لیکن وہ اور رابیونک چھت پر ملے ہی نہیں۔ میں مکانوں وغیرہ سے اٹے ہوئے احاطے میں ان دونوں کو ادھر ادھر ڈھونڈتا پھر رہا تھا کہ جھگڑے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایسے جھگڑے اس گلی میں ہر وقت ہی ہوا کرتے تھے۔

میں پھاٹک سے باہر نکلا تو نتالیا سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ وہ فٹ پاتھ پر لڑکھڑاتی اندھا دھند چلی جا رہی تھی۔ سوں سوں کرتی سسکیاں بھرتی، ایک ہاتھ سے وہ شال سے اپنا زخمی چہرہ پونچھ رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے الجھے ہوئے بالوں کو پیچھے کی طرف کھسکا رہی تھی۔ رابیونک اور آردلیون اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ رابیونک کہہ رہا تھا:

''آؤ، آؤ! پھر دیں سالی کو، آؤ!''

آردلیون دوڑا اور نتالیا کو مکا دکھانے لگا۔ وہ ایک دم سے پھرکی کی طرح گھوم گئی، چہرہ بگڑا ہوا تھا، آنکھوں میں نفرت کے شعلے لپک رہے تھے۔ وہ چیخی:

''ہاں ہاں آؤ، مارو مجھے!''

میں نے لپک کر آردلیون کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا:

''یہ تمہیں کیا ہوا؟''

''خبردار جو اس کو ہاتھ لگایا'' دکھ کے احساس سے میری سانس گھٹی جا رہی تھی۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

''تمہاری کیا لگتی ہے وہ؟ داشتہ؟ ہت تیری نتالیا کی، گندی! اس پادری کو بھی خراب کر دیا!''

رابیونک بھی رانوں پر ہاتھ مار مار کر کھی کھی کرنے لگا۔ پھر دونوں مل کر مجھ پر فقرے کسنے لگے۔ لیکن اس سب میں نتالیا کو نکل لینے کی مہلت مل گئی۔ جب بات میری برداشت سے باہر ہو گئی تو میں نے رابیونک کے سینے پر سر دے مارا اور اس کو گرا کر بھاگ نکلا۔

اس واقعے کے کافی عرصے بعد تک میں ''لکھ پتیوں کی گلی'' سے بالکل علیحدہ رہا۔ لیکن ایک بار پرھ دریا پر، کشتی میں، آردلیون سے ملاقات ہوئی۔ وہ خوش ہو کر بولا ''ھلو، تم کو کیا ہو گیا تھا؟ اور تم رہے

کہاں؟''

جب میں نے اس سے کہا کہ اس نے ستالیا کو جس طرح مارا تھا اور میری جس طرح ہتک کی تھی اس سے میں ناراض تھا تو وہ پھر مذاقیہ ہنسی ہنس کر بولا:

''تو تم سمجھے کہ دراصل ہم دونوں کا یہ مطلب تھا؟ ہم تو تمہیں دل لگی کے لئے چھیڑ رہے تھے۔ اور ستالیا جو ہے تو اس کو بھلا ہم کیوں نہ پیٹیں؟ وہ رنڈی تو ہے ہی آخر! اگر انسان اپنی بیوی کو مار سکتا ہے تو ایسی رنڈیوں کو چھوڑ دینا کیا بات ہوئی بھلا! یہ محض بکواس ہے۔ اس بات کو تو میں بھی خوب جانتا ہوں کہ مکوں سے اور مار سے کسی کو کچھ نہیں سکھایا جا سکتا!''

''لیکن آپ اس کو کیا سکھا سکتے ہیں؟ آپ کیا اس سے کچھ بہتر ہیں؟''

آردلیون نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور مذاق کے انداز میں خرخرا کے بولا:

''یہی تو بات ہے کہ اس دنیا میں کوئی کسی سے بہتر نہیں... مجھے سب نظر آتا ہے میرے بھائی! سب کچھ! ظاہر بھی اور باطن بھی! میں کوئی تمہارا دیہاتی بھولا نہیں ہوں...''

وہ اس وقت شراب کے سرور میں تھا اور اس طرح میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے کوئی شفیق استاد کسی غبی شاگرد پر ترس کھا رہا ہو۔

...کبھی کبھی میری ملاقات پاویل اودینتسوف سے بھی ہوتی۔ اب وہ بانکوں کے سے کپڑے پہنتا تھا، میری طرف ایسا رویہ رکھتا تھا جیسے بڑی خاکساری برت رہا ہے اور اس پر وہی خوش باشی کا عالم چھایا رہتا تھا۔

ہمیشہ مجھے ملامت کرتے ہوئے کہتا ''یہ تم نے ایسی نوکری کیوں کر لی، مارے جاؤ گے۔ ان دیہاتیوں کے ساتھ کام کر کے کہاں پہونچو گے تم؟''

پھر بڑے افسوس کے ساتھ اپنی دوکان کے حالات بتانے لگا:

''ژیخاریف ابھی تک اس گائے کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اور سیتانوف معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص فکر میں گھلا جا رہا ہے۔ حد سے زیادہ پینے لگا ہے۔ گوگولیف کو بھیڑیئے کھا گئے! ایسٹر کے آخری ہفتے میں وہ گھر گیا تھا۔ وہاں خوب پی کے جنگل کو نکل گیا۔ بس بھیڑیئے اس کو چٹ کر گئے!'' پھر سوچتے سوچتے پاویل زور زور سے ہنسنے لگا:

’’بھیڑیوں نے جو اس کو چٹ کیا نا تو خود بھی نشے میں دھت ہو گئے اور اپنے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر جنگل میں ٹہلتے پھرے سرکس کے کتوں کی طرح چیختے پھرے، دوسرے ہی دن وہ بھیڑیے سب مرے پڑے تھے۔‘‘

میں بھی یہ سن کر ہنسنے لگا۔لیکن دل کی گہرائیوں میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ وہ دوکان اور اس دوکان میں جو کچھ بھی مجھے عزیز تھا، وہ اب میرے لئے قصہ پارینہ بن گیا ہے۔ یہ بات افسوسناک تھی۔

19

جاڑوں کے زمانے میں میلے کے میدانوں میں تقریباً کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ میں گھر پر وہی پرانے کام کرتا تھا۔ ان میں پورا ہی دن گزر جایا کرتا تھا۔لیکن شامیں خالی ہوتی تھیں اور سارا گھر اکٹھا ہو جاتا تھا تو میں ’’نیوا‘‘ اور ’’ماسکو نامہ‘‘ میں سے ناول پڑھ کر ان لوگوں کو سنایا کرتا۔ یہ کام مجھے ناپسند تھا۔ رات کو میں اچھی اچھی کتابیں پڑھتا اور شعر کہنے کی کوشش کرتا۔

ایک دن عورتیں رات کی عبادت کے لئے گرجا گھر گئی ہوئی تھیں اور مالک کی طبیعت کچھ اچھی نہیں تھی اس لئے وہ گھر پر اکیلے رہ گئے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے:

’’پیشکوف، یہ وکٹر تمہارا مذاق اڑاتا ہے اور کہتا ہے تم شعر کہتے ہو۔ یہ بات ٹھیک ہے؟ آؤ سنیں، تم کیا کہتے ہو!‘‘

میں نے سوچا کہ انکار کرنا ذرا ویسی بات ہے۔ چنانچہ میں نے ان کو اپنی کچھ نظمیں سنائیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ان کو پسند نہیں آئیں لیکن پھر بھی وہ کہنے لگے:

’’جاری رکھو، جاری رکھو۔ممکن ہے تم دوسرے پوشکن بن جاؤ۔کبھی پوشکن کا کلام پڑھا ہے؟‘‘

کیا چڑیلوں کی شادیاں ہوتی بھی ہیں
کیا بونوں کو بھی موت آجاتی ہے۔

’’اس کے زمانے میں لوگ بونوں کو مانتے تھے۔لیکن وہ خود تو نہیں مانتا ہوگا۔ اس نے محض مذاق کیا ہوگا۔ ہاں بھائی‘‘ اس نے سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا ’’تم کو تو باقاعدہ تعلیم ملنی چاہئے تھی لیکن اب تو وقت نکل گیا! شیطان ہی جانے تم دنیا میں کیا کرو گے...اپنی یہ بیاض عورتوں سے چھپائے رکھنا ورنہ تمہارا مذاق

اڑائیں گی...عورتوں کو زخم کریدنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔دکھتی رگ کو چھیڑتی ہیں ہمیشہ۔''

ادھر کچھ دنوں سے میرے مالک نہایت خاموش رہنے لگے تھے۔فکر میں غرق، اکثر گھبرائی گھبرائی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے اور جب دروازے کی گھنٹی بجتی تو اچھل پڑتے، ذرا ذرا سی باتوں پر مریضوں کی طرح چڑھتے، ہر ایک پر بگڑتے، چیختے، گھر سے باہر نکل جاتے اور رات کو جب بڑی دیر سے لوٹتے تو نشے میں دھت ہوتے تھے... یہ بالکل ظاہر تھا کہ ان کی زندگی میں کوئی بات ہوئی ضرور ہے جو ان کے سوا اور کسی کو معلوم نہیں۔ ہے کوئی ایسی چیز جس نے ان کی روح کو اس طرح کچل کر رکھ دیا ہے کہ وہ زندگی میں اعتماد اور دلچسپی کھو بیٹھے ہیں اور اب زندگی محض عادتاً بسر ہوئی چلی جا رہی ہے۔

اتوار کو دوپہر کے کھانے کے بعد میں پیدل سیر کے لئے نکل جاتا اور شام کو نو بجے کے بعد مین یا مسکا یا گلی کے شراب خانے پہنچتا۔

اس شراب خانے کا مالک ایک گول مٹول آدمی تھا جسے پسینہ بہت آتا رہتا تھا۔اس گانا سننے کا جنون تھا۔آس پاس کے گرجوں کے تمام گانے والے یہ جانتے تھے اور وہاں اکٹھے رہتے۔ وہ ان لوگوں کو بیئر، وادکا اور چائے پلا کر گانا سنا کرتا۔ گرجوں کے یہ گانے والے نہایت ہی شرابی اور بے جان لوگ ہوتے ہیں۔ وہ بڑی بے دلی سے گاتے ہیں اور صرف دعوت کی خاطر گاتے ہیں۔ان کا گانا بھی صرف گرجوں کی مذہبی موسیقی تک ہی محدود ہوتا ہے۔اور چونکہ مذہبی اور پرہیز گار لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ شراب خانہ ایسے گیت گانے کی جگہ نہیں، اس لئے شراب خانے کا مالک ان لوگوں کو اپنے کمرے میں بلاتا تھا اور میں صرف کیواڑ سے کان لگا کر ہی سن سکتا تھا۔لیکن شراب خانے میں دیہات سے آئے ہوئے کسان اور کاریگر بھی اپنا اپنا کمال دکھاتے تھے۔ شراب خانے کا مالک شہر بھر میں گانے والوں کی تلاش کیا کرتا تھا۔ ان دیہاتیوں میں بھی تلاش کیا کرتا تھا جو ہاٹ کے دن آیا کرتے تھے، اور ان کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دیا کرتا تھا۔

گانے والے کو ہمیشہ بار کے سامنے وادکا کے خم کے نیچے، ایک اسٹول پر جگہ دی جاتی تھی۔ آرے جمے ہوئے خم کا گول پیندا اس کے سر پر ہالے کی طرح نظر آتا۔

ان میں سے بہترین گانے والا ایک زین ساز کلیشچوف تھا۔ دبلا سوکھا، چھوٹا سا آدمی۔اس کو غضب کے گانے یاد تھے۔اس کے پورا وجود کچھ عجب ملا دلا سا تھا، سر پر ننھے ننھے سرخ بالوں کے گچھے اگے

ہوئے، ناک ایسی چکنی تھی جیسے کسی لاش کی، ریشمی آنکھیں جن پر نیند کی کیفیت چھائی رہتی تھی، اور جو اپنے خانوں میں جڑی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

کبھی کبھی وہ اپنی اانکھوں کو بند کر کے سر کو خم کے پیندے پر ٹیک دیتا، سینہ پھلا لیتا اور ایسی اونچی آواز میں گاتا جو بے زنہار ہوتی:

آہ! ایک دھندسی آٹھتی ہے بیابانوں سے
راستہ نظروں سے اوجھل ہی ہوا جاتا ہے

پھر ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوتا اور بار سے لگ کر کھڑا رہتا، آنکھیں چھت سے جا لگتیں اور غمگین، درد بھری آواز فضا میں تیرنے لگتی:

کچھ نظر آتا نہیں، کون سے رخ پاؤں اٹھاؤں
راہ کس طرح دکھائی دے یہ معلوم نہیں...

اس کی آواز زوردار نہ تھی مگر وہ بے تکان گاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ شراب خانے کی دھندلی اور بے جان سرسراہٹ کو ایک روپہلی دھاگے میں پرو رہا ہے۔ ایک متنفس بھی ایسا نہ ہوتا جو گانے کے درد بھرے بول اور اس کے سبکیاں لیتے ہوئے لہجے کے اثر سے بچ سکتا، جو حد سے زیادہ شراب کے نشے میں دھت ہوتے وہ بھی حیرت انگیز طریقے پر سنجیدہ ہو جاتے اور میز پر گھورنے لگتے۔ میرا تو دل بالکل ہی پھٹنے لگتا۔ اس زوردار جذبے سے لبالب وہ کرا ہنے لگتا جو انسان پر اس وقت طاری ہوتا ہے جب کہ موسیقی اس کی روح کی گہرائیوں کو چھونے لگتی ہے۔

شراب خانے پر گرجا گھر کی سی خاموشی طاری ہو جاتی اور گانے والا منبر پر کھڑے ہوئے پادری کی طرح لگتا۔ وہ کوئی وعظ نہیں کہتا تھا بلکہ پورے بنی نوع انسان کیلئے دل سے دعا مانگتا ہوتا تھا۔ اور اس مفلس اور نادار حیات انسانی کے دکھ درد کو گویا زبان بخش دیتا تھا۔ ہر طرف داڑھی والے لوگ اس پر نظر جمائے بیٹھے رہتے، ان کے جانوروں کے سے بھولے بھالے چہروں میں ان کی معصوم آنکھیں جھپکتی رہتیں۔ کبھی کبھی ان میں سے کوئی ٹھنڈی سانس بھرتا اور گانے کی ہمہ گیر قوت کا قایل کر دیتا۔ ایسے موقعوں پر مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا کہ زیادہ تر انسان ایک کھوکھلی اور دکھاوے کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور اصل زندگی؟ آہ، یہ ہے اصلی زندگی!

دور کونے میں لیسو خا بیٹھی ہوتی تھی۔ پھولا پھولا چہرہ، بے حیا اور بے باک اور آوارہ پرلے درجے کی۔ وہ اپنے کچے گوشت کی طرح نظر آتے ہوئے کندے جھکا کر ان میں اپنا سر چھپا لیتی اور روتی۔ آنسو اس کی بے باک آنکھوں سے چپکے چپکے ڈھلکتے جاتے۔ پاس ہی کی میز پر اداس میترو پولسکی بیٹھا ہوتا تھا۔ خوب زوردار گہری آواز، دیوؤں کے سے جسم پر روئیں، شراب سے بھر بھرائے ہوئے چہرے میں بڑی بڑی آنکھیں کھلی ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ کوئی پادری تو ہے مگر اس کی زلفیں کتری جا چکی ہیں۔ سامنے میز پر رکھا ہوا وادکا کا گلاس وہ اٹھا کر اپنے لبوں تک لے جاتا اور پھر بغیر چھوائے، خاموش سے، آہستگی سے رکھ دیتا، نہ جانے کیوں اس سے پیا نہ جاتا۔

شرابخانے میں سب ہی لوگ بے حس و حرکت بیٹھے رہتے جیسے کسی بھولی بسری بات کا پھر سے ذکر ہو رہا ہو۔ ایک ایسی بات کا ذکر جو انہیں بہت عزیز ہے، ان کے دل سے بہت نزدیک ہے۔

جب کلیشچوف اپنا گانا ختم کر دیتا تو بڑی خاکساری کے ساتھ پھر اسٹول پر بیٹھ جاتا۔ شراب خانے کا مالک اسے وادکا کا ایک گلاس تھماتے ہوئے بڑی مطمئن مسکراہٹ سے کہتا:

''شاباش کیا کہتے ہیں! ویسے یہ گانا، جو تم نے گایا، یہ موسیقی تو کم ہے داستان گوئی زیادہ ہے۔ مگر تم ایسے گانے خوب گاتے ہو۔ کمال کرتے ہو۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے!...''

کلیشچوف آہستہ آہستہ وادکا پیتا، کھنکار کر گلا صاف کرتا اور آہستہ آہستہ کہتا:

''گانے کو تو جس کے آواز ہو وہی گا سکتا ہے، لیکن گانے کی روح کو ابھارنا میرا حصہ ہے!''

''چلو، بس اب شیخی نہ بگھارو!''

گانے والے پر ذرا بھی گھبراہٹ طاری نہ ہوتی، ایسی اطمینان سے کہتا:

''جس کے پاس شیخی بگھارنے کو کچھ ہو ہی نہ وہ بیشک اپنی زبان بند رکھے'' وہ ڈھیٹائی سے کہتا جاتا۔

شراب خانے کا مالک بگڑتا:

''تم بھی اپنے کو بڑا آدمی سمجھتے ہو!''

''ہاں جتنی بڑی میری روح ہے، اتنا بڑا تو سمجھتا ہی ہوں۔ اس سے بڑا کیسے سمجھ سکتا ہوں؟''

میترو پولسکی کونے میں سے چلاتا:

''ارے تم اس بد بخت فرشتے کے گانے کی کیا داد دو گے؟ کیڑے مکوڑے، زمین کے رینگنے والے...''

میترو پولسکی کا ہر ایک سے جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ جب دیکھو تب کسی کی کوئی بات پکڑ کر جھگڑا کر رہا ہے۔ تقریباً ہر اتوار کو کسی نہ کسی گانے والے یا کسی اور آدمی کے ہاتھوں وہ پٹ جایا کرتا تھا۔

شراب خانے کے مالک کو کلیشچوف کا گانا تو پسند تھا لیکن خود کلیشچوف کی ذات سے نفرت تھی۔ وہ ہر ایک سے کلیشچوف کی شکایت کرتا، اس کی ذلیل کرنے کے بہانے ڈھونڈتا یا اس کا مذاق اڑاتا۔ شراب خانے کے سب ہی آنے جانے والے اور خود کلیشچوف بھی اس بات سے واقف تھے۔

شراب خانے کے مالک کی رائے تھی کہ ''اچھا گاتا ہے، مگر بڑا مغرور ہے۔ ضرور یہی ہے کہ اس کو کھونٹی پر سے اتار دیا جائے۔ بڑا آیا اوپر ٹنگنے والا۔''

شراب خانے کے مالک کے کئی سرپرست جو برابر آتے رہتے تھے، وہ بھی اس بات سے اتفاق کرتے تھے۔

''ہاں، ٹھیک ہے۔ بڑا ہر وقت اوپر ہی چڑھا رہتا ہے!''

''اور آخر اس میں شیخی کی بات ہی کیا ہے؟ آواز تو اس کو خدا نے دی ہے۔ کوئی اس نے خود تو بنائی نہیں ہے! اور ایسی کوئی خاص آواز بھی نہیں'' شراب خانے کا مالک لقمہ دئے جاتا۔

''ہاں اور کیا۔ آواز اتنی اچھی تو ہے بھی نہیں۔ بنالیتا ہے اچھی۔ اور بس!'' دوسرے لوگ ہاں میں ہاں ملاتے۔

ایک دن کلیشچوف گانا ختم کر کے شراب خانے سے چلا گیا تو شراب خانے کے مالک نے لیسوخا کو اکسانا شروع کیا:

''تم ماریا یودو کیموونا، ذرا کلیشچوف کی آزمائش کرو نا، ذرا اس پر ہاتھ پھیرو۔ کیوں؟ تم تو آسانی سے کر سکتی ہو۔''

عورت ذرا ہنس کر بولی ''ہاں، ذرا جوان اور ہوتی تو کر سکتی تھی۔''

لیکن وہ اصرار کرتا رہا:

''جوان عورتوں میں کیا رکھا ہے؟ اور تم یہ بیڑا اٹھاؤ، ذرا تمہارے پیچھے دیوانہ ہوگا تو میرے کلیجے

میں ٹھنڈک پڑے گی۔ اس کو ذرا درد دل کا مزہ چکھاؤ۔ تم تو کرسکتی ہو ایسا۔ پھر دیکھنا کیا گاتا ہے! ذرا کوشش تو کرو، ماریا یودوکیموونا۔ میں تمہارا کیا گاتا ہے! ذرا کوشش تو کرو، ماریا یودوکیموونا۔ میں تمہارا شکر گزرار ہوں گا!''

لیکن لیسوخا نے انکار کردیا۔ وہ بس بیٹھی رہی، وہ بس بیٹھی رہی، موتی بھاری، پلکیں جھکائے سینے پر شال کی جھالر سے کھیلتی رہی اور بے جان آواز میں بڑبڑاتی رہی:

''اس مقصد کے لئے آپ کو ایک جوان عورت کی ضرورت ہے۔ اگر میں ذرا اور جوان ہوتی تو کوئی مضائقہ نہ ہوتا...''

شراب خانے کا مالک یہ کوشش بھی برابر کرتا رہتا تھا کہ کلیشچوف کو خوب پلا دی جائے۔ لیکن وہ دو تین گانوں کے درمیان بس ایک ایک گلاس شراب پیتا، پھر بڑی احتیاط اور نفاست سے گلے میں گلوبند باندھتا، الجھے بالوں پر ٹوپی لگاتا اور باہر چل دیتا ہے۔

اکثر شراب خانے کا مالک یہ کوشش بھی برابر کرتا رہتا تھا کہ کلیشچوف کے مقابلے پر اور لوگوں کو بلاتا۔ ایسے موقعوں پر جب کلیشچوف گا چکتا تو بے دلی سے اس کی تعریف کرکے شراب خانے کا مالک بڑے ذوق شوق سے اعلان کرتا:

''اور ایک بات رہ گئی صاحبو! آج رات یہاں ایک اور بھی موسیقار موجود ہے! صاحب ذرا سامنے آیئے، مہربانی کرکے!''

کبھی کبھی اس نو وارد کی بھی آواز اچھی ہوتی تھی لیکن کلیشچوف کے ان حریفوں میں سے کوئی بھی اس کی سی سادگی، جوش اور خلوص کا مظاہرہ نہیں کرسکتا تھا۔ شراب خانے کا مالک بھی کسی قدر رٹے ہوئے لہجے میں اس کو تسلیم کرتے ہوئے کہتا:

''ہوں۔ بہت خوب! آپ کی آواز اچھی ہے، مگر روح کی جو بات ہے نا...''

سب ہنسنے لگتے:

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلیشچوف کو کوئی مات نہیں دے سکتا!''

کلیشچوف اپنی گھچے دار سرخ بھوؤں کے نیچے سے سب کو جھانک جھانک کر دیکھتا اور بڑے اطمینان اور ادب سے شراب خانے کے مالک سے مخاطب ہوتا:

''تمہارا جو جی چاہے کرلو۔ میرا ایسا گانے والا نہ پاؤ گے۔ میرا فن خدا کی دین ہے...''

''ہم سب کو خدا نے ہی دیا ہے...''

''لیکن پاؤ گے نہیں میرا سا کوئی بھی۔ چاہے شراب خانے میں جتنی شراب بھی ہے سب کی سب ہی کیوں نہ بخش دو۔''

شراب خانے کے مالک کا چہرہ لال ہو جاتا اور ہو بڑابڑاتا ''ہاں ہاں، دیکھیں گے، دیکھیں گے...'' لیکن کلیشچوف اپنی بات پر اڑا رہتا:

''جانتا ہوں۔ کس کو نصیت کر رہے ہو؟''

''میں کسی کو نصیحت نہیں کر رہا۔ صرف تمہیں یہ سمجھا رہا ہوں کہ موسیقی محض تفریح ہے تو پھر سمجھو شیطان کا کام ہے۔''

''بس ہوا! چلو سنا دو ایک اور... کچھ بھی...''

''گانے کو میں ہر وقت تیار ہوں۔ سوتے میں بھی۔'' کلیشچوف جواب دیتا، پھر ذرا سا کھانس کر شروع ہو جاتا۔

چاروں طرف کمینہ پن، الفاظ اور نیت کا تمام میلا پن، شراب خانے کی تمام گندگی اور بے ہودگی، اس کا گیت چھڑنے کے ساتھ ہی دھوئیں کی طرح ہوا پر اڑ جاتے جیسے جادو کا اثر ہو۔ ہر شخص کو یہ احساس ہونے لگتا کہ اب ایک نئی زندگی، ایک نئی قسم کی زندگی کی سانسوں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ ایک ایسی زندگی جو پاکیزہ ہے، ذہن کی گہرائیوں سے نکلی ہے، محبت اور غم کے حسین میل سے بھرپور ہے۔

مجھے اس آدمی پر رشک آتا تھا۔ دل سے رشک آتا تھا اس کے فن پر اور اس طاقت پر جس سے وہ لوگوں کو جھکاتا تھا۔ کس حیرت انگیز کمال کے ساتھ وہ اس قوت کا استعمال کرتا تھا! میرا دل چاہتا تھا اس سے دوستی کروں، اس سے تفصیل سے باتیں کروں لیکن اس سے ملتے جھجک لگتی تھی۔ وہ ایسی بے جان آنکھوں سے دیکھتا تھا جیسے اسے کوئی دکھائی نہ دے رہا ہو۔ میرا دل چاہتا تھا کہ صرف گاتے وقت ہی نہیں بلکہ ویسے بھی اس کا دوست بنوں، اس کا معترف بنوں۔ لیکن نہ جانے کیوں اس میں کچھ ایسی بات بھی تھی جس سے کوفت ہوتی تھی۔ کھوسٹ بڈھوں کی طرح ٹوپی سر پر جھکائے، ایک سرخ بنا ہوا رومال گلے میں باندھتا اور سب کو دکھاتے ہوئے کہتا جاتا:

''یہ میری مٹھیا نے میرے لئے بنا ہے۔ وہ ہے کنواری، دوشیزہ۔۔اس نے۔۔۔''

مجھے یہ دیکھ کر بہت برا معلوم ہوتا تھا۔

جب وہ گا تا نہیں تھا تو اکثر اکڑا ہوا بیٹھا رہتا، پالے سے سکڑی ہوئی ناک انگلی سے کھجاتا اور جب کوئی بات پوچھی جاتی تو بڑی مشکل سے ایک دو الفاظ میں جواب دے دیتا۔ ایک مرتبہ میں اس کے پاس جا کر بیٹھا اور اس سے کچھ پوچھا تو میری طرف دیکھا تک نہیں اور بولا:

''اے لڑکے! کھسک ادھر سے!''

مجھے میتر وپولسکی زیادہ اچھا لگتا تھا۔ شراب خانے میں داخل ہوتا تو جھومتا جھامتا، اس طرح اپنے خاص کونے کی طرف جاتا جیسے بوجھ اٹھائے چل رہا ہے۔ لات مار کر کرسی گھسیٹتا اور اس پر ڈھے پڑتا۔ کہنیاں میز پر ٹکی ہوئی تھیں، بڑا سا جھبرا سر ہاتھوں پر ٹکا ہوتا۔ دو تین وادکا کے گلاس چڑھا جاتا اور ایک لفظ نہ بولتا، صرف گونجدار آواز میں کھانستا۔ اور وہ بھی اتنے زور سے کہ ہر شخص مڑ مڑ کر اس کو دیکھنے لگتا۔ اور جب کوئی مڑ کر دیکھتا تو جواباً غصے میں بھر کر گھورتا، ٹھڈی کے نیچے ہاتھ رکھ لیتا، الجھی ہوئی زلفیں سرخ بھر بھرائے ہوئے چہرے پر بکھرے جاتیں، پھر یکا یک چیختا:

''کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا گھور رہے ہو تم؟''

کبھی کبھی جواب ملتا:

''بونا نظر آتا ہے!''

ایسی شامیں بھی آتیں جب وہ خاموشی سے پیتا اور اسی خاموشی سے کھسک لیتا، بھاری بھاری پیروں کو گھسیٹتا ہوا۔ لیکن ایسا بھی ہوتا جب پیغمبروں کی طرح لوگوں کو بری بھلی سناتا:

''میں خدا کا بندہ ہوں جس کا ایمان کوئی نہیں بگاڑ سکتا۔ اور اسی حیثیت سے مین تم پر لعنت بھیجتا ہوں جیسا کہ عیسے نے ایک زمانے میں کیا تھا۔ اے شہر آریال، تجھ پر افسوس! جہاں چوٹے اور آوارہ گرد اپنی حرص و ہوس کے کیچڑ میں آلودہ رہتے ہیں۔ زمین کی اس کشتی پر افسوس جو کائنات کے پانی پر گندگی سے لدی ہوئی تیرتی پھرتی ہے اور اس کی گندگی تم ہو۔ شرابی اور پیٹو لوگ۔ زمین کے کیڑے، حشرات الارض! تمہارے دن اب گنتی کے رہ گئے ہیں، اب بدبختو! پر زمین بھی تمہاری لاشوں تک پر لعنت بھیجے گی!''

اس کی آواز کی گونج سے کھڑکیوں کے شیشے گھنگھنانے لگتے اور اس گھنگھناہٹ سے اس کے سامعین کو بہت لطف آتا۔ وہ اس کی تعریف میں گیت گانے لگتے:

''افوہ، کچھ بھی ہو، پر یہ کیا کچھ نہیں کر سکتا! جھبرا کھوسٹ!''

اس سے جان پہچان پیدا کرنا بھی آسان تھا۔ بس کھلانے پلانے کی بات تھی فوراً ایک وادکا کی صراحی اور ایک پلیٹ کلیجی کا آرڈر دے دیتا تھا جس پر سرخ مرچ چھڑکی ہوئی ہوتی تھی۔ یہ چیزیں اس کو پسند تھیں۔ وہ اس قدر زیادہ مرچ کھاتا کہ دوسرے چکھتے تو ان کے پیٹ اور گلے میں آگ لگ جاتی تھی۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ مجھے کون سی کتابیں پڑھنی چاہئیں تو وہ جھپٹ کر بولا:

''مگر پڑھو ہی کیوں؟''

پھر جب اس نے دیکھا کہ اس کے جواب سے مجھ کو دھکا لگا تو نرم پڑ کر بولا:

''تم نے کبھی مذہبی کتابیں پڑھی ہیں؟''

''ہاں۔''

''تو مذہبی کتابیں ہی پڑھو! اور کچھ نہیں۔ دنیا بھر کی عقل اس میں پوشیدہ ہے، البتہ تمہاری الٹی کھوپڑی میں کچھ بیٹھے گا نہیں۔ کسی کے بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ ویسے تم ہو کون؟ گاتے ہو؟''

''نہیں۔''

''کیوں نہیں گاتے؟ تمہیں گانا چاہئے۔ یہ دنیا کا بدترین پیشہ ہے۔''

پاس کی میز سے کسی نے کہا:

''اور آپ کیا موسیقار نہیں ہیں؟''

''میں؟ میں تو آوارہ گرد ہوں! اور کہئے!''

''کچھ نہیں۔''

''ظاہر ہے کہ کچھ نہیں! ہر شخص جانتا ہے کہ آپ کا کدو بالکل خالی اور نہ کبھی آئندہ اس میں کچھ بھرنے کی امید ہی ہے۔ آمین!''

اس لہجے میں اور اس انداز سے وہ ہر شخص سے بات کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مجھ سے بھی لیکن دو چار بار جب مین نے اس کی دعوت کر دی، تو وہ ذرا نرم پڑ گیا۔ ایک دن ذرا تعجب سے بولا:

''جب میں تم کو دیکھتا ہوں تو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ آخر تم کون ہو، کیا ہو اور کیوں ہو؟ پر میری بلا سے جاؤ جہنم میں!''

کلیشچوف کے متعلق اس کی اصلی رائے میں کبھی معلوم نہ کر سکا۔ وہ کلیشچوف کا گانا بظاہر تو بڑی خوشی سے سنتا تھا، کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ کر محبت سے مسکراتا بھی تھا لیکن وہ کلیشچوف سے ملنے کی کوشش کبھی نہ کرتا تھا۔ بلکہ اکثر بڑی حقارت سے بڑبڑا کر اس کا ذکر کرتا:

''وہ مسخرہ ہے! سانس کھینچنا جانتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں گاتا ہے۔ بہر حال گدھا ہے!''

''کیوں؟''

''کیونکہ پیدا ہی گدھا ہوا تھا۔''

اگر وہ مجھ سے سنجیدہ لمحات میں بات کرتا تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔ لیکن جب وہ نشے میں نہ ہوتا تو صرف خرخر کرتا۔ ایسے موقعوں پر اس کی دھندلی آنکھوں میں غم اور دکھ کی پرچھائیاں ہوتیں۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ آدمی جواب زندگی بھر کے لئے شرابی بن گیا تھا، قازان کی اکادمی میں پڑھتا تھا اور ممکن تھا کہ بڑا پادری بن جاتا۔ پہلے تو میں نے اس قصے کو صحیح نہیں مانا۔ لیکن ایک دن اس سے بات کرتے وقت پادری کریسانف کا نام میرے منہ سے نکل گیا۔ میترو پولسکی نے سر ہلا کر کہا:

''اور پاموا برینڈا کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔ لیکن میترو پولسکی نے تنک کر جواب دیا:

''اس سے تم سے کیا مطلب ہے جی؟''

میں نے گھر پہونچ کر اپنی ڈائری میں لکھا؛ ''پاموا برینڈا کو ضرور پڑھا جائے گا۔'' معلوم نہیں کیوں مجھے خیال آیا کہ پاموا برینڈا میں میری روح کی الجھنوں کی اطمینان بخش جواب ملے گا۔

میترو پولسکی کو عجیب قسم کے ٹیڑھے میڑھے نام بولنے اور الفاظ کی عجیب وغریب ترکیبیں بنانے میں بڑا لطف آتا تھا۔ مجھے اس سے بڑی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ مثلاً:

''زندگی کوئی انیسیا نہیں ہے!''

''انیسیا کون؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے میری گھبراہٹ سے لطف لیا ''وہ ہے کام کی چیز۔''

اس کے اس طرح کے الفاظ استعمال کرنے سے اور اس حقیقت کی وجہ سے کہ اس نے اکادمی میں

پڑھا تھا، مجھے یہ خیال ہوا کہ ضرور اس کے پاس علم کا کافی بڑا خزانہ ہے۔ اور مجھے اس بات سے سخت کوفت ہوتی تھی۔ کہ وہ اس قدر پراسرار طریقے سے اور اس قدر شاذ کبھی بات کرتا تھا۔ اگر بات کرتا بھی تھا تو وہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ شاید مجھے اس سے پوچھنے کا سلیقہ نہ آتا تھا؟

پھر بھی اس نے میری روح پر اپنے وجود کا ایک گہرا نقش چھوڑا۔ شراب پی کر وہ جس وقت حضرت عیسے کی طرح سب کو ایک سرے سے فہمائش کر کے پھٹکارنے لگتا تو مجھے اس کی یہ ادا اچھی لگتا۔ چیخ چیخ کر غراتا:

''اے زمین کے گندے لوگو، ناپاک لوگو! اے کائنات کے آلودہ کرنے والو! آج بکروں کا راج ہے اور نیک لوگوں کو ذلیل کیا جاتا ہے۔ لیکن انصاف کا دن جلد آنے والا ہے! توبہ کرو۔ پھر وقت نکل جائے گا۔ دیر ہو جائے گی۔ بہت دیر ہو جائے گی!''

اس بھڑکتی ہوئی آواز کو سن کر مجھے ''بہت خوب'' کی یاد آتی، دھوبن نتالیا کی یاد آتی اور اسکا افسوسناک انجام، اور ملکہ مارگٹ یاد آتیں جن کے چاروں طرف گندی افواہوں کے بادل لپٹے ہوئے تھے۔ اب میرے پاس یادوں کا خزانہ کافی بڑا تھا...

اس آدمی سے میری مختصر سی جان پہچان ایک عجیب طریقے سے ختم ہوئی۔

بہار کا موسم تھا۔ ایک دن میری ملاقات اس سے ایک کھیت میں ہوئی جو سپاہیوں کے کیمپ کے نزدیک ہی پڑتا تھا۔ وہ اکیلا اونٹ کی طرح چل رہا تھا، سر ہلاتے ہوئے۔

پھنسی ہوئی آواز میں مجھ سے پوچھنے لگا:

''ہوا کھا رہے ہو؟ تو آؤ ساتھ ہی کھائیں۔ میں بھی ٹہلنے ہی نکلا تھا۔ میری صحت خراب ہے بھائی۔ سچ مچ خراب ہے...''

ہم دونوں چپ چاپ ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر ہمیں ایک دم سے نظر آیا کہ ایک گڈھے میں ایک آدمی پڑا ہے۔ وہ گڈھے کی دیوار سے لگا، ٹیڑھا پڑا ہوا تھا، کوت ایک کان کے اوپر کی طرف ڈھکا ہوا تھا، کچھ اس طرح جیسے اس نے کوٹ کو کھینچ کر اوڑھنے کی کوشش کی ہو۔

میترو پولسکی رک کر دیکھنے لگا: ''نشے میں ہے۔''

لیکن پاس ہی سبزے پر ایک پستول پڑا تھا، ایک مردانی ٹوپی اور ایک واد کی بوتل جس میں س ے

تھوڑی سی پی گئی تھی۔ بوتل کی خالی گردن گھاس میں چھپی ہوئی تھی۔ اس آدمی کا چہرہ اس طرح کوٹ سے ڈھکا تھا جیسے اس نے شرم سے اپنا منہ چھپا لیا ہوا۔

ایک منٹ تک ہم لوگ خاموش کھڑے رہے، پھر میترو پولسکی اپنی ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا اور بولا ''اس نے اپنے کو گولی مار لی۔''

مجھے پہلی ہی نظر میں خیال ہوا تھا کہ وہ نشے میں نہیں ہے بلکہ مر گیا ہے۔ لیکن یہ ایسی عجیب سی بات تھی کہ میں برابر اس کو ذہن سے ہٹانے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں اس کے بڑے چکنے سر کو اور کوٹ سے نکلے ہوئے نیلے کان کو دیکھ رہا تھا تو مجھے نہ ڈر لگا نہ ترس آیا۔ اس بات کا یقین کرنا مشکل تھا کہ بہار کے ایک ایسے حسین اور جنون انگیز دن میں کسی نے کیسے خودکشی کر لی۔

میترو پولسکی جلدی جلدی اپنے گالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا جیسے انہیں گرم کر رہا ہو۔ اس کے گالوں پر خشخشی بال نکلے ہوئے تھے۔ جلدی جلدی کہے جا رہا تھا:

''اچھی پکی عمر معلوم ہوتی ہے۔ بیوی یا معشوقہ دغا دے گئی ہوگی یا کچھ روپے پیسے کا الجھاوا ہوگا...''

اس نے مجھے شہر بھیجا کہ پولیس کو بلا لاؤں۔ خود وہ اسی گڑھے کے کنارے بیٹھ گیا، پاؤں اس کے اندر لٹکا لئے اور اپنے گھسے ہوئے کوٹ کو اچھی طرح بند کر لیا جیسے اسے ٹھنڈ لگ رہی ہو۔ میں پولیس کو اطلاع دے کر الٹے ہی پاؤں واپس لوٹا لیکن اتنی ہی دیر میں میترو پولسکی صاحب اس خودکشی کرنے والے کی باقی شراب چڑھا چکے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے خالی بوتل ہوا میں لہرائی:

''لو اس نے کیا ہے اس کا خاتمہ!'' اور یہ کہہ کر زور سے بوتل زمین پر پٹخ دی۔ وہ چکنا چور ہو کر ریزہ ہو گئی۔ میرے پیچھے ہی پیچھے ایک پولیس والا پہنچا۔ گڑھے میں جھانکا، ٹوپی اتاری، ہچکچاتے ہوئے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور میترو پولسکی سے مخاطب ہوا:

''تم کون ہو؟''

''اس سے تم کو کیا مطلب ہے جی؟''

پولیس والے نے کچھ سوچا اور پھر ذرا اخلاق سے بولا:

''یہ معاملہ کیا ہے؟ ایک آدمی مرا پڑا ہے اور آپ نشے میں دھت یہاں موجود ہیں؟''

میترو پولسکی نے بڑی شان سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا ''میں تو بیس سال سے نشے میں دھت

ہوں!''

مجھے یقین تھا کہ بچی ہوئی واد کا پینے کے جرم میں اس کو ضرور گرفتار کیا جائے گا۔ شہر کی طرف سے کچھ اور لوگ بھی دوڑتے ہوئے آ گئے اور ایک سخت صورت پولیس افسر گھوڑا گاڑی میں چڑھا آموجود ہوا۔ وہ گڑھے میں اترا، مردے کا کوٹ اٹھا کر اس کی صورت دیکھی۔

''اسے کس نے سب سے پہلے دیکھا؟''

''میں نے''میتر وپولسکی نے جواب دیا۔

پولیس افسر نے اسے ایک نظر دیکھا پھر آواز کھینچ کر بولا:

''اچھا، آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی جناب عالی!''

چاروں طرف تماشائی اکٹھے ہو گئے، ہانپتے، کانپتے، خوشی میں بھرے ہوئے وہ گڈھے کے کنارے جمع ہو کر اس کے اندر جھانکنے لگے۔ کسی نے چیخ کر کہا:

''ارے اس کو تو میں پہچانتا ہوں۔ ہماری ہی گلی میں تو رہتا تھا۔ کلرک ہے!''

میتر وپولسکی پولیس افسر کے سامنے ڈھٹائی سے ڈٹا کھڑا، نہ جانے کیا کیا اوٹ پٹانگ بکے جا رہا تھا، چیخے جا رہا تھا۔ پھر افسر نے اس کے سینے میں ایک مکا دیا جس سے وہ لڑکھڑا کر بیٹھ گیا۔ تب پہلے پولیس والے نے جیب سے رسی نکالی اور اطمینان سے میتر وپولسکی کے ہاتھ باندھنے شروع کر دئے جنہیں اس نے بڑی فرمابرداری کے ساتھ پیچھے کر رکھا تھا۔ افسر بھیڑ کو تتر بتر کرنے لگا:

''نکلو یہاں سے! اٹھائی گیرے، گنڈے...''

ایک اور پولیس والا جس کی آنکھیں نمناک اور لال تھیں اور دھن تھکن سے کھل جاتا تھا، دوڑتا ہوا آیا، میتر وپولسکی کے ہاتھوں میں بندھی ہوئی رسی کے سرے پکڑے اور خاموشی سے گھسیٹتا اسے شہر کی طرف لے گیا۔

میرا وجود جیسے کچل کر رہ گیا۔ میں بھی کھیت سے نکل آیا۔ ذہن پر کوے کی سخت آواز کی طرح یہ الفاظ چوٹ دے رہے تھے:

''اے شہر آریال تجھ پر افسوس!'' رہ رہ کر تصور میں وہ غمناک تصویر ابھرتی تھی: پولیس والے نے بڑے اطمینان سے اپنے جیب سے رسی نکالی تھی اور اس غریب ''پیغمبر'' نے بڑی خاکساری سے اپنے ہاتھ

پیچھے کر دئے تھے جیسے وہ ہزارویں بار اس مصیبت کو برداشت کر رہا ہو...

بعد کو مجھے پتہ چلا کہ وہ ''پیغمبر'' جلاوطن کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد کلیشچوف کو بھی جاتے دیر نہ لگی۔ اس نے ایک مالدار عورت سے شادی کر لی اور دیہات چلا گیا جہاں اس نے زین سازی کی دوکان کھول لی۔

...لیکن اس کے جانے سے پیشتر میرے بھی اس کا گانا سننے شراب خانے میں آئے۔ میں اکثر ان سے کلیشچوف کے گانے کی تعریفیں کیا کرتا تھا۔ ایک دن بولے:

''اچھا۔ ہم بھی ضرور کسی دن شراب خانے چلیں گے اس کا گانا سننے!''

اور اب وہ میز پر میرے سامنے بیٹھا، حیرانی سے بھویں چڑھاتے ہوئے، آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔

راستے بھر وہ مجھے چھیڑتے رہے، یہاں تک کہ شراب خانے میں داخل ہونے کے بعد بھی وہ میرا مذاق اڑاتے رہے اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کا اور وہاں پھیلی ہوئی بو کا۔ جس سے دم گھٹا جاتا تھا۔

جب کلیشچوف نے گانا شروع کیا تو میرے مالک کے لبوں پر ایک حقارت بھری مسکراہٹ آئی۔ اور وہ اپنے لئے ایک گلاس میں بیئر انڈیلنے لگے۔ لیکن آدمی ہی انڈیلی تھی کہ یکایک رک گئے اور بولے:

''ہوں... یہ... کیا ظالم ہے!''

کانپتے ہاتھوں سے انہوں نے آہستہ سے بوتل میز پر رکھ دی اور غور سے سننے لگے۔ جب کلیشچوف ختم کر چکا تو ٹھنڈی سانس بھر کے بولے:

''ہاں بھائی تو ٹھیک کہتا ہے... اس کو واقعی گانا آتا ہے۔ خدا کی مار ہو اس سب پر! اس نے تو میرے بھی پسینے نکال دئے...''

کلیشچوف نے پھر گانا شروع کیا۔ اس کا سر پیچھے کو جھکا ہوا تھا، آنکھیں چھت سے لگی تھیں۔

اس دولت مند گاؤں سے نکلی سندری اجلے اجلے چمکتے کپڑوں میں اور چلی ڈگر پر...

''ہاں یہ واقعی گا سکتا ہے'' میرے مالک سر ہلا کر اور ذرا سا ہنس کر بدبدائے۔

کلیشچوف کی آواز بانسری کی طرح اوپر اٹھ رہی تھی:

سندری ہو گئی لال، بولی گھبرا کر میں ہوں ایک ابھاگن مجھ کو پوچھے کون؟

''حیرت انگیز ہے یہ شخص'' میرے مالک نے اپنی سرخ آنکھیں جھپکا کر کہا'' خدا کی پھٹکار! کس قدر حیرت انگیز ہے یہ شخص...''

میں ان کو دیکھتا رہا۔ دل خوشی سے بھرا تھا۔ گانے والے کی دردناک لے شراب خانے کی باقی تمام آہٹوں پر چھا گئی تھی اور لمحہ بہ لمحہ تیز تر، حسین تر ہوتی ہوئی زیادہ روح پرور ہوتی جاتی تھی:

ہمارے گاؤں میں انسانوں کی زندگی نہیں

میں ٹھہر کنواری، مجھے شام کی محفلوں میں کون بلانے، ہائے، میں غریب، میں کہاں سے لاؤں اچھے لباس

میں کسی لائق نہیں، مجھے بھلا کوئی گبرو جوان کیوں پوچھے!..

اور وہ رنڈوا چاہے میں بن جاؤں اس کی کنیز

نہیں، نہیں، میں اپنی قسمت اس طرح نہیں پھوڑوں گی!

میرے مالک بڑی بے حجابی سے رونے لگے۔ سر جھکائے وہ زور زور سے سکیاں لے رہے تھے اور آنسو بہہ بہہ کر ان کے گھٹنوں پر گرتے جا رہے تھے۔

تیسرے گانے کے بعد وہ نہایت متاثر ہو کر بولے:

''میں اب یہاں نہیں بیٹھ سکتا۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ ہوا بند ہے۔ یہ کمبخت بدبوئیں کیسی ہیں...آؤ، آؤ گھر چلیں!...''

باہر گلی میں آ کر ان کا موڈ بدل گیا:

''اس سب پر شیطان کی مار پیشکوف! چلو رستوراں چلیں۔ کچھ کھایا پیا جائے...میرا گھر جانے کو جی نہیں چاہتا!''

بغیر دام کئے وہ ایک گاڑی میں بیٹھ لئے اور جب تک ہم لوگ رستوراں پہنچے وہ خاموش ہی رہے۔ وہاں انہوں نے ایک کونے میں ایک میز لی اور بیٹھتے ہی آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ بات کرتے میں بار بار ادھر ادھر دیکھتے جاتے تھے جیسے بات کرنا ان کیلئے بہت دشوار ہو رہا ہو، جیسے دل میں کوئی گہرا غم چھپا ہو...

''اس بڈھے بکرے نے تو میرا دم نکال دیا...سنو تم تو بہت کتابیں پڑھتے ہو اور بہت کچھ سوچتے ہو

نا۔ اب اس کمبختی کا کیا جواز پیش کر سکتے ہو کہ میں جو زندگی بسر کر رہا تھا، اس میں بس سال در سال گذرتے جاتے تھے، چالیس سال یوں ہی گذر گئے۔ بیوی تھی، بچے تھے لیکن کوئی اتنا نہ تھا کہ جس سے دل کی بات کہتا پھر ایسے لمحات بھی آئے جب مجھے محسوس ہوا کہ کس سے دل کی بات کہنی ہی پڑے گی۔ وہ بات جو دل میں دبی پڑی ہے اور کسی سے نہ کہہ سکے! ایسا کوئی رفیق، کوئی ندیم ڈھونڈنا ہی پڑے گا۔ بیوی سے کہو تو اس کے پلے ہی نہیں پڑتی... اس کو کیا مطلب؟ بچے ہیں... گھر ہے، اس کے اپنے دھندے ہیں۔ وہ عورت میری روح کے لئے اجنبی ہے۔ بیوی تو بس اس وقت تک انسان کی دوست ہوتی ہے جب تک پہلا بچہ نہ ہو جائے۔ یہ بات ہے!... ویسے عمومی حیثیت سے بھی میری بیوی... خیر، تم خود ہی دیکھ سکتے ہو... اس کے ساتھ بھلا کیا لطف آ سکتا ہے۔ بس گوشت کا ڈھیر ہے۔ لعنت ہے اس سب پر! آہ بھیا، کیا دل میں درد ہے! کیا چوٹ ہے...''

ایک تشنجی کیفیت کے ساتھ انہوں نے ٹھنڈی اور تلخ بیئر حلق میں انڈیل لی اور خاموش بیٹھے، لمبے بالوں میں انگلیوں کو الجھاتے ہوئے پھر بولنے لگے:

''بات یہ ہے بھائی کہ عام طور پر لوگ حرامی ہوتے ہیں! اب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ان گنواروں سے بات کرنے کا شوق ہے... کیا میں نہیں سمجھتا کہ بہت سی باتیں دنیا میں غلط ہیں، سڑی ہوئی ہیں! یہ سچ ہے میرے بھائی... یہ سب کے سب چور ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہاری باتیں ان کے دل کو لگتی ہوں گی؟ ہرگز نہیں! ذرہ برابر بھی نہیں! اب پیوتر اور اوسپ ہی کو لے۔ یہ سب نکمے لوگ ہیں۔ تمہاری سب باتیں مجھ سے آ کر کہتے ہیں جو تم نے میرے متعلق بھی کیا ہوگا وہ بھی... کہو یہ بات تمہیں پسند آ سکتی ہے؟''

میں اتنا بوکھلا گیا کہ جواب دیتے بن نہیں پڑی۔

میرے مالک ذرا سا ہنسے ''دیکھا تم نے؟ تمہارا جو ارادہ تھا نا کہ ایران چلے جاؤ وہ بہت ٹھیک ارادہ تھا۔ کم از کم وہاں لوگوں کی بات تو سمجھ میں نہ آئے گی۔ دوسری زبان ہوگی! مگر یہاں اپنی زبان میں تو گندگی کے سوا کچھ نہیں۔''

میں نے پوچھا ''تو اوسپ میرے بارے میں کچھ بتاتا ہے آپ کو؟''

''تب اور کیا!'' وہ بولے ''تمہیں تعجب ہوا؟ وہ تو سب سے زیادہ مجھ کو بات بتاتا ہے۔ چالاک لومڑی ہے بھیا... نہیں پیشکوف، الفاظ کسی کے دل کو نہیں لگتے۔ سچ؟ سچ ہے کیا؟ جیسے خزاں کی برف۔ کیچڑ

ہو جائے دوسرا نتیجہ نہیں۔ بہتر یہی ہے اپنی زبان بند رکھو...''

وہ گلاس پر گلاس بھر کر بیئر پیتے رہے۔ ان کو نشہ تو نہیں چڑھ رہا تھا۔ لیکن بات کی رفتار اور اس کی تلخی بڑھتی جا رہی تھی:

''مثل مشہور ہے کہ خاموشی سونا ہے اور بات کچرا۔ اخ، بھیا، زندگی بڑی اکیلی اور غمگین ہے۔ وہ جو گا رہا تھا ''ہمارے گاؤں میں انسانوں کی زندگی نہیں'' یہ بات بالکل صحیح ہے۔ بالکل یتیموں جیسی زندگی ہے۔''

ادھر ادھر دیکھ کر انہوں نے اپنی آواز مدہم کی:

''میری ملاقات حال ہی میں ایک اپنی ہی سی بھٹکتی ہوئی روح سے ہوئی تھی، ایک عورت تھی وہ، بیوہ، مطلب یہ ہے کہ اس کا میاں سائبیریا بھیج دیا گیا تھا۔ جعلی روپیہ بنانے کے جرم میں۔ وہ اب بھی ہے یہاں قید میں۔ تو میری اس سے ملاقات ہوئی... اس کے پاس نام کو بھی ایک کوپک نہیں تھا۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ... تم تو جانتے ہی ہو۔ ایک دلال نے ہماری ملاقات کروائی... میں نے ایک نظر اس کو دیکھا کہ بس، کیا ہی ننھی منی پیاری تھی وہ، سچ مچ حسینہ، ایسی جوان، ایسی حسین۔ چنانچہ میں اس کے یہاں آنے جانے لگا۔ ایک بار، دو بار... اور پھر میں نے اس سے کہا ''یہ کیا معاملہ ہے کہ تمہارا شوہر جیل میں اور تم سیدھا راستہ نہیں چل رہی ہو۔ پھر تم سائبیریا کیوں جا رہی ہو اس کے ساتھ؟'' بات یہ ہے کہ وہ سائبیریا جانے کا پلان بنا رہی تھی... اور وہ مجھ سے کہتی ہے ''وہ جیسا بھی ہے، میرے لئے تو ٹھیک ہی ہے، کیونکہ میں اس سے محبت کرتی ہوں! ہو سکتا ہے اس نے میری خاطر ہی برائی کی ہو اور اس کی ہی خاطر میں تمہارے ساتھ یہ کر رہی ہوں۔ کیونکہ اس کو روپے کی ضرورت ہے۔ وہ شریف آدمی ہے اور قاعدے سے رہنے کا عادی ہے۔ اگر میں اکیلی ہوتی تو ضرور آبرو سے رہتی۔ تم بھی شریف آدمی ہو اور مجھے اچھے لگتے ہو لیکن اب مجھ سے ایسی بات نہ کہنا...'' لعنت ہے اس سب پر!... تو میرے پاس جو کچھ تھا وہ میں نے اٹھا کر اس کو دے دیا۔ اسی روبل سے کچھ اوپر رہا ہوگا، اور اس سے کہا ''مجھے معاف کرنا، میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا لیکن اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تم سے تعلق قائم نہیں رکھ سکتا!'' اور پھر وہاں سے یوں ہی چلا آیا۔''

ذرا دیر وہ چپ رہے اور اس عرصے میں ایک دم ان پر نشہ چڑھ گیا جیسے یکا یک ان کی قوت جواب دے گئی ہو اور پھر بدبدانے لگے:

''میں اس کے ساتھ چھ بار سویا اور تم سوچ نہیں سکتے کہ وہ کیا چیز تھی... اس کے بعد بھی میں غالباً چھ بار اس کے یہاں گیا لیکن اندر کمرے میں جانے کی ہمت نہیں ہوئی... کسی طرح بن نہ پڑا اور اب تو وہ چلی ہی گئی...''

انہوں نے میز پر ہاتھ رکھ دئے اور انگلیاں ہلاتے ہوئے سرگوشی میں کہا:

''خدا کرے اب اس سے کبھی میری ملاقات نہ ہو، خدا نہ کرے! ورنہ بالکل ہی خاتمہ ہو جائے گا! آؤ گھر چلو... چلو!''

ہم دونوں گھر کی طرف چلے تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے بدبدائے جا رہے تھے:

''دیکھا بھائی، دیکھا بھیا...''

جو باتیں انہوں نے مجھ کو بتائیں، ان پر مجھ کو تعجب نہیں ہوا۔ ادھر کچھ دنوں سے مجھ کو خود خیال ہو رہا تھا کہ ان کی زندگی میں کوئی غیر معمولی بات ہو رہی ہے۔

لیکن زندگی کے متعلق جو انہوں نے خیالات ظاہر کئے اور خاص طور پر اوسپ کے متعلق جو باتیں بتائیں، ان سے مجھ سخت کوفت ہوئی۔

20

میں تقریباً تین گرمیوں تک اس بے جان شہر میں خالی عمارتوں کے درمیان کام کرتا رہا اور دیکھتا رہا کہ ہر خزاں میں مزدور اور مستری پتھر سے بنی ہوئی بے رنگ دوکان کو گراتے ہیں اور موسم بہار میں پھر بناتے ہیں۔

میرے مالک اس بات کا اچھی طرح اطمینان کر لیتے تھے کہ وہ پانچ روبل جو وہ مجھ کو دیتے تھے وہ وصول ہو جائیں۔ چنانچہ اگر کسی دوکان میں نیا فرش بٹھایا جاتا تھا تو مجھے سطح سے لے کر تقریباً دو فٹ گہرائی تک کھودنا ہوتا تھا۔ اگر اٹھائی گیرہ بھی یہ کام کرتا تو اسے ایک روبل ملتا۔ لیکن مجھ کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ اور جب میں اس کام میں مصروف ہوتا تو ظاہر ہے کہ بڑھئیوں وغیرہ پر نگرانی نہ رکھ سکتا تھا، اس لئے وہ لوگ موقع پا کر تالے اور قبضے وغیرہ پیچ کھول کر نکال لیا کرتے تھے۔ اور دوسری چھوٹی موٹی چوریاں کر لیا کرتے تھے۔

مزدور اور ٹھیکہ دار ہر طرح مجھے دھوکا دینے کی کوشش کرتے، کھلم کھلا چوریاں کرتے جیسے ان کو بڑی

سخت ضرورت ہو۔ اگر میں ان کو پکڑ لیتا تو وہ کبھی برا نہ مانتے بلکہ حیران ہو کر کہتے:

''تم پانچ روبل کے لئے اتنی محنت ہو جیسے وہ بیس روبل ہوں، تم کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے!''

میں نے اپنے مالک کو بتایا کہ میری محنت کے ذریعہ ایک روبل کی بچت کر کے وہ بہت زیادہ نقصان اٹھاتے ہیں۔ لیکن انہوں نے آنکھ مار کر جواب دیا:

''مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو!''

میں نے دیکھا کہ وہ مجھ پر شک کرتے ہیں کہ میں چوروں سے ساز باز کرتا ہوں۔ میں اس بات پر ناراض تو نہیں ہوا۔ لیکن ان کے لئے میرے دل میں حقارت کا جذبہ ضرور پیدا ہوا۔ یہ حالات تھے: ہر شخص چوری کرتا تھا۔ خود میرے مالک کو بھی دوسروں کی چیزیں اڑا لینے میں کوئی باک نہ تھا۔

جب میلہ ختم ہوتا تھا تو وہ دوکانوں کا معائنہ کرتے کہ کہاں کہاں مرمت کی ضرورت ہے۔ اکثر ان دوکانوں میں بھولی بسری چیزیں مثلاً سماوار، برتن، قالین، قینچیاں اور کبھی کبھی مال سے بھرے بکس اور پیٹیاں تک پڑی ملتیں۔ وہ ہنس کر کہتے:

''ان کی فہرست بنا لو اور گودام میں رکھوا دو!'' گودام سے وہ خاص خاص چیزیں اپنے گھر بھجوا دیتے اور مجھ سے ایک نئی فہرست بنواتے جن میں سے یہ چیزیں کم کروا دیتے۔ مجھے سامان سے کوئی دلچسپی نہ تھی، نہ سامان کا شوق تھا۔ کتابیں تک بار محسوس ہوتی تھیں۔ میری کل جائداد دو کتابیں تھیں۔ ایک برانژے کی اور ہائنے کی نظموں کا ایک مجموعہ۔ پوشکن کا مجموعہ خریدنا چاہتا تھا لیکن شہر میں ایک ہی پرانی کتابوں کی دوکان تھی۔ اور اس کا مالک ایسا بنیا قسم کا آدمی تھا اور اتنا دام مانگتا تھا کہ میں ادا ہی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے مالک کے فلیٹ میں جو فرنیچر، قالین، آئینے اور اور سامان اٹا پڑا تھا، اس سے مجھے نفرت تھی۔ وہ سامان اس قدر جگہ گھیرتا تھا اور اس میں سے پالش اور وارنش کی ایسی بو پھٹتی تھی کہ میرا دماغ خراب ہونے لگتا تھا۔ غرضیکہ فی الجملہ مجھ کو اپنے مالک کے کمروں سے کوفت ہوتی تھی کیونکہ ان کمروں کا خیال کرتے ہی مجھے غیر ضروری کوڑے کباڑ سے بھرے ہوئے بکس یاد آتے تھے۔ اور اس پر سے جب میرے مالک دوسروں کا بھی سامان گاڑی بھر بھر کر ڈھو لیجاتے تھے اور بھرے پر اور بھرتے تو ظاہر ہے میں کیسا محسوس کرتا ہوں گا۔ ویسے ملکہ مارگٹ کا مکان بھی سامان سے بھرا تھا لیکن کم از کم وہ سامان خوبصورت تو تھا۔

زندگی مجھ کو جابجا سے اکھڑی ہوئی لگتی تھی جیسے اس کے مختلف پہلو ایک دوسرے سے میل نہ کھاتے ہوں اور اس میں کا بھی تر حصہ بےکار ہو۔ ابھی دوکانیں کھڑی کر رہے ہیں اور بہار کے سیلاب پھر آئے اور وہ برباد ہو گئیں۔ فرش پھول گئے، دروازے لٹک گئے۔ پانی ہٹ گیا تو شہتیر سڑنے لگے۔ برسوں تک، ہر سال، میلے کے ان میدانوں میں سیلاب کا پانی بھرتا اور سڑکوں اور عمارتوں کی تباہی مچاتا، یہ سالانہ عذاب بہت نقصان کا باعث بنتا اور ہر شخص جانتا تھا کہ یہ اپنے آپ رکنے والا نہیں۔

ہر موسم بہار میں جب برف ٹوٹتی تو درجنوں کشتیاں اور بجرے ستیاناس ہو جاتے۔ لوگ آہیں بھرتے، ہائے وائے کرتے اور پھر سے نئی کشتیاں بناتے۔ پھر وہ بہار کے موسم میں برباد ہوتیں۔ معلوم نہیں لوگ مصیبت کے اس چکر میں کیوں گرفتار تھے!

جب میں نے اوسپ سے اس مسئلے پر گفتگو کی تو وہ حیران ہو کر مجھ ہی پر ہنسنے لگا۔

''اب کوے کو بھی دیکھنا کہ کائیں کائیں کئے جا رہا ہے! تو پوچھنا کہ کیوں کر رہا ہے؟ آخر تمہیں اس سے کیا مطلب ہے؟ تمہارا کیا لے رہا ہے؟''

پھر وہ زیادہ سنجیدگی سے مجھ سے بات کرنے لگا۔ لیکن پھر اس کی جوانوں جیسی روشن آنکھوں میں تمسخر کی چنگاریاں چھٹک رہی تھیں۔ کہنے لگا:

''تم بڑے ہوشیار ہو جو ایسی باتوں کا فوراً نوٹس لے لیتے ہو! یہ ٹھیک ہے کہ ان باتوں سے تم سے واسطہ نہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ تم کبھی ان باتوں کا اچھا استعمال کر سکو! یہاں اور بھی بہت سی باتیں تمہارے نوٹس کرنے کے لائق ہیں...''

اور پھر وہ خشک الفاظ کی بارش کرنے لگا، جنکے بیچ بیچ میں عوامی ضرب المثل بیان کرتا تھا، نادر تشبیہیں دیتا جاتا تھا اور لطیفے سناتا جاتا تھا:

''اب ایک طرف کچھ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ زمین بہت کم ہے اور والگا ہر موسم بہار میں ساحل کو کاٹ لیجاتی ہے اور مٹی کو بہا کر بیچ دریا میں چھچھلا پن پیدا کر دیتی ہے۔ کچھ کہتے ہیں: ارے والگا چھچھلی ہو گئی ہے! بہار کے چشموں اور گرمیوں کی بارش سے جابجا نالے بن گئے ہیں۔ اور زمین پھر والگا کے اندر تک چلی گئی ہے۔''

اس کے بات کرنے کے انداز میں نہ شکایت تھی، نہ پشیمانی، نہ دکھ جیسے وہ صرف زندگی سے

شکایتوں کے متعلق حقیقتوں کے علم کو ظاہر کر رہا ہے۔ اور اگر چہ اس کے الفاظ اور میرے خیالات ایک دوسرے سے مطابقت رکھتے تھے، پھر بھی اس کے الفاظ سننا ایک مصیبت تھی۔

''اور پھر ایک بات اور بھی ہے۔ آگ!''

مجھے معلوم تھا کہ کوئی موسم گرما ایسا نہیں گذرتا تھا جب والگا کے پرے جنگلوں میں آگ نہ لگتی ہو۔ ہر جولائی میں آسمان عنابی اور زعفرانی دھوئیں کی نقاب میں چھپ جاتا تھا اور جھکا ہوا سرخ سورج بغیر شعاعوں کے ایسا لگتا جیسے دکھتی ہوئی آنکھ۔

اوسپ نے کہا'' جنگل؟ جنگلوں کی کیا حقیقت ہے؟ یہ جنگل یا تو زار کے ہیں یا بڑے آدمیوں اور زمینداروں کے۔ کسانوں کے پاس جنگل کہاں اور شہروں میں بھی اگر آگ لگ جائے تو ایسا کوئی مضائقہ نہیں۔ وہاں صرف امیر لوگ رہتے ہیں اور امیروں پر کیا ترس کھانا! لیکن شہروں اور دیہات کا مقابلہ کر کے دیکھو تو نہ جانے کتنے گاؤں گرمیوں میں جل جاتے ہیں۔ سو تو ضرور جلتے ہوں گے اور یہ کافی بڑا نقصان ہے!''

پھر وہ دھیرے سے ہنسا'' ہم لوگوں کی زندگی میں غم تو بہتیرا ہی ہے لیکن عقل کا نام نشان نہیں! تم کو اور مجھ کو، دونوں کو ہی نظر آ سکتا ہے کہ کسی بھی انسان کی محنت کا فائدہ اس کو نہیں ملتا بلکہ آگ یا پانی کی نذر ہوتا ہے!''

''پر آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟ اس میں ہنسی کی کیا بات ہے؟''

''کیوں نہ ہنسوں؟ آگ کو آنسوؤں سے نہیں بجھایا جا سکتا اور سیلاب تو آنسوؤں سے اور بھی زیادہ زور پکڑتے ہیں۔''

مجھے اس بات کا یقین تھا کہ اب تک میں جتنے لوگوں سے ملا تھا، یہ خوب رو بڈھا ان سب سے زیادہ عقلمند تھا۔ لیکن مجھے اس کی پسند یا ناپسند کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔

میں اس بات پر غور کر رہا تھا کہ اس نے میرے ذہن میں لگی ہوئی آگ میں اور ایندھن ڈالنا شروع کیا۔

''ذرا اس بات پر غور کرو کہ لوگ اپنی اور دوسروں کی طاقت کو کس طرح ضائع کرتے ہیں۔ دیکھو تمہارے مالک تمہارا کچومر نکال دیتے ہیں یا وادکا سے کس قدر سخت نقصان لوگوں کو پہنچتا ہے۔ بے حساب

نقصان! کوئی پڑھا لکھا دماغ بھی اس نقصان کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا... اگر کوئی جھونپڑا جل جائے تو اس کو تو پھر سے بنایا جا سکتا ہے لیکن اگر ایک اچھا انسان تباہی کے راستے پر پڑ جائے تو پھر اس کا کوئی مداوا نہیں! مثلاً آردلیون کو دیکھو یا گریگوری کو دیکھو۔ کس طرح یہ دیہاتی دھواں ہو گئے! گریگوری کچھ ایسا ذہین تو نہیں مگر مخلص تو تھا ہی! اور کس طرح بھک سے اڑ گیا جیسے سوکھی گھاس کا گٹھا ہو۔ اور پھر عورتیں اس پر یوں پل پڑیں جیسے مردار کو کیڑے چاٹ جاتے ہیں۔''

''اچھا میں جو کچھ آپ سے کہتا ہوں وہ آپ میرے مالک کو کیوں بتا دیتے ہیں؟'' میں نے کہا۔ یہ بات میں نے اس لئے پوچھی تھی کہ مجھے اس کا سبب معلوم کرنے کی کرید لگی تھی، ورنہ اوسپ کے خلاف میرے دل میں کوئی شکایت نہ تھی۔

اس نے بڑی سادگی اور نرمی سے جواب دیا:

''وہ اس لئے کہ ان کو پتہ چل جائے کہ تمہارے دماغ میں کیا خیالات ایسے بھرے ہوئے ہیں جو تمہیں نقصان پہونچا سکتے ہیں۔ ان کو چاہئے نا کہ تمہیں عقل سکھائیں، ہدایت دیں۔ اگر تمہارے مالک یہ کریں گے تو پھر اور کون کرے گا؟ میں جو باتیں ان سے کہتا ہوں وہ کچھ تمہاری دشمنی میں نہیں کوئی بے وقوف لڑکے نہیں ہو لیکن تمہارے دماغ میں کوئی شیطان بیٹھا یہ تمام باتیں بھر رہا ہے۔ اگر تم چوری کرو گے تو میں اپنی زبان بند رکھوں گا، عورتوں کے پاس جاؤ گے تب بھی چپ رہوں گا۔ شراب پی کر دھت ہو جائے گے تب بھی ایک لفظ نہ کہوں گا، مگر میں تمہارے مالک سے تمہارے ان سرکش خیالات کا ضرور ذکر کروں گا۔ اسی لئے بہتر ہے کہ تم بھی آگاہ رہو...''

''اب میں آپ سے بات ہی نہیں کروں گا!''

وہ پھر بھر کیلئے چپ ہو گیا اور اپنی ہتھیلی پر لگا ہوا تارکول چھڑانے لگا، پھر بڑی محبت سے میری طرف دیکھا اور بولا:

''ہاں۔ تم کرو گے بات! جھوٹ بولتے ہو کہ نہیں کروں گا۔ نہیں تو پھر کس سے بات کرو گے؟ یہاں ہے ہی کون...''

اوسپ اپنی تمام ستھرائی اور پاکیزگی کے باوجود اس وقت بالکل یاکوف خلاصی کی طرح لگ رہا تھا۔ ہر ایک سے بالکل الگ تھلگ، ہر چیز سے بالکل بے نیاز۔

اس کو دیکھ کر مجھے کبھی پیوتر واسیلی وچ یاد آتا جو کٹر مذہبی تھا، کبھی وہ تھیلے والا پیوتر یاد آتا اور بعض اوقات اس کی بہت سی باتیں نانا ابا سے ملتی جلتی نظر آتیں۔ اب تک میں نے جتنے بوڑھے آدمی دیکھے تھے، ان میں سے ہر ایک کی کسی نہ کسی بات کی جھنک اوسپ میں آتی تھی۔ ویسے ان میں سے ہر ایک بوڑھا اپنی جگہ پر حیرت انگیز طور پر دلچسپ تھا مگر مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اگر ان میں سے کسی کے ساتھ بھی میں رہوں تو زندگی سخت مشکل اور اجیرن ہو جائے۔ یہ لوگ اپنی سمجھداری کی باتوں سے جیسے روح کو چاٹ جاتے تھے اور دل کو کھا کر کھوکھلا کر دیتے تھے۔ کیا اوسپ بھلا آدمی تھا؟ نہیں۔ برا آدمی تھا؟ نہیں۔ وہ ہوشیار تھا، یہ مجھے صاف نظر آتا تھا۔ لیکن جہاں میں اس کے ذہن کی ہمہ گیری کا معترف تھا وہاں یہ بھی مجھ پر بالکل واضح تھا کہ اس کے سوچنے کے طریقے سے میرے ذہن پر مردنی سی چھا جاتی تھی اور اس کے خیالات میرے خیالات کی ضد تھے۔

میرے ذہن میں تاریک خیالات کا طوفان اٹھ رہا تھا:

''تمام انسان ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں، مسکراہٹوں اور شیریں الفاظ کے باوجود سب ایک دوسرے کے لئے غیر ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ محبت کے مضبوط رشتے سے کوئی بھی زندگی کے ساتھ وابستہ نہیں۔ صرف نانی اماں سچ مچ لوگوں سے اور زندگی سے محبت کرتی ہیں اور ملکہ مارگٹ، عجیب وغریب ملکہ مارگٹ۔''

بعض اوقات ایسے تاریک خیالات بادلوں کی طرح دماغ پر چھا جاتے، زندگی پھیکی پڑ جاتی اور دم جیسے گھٹنے لگتا۔ لیکن اس زندگی کے علاوہ اور کس طرح زندگی بسر کی جا سکتی تھی؟ میں کہاں جا کر پناہ ڈھونڈوں؟ اوسپ کے سوا اور کوئی تو اتنا بھی نہ تھا کہ جس سے بات تک کر سکتا۔ اور اب میں اسی لئے اور بھی اس کی طرف جھکتا چلا جا رہا تھا۔

میرے جوشیلے بیانات کو وہ غور سے سنتا، مجھ سے سوالات کرتا، حالات دریافت کرتا اور پھر ٹھہراؤ کے ساتھ کہتا:

''دیکھو، کھٹک بڑھئی جو ہوتا ہے نا وہ بڑا ڈھیٹ پرندہ ہوتا ہے لیکن کسی کو مرعوب نہیں کر سکتا، اس سے کوئی ڈرتا نہیں ہے! میں تمہیں تہہ دل سے مشورہ دیتا ہوں کہ کسی خانقاہ میں داخل ہو جاؤ اور ہوش سنبھالنے تک تم وہاں رہ سکتے ہو اور ایمانداروں کو اپنی باتوں سے تسکین دے سکتے ہو۔ تمہیں رائے دیتا

ہوں کہ یہی کرو۔ مجھے ڈر ہے کہ تم سے دنیاداری نہیں برتی جاسکتی...''

مجھے خانقاہ میں داخل ہونیکی کوئی خواہش نہ تھی۔ مگر مجھے یہ ضرور محسوس ہوتا تھا کہ میں ایسے خیالات کے ایک ڈھیر کے نیچے دبا ہوا ہوں جو خود میری سمجھ میں بھی نہیں آرہے ہیں۔ دل بھر آیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی ایک جنگل ہے جس پر خزاں چھائی ہے۔ سانپ کی چھتریوں کا موسم بیت چکا ہے اور اب خالی جنگل میں کرنے کو کچھ نہیں، جس کے کونے کونے سے میں واقف تھا۔

میں نہ تو وادکا پیتا اور نہ ہی عورتوں میں جاتا۔ روح کو نشہ دلانے والی ان دونوں چیزوں کے بجائے میرے لئے کتابیں تھیں۔ لیکن جتنا ہی زیادہ پڑھتا تھا، اتنا ہی زیادہ اس خلا میں زندگی بسر کرنا دشوار ہوتا جاتا تھا۔ لوگوں کے زندگی بسر کرنے کے جو طریقے نظر آتے تھے وہ اور زیادہ بے کار اور بے معنی محسوس ہوتے جاتے تھے۔

حال ہی میں میرا پندرھواں سال پورا ہوا تھا۔ لیکن کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ میں نے زندگی میں اب تک جو کچھ بھگتا، جو کچھ پڑھا اور جو کچھ ایک منتشر طریقے سے سوچا ہے، اس کے اثر سے دل لبالب بھر کر بوجھل ہو گیا ہے۔ میرے تاثرات کا خزانہ ایک ایسے گودام کی طرح لگتا تھا جس میں بے شمار چیزیں اوندھی سیدھی ٹھسی پڑی تھیں اور مجھ میں ان کو الگ الگ کرنے کی نہ قوت تھی، نہ صلاحیت۔

اور ان تاثرات کے بوجھ سے میرے قدم جمنے کی بجائے میرا پورا وجود اس طرح اتھل پتھل ہو کر ہچکولے کھا رہا تھا جیسے ڈولتی ہوئی کشتی میں بھرا ہوا پانی۔

مجھے شکایتیں کرنے سے، دکھ سے اور بیماریوں سے نفرت تھی۔ جہاں کہیں دل آزادی یا بے رحمی دیکھتا۔ خون، تھپڑ، مکے بازی دیکھتا یا زبانی گالیاں بھی سنتا تو میرے دل میں احتجاج کی لہر آٹھتی۔ یہ لہر بڑی جلدی غصے میں تبدیل ہو جاتی اور میں وحشی جانوروں کی طرح لڑ پڑتا جس کی وجہ سے بعد کو پشیمانی اور پچھتاوے کی شدید تکلیفیں بھگتنی پڑتیں۔

ایسے موقعے آتے جب کسی کو آزار پہونچتے دیکھ کر میں آزار پہونچانے والے سے بدلہ لینے کے لئے اندھا دھند لڑائی جھگڑے میں کود پڑتا۔ آج بھی جب اس بے بس غصے کے دورے کی یاد آتی ہے تو میرا دل ندامت اور رنج سے بھر جاتا ہے۔

اس زمانے میں جیسے میرے دو وجود تھے۔ ایک وجود زندگی کی بہت سی گندی اور قابل نفرت چیزیں دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ زندگی کی وحشت ناک الٹ پلٹ نے اس کے مزاج میں طنز اور شک کا عنصر پیدا کر دیا تھا اور وہ اپنے سمیت تمام انسانوں کو بے بسی کے ساتھ رحم کی نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ اس وجود کا جی چاہتا تھا کہ انسانوں اور بستیوں سے کہیں دور ایک الگ تھلگ اور پرسکون زندگی بسر کرے۔ کتابوں کے جلو میں۔ وہ کبھی ایران بھاگ جانے کا خواب دیکھتا، کبھی خانقاہ میں پناہ لینے کی سوچتا، کبھی کسان کے جھونپڑے یا کسی ریلوے گارڈ کی کوٹھری میں جا پڑنے کا ارادہ کرتا، کبھی شہر کے کنارے چوکیدار بننے کی سوچتا۔ انسان سے جتنا بھی دور رہا جائے اتنا ہی بہتر ہے...

دوسرا وجود سچی کتابوں، عقلمندی اور ذکاوت سے بھری ہوئی کتابوں کی پاکیزہ صہبائے روحانی سے غسل کر کے یہ محسوس کرتا کہ زندگی کی یہی وحشتناک الٹ پلٹ ایک ایسی قوت ہے جو آسانی سے اس کا سر اڑا سکتی ہے یا اپنے گندے پہیوں تلے اس کے دل کو کچل سکتی ہے۔ اس لئے وہ اپنی ساری قوت اکٹھی کر کے، دانت بھینچ کے، مٹھیاں باندھ کے، اپنے بچاؤ پر آمادہ ہو جاتا۔ چاہے مار پیٹ ہو، چاہے زبانی بحث مباحثہ۔ اس کے دل میں بھرا ہوا محبت کا خزانہ اور رحم کا جذبہ عمل میں ظاہر ہوتا اور جیسا کہ فرانسیسی ناولوں کے دلیر ہیروں کے شایان شان تھا۔ وہ فوراً ذرا سے استعمال پر اپنی تلوار سونت کر میدان میں آ کودتا تھا...

اس زمانے میں ایک نہایت کمینہ شخص میرا دشمن تھا۔ یہ مالا یا پوکروفسکایا گلی میں جو قحبہ خانہ تھا اس کا دربان تھا۔ اس سے میری جان پہچان یوں ہوئی کہ ایک دن صبح کو میلے کے میدانوں کی طرف جاتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ برساتی کے سامنے ایک گاڑی سے ایک لڑکی کو گھسیٹ کر اتار رہا ہے۔ وہ لڑکی نشے میں بالکل دھت اور بدحواس تھی۔ دربان نے لڑکی کی ٹانگیں پکڑیں۔ اس کے موزے پھسل کر نیچے آ گئے تھے اور اس فحش طریقے سے اس کو جھٹکا دیا کہ اس کا جسم کمر تک کھل گیا۔ جھٹکا دیتے وقت وہ خرخر کرتا جاتا تھا، ہنستا جاتا تھا اور اس لڑکی پر تھوکتا جاتا تھا۔ لڑکی ملی دلی، اندھا دھند، ہونٹ لٹکے ہوئے، جھٹکے کھاتی، کھٹ کھٹ نیچے آتی جا رہی تھی۔ اس کے بازو اس طرح لٹک رہے تھے جیسے کندھوں پر سے اکھڑ گئے ہوں، سر کی طرف پڑے ہوئے تھے۔ سر پہلے تو سیٹ پر کھٹ سے گرا، پھر گاڑی کے پائے دان پر، پھر فٹ پاتھ پر۔

کوچوان نے گھوڑے کو چابک لگائی اور روانہ ہوگیا۔ دربان نے لڑکی کی ٹانگوں کو ٹھیلے کے ہینڈل کی طرح دونوں طرف سے پکڑا اور اسے فٹ پاتھ پر لاش کی طرح گھسیٹتا ہوا لے چلا۔ اب مجھ سے برداشت نہ ہوسکا۔ غصے میں پاگل ہوکر میں اس پر لپکا۔ وہ تو خیریت یہ گزری کہ میں اپنے ہاتھ میں جو پیمائش کا بھاری آلہ لئے تھا وہ میں نے پھینک دیا یا ہوسکتا ہے وہ میرے ہاتھ سے اتفاقاً گر گیا ہو۔ اس طرح سے وہ دربان اور میں دونوں ہی خطرناک انجام سے بچ گئے۔ میں اپنی پوری رفتار سے دوڑتا ہوا اس پر ٹوٹا، اس زمین پر گرادیا، لپک کر برساتی میں چڑھا اور گھنٹی کو بڑے زور سے کھینچا۔ گھنٹی کی آواز سن کر کچھ وحشی قسم کے لوگ دوڑتے ہوئے آپہونچے۔ میں ان کو کیا سمجھا تا چنانچہ میں نے اپنا آلہ اٹھایا اور اتیزی سے نو دو گیارہ ہوگیا۔

دریا کے کنارے چڑھائی پر میں نے کوچوان کو جالیا۔ اس نے اوپر سے، اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے مجھے معترف نگاہوں سے دیکھا:

''تم نے خوب ٹھیک کیا!''

میں بگڑ کر اس سے پوچھنے لگا کہ اس نے دربان کو اس لڑکی کے ساتھ ایسا بے حیائی کا سلوک کیوں کرنے دیا۔

اس نے حقارت سے جواب دیا:

''وہ لڑکی جائے جہنم میں! جب ان جنٹلمین لوگوں نے اسے گاڑی میں لادا تھا تو مجھے کو کرایہ ادا کر دیا۔ باقی کسی بات سے مجھ سے کیا مطلب؟''

''لیکن اگر یہ لوگ اس کو مار ڈالتے تو؟''

''ایسی عورتیں آسانی سے نہیں مرتیں'' اس نے اس طرح کہا جیسے اسے نشے میں دھت رنڈیوں کو مار ڈالنے کے فن میں مہارت ہو۔

اس واقعے کے بعد تقریباً روز ہی صبح اس دربان سے میری مڈبھیڑ ہوجایا کرتی تھی۔ جب میں گلی سے ہوکر گذرتا تو وہ روش کو جھاڑتا ہوا ملتا یا سیڑھیوں پر اس طرح بیٹھا ہوا ہوتا جیسے میرا انتظار ہی کر رہا ہے۔ جیسے ہی میں سامنے پڑتا وہ آستینیں چڑھا کر دھمکاتا:

''دیکھ لینا، اگر تیری یہ ہنڈیا توڑ نہ دی ہو تو...''

اس کی عمر چالیس سے اوپر رہی ہوگی، چھوٹا سا قد، ٹیڑھی ٹانگیں، پیٹ والی عورتوں کی سی توند۔ وہ کھڑا کھڑا ہنستے ہوئے روشن آنکھوں سے مجھے دیکھتا اور مجھے زیادہ کوفت تو اس بات کی ہوتی کہ اس کی آنکھوں میں نرمی رہتی، دوستی اور خوش مزاجی کی ہوتی کہ اس کی آنکھوں میں نرمی رہتی، دوستی اور خوش مزاجی نظر آتی۔ اسے مار پیٹ میں کوئی مہارت نہیں تھی، بازو بھی اس کے میرے بازوؤں سے چھوٹے ہی تھے۔ وہ چار حملوں کے بعد وہ ہار مان لیتا، دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو جاتا اور حیران ہو کر ہانپنے لگتا ''ٹھیر ٹھیر تو جا، جنگلی بلا!...''

میں اس روز روز کی جھپٹ سے عاجز آ گیا تھا اور ایک دن اس سے کہا:

''سن بے گدھے! میرا پیچھا چھوڑ، ہیں؟ چھوڑتا ہے کہ نہیں؟''

اس نے شکایت کے لہجے میں کہا ''تو پھر تم نے شروع کیوں کی لڑائی؟''

میں نے الٹ کر اس سے سوال کیا کہ وہ اس لڑکی کی بے آبروئی کیوں کر رہا تھا؟

''پھر تمہیں کیا؟ کیا تمہیں اس پر ترس آتا ہے؟''

''ہاں، بے شک آتا ہے۔''

وہ ذرا سا رک گیا، پھر اپنے ہونٹ پونچھے اور کہنے لگا:

''تو پھر تم کو تو بلیوں پر بھی ترس آتا ہوگا؟''

''ہاں، آتا ہے...''

تو وہ بولا:

''تم گدھے ہو اور جھوٹے بھی ہو! ذرا ٹھہرو، میں تمہیں دکھاؤں گا تماشہ...''

اس گلی سے میں اس لئے گذرتا تھا کہ وہ جگہ جہاں میں کام کرتا تھا ادھر سے نزدیک پڑتی تھی۔ لیکن اب میں نے صبح ذرا سویرے اٹھنا شروع کر دیا تا کہ دوسرے رستے سے جا سکوں اور دربان سے پہلو بچا سکوں۔ میری ان تمام کوششوں کے باوجود ایک دن ایسا اتفاق ہو گیا کہ میں ادھر سے گذر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ سیڑھیوں پر بیٹھا ہے۔ اس کی گود میں ایک سرمئی رنگ کی بلی تھی جسے وہ تھپتھپا رہا تھا۔ میں اس سے کوئی تین قدم کے فاصلے پر رہا ہوں گا کہ وہ اچھل کر ایک دم کھڑا ہو گیا، بلی کی دونوں پچھلی ٹانگیں پکڑیں اور اس زور سے اس کے سر کو پتھر کے ستون پر پٹخا کہ گرم خون کی تمام چھینٹیں مجھ پر پڑیں۔ پھر اسے اٹھا کر

میرے قدموں کے پاس ڈال دیا، خود پھاٹک کی آڑ میں کھڑا ہو گیا اور بولا ''اب کہو۔''

میں کیا کرتا؟ چشم زدن میں ہم دونوں گتھم گتھا، کتوں کی طرح ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے احاطے میں لوٹ رہے تھے۔ پھر میں دریا کے کنارے چڑھائی پر گھاس پر اوندھے منہ گر پڑا۔ اور میں نے زور سے اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے دبا لیا کہ چیخ نہ نکل جائے کہ کہیں پھوٹ پھوٹ کر رونے نہ لگوں۔ آج تک بھی مجھے اس واقعے کی یاد آتی ہے تو نفرت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور میں حیران رہ جاتا ہوں کہ اس وقت میں پاگل کیوں نہیں ہو گیا، کیوں اس وقت میں نے کسی کا بھی خون نہیں کر دیا؟

اور اس نفرت انگیز بات کو بیان کرنے سے بھی میرا کیا مقصد ہے؟ اے میرے شریف النفس قاری! تمہیں یہ معلوم ہو کہ یہ باتیں ابھی تک گئی گذری نہیں ہیں۔ تم ''وحشت ناک'' من گھڑت قصوں کو پڑھ کر لطف لیتے ہو نا؟ جب کہ تمہیں اس بات پر اعتراض نہیں کہ خیالی وحشت ناکیوں کا بیان کر کے تمہارے احساسات کو گدگدایا جائے۔ تو پھر میں نے تو حقیقی وحشت ناکیاں دیکھی ہیں، روزانہ کی زنگی کے سچے مظالم دیکھے ہیں اس لئے مجھے اس بات کا حق ہے کہ میں ان کو بیان کر کے تمہارے احساسات کو گدگداؤں، چاہے ہمیں کوفت ہی کیوں نہ ہو۔ ان سچی باتوں کو تم سے بیان کروں تاکہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ تم کہاں رہ رہے ہو اور کس قماش کی زندگی بسر کر رہے ہو! تم اس بات کا یقین کر سکو کہ ہم سب ابھی تک ایک نیچ اور کمینی زندگی گذار رہے ہیں اور حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

میں انسان سے بہت محبت کرتا تھا اور کسی کو تکلیف پہنچانا نہ چاہتا تھا لیکن جذباتی بننے سے کام نہیں چل سکتا۔ اور خوبصورت پچرنگے جھوٹ سے مکروہ حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ زندگی! زندگی! اور پھر ہمیں زندگی کے خزانے میں اپنے دل و دماغ کی تمام نیکی اور انسانیت کو انڈیل دینا چاہئے!

...خاص طور پر مجھ کو اس رویے پر نہایت غصہ آتا تھا جو عورتوں کی طرف تھا اور اس رویے کو تسلیم شدہ اور صحیح مانا جاتا تھا۔ میرے مشاہدے اور مطالعے نے یہ بتایا تھا کہ زندگی مین اور کوئی چیز عورت سے زیادہ لطیف اور معنی خیز نہیں ہے۔ میرے اس خیال کو نانی اماں کے وجود نے اور بھی پختگی بخشی تھی اور ان کی بیان کی ہوئی تمام کہانیوں نے جو پاک مریم اور عقل مند واسیلیسا کے متعلق تھیں۔ پھر نتالیا کی ہستی تھی۔ بد نصیب دھوبن نتالیا کی۔ اور سینکڑوں ہزاروں مسکراہٹوں میں دیکھے تھے۔ عورتیں جو زندگی کی خالق تھیں، جو

اس دنیا کی محبت اور مسرت کی محتاج تھیں، حسن وخوبصورتی عطا کرتی تھیں۔

ترگینیف کی کتابیں عورت کی شان میں تعریفوں کی گیتوں سے لبریز تھیں۔ اور مارگٹ تو ان تمام تعریفوں اور توصیفوں کی نمائندہ تھی۔ اس تمام خزانے کی سرتاج جو ہائنے اور ترگینیف جیسے مصنفوں نے مجھے بخشا تھا۔

میلے کے میدانوں سے واپسی پر میں اکثر پہاڑی پر کریملن کی دیوار کے پاس رک جایا کرتا تھا اور وہاں سے والگا کے پرے غروب آفتاب کو دیکھتا رہتا تھا۔ آفتاب سے شعلے کی طرح سرخ، لہراتے ہوئے چھوٹے چھوٹے دریا، والگا۔ عنابی اور اودا نظر آتا۔ ایسے لمحات میں مجھے یہ محسوس ہوتا کہ یہ ہماری دنیا ایک بہت بڑا بجرا ہے جو قیدیوں کو اپنے اندر بند کئے بہتا چلا جا رہا تھا، یا جیسے سور ہو، جس کو ایک غیر مرئی جہاز کھینچے لئے جا رہا ہے۔

لیکن زیادہ تر تو یہ ہوتا تھا کہ میرے ذہن پر دنیا کی وسعت کا خیال چھا جاتا۔ ان دوسرے شہروں کا خیال آتا جن کا ذکر میں نے کتابوں میں پڑھا تھا۔ ان غیر ممالک کا خیال آتا جہاں زندگی اور طرح گذرتی تھی۔ ان غیر ممالک کے مصنفین کی لکھی ہوئی کتابوں میں زندگی کا ایک ایسا عکس نظر آتا جو میرے چاروں طرف آہستہ اور ایکسانیت سے گھومتی ہوئی زندگی سے زیادہ پسندیدہ اور کم صعوبت والی تھی۔ اس خیال سے میرے دل کے خطرات کم ہو جاتے، دب جاتے اور مجھے سکون ہو جاتا۔ ایک امید بندھتی کہ غالبًا زندگی کا ایک بہتر نظام کبھی نہ کبھی ممکن ہوگا۔

اور میں سوچتا رہتا کہ کسی نہ کسی دن میری ملاقات کسی ایسے عقلمند اور مخلص انسان سے ہوگی جو مجھے ایک وسیع اور روشن شاہراہ پر لے جائے گا۔

ایک دن اسی طرح میں کریملن کی دیوار کے پاس ایک بنچ پر بیٹھا تھا کہ یاکوف ماموں آ نکلے۔ میں نے نہ تو ان کو آتے دیکھا اور نہ ہی ان کو فوراً پہچان سکا۔ اگرچہ ہم دونوں برسوں سے ایک ہی شہر میں رہتے تھے لیکن شاذ ہی ملاقات ہوتی تھی۔ کبھی اتفاق سے ملاقات ہوتی بھی تو نہایت سرسری طور پر۔

انہوں نے مذاقیہ انداز میں مجھے ٹہوکا دے کر کہا ''تم تو خوب اگتے جا رہے ہو۔''

پھر ہم لوگ اس طرح بات کرنے لگے جیسے ہم رشتہ دار تو نہیں ہیں لیکن ایک دوسرے کو بہت دنوں سے جانتے ہیں۔

نانی اماں سے مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ماموں یاکوف اپنے سب پیسے برباد کر چکے ہیں۔ کچھ عرصے تک وہ قیدیوں کی کالونی میں نگران کے نیچے کام کر رہے تھے لیکن اس نوکری کا بڑا حسرت ناک انجام ہوا۔ بات یہ ہوئی کہ ایک بار نگران بیمار ہوا۔ اس کی بیماری کے دوران میں یاکوف ماموں مجرموں اور قیدیوں کو اپنے گھر پر بلا کر رنگین پارٹیاں کیا کرتے۔ جب یہ بات کھلی تو ان کو ملازمت سے برخواست کر دیا گیا اور قیدیوں کو رات کے وقت کھلا چھوڑ دینے کے جرم میں ان پر مقدمہ بھی چلایا گیا۔ ان قیدیوں میں سے کوئی بھاگا تو نہیں تھا لیکن ایک آدمی پادری صاحب کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرتا ہوا پکڑا گیا تھا تفتیش بڑی لمبی ہوئی۔ چوکی داروں نے مل کر کچھ ایسا گھپلا کیا کہ میرے نیک دل ماموں اس ذلت سے بال بال بچ گئے۔ اب وہ کہیں نوکر نہیں تھے بلکہ ان کا لڑکا ہی ان کا خرچ اٹھاتا تھا۔ وہ روکاویشنیکوف کی بھجن منڈلی میں تھا۔ یہ پارٹی اس زمانے میں کافی مشہور تھی۔ یاکوف ماموں بڑے عجیب طریقے سے اپنے بیٹے کا ذکر کرتے تھے:

''وہ آج کل بڑا سنجیدہ ہو گیا ہے! اپنے آپ کو جانے کیا سمجھتا ہے۔ مغنی بن گیا ہے۔ سماوار گرم کرنے یا کوٹ پر برش کرنے میں مجھ سے ذرا دیر ہو جاتی ہے تو بگڑ جاتا ہے! بڑا صاف ستھرا لڑکا ہے۔ اس کی عادتیں بڑی ستھری ہیں...''

میرے ماموں، جواب کافی بوڑھے لگتے تھے، خود بہت ہی گندے اور پھٹیچر نظر آرہے تھے۔ ان کی حالت قابل رحم تھی، رنگیلی زلفیں چھدری ہو گئی تھیں، کان باہر کو نکل آئے تھے، آنکھوں کی سفیدی اور شیو کئے ہوئے گالوں کی ریشمی جلد پر سرخ سرخ رگوں کا جال سا دکھائی دے رہا تھا۔ اگرچہ وہ ہنس ہنس کر بات کر رہے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے منہ میں کوئی چیز پھنسی ہوئی ہے اور ان کی زبان اٹک رہی ہے۔ حالانکہ ان کے دانت بہت ہی اچھی حالت میں تھے۔

مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ ایک ایسے آدمی سے ملاقات ہوئی جو خوش رہنا جانتا تھا، جس نے بہت کچھ دیکھا تھا اور اس لئے اس ضرور بہت معلومات ہوں گی۔ مجھے ان کے مذاقیہ، رندانہ گیت یاد آئے اور نانا ابا جو ان کے متعلق کہا کرتے تھے کہ ''گانے میں داؤد اور کام کرنے میں اسلم''۔ وہ بات مجھ کو اب تک یاد تھی۔

ہمارے سامنے سے شہر کے شرفا ٹہلتے ہوئے نکلتے جا رہے تھے: کلرک، افسر لوگ اور ان کی عورتیں،

پھولے پھولے لباس پہنے۔ میرے ماموں ایک پرانا کوٹ اور گھسی ہوئی ٹوپی پہنے تھے، پھٹیچر جوتے اور بنچ پر اس طرح دبے سکڑے بیٹھے تھے جیسے انہیں خود اپنے وجود پر ندامت ہو رہی ہو۔ ہم دونوں پوچائینسکی نالے والی میز پر بیٹھے جو باہر بازار کی طرف کھلتی تھی۔

آپ کو یاد ہے ماموں، آپ کیسے گایا کرتے تھے:

ایک فقیر نے پاجامہ سکھانے کو لٹکایا

دوسرے فقیر نے چرایا...''

جب میں اس گانے کے مصرعے دوہرانے لگا تو مجھے پہلی بار اس گانے کے طنز کا احساس ہوا اور مجھے ایسا نظر آیا کہ میرے ماموں جو دیکھنے میں اتنے رنگین اور خوش باش تھے، وہ دراصل کس قدر تلخ مزاج اور عقل مند آدمی تھے۔ لیکن انہوں نے وادکا کا ایک گلاس انڈیلا اور سوچتے ہوئے صرف اتنا کہا:

''ہاں میں نے اپنی زندگی تو بسر کر ہی لی، لطف بھی اٹھایا۔ اگر چہ زیادہ نہیں! یہ گانا میرا تو نہیں ہے۔ یہ تو وہیں کے ایک مذہبی اسکول کے کسی استاد نے لکھا تھا۔ دیکھو کیا نام تھا مرحوم کا؟... میں بھول بھی گیا۔ میں اور وہ بڑے پکے دوست تھے لیکن اس نے پی پی کر اپنا خاتمہ کر لیا۔ ایک رات باہر نکل گیا نشے میں، بس سردی سے اکڑ کر مر گیا۔ اف کتنے انسانوں کو میں نے پی پی کر جان دیتے دیکھا ہے کہ گنتی نہیں ہو سکتی! کیا تم پیتے ہو؟ مت پینا۔ کچھ دن اور ٹھیرو۔ نانا ابا سے ملاقات ہوتی ہے؟ منہ بسورتے آدمی ہیں بڑے میاں۔ ایسا لگتا ہے اب ان کا دماغ بھی کمزور ہو گیا ہے۔''

ایک دو پیگ پی کر وہ ذرا مزے میں آ گئے، کندھے پھیلائے جیسے جوانی عود کر رہی ہو اور زیادہ جی لگا کر بات چیت کرنے لگے۔ میں نے ان سے اس قیدیوں والے معاملے کے متعلق پوچھا:

''تو تم نے بھی اس کے بارے میں سن لیا؟'' انہوں نے سوال کیا۔ پھر آواز مدہم کر کے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولے:

''اچھا اگر وہ مجرم ہیں تو پھر کیا؟ میں کوئی ان کا جج نہیں ہوں۔ مجھے تو یہ نظر آتا تھا کہ وہ بھی ہماری ہی طرح کے انسان تھے۔ تو میں نے ان سے کہا'' آؤ بھائیو، سب مل کر دوستی اور پیار سے رہیں۔ وہ جیسے وہ گیت ہے نا، اس طرح لطف اٹھائیں:

بدقسمتی کو ماریں لات، خوش رہیں، مزے کریں

تا کہ اس سفر کو ہم مل کے ساتھ طے کر لیں،
بے وقوف ہے وہ جو غم کے آگے جھک جائے،
خوشی و رنگینی، زندگی ہماری ہے!...''

وہ ہنسنے لگے اور کھڑکی میں سے جھانک کر نالے کو دیکھنے لگے جہاں چھوٹی چھوٹی دوکانوں پر تاریکی بیٹھتی جا رہی تھی۔ پھر مونچھوں پر ہاتھ پھر کر کہنے لگے:

''اور اس قید خانے میں اس قدر اکتاہٹ اور پھیکا پن تھا کہ ظاہر ہے وہ بیچارے باہر آ کر بہت خوش ہوئے۔ جب حاضری دے لیتے تو وہ لوگ مجھ سے ملنے آتے۔ کھانا ہوتا، وادکا پی جاتی۔ جو کبھی میری ہوتی، کبھی ان لوگوں کی۔ اور محفل ایسی گرم ہوتی کہ مزا آ جاتا۔ مجھے گانے ناچنے کا شوق ہے ہی اور ان لوگوں میں بعض بہت اچھا گاتے اور ناچتے تھے۔ سچ مچ بہت ہی خوب! تمہیں یقین نہ آئے گا۔ ان میں سے آدھوں کے پیروں میں تو زنجیریں اور بیڑیاں ہوتی تھیں اور زنجیروں کے ساتھ بھلا کیسے ناچا جا سکتا ہے؟ اس لئے بھئی ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میں ان کو بیڑیاں اتارنے کی اجازت دے دیا کرتا۔ پر وہ لوہار کی مدد کے بغیر خود بھی اپنی بیڑیاں اتار لیتے تھے۔ بڑے ہی ہوشیار لوگ! افوہ! بڑے ہی سمجھدار! البتہ یہ سب جھوٹ اور بے کار الزام ہے کہ میں نے ان کو اس لئے آزاد کیا تھا کہ شہر میں جا کر چوریاں کریں، نہ ایسی بات کوئی ثابت ہی کر سکا...''

پھر وہ چپ ہو گئے اور نالے کی طرف دیکھنے لگے۔ وہاں پرانی سیکنڈ ہینڈ چیزوں کے دوکاندار اپنی دوکانیں بند کر رہے تھے۔ چٹخنیوں کی جھنا جھن، تالوں کی کھٹ پٹ اور گرتے ہوئے پٹروں کی دھڑ ادھڑ سنائی دے رہی تھی۔ پھر انہوں نے بڑے مزے میں مجھ سے آنکھ ماری اور بولے:

''جو سچ پوچھو تو ان ہی میں سے ایک بے شک رات کو باہر نکل جاتا تھا، مگر اس کے بیڑیاں تھیں ہی نہیں۔ وہ نیژنی کا ایک معمولی سا چور تھا۔ اصل میں پیچور کا ندی کے پاس اس کی ایک معشوقہ رہتی تھی۔ اور وہ جو پادری کا گڑ بڑ ہوئی وہ تو محض ایک غلطی تھی۔ وہ پادری صاحب کو ایک خاص سوداگر سمجھا۔ یہ واقعہ جب ہوا تو جاڑوں کی طوفانی رات تھی۔ سب ہی بڑے بڑے کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ اب اس میں کیا پتہ چلتا کہ کون سوداگر ہے، کون پادری ہے۔''

مجھے اس قصے کو سن کر بڑا لطف آیا۔ وہ بھی ہنس کر بولے:

ہاں اور کیا! اب آخر اس بیچارے کی سمجھ میں کیسے آتا کہ یہ پادری صاحب قبلہ ہیں۔''

پھر یکا یک ان کا موڈ بگڑ گیا۔ جلدی سے غصے میں بھر کر انہوں نے اپنی پلیٹ آگے کو سرکا دی، برا سا منہ بنایا اور سگریٹ جلاتے ہوئے بڑبڑائے:

''یہ لوگ ایک دوسرے کو لوٹتے ہیں، پھر ایک دوسرے کو پکڑتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کو قید خانے میں ڈالتے ہیں یا سخت مشقت کے لئے سائبیریا بھیج دیتے ہیں لیکن مجھے خواہ مخواہ ہی بیچ میں کیوں پھنسایا؟ تھڑی ہے اس سب چکر پر!... آخر میرا اپنا ضمیر ہے، روح ہے!''

میری نظروں کے سامنے اس بھدے خلاصی کی ہستی ابھر آئی۔ وہ بھی ''تھڑی ہے'' کہنے کا بڑا شوقین تھا اور اس کا نام بھی یاکوف تھا۔

ماموں نرمی سے بولے ''کیا سوچ رہے ہو؟''

''کیا آپ کو ان قیدیوں پر ترس آتا تھا؟''

''بے شک۔ ان پر ترس آنا بالکل فطری بات ہے۔ اس قدر اچھے لوگ، سچ مچ بہت ہی خوب انسان تھے وہ! کبھی کبھی میں ان کو دیکھ کر سوچتا کہ تم لوگ اتنے سمجھدار اور ذہین لوگ ہو۔ میں تو تمہارا جوتا صاف کرنے کے لائق بھی نہیں ہوں اور میں تمہارا نگران ہوں، تمہارا چوکی دار! کیسے تیز اور چابک دست ہیں یہ بدمعاش!''

شراب پینے سے اور ان یادوں کے اثر سے وہ پھر مزے میں آ گئے تھے۔ دونوں کہنیاں انہوں نے کھڑکی کے طاق پر ٹیک دیں اور پیلے ہاتھ میں دبے ہوئے سگریٹ کو ہلاتے ہوئے جوشیلی آواز میں کہنے لگے:

''ان میں ایک کانا تھا۔ اگر تم کبھی اس کو بات کرتے سنتے تو کہتے۔ اگر تم کبھی اس کو بات کرتے سنتے تو کہتے۔ وہ دھات پر کھدائی کا کام اور گھڑی سازی کرتا تھا۔ جعلی سکے کے سلسلے میں پکڑا گیا تھا اور اس نے قید خانے سے نکل بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ ذرا سنتے تم کسی طرح بات کرتا تھا۔ بالکل آگ! طائر خوش لحن کی طرح گانا گاتا تھا۔ کہتا ''مجھ کو یہ سمجھائے کہ ٹکسال میں روپیہ کیوں بن سکتا ہے اور میں کیوں نہیں روپیہ بنا سکتا؟ سمجھایئے نا!'' اب اس کو کون سمجھاتا؟ میں بھی نہیں سمجھا سکتا تھا اور میں اس کا نگران تھا! پھر ایک اور شخص تھا، اور ماسکو کا بڑا مشہور چوٹا تھا۔ صاف ستھرا رہتا تھا اور خاموش۔ شوقین مزاج تھا، ہمیشہ

بڑی لطافت اور شرافت سے بات کرتا۔ وہ کہتا تھا ''لوگ محنت کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ تھک کر، ٹوٹ کر گر پڑتے ہیں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' پھر کہتا ''میں ایک بار اس کو آزما چکا ہوں۔ میں نے اتنا کام کیا، اتنی محنت کی کہ انگلیاں گھس گئیں۔ اور کیوں؟ بس ذرا سے کے لئے۔ ایک انگشتانے بھر شراب پی لو، تاش میں ذرہ برابر ہار جاؤ، کسی عورت کے پاس جاؤ، اسے کچھ دے دو۔ تو پھر وہی موچی کے موچی۔ دیوالیہ، بھوکے ننگے۔ نہیں بھائی، میں یہ کھیل نہیں کھیل سکتا ہوں...''

یاکوف ماموں میز پر جھک پڑے اور کہتے رہے، کہتے رہے۔ ان کا چہرہ بالوں کی جڑوں تک سرخ ہو گیا تھا اور اتنا جوش ان کو آ گیا تھا کہ ننھے ننھے کان پھڑ پھڑا رہے تھے:

''یہ لوگ کوئی بے قوف نہیں ہیں بھیا! یہ زندگی کا صحیح نظریہ رکھتے ہیں۔ جہنم میں جائے یہ سب کچھ! اب مجھے ہی دیکھو، میری بھی کوئی زندگی رہی۔ اسے یاد کر کے شرم آتی ہے۔ جو اچھی چیز حاصل بھی کی وہ چھین کر چرا کر۔ غم کمایا، مسرت چرائی! پہلے باپ چیختے ''یہ نہ کرو!'' پھر بیوی چیختی ''وہ نہ کرو!'' پھر میں ڈرتا کہ کون ایک روبل کے پیچھے اپنی گردن تڑوا لے۔ اس طرح زندگی تو پھسلتی ہی رہی، گذرتی ہی رہی۔ بڑھاپا آ گیا۔ اور اب اپنے بیٹے کی محتاجی ہے۔ اب چھپاؤں کیوں؟ مجھے تو ذلیل ہو کر اس کی خدمت کرنی پڑتی ہے اور وہ ہے کہ جنٹلمین کی طرح مجھ پر چیختا رہتا ہے۔ وہ مجھے ویسے تو ''بابا'' کہتا ہے لیکن مجھے ایسا لگتا ہے جیسے مجھے ''کتا'' کہہ کر بلا رہا ہو! کیا میں اس لئے ہوا تھا، اس لئے سب کچھ بھگتا تھا کہ آخر عمر میں اپنے بیٹے کا نوکر بنوں۔ اگر یہ بیٹا نہ ہوتا، تو زندگی سے مجھے کیا مسرت حاصل ہوتی؟''

میں بہت دھیان سے نہیں سن رہا تھا۔ چنانچہ میں نے جواب سننے کی خاطر نہیں بلکہ یوں ہی رک رک کر کہا:

''میں بھی نہیں جانتا ہوں کہ زندگی آخر کیسے بسر کی جائے...''

انہوں نے فوں سے کہا ''ہنہہ... جانتا بھی کون ہے؟ میری تو کسی ایسے شخص سے آج تک ملاقات ہوئی نہیں جو جانتا ہو! لوگ بس یوں ہی جیئے چلے جاتے ہیں، عادتاً...''

ان کے لہجے میں پھر غصہ پیدا ہو گیا جیسے کوئی چوٹ لگ گئی ہو:

''ایک اور شخص تھا اور رویل کا رہنے والا جوزنا بالجبر کے لئے بند کر دیا گیا۔ وہ سرفا میں سے تھا اور خوب ناچتا تھا۔ وہ لوگوں کو وانکا کے متعلق گانا سنا سنا کر خوب ہنسایا کرتا تھا:

قبرستانوں میں وانکا گھومتا ہے

اپنا سوکھا سا منہ لٹکائے

وانکا، وانکا، یہاں کیوں آئے دیکھو تو اس سے بہتر جگہ ہے کہیں؟

لیکن میرا خیال یہ ہے کہ اس گانے میں ہنسی کی کوئی بات نہیں۔ یہ جیتی جاگتی حقیقت ہے، زندہ حقیقت! کتنا ہی کسمساؤ، کتنا ہی رسمساؤ لیکن قبرستان سے نجات نہیں۔ اور جب وہاں پہنچ جایئے تو کمبخت کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ نگران ہیں یا چوٹے...''

غالباً اب وہ بولتے بولتے تھک گئے تھے۔ انہوں نے وادکا اٹھا کر ختم کر دی اور چڑیا کی طرح گردن ادھر ادھر ہلا کر ایک آنکھ سے خالی صراحی دیکھی، پھر خاموشی سے سگریٹ کا کش کھینچنے لگے، پیچ کھاتا ہوا دھواں ان کی مونچھوں سے اٹھنے لگا،

پتھر کا مستری پیوتر جو کسی طرح بھی یاکوف ماموں سے مشابہ نہ تھا۔ وہ بھی یہ بات کہنے کا شوقین تھا ''انسان چاہے جتنی کوشش کرے اور چاہے جتنی امید باندھ لے لیکن انجام آخر کار تابوت اور قبر کا کونا ہے''۔ عوام کی کتنی ضرب المثال اس خیال کو ظاہر کرتی ہیں۔

مجھے کوئی خواہش نہ تھی کہ یاکوف ماموں سے اور کچھ پوچھوں۔ مجھے ان پر ترس آ رہا تھا اور ان کی موجودگی سے میرا دل بجھا جا رہا تھا۔ کوشش کے باوجود یہ نہیں بھلا پا رہا تھا کہ وہ کیسے رنگین گانے گاتے تھے اور ان کے چھتارے کی جھنجھناہٹ کیسی ہوتی تھی جو اداسی کے چیتھڑے اڑا دیا کرتی تھی۔ نہیں، میں زندہ دل تسگان کو بھولا نہیں تھا اور جب میں نے موجودہ یاکوف ماموں پر نظر ڈالی جو اس قدر مضمحل نظر آ رہے تھے، تو میں سوچنے لگا کہ کیا ان کو یہ بھی یاد ہے کہ انہوں نے ہی تسگانوک کو صلیب کے نیچے کچل کر مار ڈالا تھا؟

لیکن پوچھنے کو جی نہ چاہا۔

میں نے جھانک کر نالے کی طرف دیکھا۔ اگست کا کہر چھایا ہوا تھا۔ نیچے گہرائیوں سے سیب اور خربوزوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ شہر کو جانے والی پتلی سڑک پر لالٹینیں چمک چمک اٹھتی تھیں اور میرے چاروں طرف کا ماحول مدتوں کا جانا پہچانا محسوس ہو رہا تھا۔ سیٹی بجی، لوری بینسک کے لئے اسٹیمر روانہ ہوا۔ وہ سیٹی بجی تو پیرم کیلئے اسٹیمر چھوٹا...

یاکوف ماموں بولے ''آہ، اچھا تو میں چلوں ...''

شراب خانے کے دروازے پر انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مذاقیہ لہجے میں بولے:

''اب منہ لٹکائے نہ گھومنا۔ ارے، تو تو منہ بسورنے لگا۔ مار گولی! ابھی جوان ہے۔ تقدیر چاہے جیسے ہو خوش کا راستہ کھلا ہے! اسے یاد رکھو! اچھا خدا حافظ۔ میرا راستہ ادھر او سپینسکی گرجا گھر کی طرف سے نکلتا ہے۔''

اس طرح میرے رنگین مزاج ماموں چلے گئے اور مجھ کو اتنی کرکے اپنی گفتگو سنا کے میرے ذہن کو اور بھی زیادہ الجھن میں ڈال گئے۔

میں شہر کی طرف چلا اور میدان میں نکل آیا۔ پورا چاند نکلا ہوا تھا، بادل نیچے ہو کر آسمان پر ادھر سے ادھر تیرتے پھرتے تھے اور اپنی سیاہ پرچھائیوں سے میری پرچھائیں کو مٹاتے جاتے تھے۔ میں نے کھیتوں کھیتوں میں شہر کا ایک پورا چکر لگایا اور پھر دریائے والگا کے اونچے کنارے پر آنکلا۔ وہاں میں گرد آلود سبزے پر لیٹ گیا اور بڑی دیر تک دریائے والگا کے اس پار، اس کی وادیوں کو، اس خاموش بے حس وحرکت زمین کو دیکھتا رہا۔ والگا پر بادلوں کے سائے آہستہ آہستہ تیرتے، نکلتے جا رہے تھے۔ والگا کے پار پہنچ کر ان سائیوں کا رنگ اور روشن ہو جاتا تھا جیسے انہوں نے دریا کے پانی میں منہ دھو لیا ہو۔ میرے چاروں طرف ہر چیز پر نیند کا عالم طاری تھا۔ ہر چیز جیسے دب گئی تھی، بیٹھ گئی تھی۔ جو چیزیں ہلتی بھی تھیں وہ بڑی ہچکچاہٹ سے رک رک کر جیسے اندرونی زندگی کی حرکت اور جوش کے بجائے مجبوراً ایسا کر رہی ہوں۔

اور میرا دل چاہتا تھا کہ اپنے آپ کو اور کائنات کا ایک زور کی ٹھوکر ماروں تاکہ ہر چیز، میرے سمیت، خوش سے پھرکی کی طرح تھرکنے لگے، ان انسانوں کی طرح جو ایک دوسرے سے اور زندگی سے محبت کرتے ہیں۔ ایسی زندگی سے جو ایک نئی زندگی کی داغ بیل رکھے گی، زیادہ پر خلوص زندگی، زیادہ ایماندار، زیادہ دلیر اور زیادہ حسین زندگی۔

اور پھر سوچا، اگر اب اور اسی وقت کچھ نہ کیا تو سمجھو کچھ کھو بیٹھے۔

خزاں کے دنوں میں، جب نہ صرف یہ کہ سورج دکھائی نہیں دیتا بلکہ انسان کو سورج کا احساس تک نہیں رہتا، تو انسان سورج کو بھول جاتا ہے۔ ایسے دنوں نہ جانے کتنی بار جنگلوں میں میں رستے سے بھٹکا ہوں۔ راستے سے ہٹے نہیں کہ پگڈنڈیاں اوجھل ہوئیں اور آخر کار ان کی تلاش سے نڈھال ہو کر انسان

دانت بھینچ لیتا ہے اور ناک کی سیدھ میں چل دیتا ہے۔ سڑے ہوئے درختوں اور پتوں پر قدم اٹھاتے ہوئے دلدل کے ٹیلوں پر آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اور آخر میں جنگل سے نکل جاتا ہے!

آج میں نے بھی یہی کہا۔

اس سال موسم خزاں میں قازان روانہ ہوگیا۔ میرے دل میں ایک امید دبی ہوئی تھی کہ وہاں اپنے لئے تعلیم حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نکال سکوں گا۔

پڑھنے والوں سے

marxists.org کا اردو سیکشن آپ کا بہت شکرگزار ہوگا اگر آپ ہمیں اس کتاب کے مواد اور اس کے ترجمے کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دے سکیں تو ہم آپ کے شکرگزار ہوں گے۔

اپنی رائے کے لئے درج ذیل پتے پر ای میل کریں:

hasan@marxists.org

اس کے علاوہ اگر آپ اردو یا کسی اور زبان کے سیکشن کے لئے اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کرنا چاہیں تو انسانی علمی ترقی میں آپ کا حصہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

یہ ایڈیشن مارکسسٹ انٹرنیٹ آرکائیو اردو سیکشن کے لئے ابن حسن نے ترتیب دیا۔

کمپوزنگ: رضیہ سلطانہ

پروف ریڈنگ: حبیب اللہ